

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مطالب الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر — خود — قرآن مجید سے)

جلد چہارم

سورۃ آل عمران (۳) - سورۃ النساء (۴) - اور سورۃ المائدہ (۵)
(مع اندکس)

پرویز

شائع کردہ: ادارہ طلوع اسلام ۲۵، گلبرگ ۲ لاہور

سلسلہ

۱۔ مطالب الفرقان کی پہلی جلد، اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری، اکتوبر ۱۹۷۶ء اور تیسری، نومبر ۱۹۷۹ء میں۔ اس (چوتھی) جلد کا مسودہ دو سال قبل تیار ہو چکا تھا۔ لیکن حالات کی نامساعدت نے اس کی اشاعت میں بھی غیر معمولی تاخیر کر دی۔ ویسے بھی موجودہ حالات میں اس قسم کی بلند پایہ، ضخیم، اعلیٰ معیار کی تحقیقی کتابوں کا شائع کرنا بڑا ہمت طلب ہے۔ شکر ایزدی کو وہ اس وقت تک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے جا رہا ہے، ورنہ ہماری کوتاہ دامنی تو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سابقہ تین جلدوں میں سب سے زیادہ ضخیم، جلد سوم تھی جو ۵۴۸ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس جلد کی ضخامت قریب ساڑھے چھ سو (۶۵۰) صفحات تک بڑھ گئی ہے۔ پہلے ارادہ تھا کہ سورۃ المائدہ کا حصہ اس سے حذف کر دیا جائے، لیکن پھر جی نہ پا یا کہ اس قدر مشتاق اور متعلق قارئین کو اس مزید عرصہ کے لئے محروم رکھا جائے۔ لہذا اسے بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔

۲۔ سلسلہ مطالب الفرقان کا تفصیلی تعارف، اس کی پہلی دو جلدوں میں کرایا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس جلد میں کس قدر اہم مباحث آگئے ہیں، اس کا اندازہ فہرست مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔ بالخصوص حضرت مریمؑ کی انقلاب انگیز داستانِ حیات اور حضرت عیسیٰؑ کی حیاتِ مقدسہ کے احوال و کوائف جن میں ان کی پیدائش، معجزات۔ دنیا سے تشریف براری، مذہبی پیشواؤں کی خود ساختہ انسانیت کش خدائی اور رومن ایسائز کی خون آشام شائشائیت کے خلاف علمِ بغاوت۔ ان کے علاوہ ترکہ اور وراثت سے متعلق احکام۔ عائلی قوانین کے بعض اہم گوشے۔ حدود (جرائم کی سزاؤں) سے متعلق قرآنی قوانین۔ اسلامی نظام اور ”اطاعتِ خدا اور رسول“ کا تفصیلی مفہوم۔ حدیث اور سنت سے متعلق عنوانات کی سیر حاصل بحث۔ یہ اور اسی انداز کے دیگر عنوانات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۳۔ اندازِ بیان اس جلد میں بھی حسبِ سابق رکھا گیا ہے۔ یعنی جو مباحث سابقہ جلدوں میں آچکے ہیں، ان کا اعادہ نہیں کیا گیا بجز اس کے جہاں کسی نکتہ کی وضاحت کے لئے ایسا ضروری سمجھا گیا ہے۔ بعض اوقات تو ایک ہی جلد میں اہم نکات کا اعادہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیں گے تو اس سلسلہ کی ہر جلد میں پورے کے پورے قرآن مجید کی بنیادی تعلیم اور پیام کا عکس نظر آ جائیگا۔ جو تفسیر خود قرآن کریم سے مرتب کی جائے اس کا یہی عالم ہوتا ہے۔ پہلی تین جلدوں کا مشترکہ انڈکس، تیسری جلد کے آخر میں چسپاں کیا گیا تھا۔ اس جلد کا الگ انڈکس اس کے آخر میں پوسٹ ہے۔ جس عنوان کے متعلق تشریح مطلوب ہو، بہتر ہو کہ اس کا حوالہ دونوں انڈکسوں میں دیکھ لیا جائے۔

آیات کا حوالہ حسبِ سابق ہے۔ یعنی متن کتاب میں سورۃ اور انڈکس میں (آیت: سورۃ)

۴۔ مفکر قرآن اس عمر رسیدگی، مسلسل نامزدائی، طبیعت اور دیگر کثیر مصروفیات کے باوجود، مطالب الفرقان کی تدوین میں مسلسل مصروف رہتے ہیں۔ ایسا کچھ قرآن کے ساتھ ان کے بے پایاں عشق کی رو ہی سے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر، صحت اور توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ والسلام۔

بِسْمِہِ تَعَالٰی

آئینہ مطالب

(مطالب الفرقان — جلد چہارم)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸	انجیل کی تاریخ		سلسبیل
۱۷	هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ الْحَكِيمُ		فہرست
	عمل اور اس کی نتیجہ خیزی کو کو سمجھانے کے لئے		حرف آغاز
۱۸	محسوس مثال جنین کی پیدائش		پہلا باب
۱۹	هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ أُولُوا الْأَلْبَابِ		آیت ۳ تا آیت ۳۱
۲۰	محکمات و متشابہات کی تشریح		آلَمْ الْقِيَوْمِ
۱۹	اس آیت کا غلط مفہوم	۳	حکومت عرف خدا کے زندہ و پائندہ کی ہرکتیج
۲۰	قرآنی اصطلاحات — محکمات و متشابہات	۳	اس کا عملی مفہوم
۲۱	ام الکتاب اور تاویل کا مفہوم	۴	خدا کے زندہ کی حکومت زندہ انسانوں کے لئے
۲۱	محکمات و متشابہات کا وضاحتی مفہوم	۵	زندگی بخش نظام -
۲۱	عرش کی مثال	۵	نَزَلَ عَلَيْكَ ذُو انْتِقَامٍ
۲۳	خدا کے لئے انسانی اعضاء کے الفاظ	۶	لفظ انتقام کا مفہوم
۲۳	عرش کے متعلق ایک روایت	۶	خدا کے ذوا انتقام ہونے سے مراد
۲۳	وہ مثالوں سے بھی بلند ہے	۶	خدا انسانی جذبات سے مبرا اور مستغنی ہے
۲۴	قرآنی حقائق کے سمجھنے کا طریق	۷	إِنَّ اللَّهَ فِي السَّمَاءِ
۲۴	ہر زمانے کی علمی سطح اور ہر انسان کی ذہنی سطح کے مطابق		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	قَدْ كَانَ لَكُمْ الْإِبْصَارِ	۲۵	خارجی کائنات کے حقائق
۳۵	جنگ بدر کی طرف ضمنی اشارہ	۲۶	قرآن کریم کی تمام آیات محکم ہیں
۳۶	زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُسْنُ الْمَآبِ	۲۶	متشابہا مثانی کا مفہوم
۳۷	دنوی زینت کی چیزیں حرام نہیں۔ لیکن جہان میں اور کسی مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو جائے تو اس قدر کی خاطر دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دینا تقاضا ایمان ہے۔	۲۷	اضداد سے مفہوم کی وضاحت
۳۸	مال اور اولاد فتنہ بن جاتے ہیں بلکہ دشمن ایمان و آگہی	۲۸	رَبَّنَا لَا تُفِزْ الْوَهَّابِ
۳۹	قُلْ أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ بِالْعِبَادِ	۲۸	مغرب کے سائنسدانوں اور قرآن کے سائنسدانوں کے مقصود و منتہی میں فرق
۴۰	ان کے برعکس جنت کی زندگی کے اہل	۲۹	رَبَّنَا إِنَّكَ الْبَيْعَادِ
۴۱	الَّذِينَ يَقُولُونَ عَذَابُ النَّارِ	۳۰	خدا کی رہنمائی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کر دے گی
۴۲	عباد اللہ کی خصوصیات	۳۱	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقَوْدُ النَّارِ
۴۳	کبار الاثم سے بچنے والے، اور چھوٹی موٹی لغزشوں (لمم) کی اصلاح کر دینے والے	۳۲	جہنم اور قود جہیم
۴۴	الصَّابِرِينَ بِالْأَسْحَارِ	۳۳	كَذَابُ الْإِل الْعِقَابِ
۴۵	صابرین۔ صادقین۔ قانتین۔ مستغفرین بالاسحار	۳۴	تاریخی شواہد سے قرآنی دعاوی کا ثبوت
۴۶	صدق کا مفہوم	۳۵	قوم فرعون کا مال
۴۷	قانتین کا مفہوم	۳۶	ذنب (جمع ذنوب) کا مفہوم
۴۸	مستغفرین بالاسحار	۳۷	عظمتِ انبیاء کی بحث
۴۹	شَهِدَ اللَّهُ حَكِيمٌ	۳۸	انبیاء کرام کی (معاذ اللہ) لغزشیں
۵۰	خدا کی شہادت کا مفہوم	۳۹	مودودی (مروجہ) کی گمراہ کن توجیہ
		۴۰	سورۃ الفتح کی تشریح
		۴۱	قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا بئسَ الْمَآدُ
		۴۲	لشکروں کے اجتماعات..... جنگی تصادمات
		۴۳	حشر کے معنی اس دنیا کے اجتماعات بھی ہیں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۴	ہمارے لئے راہنمائی — ہمارا فریضہ برہمچاری کا کوشش کرنا ہے، نتیجہ مرتب کرنا نہیں۔	۴۰	ملائیکہ کی شہادت
۴۵	إِنَّ الَّذِينَ يَعْذِبُ آلِهِمْ قُلْ أَنْبِئْهُمْ كَذَلِكَ۔	۴۱	وحدت کائنات
۴۶	أُولَئِكَ تُصْرِفُونَ۔	۴۲	تمام کائنات میں اقتدار صرف قوانین خداوندی کا ہے۔
۴۷	حیط اعمال کا مطلب۔	۴۱	ارباب علم کی شہادت
۴۸	اعمال کس طرح رائیگاں چلے جاتے ہیں؟	۴۱	قسط کا مفہوم
۴۹	دین کے شعائر کی شکلیں قائم رہتی ہیں، ان کی روح باقی نہیں رہتی۔	۴۲	إِنَّ الَّذِينَ سَرِيعُ الْحِسَابِ
۵۰	ہماری یہی حالت ہے۔	۴۳	یہی الدین اور الاسلام ہے
۵۱	الْمُتَرَدِّينَ مُعْرِضُونَ	۴۴	یہی الدین حضراتِ انبیاء کرامؑ لاتے رہے، لیکن ان کے متبعین اس میں اختلاف پیدا کر دیتے۔
۵۲	اہل کتاب کو ضابطہ خداوندی کا صرف ایک حصہ دیا گیا تھا۔	۴۵	إِنَّ حَاجُّوكَ بِالْعِبَادِ
۵۳	وہ ضابطہ مکمل شکل میں قرآن کے اندر دیا گیا ہے۔	۴۶	اہل کتاب اور غیر اہل کتاب، سب کو ایمان لانے کی دعوت
۵۴	جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں	۴۷	نبوت اور رسالت میں فرق
۵۵	اختلافات بھی کتاب اللہ کی رو سے دور کئے جاسکتے ہیں	۴۸	رسول اللہ کافر فیضہ پیغام خداوندی کا پہنچا دینا تھا، دوسروں کو راہِ راست پر چلا دینا نہیں حضور کی آرزو کہ جس نظام کے لئے وہ اس قدر جدوجہد کر رہے ہیں وہ آپ کی زندگی میں قائم ہو جائے
۵۶	ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ يَفْتَرُونَ۔	۴۹	خدا کی طرف سے جواب کہ آپ کو اس سے غرض نہیں کہ وہ کب قائم ہوگا۔ آپ کافر فیضہ کوشش کئے جانا ہے۔
۵۷	نجات کے متعلق یہودیوں کا باطل عقیدہ		
۵۸	ہمارے ہاں شفاعت کا عقیدہ		
۵۹	ایک روایت		
۶۰	اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ارشاد		
۶۱	شفاعت کا عقیدہ قوم کو جرائم پر جرمی کر دیتا ہے		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۸	اصول شکنی کو بھی۔ اور اس کے لئے (معاذ اللہ) { سند اسوۃ رسول اللہ سے پیش کرتے ہیں۔	۵۱	۳/۲۶۷ { فُكِّفَتْ اِذَا جُمِعَتْ لَهُمْ يَطْلُمُونَ مکافات عمل۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی
۵۹	دروغ گوئی کی اجازت ہی نہیں۔ یہ واجب ہو جاتی ہے تقیہ کی بھی اجازت ہے۔	۵۲	۳/۲۵ { قُلِ اللَّهُمَّ قَدِيرٌ اس آیت کا مروجہ ترجمہ
۶۰	تقیہ کا مفہوم اور مسلک قُلْ اِنْ قَدِيرٌ	۵۳	صبیح صورت حالات عزت و ذلت، حکومت اور محکومی۔ سب
۶۱	جو کچھ کرنا ہو، کھلے بندوں کرو۔ يَوْمَ تَجِدُ بِالْعِبَادِ	۵۴	خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتی ہے { تَوُجَّحُ الْكِل حِسَابِ
۶۲	ہر عمل کا نتیجہ سامنے آجائیگا۔ پھر { مناقت سے کیا حاصل؟	۵۵	قانونِ مشیت کی شہادت، نظامِ کائنات سے اقوام کی موت و حیات کا قانون۔
۶۳	قُلْ اِنْ كُنْتُمْ غُفُورٌ رَّحِيمٌ خدا کے ساتھ محبت کے معنی اس کی اطاعت ہیں۔	۵۶	بغیر حساب رزق کا مفہوم۔ دوقومی نظریہ۔
۶۴	قُلْ اطِيعُوا اللَّهَ الْكُفْرَيْنِ اطاعتِ خدا اور رسول کا عملی مفہوم۔	۵۷	۳/۲۷ { لَا يَتَّخِذْ الْمَصْبُورُ کفار (غیر مسلموں) کے ساتھ مومنین کے تعلقات
	دوسرا باب	۵۸	ان سے دوست داری کے تعلقات قائم { نہیں کئے جاسکتے۔
	آیت ۳ تا ۳/۱۱۹	۵۹	إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُ ط کا { غلط ترجمہ اور مفہوم۔ مودودی مرحوم کی
	۳/۳۲-۳۳ { إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى عَلَيْهِ	۶۰	تفسیر کی رو سے۔ مطالب الفرقان میں مودودی مرحوم کے
۶۵	عمران کون تھا؟	۶۱	حوالے زیادہ کیوں دیئے جاتے ہیں { مودودی مرحوم منافقت کو جائز قرار دیتے ہیں۔
۶۶	آدم۔ نوح۔ آلِ ابراہیم۔ آلِ عمران کے { اصطفیٰ کا کیا مطلب ہے۔		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۲	یہودی معاشرہ میں فحاشی۔	۷۵	حضرت زکریا کا تذکرہ۔
۷۵	اُن کے معبدوں اور سیکلوں تک میں قحبہ گری۔		یہ آیات آگے چل کر، حضرت مریمؑ
۷۶	بیکل کی رابسات کی زندگی اور قیود۔		کے تذکرہ میں آئیں گی
۷۷	نذرین (منت ماننے والوں) کا طبقہ۔	۷۶	هٰذَا لَكَ دَعَا..... سَمِيعُ الدُّعَاءِ
۷۷	اِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ..... الْعَلِيِّمُ۔	۷۷	حضرت زکریا کی اولاد کے لئے دعا۔
۷۷	والدہ حضرت مریمؑ کی منت۔	۷۷	فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ..... اُبْكَار
۷۷	فَلَمَّا وَضَعَتْهَا..... الرَّجُلِیْمُ	۷۷	بیٹے کی بشارت۔
۷۸	حضرت مریمؑ کی پیدائش۔	۷۷	محراب کے معنی۔
۷۸	مریمؑ کے معنی۔	۷۷	”یہ بچی“ کے معنی اور اہمیت۔
۷۹	بیکل کی زندگی۔	۷۷	سَيِّدًا - خَصُوصًا - صَالِحًا - نَبِیَّ۔
۷۹	پوجاریوں کی آلودہ نگہی اور حضرت مریمؑ کو اپنی	۷۸	حضرت زکریا کا استنصاب کہ یہ بیٹا
۷۹	تحویل میں لینے کے لئے جلد جوئی۔	۷۸	میری اولاد ہوگا یا مریمؑ کی طرح کا بچہ!
۷۹	فَقَدْ قَبِلْنَا رَبَّنَا..... بِغَيْرِ حِسَابٍ	۷۸	حضرت زکریا کی بیوی میں طبعی نقص تھا۔ اس کی
۸۰	بیکل میں رزق۔	۷۹	اصلاح ہوگئی تو وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوگئی۔
۸۰	عند اللہ رزق کا مفہوم۔	۷۹	انجیل میں مذکور یوحنا۔
۸۱	حضرت مریمؑ کی کشمکش۔ قلبی اضطراب۔	۷۹	حضرت مریمؑ عیسا سلام
۸۱	اطمینان بوساطت ملک۔	۷۹	وَ اِذْ قَالَتِ..... الْعَلِیْنِ
۸۱	نزول ملک بشارت دینے کے لئے۔	۷۹	ان کی برگزیدگی کی وجہ ایک نبی کی والدہ ہونا نہیں
۸۲	ایک ضمنی گوشہ۔ نبوت مردوں تک محدود تھی۔	۷۹	(مروجہ عقیدہ کے مطابق) بن باپ بچے کی
۸۲	يٰمَرْيَمُ اقْنُتِیْ..... یَخْتَصِمُونَ	۷۹	والدہ ہونا بھی نہیں۔
۸۳	حضرت مریمؑ کے دل میں مستقبل کے	۷۹	حفاظت عصمت کے لئے حضرت یوسفؑ کی مثال
۸۳	خطرات کا احساس شدید تھا۔	۷۹	حضرت مریمؑ کی حفاظت عصمت کی منفردیت۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۳	{ قرآنی نقطہ نگاہ سے بن باپ کے پیدا ہونے کے عقیدہ کی تردید۔	۸۳	{ اس کے باوجود حضرت مریمؑ نے یہ انقلابی قدم اٹھایا۔
۹۴	{ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ الصّٰلِحٰتِ ۳۴-۳۵	۸۴	{ یہ تھی ان کی وجہ فضیلت۔
۹۵	{ حضرت مریمؑ کی طوط ملائکہ کی آمد۔	۸۵	{ (ضمناً) قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات کی صداقت کا ثبوت
۹۶	{ ملائکہ کے معنی پیغام رساں۔	۸۶	{ حضرت عیسیٰؑ۔
۹۷	{ یہ پیغام رساں حضرت زکریاؑ کی طرف سے آئے تھے۔	۸۷	{ حضرت عیسیٰؑ و دیگر انبیاء کرام کی طرح ایک نبی تھے لیکن ان کے متعلق خصوصی عقائد
۹۸	{ کلمۃ اللہ کا مفہوم۔	۸۸	{ مروج ہیں ان عقائد کی اہمیت۔
۹۹	{ عیسیٰؑ اور مسیح کے معنی۔	۸۹	{ اس اہمیت کی وجہ۔ ایک گہری سازش۔
۱۰۰	{ ابن مریم کیوں؟	۹۰	{ اس کے لئے جھوٹی روایات وضع کی گئیں۔
۱۰۱	{ تو ہم پرستیوں کا ازالہ۔	۹۱	{ یہودیوں کی سازش۔
۱۰۲	{ قَالَتْ فَيَكُونُ ۳۶	۹۲	{ حضرت موسیٰؑ حضور سے قابض!
۱۰۳	{ حضرت مریمؑ کا استعجاب اور خدا کی طرف سے جواب۔	۹۳	{ عیسائیوں کی سازش۔
۱۰۴	{ کن فیکون کا مفہوم۔	۹۴	{ حراری اور صحابہؓ کا تقابل۔
۱۰۵	{ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْاِنْجِيلَ ۳۷	۹۵	{ بخاری کی وضعی روایت۔
۱۰۶	{ حضرت عیسیٰؑ کی بنیادی خصوصیت۔	۹۶	{ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش۔
۱۰۷	{ بنی اسرائیل کی طرف رسول۔	۹۷	{ یوسف نجار کا بیٹا۔
۱۰۸	{ ”کشل آدم“ کا مفہوم۔	۹۸	{ ابن اللہ کا عقیدہ۔
۱۰۹	{ (آیات ۳۸-۵۰ آگے آئیں گی) (نیز دیکھئے صفحہ ۱۴۰)	۹۹	{ مقام الوہیت۔ عین خدا۔
۱۱۰	{ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش و دیگر انسانوں کی طرح ہوئی تھی۔	۱۰۰	{ حضرت مریمؑ کا مقام۔
۱۱۱	{ وَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا کا مفہوم۔	۱۰۱	{ پیدائش۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۶	اعلانِ نبوت -	۱۰۳	{ سورہ مریم (۱۹) میں پیدائش حضرت عیسیٰؑ کی مزید تفصیلات -
۱۱۷	ہیکل کے پکاریوں کی طعن و تشنیع -	۱۰۴	اور ہماری روایات -
۱۱۸	جھوٹے میں لیٹے باتیں!	۱۰۴	{ جبریل کس انداز میں حضرت مریمؑ کے پاس آئے تھے؟ (معاذ اللہ صدار معاذ اللہ)
۱۱۸	بعثت حضرت عیسیٰؑ کے وقت بنی اسرائیل کی حالت -	۱۰۶	روح کے معنی وحی خداوندی -
۱۱۹	آپ کی زندگی کا (غلط) نقشہ -	۱۰۷	{ وَسَاسُوا لَآ..... مُؤْمِنِينَ -
۱۱۹	حضرت عیسیٰؑ کی انقلاب آفرین تعلیم -	۱۰۸	اس آیت کا عام ترجمہ -
۱۲۰	اجبار و رعبان کے خلاف اعلانِ جہاد -	۱۰۸	معجزات کی اصولی بحث -
۱۲۰	حکومت خداوندی کے قیام کے داعی -	۱۰۹	ان سے حاصل کیا ہوا؟
۱۲۰	مذہبی پیشوائیت کے خطرات -	۱۱۰	{ حضرت عیسیٰؑ کا انداز..... تمثیلات و استعارات کے ذریعے تبیینِ حقیقت -
۱۲۰	سیکولر حکومت کی ثنویت کے داعی -	۱۱۱	کلام عرب میں مجازی - معانی -
۱۲۱	یہودیوں کی سازش -	۱۱۲	حضرت عیسیٰؑ کی تشبیہات -
۱۲۱	جھوٹے الزامات اور سرائے موت کا فیصلہ -	۱۱۳	آیت (۳۸) کا مفہوم -
۱۲۱	قَلَمًا أَحْسَنَ..... الشَّهِيدِينَ -	۱۱۳	حضرت عیسیٰؑ کا معاشی انقلاب -
۱۲۳	حضرت عیسیٰؑ کے حواری -	۱۱۴	نظام ربوبیت کی ایک جھلک -
۱۲۳	انجیل کی رو سے - قرآن کی رو سے -	۱۱۴	معجزات تمثیلی تھے - عیسائی مفکرین کا اعتراض
۱۲۴	وَمَكْرُؤٌ..... أَلْمَا كَسَوِينَ -	۱۱۵	{ وَمُصَدِّقًا..... مُسْتَقِيمٌ
۱۲۴	یہودیوں کی سازش اور تدبیر خداوندی -	۱۱۵	بنی اسرائیل کی خود ساختہ "شرعی" زنجیروں کو توڑ دیا -
۱۲۴	حیات و وفاتِ مسیح کا مسئلہ -	۱۱۶	وطن کی طرف مراجعت -
۱۲۴	آنے والے کا عقیدہ -		
۱۲۵	{ یہودیوں کے ہاں، اور خود ہمارے ہاں! حضرت عیسیٰؑ کی ہجرت -		
۱۲۶	{ آپؑ یہودیوں کے ہاتھ ہی نہیں آئے (ہجرت) رسول اللہؐ کے مطابق -		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۲	۳۴۰ فَمَنْ جَآجَلَكَ الْكَذِبِينَ - ۱۲۲	۱۲۶	۳۵۴ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ تَخْتَلِفُوْنَ
۱۲۲	مباہلہ کے معنی -	۱۲۷	واقعہ صلیب - انجیل کے مطابق -
۱۲۴	۳۴۱-۳۴۲ اِنَّ هٰذَا بِالْمُفْسِدِينَ - ۱۲۴	۱۲۷	دنیا کے ہر مذہب میں آنے والے کا عقیدہ -
۱۲۴	حقیقی واقعات وہی ہیں جنہیں قرآن نے بیان کیا ہے -	۱۲۷	حیاتِ مسیح کے عقیدہ کی تائید میں روایات -
۱۲۴	عصر حاضر کی تحقیقات کی شہادت -	۱۲۷	سَرَفَعَ اِلَى السَّمَاءِ کا عقیدہ -
۱۲۴	۳۴۳ قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ مُسْلِمُونَ - ۱۲۴	۱۲۸	خدایگان اور زمان کی حدود سے بلند و بالا ہے -
۱۲۴	اہل کتاب سے کہا کہ جزئیات کو چھوڑو اور {	۱۲۸	الحی کا مفہوم -
۱۲۴	دین کی اصل و اساس کی طرف آؤ - }	۱۲۹	”مجسم خدا“ کا عقیدہ -
۱۲۵	ہماری حالت بھی انہی اہل کتاب کی سی ہے -	۱۳۰	عرش پرستی -
۱۲۶	۳۴۴ يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ مِنَ الْمُشْرِكِينَ - ۱۲۶	۱۳۰	وفات حضرت مسیح -
۱۲۷	رسول اللہ شیعہ تھے یا سنی؟ اہل حدیث تھے {	۱۳۳	صیب کے واقعہ کی سقیقت -
۱۲۷	یا اہل فقہ؟ }	۱۳۴	صیب کسی اور کو دی گئی تھی -
۱۲۸	حنفی مجموعہ احادیث -	۱۳۵	انجیل برنباس کا تعارف اور شہادت -
۱۲۸	حدیث کسی حنفی سے پڑھو، پھر بیعت کی جائیگی -	۱۳۷	اس کے بعد یہودیوں کی آخری تباہی -
۱۲۹	حنفی تفسیر قرآن -	۱۳۸	۳۵۵-۳۵۶ فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوا الظَّالِمِیْنَ
۱۲۹	سنی ترجمہ قرآن -	۱۳۸	یہودیوں پر عیسائیوں کے غلبہ کی پیش گوئی -
۱۵۰	کیا رسول اللہ غیر مقلد ہی رہے؟ (معاذ اللہ)	۱۳۹	۳۵۷ ذٰلِكَ تَتْلُوْهُ الْحٰكِمِیْدِ
۱۵۰	۳۴۷ اِنَّ اَوْلٰی النَّاسِ وَاِلٰی الْمُؤْمِنِیْنَ - ۱۵۰	۱۳۹	عصر حاضر کی تحقیق کس طرح قرآنی شواہد {
۱۵۰	انسان اسی کی ملت بننا ہے جس کا وہ اتباع کرے }	۱۴۰	کی تائید کر رہی ہے -
۱۵۱	۳۴۸ وَ دَّتْ طٰٓئِفَةٌ تَشْهَدُوْنَ - ۱۵۱	۱۴۰	۳۵۸-۳۵۹ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی الْمُسْتَرِیْنِ
۱۵۱	حنی کے معاملہ میں کسی سے مفاہمت یا مصالحت {	۱۴۰	(نیرہ دیکھئے صفحہ ۱۰۲)
۱۵۱	نہیں ہو سکتی۔ حنی اہل بتو ہے اور بے لچک }	۱۴۰	اسکے بعد بٹ دھرمی کرنیوالوں سے قطعِ علاقہ -

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۰	خداوندی ہے، خواہ فریق کوئی بھی ہو۔	۱۵۱	يَا أَهْلَ الْكِتَابِ..... تَعْلَمُونَ {
۱۴۰	کفار کے اچھے کاموں کا صلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔	۱۵۲	تلبیس حق و باطل، کتمان حقیقت {
۱۴۱	وَأَنَّ مِنْهُمْ..... يَعْلَمُونَ -	۱۵۳	قرآن مجید کے باطنی معانی {
۱۴۱	مذہبی پیشوائیت کے لیے۔ دین ذریعہ معاش	۱۵۳	وَقَالَتْ طَائِفَةٌ..... لَعَلَّهُمْ {
۱۴۲	مَا كَانَ لِشَيْءٍ..... تَذَرُّسُونَ -	۱۵۳	يَرْجِعُونَ -
۱۴۳	انسانی آزادی کا عظیم اور بے مثال منشور۔	۱۵۳	دین میں وسوسہ انگیزی۔
۱۴۳	اور تو اور رسول کو بھی حق حاصل نہیں کہ وہ {	۱۵۳	اس سے اسلام کچھ کا کچھ بن گیا۔
۱۴۳	کسی کو اپنا محکوم اور فرمانبردار بنائے۔	۱۵۳	وَلَا تَقُولُوا..... ذُو الْفَضْلِ {
۱۴۳	حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔	۱۵۳	الْعَظِيمِ -
۱۴۴	وَلَا يَأْمُرُكُمْ..... مُسْلِمُونَ -	۱۵۵	بلا تحقیق عقیدہ کہ جس مسلک پر ہم ہیں وہی {
۱۴۵	کسی (مذہب) فوق الفطرت قوت کی بھی {	۱۵۵	مسلک حق ہے! اپنا مسلک مت چھوڑو {
۱۴۵	غلامی نہیں۔	۱۵۵	دوسروں کو اس کی طرف لے آؤ۔
۱۴۵	وَإِذَا أَخَذَ..... الشَّهَادَاتِ -	۱۵۶	معیار ہدایت قرآن مجید ہے۔
۱۴۵	سلسلہ رشد و ہدایت کی اصولی بحث۔	۱۵۶	وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ..... وَهُمْ {
۱۴۶	فَمَنْ تَوَلَّى..... الْفَاسِقُونَ	۱۵۶	يَعْلَمُونَ -
۱۴۶	رسول آخر الزمان کی رسالت پر ایمان کا مطالبہ۔	۱۵۶	اہل کتاب کے دیا تدار لوگوں کی تشریف۔
۱۴۶	أَقْبِعُوا دِينَكُمْ..... يُوجِعُونَ -	۱۵۸	قرآن کی کشادہ نگہی۔
۱۴۶	دین خداوندی ساری کائنات میں جاری و ساری ہے {	۱۵۸	پرائیویٹ اور پبلک ضوابط اخلاق الگ الگ {
۱۴۶	طوعاً و کرہاً کا مفہوم۔	۱۵۸	قومی عصبيت کا جہنم۔
۱۴۸	قُلْ آمَنَّا..... مُسْلِمُونَ -	۱۵۹	بَلَى مَنْ أَوْفَى..... عَذَابَ أَلِيمٍ {
۱۴۸	تمام انبیاء سابقہ کی طرف نازل شدہ دین۔	۱۵۹	قرآنی ضابطہ اخلاق۔
			نہارا عہد خدا کے ساتھ ہے جس کا پورا کرنا فریضہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۳	حضرت یعقوب بعض چیزوں کے کھانے سے احترار برتتے تھے۔	۱۶۸	وَمَنْ يَبْتَغِ الْخَيْرَيْنِ اسی کا نام اسلام ہے۔ اور اسی کو آخر الامر نوع انسانی کو اختیار کرنا ہوگا
۱۴۳	یہودیوں نے سمجھ لیا کہ وہ حرام ہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔	۱۶۹	كَيْفَ يَهْدِي الظَّالِمِينَ - ہم نے اس دین کو اپنا، اور پھر چھوڑ دیا۔ اس سے زیادہ کسی قوم کی حرام نصیبی کیا ہو سکتی ہے؟
۱۴۳	رسول اللہؐ نے بھی ایسا کیا تھا۔	۱۷۰	أُولَٰئِكَ يَنْظُرُونَ - عبرت آمیز انجام۔
۱۴۳	اس پر تنبیہ کہ امت انہیں بھی حرام نہ تصور کرے۔	۱۷۰	إِلَّا الَّذِينَ غَفُوًّا رَّحِيمٌ اگر یہ قوم اپنی غلط روش چھوڑ کر وہی (صحیح) راستہ پھر سے اختیار کر لے تو انعاماتِ خداوندی کی مستحق ہو سکتی ہے
۱۴۳	ایک اہم دینی سوال۔	۱۷۰	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصْرِفُونَ تو براہی زندگی میں تاکہ سابقہ روش کے نقصانات کی تلافی ہو سکے۔
۱۴۳	سنت رسول اللہؐ کسے کہتے ہیں۔	۱۷۰	لَنْ تَنَالُوا عَلَيْهِمْ محبوب ترین چیزوں کا انفاق۔
۱۴۵	مودودی (مرحوم) اور دیگر علماء میں بحث۔	۱۷۱	محبوب ترین اشخاص اور اشیاء اور اقدار خداوندی ہیں تصادم کی صورت میں
۱۴۶	پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کا مسئلہ۔	۱۷۲	كُلُّ الطَّعَامِ هُمْ الظَّالِمُونَ خدا کی راہ میں رکاوٹ بن کر ٹوٹ کر بے ہوا ہو جاؤ، شری دین میں الجھاؤ اور خمیدگی پیدا کرو۔
۱۴۷	مودودی (مرحوم) کا اعتراف کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ناممکن ہے۔		
۱۴۷	شریعت پنچوں کے قیام کی سعی لا حاصل۔		
۱۴۷	قُلْ صَدَقَ اللَّهُ الْمُشْرِكِينَ - حضرت ابراہیمؑ مشرکین میں سے نہیں تھے۔		
۱۴۸	إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ الْعَالَمِينَ کعبہ سے متعلق آیات - تشریح سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔		
۱۴۹	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعْمَلُونَ آیت اللہ سے انکار سنگین جرم ہے۔		
۱۴۹	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعْمَلُونَ خدا کی راہ میں رکاوٹ بن کر ٹوٹ کر بے ہوا ہو جاؤ، شری دین میں الجھاؤ اور خمیدگی پیدا کرو۔		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۶	امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ ہے۔	۱۸۰	عَوَجًا اور عَوَجًا کا فرق۔
۱۸۸	مَنْكُحُ کی تشریح۔	۱۸۱	دین میں غیر محسوس ٹیڑھاپن پیدا کر دینا۔
۱۸۸	وَلَا تَكُونُوا..... خُلْدُونَ۔	۱۸۲	اس سے دین، مذہب بن کر رہ جانا ہے۔
۱۸۹	تفرقہ، خدا کا عذاب اور رو سیاهی کا موجب۔	۱۸۲	ظواہر پر اس قدر زور مقصد یکسر غائب۔
۱۸۹	تِلْكَ آيَةُ اللَّهِ.....	۱۸۲	قبلہ کا مقصد محدود۔
۱۸۹	تَرْجِعُ الْأُمُورُ	۱۸۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... كُفْرِينَ
۱۸۹	خارجی کائنات میں قوانین خداوندی۔	۱۸۲	فِيكُمْ رَسُولُهُ (کا غلط) اور صحیح مفہوم
۱۸۹	كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ..... الْفَاسِقُونَ	۱۸۲	ختم نبوت سے شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔
۱۸۹	خیر امت جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔	۱۸۲	اب دور نظام کا ہے۔
۱۸۹	اس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔	۱۸۳	وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ..... مُسْتَقِيمٍ
۱۹۰	اس فریضہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔	۱۸۳	اسلام اعتصام بکتاب کا نام ہے یہ شخصیتوں کے سہارے قائم رہنے کے لئے نہیں دیا گیا۔
۱۹۰	لہذا اسلامی نظام میں عورتیں بھی امور مملکت میں شریک ہو سکتی ہیں۔	۱۸۴	اسلامی نظام کی وضاحت۔
۱۹۰	لَنْ يَضُرَّكُمْ..... يُنصَرُونَ۔	۱۸۵	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... قَسِلُونَ
۱۹۱	اگر یہ یہود مخالفت سے باز نہ آئے تو شکست کھا جائیں گے۔	۱۸۵	زندگی بھر اعتصام بکتاب اللہ۔
۱۹۱	ضَرَبْتُ عَلَيْهِمْ..... يَعْتَدُونَ	۱۸۶	وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ..... تَهْتَدُونَ۔
۱۹۱	اور ذلیل و خوار ہونگے۔	۱۸۶	دین کا اصل الاصول۔ اعتصام بکتاب اللہ۔
۱۹۱	لَيْسُوا سَوَاءً.....	۱۸۶	اس سے وحدت امت قائم ہوتی ہے۔
۱۹۱	بِالْمُتَّقِينَ۔	۱۸۶	اور امتی بنیاد پر نظام اسلام کا قیام۔
		۱۸۶	وَلَكِنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ..... الْمُفْلِحُونَ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	تیسرا باب		
	آیات ۳ تا ۱۹۹		
۱۹۸	ہجرت کے بعد بھی قریش نے مخالفت کیوں جاری رکھی	۱۹۲	یہودیوں میں سے اسلام لے آنے والے {
۱۹۹	نوحہ ابو جہل -	۱۹۳	اس کا دروازہ کسی پر بند نہیں۔
۲۰۰	جنگ احد -	۱۹۴	قرآن سے انکار کرنے والوں کا انجام -
۲۰۱	رسول فوج کا کمانڈر - ان حقیقت بھی ہوتا تھا -	۱۹۵	یہودیوں کا اتفاق -
۲۰۲	توکل کا مفہوم -	۱۹۶	ان کی مملکت کی عصیت اور تنگ نظری -
۲۰۳	خدا کے زندہ دہ پائندہ ہونے کا عملی ثبوت -	۱۹۷	اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت -
۲۰۴	اس کی کتاب کے کافی اور محکم ہونے پر ایمان -	۱۹۸	اسلامی مملکت کے عناصر ترکیبی اور مقاصد -
۲۰۵	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا ضمنی تذکرہ -	۱۹۹	غیر مسلم اس میں شریک نہیں کئے جاسکتے -
۲۰۶	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۰۰	یَا أَيُّهَا الَّذِينَ تَعْقِلُونَ.....
۲۰۷	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا مفہوم، اس کا اثر -	۲۰۱	انہیں راز دان نہیں بنایا جاسکتا -
۲۰۸	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا ضمنی تذکرہ -	۲۰۲	ہَا أَنتُمْ..... بِذَاتِ الصُّدُورِ
۲۰۹	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۰۳	یہ تمہارے دلی دشمن ہیں، اور سخت منافق
۲۱۰	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا مفہوم، اس کا اثر -	۲۰۴	دور حاضر کے لات و منات -
۲۱۱	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۰۵	مغرب کی (سرمایہ پرست) عیسائی
۲۱۲	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا ضمنی تذکرہ -	۲۰۶	سلطنتوں کی مسلمانوں کو دعوت
۲۱۳	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۰۷	خدا پرستوں اٹھو۔ روس کی دھرتی کے
۲۱۴	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا مفہوم، اس کا اثر -	۲۰۸	خلافت مشترکہ محاذ بناؤ۔ اور خود
۲۱۵	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۰۹	مسلمانوں کے جانی دشمن
۲۱۶	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا ضمنی تذکرہ -	۲۱۰	ان تَمَسُّكُمْ..... مُحِيطٌ
۲۱۷	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -	۲۱۱	مومن اور کفار کبھی ایک
۲۱۸	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا مفہوم، اس کا اثر -	۲۱۲	قوم نہیں بن سکتے۔
۲۱۹	جنگ احد میں ملائکہ کے ذریعے نصرت -		
۲۲۰	جنگ بدر میں ملائکہ کی نصرت کا ضمنی تذکرہ -		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۳	حیات، مرگ با شرف	۲۰۶	نہ مال غنیمت، نہ غلام نہ لونڈیاں۔
۲۱۳	موت، حیات بے شرف۔	۲۰۶	صرف اعلیٰ کلمۃ الحق۔ نظام خداوندی کا غلبہ
۲۱۳	موت اور حیات قانون خداوندی سے وابستہ ہے۔	۲۰۶	غلاموں اور لونڈیوں (روما ملک) کا خاتمہ۔
۲۱۳	خودکشی (ہلاکت خویش) کی ممانعت۔	۲۰۶	لَيْسَ لَكَ سَرَّ حَبِيبٌ
۲۱۳	وَلَيْسَ قِتْلُكُمْ يَجْمَعُونَ	۲۰۶	اور میانی ریات بد میں آئینگی، دیکھئے ص ۲۳۹
۲۱۳	اصل حیات توفیق فی سبیل اللہ میں مضمر ہے۔	۲۰۶	وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ الْمُؤْمِنِينَ
۲۱۳	اس میں مرد مومن قتل ہو جائے یا ویسے مر جائے۔	۲۰۶	بیر اندازوں کے ایک دستے کا غلط فیصلہ۔
۲۱۳	وَلَيْسَ مَثَلُكُمْ تَحْشَرُونَ	۲۰۶	اس سے سخت نقصان پہنچا۔
۲۱۳	قتل ہو جانے والے یا مر جانے والے سب ایک	۲۰۶	اس کی تلافی
۲۱۳	نقطہ پر جمع ہوں گے۔	۲۰۸	چھوٹی موٹی لغزشیں یا تدبیری غلطیاں
۲۱۳	سوال موت کے طریقہ کا نہیں سوال مقصد کا ہے	۲۰۸	معصیت نہیں ہوتیں۔
۲۱۳	فَبِمَا سَرَّ حَمْدِهِ حَوْلِكَ	۲۰۹	اِذْ تَضَعُونَ تَعْمَلُونَ
۲۱۳	الْمُتَوَكِّلِينَ	۲۰۹	اس افراتفری کے عالم میں رسول اللہ کا اسوہ
۲۱۳	رسول اللہ کی خصوصیات کبریٰ۔	۲۰۹	روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑے ہیں۔
۲۱۳	سربراہ ملک اور فوج کے کمانڈر کی حیثیت	۲۱۰	ثُمَّ أُنْزِلَ يَكْذِبُ الْقُدُورَ
۲۱۳	سے ڈسپن قائم رکھنے کے لئے فولاد کی طرح	۲۱۱	منافقین کی حالت۔
۲۱۳	سمت اور حلقہ رفقاء میں برشم کی طرح نرم	۲۱۱	إِنَّ الَّذِينَ حَلِيمٌ
۲۱۳	شفقت اور رافت کے مجسمہ۔	۲۱۲	خطا کاروں کی توبہ کی قبولیت۔
۲۱۵	حضور کو مشاورت کا حکم۔	۲۱۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ بِصِيرٌ
۲۱۵	مغرب کے جمہوری نظام اور قرآن کے	۲۱۲	خطرات سے جی چرانا کفر ہے۔
۲۱۵	مشاورتی نظام میں فرق۔	۲۱۲	اُن کا مقابلہ کرنا ایمان ہے۔
۲۱۵	ہم نے اس باب میں پیچیدگیاں پیدا کر لیں۔	۲۱۲	موت اور حیات کا قرآنی مفہوم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۵	رسول اپنی وحی میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔	۲۱۶	سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا نظریہ کہ رسول اللہ کے ہر قول اور عمل کے لئے وحی نازل ہوتی تھی
۲۲۶	ہم نے اس وحی کے ساتھ کیا کیا؟	۲۱۶	اس صورت میں مشاورت کا حکم (معاذ اللہ) بے معنی ہو جاتا ہے۔
۲۲۷	اختلافِ قرأت کا عقیدہ۔	۲۱۷	حدیث بھی وحی ہے اور اس کا انکار کفر۔
۲۲۸	مثلاً، مہر (وحی غیر متلو) یعنی احادیث	۲۱۸	یہ مثلہ و معہ ہے، اور وحی غیر متلو۔
۲۲۹	ناسخ و منسوخ۔	۲۱۹	قانون سازی کے سلسلہ میں دشواریاں۔
۲۳۰	باطنی معانی کا عقیدہ۔	۲۲۰	مودودی (مرحوم) کو اپنا سابقہ مسلک بدنام پڑا۔
۲۳۱	اَفَمَنْ اَتَّبَعَ..... يَعْمَلُونَ	۲۲۱	رسول اللہ کی رسالت۔ امارت اور بشریت کی الگ الگ حیثیتیں۔
۲۳۲	رضوان اللہ کا مفہوم۔	۲۲۲	امت کو مشورہ کا حکم۔
۲۳۳	فرق مدارج۔	۲۲۳	امام بر حنیفہ کا مسلک۔
۲۳۴	لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ..... قَبِيْن	۲۲۴	مغرب کا جمہوری نظام اور نظام مشاورت ربار دیگر صحابہ کی عظمت فکر و پاکیزگی سیر
۲۳۵	بیشت رسول اللہ، احسان خداوندی تھا۔	۲۲۵	اِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ..... الْمُؤْمِنُونَ
۲۳۶	رسول اللہ کے فرائض تعلیم کتاب و حکمت اور انسانی ذات کی نشوونما۔	۲۲۶	فُضِّلَتْ خداوندی کا مفہوم۔
۲۳۷	وحی کا عطا ہونا خدا کا احسان تھا۔	۲۲۷	انسانی کوشش کا وحی خداوندی کے ہم آہنگ ہونا
۲۳۸	یہ بلا مزد و معاوضہ ملی تھی	۲۲۸	جماعت اور فرد کا تعلق۔
۲۳۹	وگوں کا ایمان لانا، رسول اللہ پر احسان نہیں تھا، بلکہ اُن پر خدا کا احسان تھا	۲۲۹	رسول کی صداقت پر ایمان۔
۲۴۰	اَوَلَمْ نَاْصَابِكُمْ..... قَدِيْرٌ	۲۳۰	وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ..... يُظْلَمُونَ
۲۴۱	جنگ احد کی شکست کی یاد دہانی۔	۲۳۱	رسول کی صداقت پر ایمان ضروری ہے۔
۲۴۲	ایک حکم اصول — ہر مصیبت کا ذمہ دار انسان خود ہوتا ہے		
۲۴۳	وَمَا آصَابَكُمْ..... الْمُؤْمِنِيْنَ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۵	۳ ۱۷۵ وَلَا يَحْزُنْكَ عَظِيمٌ	۲۳۱	اُذُن اللہ کا صحیح مفہوم۔
"	{ ان بہت شکستہ حادثات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں	۲۳۲	۳ ۱۶۶ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَاقَوْا... وَقِيلَ لَهُمْ يَكْتُمُونَ
۲۳۶	۳ ۱۷۶-۱۷۷ اِنَّ الَّذِيْنَ عَذَابُ مُّسِيْنٌ	"	منافقت کیا ہے؟ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور
"	{ قانونِ جبلت۔ اس سے شکوک و شبہ اور منافقہ آفرینی کی کوشش	"	۳ ۱۶۷ الَّذِيْنَ قَالُوْا حٰدِقِيْنَ
۲۳۷	۳ ۱۷۸ مَا كَانَ اللّٰهُ اَجْرٌ عَظِيْمٌ	"	منافقین کی عملی حالت
"	{ منافقین کی شناخت بذریعہ وحی نہیں کرائی گئی تھی لیکن وہ حضور کی زندگی ہی میں چھٹ کر الگ ہو گئے تھے	"	{ خود بھی فریب کار اور دوسروں کو بھی درخلائے والے
۲۳۷	[آیات (۳/۱۷۸-۱۷۹) کے بعد آیت (۳/۱۵۱) سے سلسلہ کلام شروع کر دیا گیا تھا۔ اب آیات (۳/۱۷۹-۱۸۰) دیکھئے]	۲۳۳	۳ ۱۶۸-۱۷۰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ
۲۳۸	۳ ۱۷۹-۱۸۰ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لِلْمُتَّقِيْنَ	"	مفتولیس فی سبیل اللہ، یا شہداء صرف قتل ہو جانے والے نہیں، اس راہ میں جنہیں ویسے ہی موت آجائے، وہ بھی موت اور حیات کی حقیقت۔
۲۳۹	{ ربوٰ کا نظام (یعنی نظام سرمایہ داری) کفر کا نظام ہے۔	"	موت ہر ایک کے لئے ہے۔
"	{ جنت ارض و سموات کو محیط ہے۔	"	جہنم کی زندگی — نہ موت نہ حیات۔
"	{ اس میں ارضی جنت خود بخود آجاتی ہے۔	"	{ جو یہاں سے چلا جائے اُس کا دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا
۲۴۰	۳ ۱۸۲ الَّذِيْنَ يَنْفَقُوْنَ مُّحْسِنِيْنَ	۲۳۴	۳ ۱۸۱ الَّذِيْنَ اَجْرٌ عَظِيْمٌ
"	{ یہ جنت متقین کے لئے ہے۔	"	و حوت خداوندی پر لبیک کہنے والے۔
"	{ متقین کی صفات۔	"	۳ ۱۸۲-۱۸۳ الَّذِيْنَ قَالَ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
"		۲۳۵	{ مومن دشمنوں کے ہجوم سے بھی نہیں ڈرتا، اس سے اُس کا ایمان بڑھ جاتا ہے
"		"	{ شیطان و سوسرائیگز یوں سے خوف پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۴	۳ ۱۳۶-۳۷ قَدْ خَلَتْ..... لِلْمُتَّقِينَ	۲۴۰	۱۔ اتفاق (زندگی کی ہر حالت میں)
۲۴۴	۳ ۱۳۶-۳۷ اہم سابقہ کے غلط اعمال اور نظام کا نتیجہ۔	۲۴۰	۲۔ کاظمین الغیظ۔
۲۴۴	۳ ۱۳۶-۳۷ ان کی اُجڑی ہوئی بسنتوں کے کھنڈرات کو دیکھو۔	۲۴۰	۳۔ عافین عن الناس۔
۲۴۵	۳ ۱۳۸ اقوام سابقہ کے انجام و عواقب کا تذکرہ،	۲۴۱	کاظمین الغیظ کا مفہوم، دورِ حاضرہ کی
۲۴۵	۳ ۱۳۸ تمہاری عبرت اور موعظت کے لئے ہے {	۲۴۱	سائنس کا لوجی کی روشنی میں
۲۴۵	۳ ۱۳۸ وَلَا تَقْنُتُوا..... مَوَٰمِنِينَ۔	۲۴۱	کفایت کا مفہوم
۲۴۵	۳ ۱۳۸ مقامِ مومن..... اعلیٰ	۲۴۱	عافین عن الناس کے معنی۔
۲۴۵	۳ ۱۳۸ تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔	۲۴۱	کینہ فطرت لوگوں سے اُلجھو نہیں۔
۲۴۵	۳ ۱۳۸ پھر جنگِ احد میں شکست کیوں ہوئی تھی؟	۲۴۱	نفوت سے اعراض برتنے والے۔
۲۴۶	۳ ۱۳۹-۴۰ اَنْ يَّمْسُسَ سَكْمُ..... الْكُفْرَيْنِ	۲۴۲	۳ ۱۳۷ وَالَّذِينَ اِذَا..... يَعْلَمُونَ
۲۴۶	۳ ۱۳۹-۴۰ گردِ دُش دو لابی ایک عظیم تاریخی حقیقت {	۲۴۲	مومنین کی مزید صفات۔
۲۴۶	۳ ۱۳۹-۴۰ اس نزاحم اور تخاصم سے مقصد احتساب {	۲۴۲	فاحشات سے بچنے والے۔
۲۴۶	۳ ۱۳۹-۴۰ خویش ہوتا ہے۔	۲۴۲	اگر کبھی بھولے سے کوئی غلط حرکت
۲۴۶	۳ ۱۳۹-۴۰ محوِ ثبات کا بنیادی اصول۔	۲۴۲	سرزد ہو جائے تو فوراً قانونِ خداوندی
۲۴۶	۳ ۱۴۱ اَمْ حَسِبْتُمْ..... الصَّابِرِينَ۔	۲۴۲	کی طرف رجوع کرنے والے
۲۴۶	۳ ۱۴۱ اس کے برعکس سرمایہ داری کی خود فریبی، {	۲۴۲	وہ اس پر اصرار نہیں کرتے۔
۲۴۶	۳ ۱۴۱ جس میں مذہبی پیشوائیت انہیں متلا کھتی ہے {	۲۴۲	اپنے آپ پر ظلم کرنے والے۔
۲۴۶	۳ ۱۴۱ کچھ پیسے خرچ کر دو۔ یہاں بھی عیش، وہاں بھی عیش!	۲۴۳	جرم کی سزا کے لئے دو شرطیں۔
۲۴۸	۳ ۱۴۲ وَلَقَدْ كُنْتُمْ..... تَنْظُرُونَ۔	۲۴۳	۱۔ مجرم عادی ہو۔ ۲۔ اسے علم ہو یا اس میں
۲۴۸	۳ ۱۴۲ جان دے کر جنت خرید لو۔	۲۴۳	ایسا سمجھنے کی صلاحیت ہو کہ وہ جرم ہے {
۲۴۸	۳ ۱۴۲ ایک نئے دور کا آغاز۔	۲۴۳	۳ ۱۴۵ اُولَٰئِكَ..... اَجْرُ الْعَمَلِينَ۔
۲۴۸	۳ ۱۴۲ شخصیتوں کی جگہ اجتماعی نظام کا دور۔	۲۴۳	اور جنت، عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ کسی اور {
		۲۴۳	طرح نہیں مل سکتی۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۵	انبیاء اور ان کے ساتھ ان کے رفقاء کی جماعتیں	۲۴۹	وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا الشَّكِرُ الشَّكِرُ
۲۵۶	قَاتِلَهُمُ اللَّهُ الْمُحْسِنِينَ	۲۴۹	رسول اللہ خدا کے پیغامبر ہیں۔
۲۵۶	ثواب الدنیا بھی اور ثواب الآخرہ بھی۔	۲۴۹	آپ کی وفات کے بعد یہ نظام قائم رہا،
۲۵۶	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ النَّصْرِينَ	۲۴۹	تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔
۲۵۶	اگر تم نے کفار کا شیوہ اختیار کر لیا تو	۲۴۹	اصل قوت نظام کی ہے۔ شخصیتوں کی نہیں۔
۲۵۶	اسلامی نظام درہم برہم ہو جائے گا	۲۴۹	اس سے ختم نبوت کی دلیل مل جاتی ہے۔
۲۵۶	ہمارا مردہ اسلام اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے	۲۵۰	وفات (حضرت مسیح) کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے
۲۵۶	سُنُّنَتِي الظَّالِمِينَ	۲۵۰	حضور کے بعد ہم نے کیا کیا۔
۲۵۶	شرک کا لازمی نتیجہ خوت ہے۔	۲۵۰	نظام کی جگہ شخصیت پرستی شروع کر دی۔
۲۵۶	قرآن کے سوا یا اس کے ساتھ انسانوں کے	۲۵۱	ملوکیت۔ مذہبی پیشوائیت۔ ائمہ حدیث،
۲۵۶	خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت شرک ہے	۲۵۱	ائمہ فقہ سب اسی شخصیت پرستی کے مظاہر ہیں
۲۵۶	اس سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ	۲۵۱	پھر مجدد۔ نزول مسیح۔ بعثت امام مہدی
۲۵۶	وہ خدا سے واحد کی اطاعت کے تصور تک	۲۵۱	کے عقائد یہ سب نظام کے فقدان کے
۲۵۶	سے گھبراتا ہے اور انسانوں کی ساختہ	۲۵۱	پیدا کردہ ہیں۔
۲۵۶	شریعت کو پسند کرتا ہے۔	۲۵۱	اسلامی نظام کیسے متشکل ہو گا؟
۲۵۸	آیات ۱۵۱ تا ۱۷۸ پہلے آچکی ہیں	۲۵۲	وَمَا كَانَ الشَّكِرُ
۲۵۸	وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ نَجِيبُونَ	۲۵۲	اجل کے معنی۔
۲۵۸	بخل بدترین خصلت اور تباہی کا موجب ہے	۲۵۳	کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟
۲۵۸	اس کے معنی ہیں سب کچھ اپنے لئے سمیٹ رکھنا	۲۵۳	ثواب کا مفہوم۔
۲۵۹	اس مسلک کے اختیار کرنے والی قوم کی جگہ	۲۵۵	وَكَايُنَ الْكَافِرِينَ
۲۵۹	دوسری قوم لے لیتی ہے	۲۵۵	سابقہ انبیاء کو بھی ایسے ہی تصانیف
۲۶۰	لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ الْحَوِيقِ	۲۵۵	کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۴	نجات کے معنی عذاب سے دور رکھنے کے ہیں۔	۲۶۰	ان کا اعتراض کہ خدا محتاج ہے جو ہم سے { روپیہ مانگتا ہے؟
۲۶۴	{ لَتُبْلَوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ الْاَمْوَالِ -	۲۶۱	{ جواب کہ یہ سب کچھ تمہارے ہی فائدے کیلئے ہے تقدیر کی آڑ میں کٹ جئیاں۔
۲۶۵	{ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ يَشْتَرُونَ - کتمان حق اہل کتاب کا شیوہ تھا۔	۲۶۱	{ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّهْتَ لِلْعَبِيْدِ یہ تباہی ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوگی۔ ان پر ناحق ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی
۲۶۵	{ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ اَلَيْحُ ان کاموں کی بنا پر اپنی تعریف چاہتے ہیں جنہیں وہ کرتے نہیں۔	۲۶۱	{ الَّذِيْنَ قَالُوْا صٰدِقِيْنَ یہودیوں کی کٹ جتنی کہ ہم اسی صورت میں ایمان لائیں گے کہ آپ سوختی قربانی کا حکم لائیں
۲۶۴	{ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ قَدِيْرٌ مسلطہ کائنات اس لئے ٹھیک ٹھاکہ چل رہا ہے کہ اس میں ہر قوت اپنا کام کر رہی ہے۔ باتیں نہیں بنا رہی۔	۲۶۱	{ رَسُوْلُوْنَ كَا قَتْلِ - ایمان لائیں گے کہ آپ سوختی قربانی کا حکم لائیں رسولوں کا قتل۔
۲۶۴	{ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الْاَلْبَابِ دین کا ملخص نظام کائنات پر غور و فکر سے۔	۲۶۲	{ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ الْمُنِيْرُ رسول اللہ سے کہا کہ ان لوگوں نے ہر رسول کی تکذیب کی تھی نہ بور کے معنی۔ یہ حضرت ادوڈ کی کتاب کا نام نہیں تھا۔
۲۶۴	{ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ربوبیت عالمینی کے لئے صرف کرنا	۲۶۳	{ تکذیبِ رسل کا مفہوم۔ کُلُّ نَفْسٍ ذٰ اٰثِقَةٌ الْمَوْتِ الْغُرُوْرُ
۲۶۴	{ نظامِ فطرت پر غور و فکر کے دروازے مومن و کافر سب کے لئے کھلے ہیں۔	۲۶۴	{ موت ہر شخص کو اگر رہے گی اس سے کسی کو مفر نہیں لیکن اس سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔
۲۶۴	{ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ الشَّارِ مومن وہ ہیں جو ان قوتوں کو خدا کی راہ نمائی میں صرف کریں۔	۲۶۴	{ زندگی اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھنے کے لئے آگے بھی جاتی ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۷	ذکر کا مفہوم۔ قوانین خداوندی کو سامنے رکھنا۔	۲۶۷	ذکر کا مفہوم۔ قوانین خداوندی کو سامنے رکھنا۔
۲۶۸	کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔	۲۶۸	کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔
۲۶۹	ہمارے ہاں تصوف اور شریعت دونوں میں اسے باطل سمجھا جاتا ہے۔	۲۶۹	ہمارے ہاں تصوف اور شریعت دونوں میں اسے باطل سمجھا جاتا ہے۔
۲۷۰	رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْصَارُ کائنات کو باطل سمجھنے والی قوتیں،	۲۷۰	رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْصَارُ کائنات کو باطل سمجھنے والی قوتیں،
۲۷۱	ذلت آمیز عذاب میں مبتلا رہتی ہیں۔	۲۷۱	ذلت آمیز عذاب میں مبتلا رہتی ہیں۔
۲۷۲	رَبَّنَا إِنَّنَا لَبُیْعَادُ ان کی انسانیت ساز آرزو میں اور حین دعائیں۔	۲۷۲	رَبَّنَا إِنَّنَا لَبُیْعَادُ ان کی انسانیت ساز آرزو میں اور حین دعائیں۔
۲۷۳	فَاسْتَجَابَ.....حُسْنُ الشَّوَابِ قبولیت دعا سے مراد۔	۲۷۳	فَاسْتَجَابَ.....حُسْنُ الشَّوَابِ قبولیت دعا سے مراد۔
۲۷۴	کسی کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔	۲۷۴	کسی کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔
۲۷۵	عورتوں اور مردوں کی مساوات۔	۲۷۵	عورتوں اور مردوں کی مساوات۔
۲۷۶	مومن صرف مفکر نہیں ہوتا۔ مجاہد بھی ہوتا ہے	۲۷۶	مومن صرف مفکر نہیں ہوتا۔ مجاہد بھی ہوتا ہے
۲۷۷	لَا يَغُرَّتْكَ.....يَغُورُ الْبَهَادُ صرف اسی دنیا کی متاع کو مقصود جیات	۲۷۷	لَا يَغُرَّتْكَ.....يَغُورُ الْبَهَادُ صرف اسی دنیا کی متاع کو مقصود جیات
۲۷۸	سمجھنا، خود فریبی ہے۔	۲۷۸	سمجھنا، خود فریبی ہے۔
۲۷۹	لَكِنَّ الَّذِينَ.....لَلْأَبْرَارِ اہل جنت کی خدا کے ہاں ایسی عزت ہوگی	۲۷۹	لَكِنَّ الَّذِينَ.....لَلْأَبْرَارِ اہل جنت کی خدا کے ہاں ایسی عزت ہوگی
۲۸۰	جیسی جہان کی عزت اور قدر و منزلت ہوتی	۲۸۰	جیسی جہان کی عزت اور قدر و منزلت ہوتی
۲۸۱	وہاں خیر ہی خیر ہوگا۔ شر نہیں ہوگا۔	۲۸۱	وہاں خیر ہی خیر ہوگا۔ شر نہیں ہوگا۔
۲۸۲	وَأَنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ.....الْحِسَابِ	۲۸۲	وَأَنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ.....الْحِسَابِ

چوتھا باب

آیات ۴- تا ۴۷

۲۸۳	يَا أَيُّهَا النَّاسُ.....رَقِيبًا	۲۸۳	يَا أَيُّهَا النَّاسُ.....رَقِيبًا
۲۸۴	تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔	۲۸۴	تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔
۲۸۵	وَالْتُوا الْيَتَامَى.....كَبِيرًا	۲۸۵	وَالْتُوا الْيَتَامَى.....كَبِيرًا
۲۸۶	یتیموں کی نگہ برداشت فریضہ خداوندی ہے۔	۲۸۶	یتیموں کی نگہ برداشت فریضہ خداوندی ہے۔
۲۸۷	وَأِنْ خِفْتُمْ.....تَعُولُوا	۲۸۷	وَأِنْ خِفْتُمْ.....تَعُولُوا
۲۸۸	تعدد از دواج کا مسئلہ۔	۲۸۸	تعدد از دواج کا مسئلہ۔
۲۸۹	ہماری مذہبی پیشوائیت اس باب میں کیا کرتی ہے؟	۲۸۹	ہماری مذہبی پیشوائیت اس باب میں کیا کرتی ہے؟
۲۹۰	وَالْتُوا النِّسَاءَ.....مَرِيًّا	۲۹۰	وَالْتُوا النِّسَاءَ.....مَرِيًّا
۲۹۱	مہر بلا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔	۲۹۱	مہر بلا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔
۲۹۲	وَلَا تَتَوَلَّوْا السُّفَهَاءَ.....مَعْرُوفًا	۲۹۲	وَلَا تَتَوَلَّوْا السُّفَهَاءَ.....مَعْرُوفًا
۲۹۳	مال و جبر قیام ہے۔	۲۹۳	مال و جبر قیام ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۶	رجم (سنگساری) کی سزا۔	۲۷۸	۴/۶ وَأَبْتَلُوا إِلَيْكُمْ... حَسِبًا
۲۹۹	کوڑوں کی تفصیل۔	۲۷۹	یتیموں کی پرورش کا مسئلہ اور اس کا معاوضہ
۳۰۳	لوٹہ کی سزا نصف۔	۲۷۹	نکاح کی عمر۔
۳۰۳	بنی کی بیویوں کی سزا دگی۔	۲۷۹	وراثت کے متعلق تمہیدی وضاحت۔
۳۰۵	اصول: سزا کے تعین کے لئے مجرم کے	۲۸۰	حق وراثت متوفی کی وفات کے بعد ہوتا ہے
۳۰۵	کوائف کا پیش رکھنا ضروری ہے۔	۲۸۱	وہ نہ کہ اس کی زندگی میں۔
۳۰۶	لواطت اور سحاق۔ (۴/۱۶)	۲۸۱	وصیت کا حق۔
۳۰۷	مباذیات زنا۔ (۴/۱۵)	۲۸۱	۴/۷ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ... مَّفْرُوضًا
۳۰۷	بے حیائی کی باتوں کا پھیلانا۔	۲۸۱	مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے حصے کے مالک ہونے ہیں۔
۳۰۸	(معافی کی گنجائش)	۲۸۱	۴/۸-۱۰ وَإِذَا حَضَرَ... سَعِيرًا
۳۰۸	شریف زادوں سے چھوڑ چھاڑ۔	۲۸۱	یتیموں کا مال ناحق کھانے والے۔
۳۰۸	رسنگین ترین جرم)	۲۸۱	۴/۱۱-۱۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... حٰلِيْمٌ
۳۰۹	تہمت تراشی اور اس کی سزا۔	۲۸۱	وراثت (یا ترکہ) کی تقسیم کا قانون
۳۱۰	خود اپنی بیوی کے خلاف تہمت (لعان)	۲۸۱	کلامہ کے ترکہ کی تقسیم۔
۳۱۰	جرم خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی	۲۸۱	ترکہ اور وراثت کے حصوں کی تفصیلی بیان۔
۳۱۰	دوسرے کے سر۔	۲۸۱	۴/۱۳-۱۴ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ... مَّهِيْنٌ
۳۱۰	پہلے آچکی ہیں (۳۰۵-۳۰۶)	۲۸۱	قانون وراثت کی اہمیت۔
۳۱۱	۴/۱۵-۱۶ اِنَّمَا التَّوْبَةُ... اِلَیَّہَا۔	۲۸۱	یتیم پوتے کی وراثت۔
۳۱۱	توبہ اور معافی کس کے لئے ہے؟	۲۸۱	عالمی قوانین۔
۳۱۱	شروع پارہ پنجم	۲۸۱	حفاظت عصمت۔
۳۱۱		۲۸۱	زنا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۹	جاری یعنی ہمسایہ کا مفہوم اور اس کا حق ۔	۳۱۱	مطالب الفرقان جلد سوم میں آچکی ہیں [۴/ ۱۹-۲۲]
۳۲۰	مختال اور فخور کا مفہوم ۔	۳۱۲	رعالمی قوانین ص ۳۳۶ سے آخر تک [۴/ ۲۵]
۳۲۱	الَّذِينَ يَجْلُونَ... مَّيْنًا۔	۳۱۳-۱۴	وَمَنْ لَّمْ... رَّحِيمٌ لوڈیوں سے نکاح اور جرم زنا میں ان کی سزا۔ [۴/ ۲۶-۲۸]
۳۲۲	نخل اور نخل کی تشریح اور مذمت ۔	۳۱۵-۱۶	يُرِيدُ اللَّهُ... ضَعِيفًا ان احکام کی حکمت اور غرض و غایت ۔ [۴/ ۲۹-۳۱]
۳۲۳	وَالَّذِينَ يَنْفِقُونَ... قَرِيبًا	۳۱۷	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ... كَرِيمًا نجات اور ربو میں فرق ۔ تجارت کے منافع کی حیثیت ۔ [۴/ ۳۲]
۳۲۴	ربا کاری کی غرض سے انفاق ۔	۳۱۸	وَلَا تَتَمَتَّوْا... عَلِيَّهَا عورت اپنے مال اور جائیداد کی مالک ہوتی ہے عورتیں بھی اکتساب رزق کر سکتی ہیں ۔ [۴/ ۳۳]
۳۲۵	خدا کے معاشی نظام کی بنیاد خدا اور آخرت پر ایمان پر ہے ۔	۳۱۹	وَبِكُلِّ... شَهِيدًا عقدی رشتہ (میاں بیوی) کا ترکہ میں حصہ ۔ [۴/ ۳۴]
۳۲۶	کبیو نرم یا سوشلزم میں یہ بنیاد نہیں ہوتی ۔	۳۲۰	الَّذِينَ جَاءُوا... كَبِيرًا دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم ص ۴۹-۵۹ [۴/ ۳۵]
۳۲۷	اس لئے وہ ناکام رہ جاتے ہیں ۔	۳۲۱	وَأَن خِفْتُمْ... خَيْرًا دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم ص ۳۸۵ [۴/ ۳۶]
۳۲۸	وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ... عَظِيمًا	۳۲۲	وَأَعْبُدُوا اللَّهَ... فَخُورًا والدین ۔ اقربا ۔ یتامی ۔ مساکین ۔ ہمسایہ ۔ مسافر اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ۔
۳۲۹	انفاق فی سبیل اللہ کا اجر ۔	۳۲۳	
۳۳۰	کفار کے ”نیک اعمال“ کا اجر کیوں نہیں ملے گا ۔	۳۲۴	
۳۳۱	انہوں نے ان کا اجر اسی دنیا میں لے لیا تھا ۔	۳۲۵	
۳۳۲	اشکبار بغیر الحق باطل کی راہ ہے ۔	۳۲۶	
۳۳۳	فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا... حَدِيثًا	۳۲۷	
۳۳۴	رسول اللہ کے شہید ہونے کا مطلب ۔	۳۲۸	
۳۳۵	امت مسلمہ کے شہید ہونے سے مراد ۔	۳۲۹	
۳۳۶	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ... غَفُورًا	۳۳۰	
۳۳۷	صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات ۔	۳۳۱	
۳۳۸	تیمم کا حکم ۔	۳۳۲	
۳۳۹	جب تم ہوش میں نہ ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ ۔	۳۳۳	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۲	جبت کا مفہوم -	۳۲۷	اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَصِيْرًا
۳۳۲	اَمْ لَهُمْ نَقِيْرًا	۳۲۷	سابقہ اہل کتاب کو مکمل ضوابط و قوانین
۳۳۳	قیمت ہے کہ نظام حکومت ان کے	۳۲۸	نہیں دیئے گئے تھے۔
۳۳۳	ہاتھ میں نہیں تھا گریسی میں کیا ہوتا ہے	۳۲۸	مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا قَلِيْلًا
۳۳۳	اَمْ يَحْسُدُوْنَ سَعِيْرًا	۳۲۸	تحریف کتب -
۳۳۳	بنی اسرائیل (یہودیوں) کا حسد کہ نبوت	۳۲۹	ذنات اور کینگی کی سطح پر اتر آئے تھے۔
۳۳۳	اور حکومت بنی اسماعیل (نبی اکرم)	۳۲۹	يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ مَفْعُوْلًا
۳۳۳	کی طرف کیوں منتقل ہو گئی؟	۳۲۹	اس قسم کی پست ذہنیت کا علاج
۳۳۳	ان میں سے (ذریعہ اسماعیلی) ضابطہ	۳۲۹	صرف قرآن کے اتباع سے ہو سکتا ہے
۳۳۳	خداوندی پر ایمان لے آئی۔ اس لئے	۳۳۰	قرآن کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ خدا
۳۳۳	اس کی نوازشات سے منتفع ہو رہی ہے	۳۳۰	کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے
۳۳۳	آل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم	۳۳۰	انسانوں کی محکومیت اختیار کرنا شرک ہے۔
۳۳۳	عطا ہوئے تھے۔	۳۳۰	اِنَّ اللّٰهَ عَظِيْمًا
۳۳۳	اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا خَلِيْلًا	۳۳۰	اور شرک سے انسانی ذات کو جو نقصان
۳۳۳	ان دونوں گروہوں (کفار اور اہل ایمان) کا تقابل	۳۳۰	پہنچتا ہے وہ ناقابل تلافی ہوتا ہے
۳۳۳	تبدیلی جلوہ کا مفہوم -	۳۳۰	اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ مَبِيْنًا
۳۳۵	اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ يَصِيْرًا	۳۳۰	نزکیہ نفس کے خود فریب مدعی -
۳۳۵	نظام خداوندی کے دو اہم ستون -	۳۳۱	یہ صرف قرآن کی اطاعت سے ہو سکتا ہے۔
۳۳۵	امانات ان کے اہل کے سپرد کرو۔	۳۳۱	اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَصِيْرًا
۳۳۵	معاملات کے فیصلے عدل کے ساتھ کرو۔	۳۳۱	یہودیوں کے اہل شریعت کی کیفیت -
۳۳۵	امانات ان کے اہل کے سپرد اور	۳۳۱	وہ قوانین خداوندی کے بجائے جبت
۳۳۵	عدل الحق کے مطابق نظام خداوندی	۳۳۱	اور طاغوت کے احکام کی اطاعت کرتے
۳۳۵	کے یہ دو ستون ہیں۔	۳۳۱	اور کراتے ہیں۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۶۰	مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔	۳۳۶	یَا أَيُّهَا الَّذِينَ تَتَّوِيلًا..... تَتَّوِيلًا
۳۶۱	اُولَئِكَ الَّذِينَ..... بَلِيغًا	۳۳۷	قرآن کا سیاسی نظام۔
۳۶۲	ان سے اعراض برتو۔ لیکن اس کے باوجود انہیں حق و صداقت کی تلقین کرتے رہو	۳۳۸	”اللہ اور رسولؐ“ کی اطاعت سے مراد مرکزیت یا سربراہ مملکت اسلامی ہے (نیز دیکھئے پی)
۳۶۳	وَمَا أَرْسَلْنَا..... سَرَّحِيمًا	۳۳۹	”اولی الامر“ سے مراد افسران ماتحت ہیں۔
۳۶۴	مجرم، خدا اور رسولؐ کا باہمی تعلق۔	۳۴۰	بعد میں کیا ہوا؟
۳۶۵	فیصلہ صرف قانونی خداوندی کی رو سے ہوگا۔	۳۴۱	تھیاب کر سبی۔
۳۶۶	اگر (بفرض محال) رسولؐ بھی اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے بھی اس کی سزا ملے گی	۳۴۲	رسولؐ کی اطاعت، احادیث کی رو سے۔
۳۶۷	فیصلہ الحق کے مطابق کیا جائے گا۔	۳۴۳	احادیث کی جمع و تدوین کی تاریخ۔
۳۶۸	جرائم کیسے کم ہو سکتے ہیں؟	۳۴۴	ان میں باہمی تضاد اور اختلافات ہیں۔
۳۶۹	جب مجرم کے دل میں قانون کا احترام ہو۔	۳۴۵	حدیث کے متعلق عقائد۔
۳۷۰	فَلَا وَرَبِّكَ..... تَسْلِيمًا	۳۴۶	کرنے کا کام — احادیث کو قرآن کی کی روشنی میں پرکھ لینا ضروری ہے
۳۷۱	جرم و سزا کا فلسفہ۔	۳۴۷	اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِينَ..... بَعِيدًا
۳۷۲	مجرم کے دل میں قانون کا احترام اور فیصلہ کرنے والے کے متعلق یقین کہ اس کا فیصلہ حق پر مبنی ہوگا۔	۳۴۸	دعویٰ ایمان کا اور معاملات کے فیصلے (طاغوت) غیر اللہ کے قوانین کی رو سے
۳۷۳	اس سے معاشرہ جرائم سے پاک ہوگا۔	۳۴۹	وَإِذَا..... صُدُّوا
۳۷۴	ذہنیت کی تبدیلی کے بغیر اصلاح نہیں ہو سکتی۔	۳۵۰	پر منافقت ہے۔
۳۷۵	جس کے دل میں قرآنی فیصلے سے کبیدگی پیدا ہو، وہ صاحب ایمان نہیں ہوگا۔	۳۵۱	فَكَيْفَ إِذَا..... تَوَفِّيَقًا
		۳۵۲	منافقین مصیبت کے وقت ڈرتے ہوئے آئیں گے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۶۹	لیکن سب سے برتر - اپنا رفیق -	۳۶۵	وَلَوْ اَتَاكُنْتَنَا..... مُسْتَقِيمًا
۳۷۳	{ یعنی خدا اپنی سکیموں کو انسان کے ہاتھوں پر روئے کار لاتا ہے۔	۳۶۶	{ مفاد پرستانہ ذہنیت۔
۳۷۴	{ مگر کے مظلوموں کی خدا سے فریاد۔	۳۶۷	{ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ..... عَلِيمًا
۳۷۵	{ اور خدا کا مدینہ کی جماعت سے کہنا کہ تم ان کی امداد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟	۳۶۸	{ منعم علیہ حضرات - انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین کی معیت اور رفاقت
۳۷۶	{ جنگ بدر میں - کمائیں مجاہدین کی بھین -	۳۶۹	{ مرزا غلام احمد قادیانی کا باطل دعویٰ نبوت
۳۷۷	{ تیر خود خدا چلا رہا تھا!	۳۷۰	{ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... جَمِيعًا
۳۷۸	{ بیعت رضوان - مومن کے ہاتھ پر خود خدا کا ہاتھ۔	۳۷۱	{ ان کی معیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم جہاد کے لئے ہر وقت تیار رہو۔
۳۷۹	{ اس کے بعد کیا ہو!	۳۷۲	{ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ..... عَظِيمًا
۳۸۰	{ ہم نے ان نظریات کی رفاقت چھوڑ دی تو انہوں نے پھر کائناتی رفتار سے چلنا شروع کر دیا	۳۷۳	{ ان کے برعکس منافقین کی حالت۔
۳۸۱	{ ملکیت - غلامی - نسل پرستی - شخصیت پرستی - سرمایہ پرستی	۳۷۴	{ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ..... عَظِيمًا
۳۸۲	{ یقیناً غلام - یہ تمام باطل تصورات مٹتے جا رہے ہیں اور اقوام عالم قرآنی تصورات کی طرف آرہے ہیں۔	۳۷۵	{ جماعت مومنین کو جہاد کی تاکید۔
۳۸۳	{ اعتراض کہ خدا ظالم کی کلائی کیوں نہیں مروڑتا۔	۳۷۶	{ میدان جنگ میں جان دے دینے والے اور غالب و منصور واپس لوٹنے والے، دونوں یکساں مدارج کے مستحق۔ اس سے واضح ہے کہ غازی اور شہید ہم مرتبہ ہیں۔
۳۸۴	{ اس کا جواب۔	۳۷۷	{ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ..... تُصَيِّرُوا
۳۸۵	{ الَّذِينَ آمَنُوا..... خَافِعًا	۳۷۸	{ ایک عظیم انقلابی نقطہ۔
۳۸۶	{ اللہ کی راہ میں جنگ - اور طاغوت کی راہ میں جنگ	۳۷۹	{ خدا نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کیا
۳۸۷	{ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ..... فَتِيلًا	۳۸۰	{ احسن تقویم - واجب التکريم بشیر مخلوق سے افضل
۳۸۸	{ نماز روزے تک کا اسلام قبول۔		
۳۸۹	{ جہاد و قتال سے گریز!		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۴	رسول پر ذمہ داری اپنی ذات کی تھی لیکن اپنے رفقاء کی تعلیم و تربیت بھی آپ کا فریضہ تھا۔	۳۸۰	اَیْنَ مَا تَكُونُوا..... شَهِیدًا
۳۸۵	مَنْ يَشْفَعْ..... مُقْبِلًا	۳۸۱	موت تو بہر حال آکر رہے گی۔
۳۸۶	شفاعتِ حسنہ اور شفاعتِ سیئہ کا مفہوم دنیاوی زندگی میں قوانینِ طبعی کے مطابق کوشش کرنے کے میدانِ کافرو مومن دونوں کے لئے یکساں کھلے ہیں۔	۳۸۱	حسنت (خوشگواریاں) اور سیئات (ناکامیاں)
۳۸۷	وَإِذَا أَحْيَيْتُمُ..... حَسْبًا	۳۸۲	سب قانونِ مکافات کے مطابق واقعہ ہوتی ہیں۔
۳۸۸	حسنِ سلوک کرنے والے کے ساتھ اس سے بہتر حسنِ سلوک، یا کم از کم اتنا ہی حسنِ سلوک کرو۔ ہمارا رسمی "السلام علیکم"۔	۳۸۲	قوانینِ خداوندی کے اتباع سے حسنت۔
۳۸۹	أَللَّهُ لَا إِلَهَ..... حَدِيثًا	۳۸۳	ان کی خلاف ورزی سے نقصانات۔
۳۹۰-۹۱	اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کا ہوگا۔	۳۸۴	دین کے پیش نظر عالمگیر انسانیت کا مفاد ہوتا ہے
۳۹۱	فَمَا لَكُمْ..... سَبِيلًا	۳۸۵	مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ..... حَقِيقًا
۳۹۲	منافقین کے بارے میں دو آراء نہیں ہونی چاہئیں۔	۳۸۶	خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے جسے رسول نے قائم کیا تھا
۳۹۳	وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ..... نُصِيرُوا	۳۸۷	وَيَقُولُونَ..... وَكَيْلًا
۳۹۴	ہجرت، مومن ہونے کا ثبوت	۳۸۸	منافقین کی حالت۔
۳۹۵	إِلَّا الَّذِينَ..... مُبِينًا	۳۸۹	أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ..... كَثِيرًا
۳۹۶	جنگ اور صلح کی شرائط۔	۳۹۰	قرآن میں کوئی خلائی بات نہیں۔
۳۹۷	جوہرِ قتل کی سزا کے سلسلہ میں جامع احکام۔	۳۹۱	قرآن کی اطاعت کرنے والوں میں باہمی اختلاف اور تفرقہ نہیں ہو سکتا۔ وحدتِ امت کا یہی ذریعہ ہے۔
		۳۹۲	وَإِذَا جَاءَهُمْ..... قَلِيلًا
		۳۹۳	افواہوں کو پھیلانے کی طاقت۔ انہیں حکومت کے تحقیقاتی مرکز تک پہنچاؤ۔
		۳۹۴	فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ..... تَنْكِيلًا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۰۱	وَاِذَا خَرَبْتُمْ مَقْبِلًا.....	۳۹۲	(۱) انسانی جان کی قدر و قیمت -
۴۰۱	حالت جنگ میں فریضہ صلوٰۃ کی ادائیگی -	۴۰۲	(ii) ہر انسانی جان واجب الاضرام ہے -
۴۰۲	وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ..... مَّهِينًا	۴۰۳	(iii) قاتل کا مؤاخذہ کرنا (قصاص)
۴۰۲	صلوٰۃ کی امامت، سربراہ مملکت یا عمال حکومت کا فریضہ ہے -	۴۰۴	اسلامی حکومت کا فریضہ ہے -
۴۰۳	وَاِذَا اقْضَيْتُمْ..... مَّوْقُوتًا	۴۰۵	(iv) آنکھ کے بدلے آنکھ - یہودیوں کے ہاں تھا ہمارے لئے نہیں
۴۰۳	صلوٰۃ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے -	۴۰۶	(v) قتل خطا کی سزا دیت (خون بہا)
۴۰۳	ذکر سے مراد قوانین خداوندی کا پیش نظر رکھنا ہے	۴۰۷	وَمَا كَانَ..... حَكِيْمًا
۴۰۴	جمعہ کے دن کی چھٹی قرآنی تعلیم کے خلاف ہے	۴۰۸	قتل خطا کی سزا - دیت -
۴۰۴	صلوٰۃ موقت فریضہ ہے - اس کا مفہوم -	۴۰۹	وَمَنْ يَقْتُلْ..... عَظِيْمًا
۴۰۴	وقت کی پابندی کی اہمیت -	۴۱۰	قتل عمد کی سزا -
۴۰۴	وَلَا تَهْنُؤْا..... حَكِيْمًا	۴۱۱	جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے وضعی فسانے
۴۰۵	جنگ کی حالت میں دشمن کا سچپا کرنے میں سستی نہ کرو -	۴۱۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ..... خَبِيرًا
۴۰۵	ذکر اور نوافل وغیرہ کا غلط مفہوم -	۴۱۳	جنگ میں جو صلح کا پیغام دے تو اس باب میں تحقیق کر لینا ضروری ہے
۴۰۶	اِنَّا اَنْزَلْنٰا..... رَّحِيْمًا	۴۱۴	مرزا غلام احمد کے متبعین کا نرالا اجتہاد!
۴۰۶	حضور کو حکم کر لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کریں	۴۱۵	لَا يَسْتَوِي..... رَّحِيْمًا
۴۰۶	خائنین کی وکالت ممت نہ کرو -	۴۱۶	جہاد کی شرکت کے لئے تیز گام اور سست وفادار
۴۰۷	وَلَا تُجَادِلْ..... اَرْشِيْمًا	۴۱۷	اِنَّ الَّذِينَ..... رَّحِيْمًا
۴۰۷	جہانت کا مفہوم -	۴۱۸	[ان آیات کی تشریح (جو ہجرت کی اہمیت سے متعلق ہیں) مطالب الفرقان - جلد سوم ص ۵۲-۵۵ میں آچکی ہے]
۴۰۸	دوسروں کے ساتھ اور خود اپنی ذات کے خلاف جہانت - وکالت کا پیشہ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۴	منافقت، درحقیقت شرک ہے۔ یعنی ایک کا ہو کر نہ رہنا۔ اور یہ ناقابل معافی جرم ہے	۴۰۹	يَسْتَخْفُونَ وَكَيْلًا۔ خدا کے قانون مکافات کے خلاف
۴۱۵	اِنَّ يَدْعُوْنَ مَحِيصًا خدا کے سوا ہر سہارا کمزور ہوتا ہے۔	۴۱۰	وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوءًا رَّحِيمًا اس کے مؤاخذہ سے اپنے سن عمل کی رد سے ہی بچا جاسکتا ہے
۴۱۶	وَالَّذِينَ آمَنُوا قِيلًا ایمان و عمل صالح کا نتیجہ جنت کی زندگی۔	۴۱۱	وَمَنْ يَّكْسِبْ عَظِيمًا جرم، دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے خلاف جرم کا مرتکب ہوتا ہے
۴۱۷	كَيْسَ بَأْسًا تَكْفُرُ نُصِيرُوا جنت خوش فہمیوں سے نہیں مل سکتی۔	۴۱۲	وَمَنْ يَّعْمَلْ نَقِيرًا یہ عمل صالح سے ملتی ہے۔ اور اس میں عورتیں اور مرد یکساں ہیں۔
۴۱۸	وَمَنْ أَحْسَنُ مَجْطِطًا۔ یہی دین (نظام زندگی) احسن ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ یہی ملت ابراہیمی ہے۔	۴۱۳	وَمَنْ يَّشَاقِقِ الرَّسُولَ مَصِيرًا اسلامی نظام کو نقصان پہنچانے والے۔
		۴۱۴	اِنَّ اللّٰهَ بَعِيدًا سیمیل المؤمنین سے مراد۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۲۲	قرآن کا منفرد نظام عدل -	۴۱۸	یہی نظام ساری کائنات میں جاری و ساری ہے
۴۲۳	کون کون سے معاملات میں شہادت کا ذکر آیا ہے	۴۱۹	وَيَسْتَفْتُونَكَ حَلِيمًا
۴۲۴	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ بَعِيدًا -	۴۱۹	یتامی النساء کے معنی -
۴۲۴	مسلمانوں، کو بھی ایمان لانے کا حکم -	۴۱۹	تعدد از دواج کے سلسلہ کی ایک کڑی -
۴۲۵	یہ حکم ہم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے -	۴۱۹	مطالب الفرقان - جلد سوم میں
۴۲۵	چھٹا جزو ایمان - تقدیر پر ایمان	۴۱۹	آپ کی ہیں - (ص ۳۸۶)، (۳۲۸)
۴۲۵	بعد کا اضافہ ہے -	۴۲۰	وَإِنْ يَتَفَرَّقَا حَكِيمًا
۴۲۵	إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا	۴۲۰	طلاق کی صورت میں معاش کا انتظام
۴۲۵	اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں -	۴۲۰	معاشہ کے ذمہ ہوگا -
۴۲۶	بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ جَمِيعًا -	۴۲۰	وَبَلَّغْ مَا فِي السُّورَةِ وَكِيلًا
۴۲۶	ایسے لوگ منافق ہوتے ہیں - یعنی دعویٰ	۴۲۰	خارجی کائنات میں نظام ربوبیت -
۴۲۶	ایمان کا اور دوستی کفار کے ساتھ -	۴۲۱	إِنْ يَشَاءِ يُذْهِبْكُمْ قَدِيرًا
۴۲۶	وَقَدْ نَزَّلَ جَمِيعًا	۴۲۱	اگر خدا کی مشیت میں ہو تو وہ موجودہ
۴۲۶	جہاں آیت اللہ سے استہزا ہوتا ہو	۴۲۱	نوع انسان کی جگہ کوئی اور نوع لے آئے
۴۲۶	وہاں مت بیٹھو -	۴۲۱	مَنْ كَانَ بَصِيرًا
۴۲۶	الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ سَبِيلًا	۴۲۱	لیکن خدا ایسا کرنا نہیں چاہتا - وہ انسانوں کا
۴۲۶	منافقین کی دورخی پالیسی -	۴۲۱	اختیار و ارادہ سلب نہیں کرنا چاہتا -
۴۲۶	خدا کبھی کفار کو مومنین پر غالب نہیں آنے دے گا	۴۲۱	تو انہیں خداوندی کی اطاعت سے، دنیا
۴۲۶	خدا کے اس فیصلہ کی روشنی میں واضح ہے	۴۲۱	اور آخرت دونوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے
۴۲۶	کہ ہمارا شمار مومنین کے زمرے میں نہیں	۴۲۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ خَبِيرًا
۴۲۶	ہو سکتا کیونکہ ہم پر تو ہر جگہ کفار غالب ہیں	۴۲۲	شہادت کا عظیم اصول -
۴۲۸	إِنَّ الْمُنَافِقِينَ قَلِيلًا	۴۲۲	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۳۳	مظلوم کو ظلم کی تشہیر کا حق حاصل ہے۔	۴۲۸	منافقین کی فریب کاریاں
۴۳۴	﴿ اِنَّ تَبَدُّوَ اٰخِرًا قَدِيْرًا ﴾ ۴/۱۳۹	۴۲۹	منافقین کی نماز۔ بے مقصد نقل و حرکت۔
۴۳۴	بھلائی کی باتوں کو پوشیدہ رکھو یا { ظاہر کرو۔ اس میں مضائقہ نہیں۔	۴۳۰	ایسی ہی ہماری نمازیں ہیں۔
۴۳۵	﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ مَّهِينًا ﴾ ۴/۱۵۰-۵۱	۴۳۰	﴿ مَّذْبُذَّبِيْنَ سَبِيْلًا ﴾ ۴/۱۳۳
۴۳۵	خدا کو ماننا اس کے جملہ قوانین کرنا ہے۔	۴۳۱	منافقین کی تذبذب کی حالت۔
۴۳۵	ان میں کسی قسم کی تفریق کفر ہے۔	۴۳۱	﴿ يَاٰ اَيُّهَا الَّذِيْنَ مَّهِينًا ﴾ ۴/۱۴۴
۴۳۵	﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَّحِيْمًا ﴾ ۴/۱۵۲	۴۳۱	منافقین کے ساتھ دوسنداری کے تعلقات
۴۳۵	﴿ يَسْأَلُكَ غَلِيْظًا ﴾ ۴/۱۵۳-۵۴	۴۳۱	وابستہ نہیں کئے جاسکتے
۴۳۵	یہودی آپ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔	۴۳۱	کنارا و منافقین کا شمار ایک ہی زمرہ میں ہوتا ہے
۴۳۵	انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس سے بھی { بڑھ کر معجزات کا مطالبہ کیا تھا۔	۴۳۱	﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ نَصِيْرًا ﴾ ۴/۱۴۵
۴۳۵	﴿ فَبِمَا نَقْضِهٖمْ قَلِيْلًا ﴾ ۴/۱۵۵	۴۳۱	منافقین جہنم کے درک اسفل ہیں۔
۴۳۵	انہوں نے ہر عہد کو توڑا۔ انبیاء کو { قتل کیا۔ کٹ جتیاں کرتے رہے۔	۴۳۱	﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عَظِيْمًا ﴾ ۴/۱۴۶
۴۳۵	یہ آیات دوسرے باب میں آچکی ہیں۔	۴۳۲	منافقین کے لئے بھی باز آفرینی کی گنجائش۔
۴۳۵	﴿ فَبَطَلْهُمْ كَثِيْرًا ﴾ ۴/۱۶۰	۴۳۲	﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ عَلِيْمًا ﴾ ۴/۱۴۷
۴۳۵	ان جرائم کی سزا کے طور پر، ان پر بعض { حلال چیزیں حرام قرار دے دی گئی تھیں	۴۳۳	خدا کی کشادہ نگہی۔
		۴۳۳	اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا پتا ہے
			شروع پارہ چھٹا
		۴۳۸	﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ عَلِيْمًا ﴾ ۴/۱۴۸
		۴۳۸	وہ تائب ہو جانے والوں کے ماضی
		۴۳۸	سے خود ہی درگزر نہیں کرتا بلکہ تاکید کرتا ہے کہ ان کی لغزشوں کی تشہیر نہ کی جائے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۴۳	ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے	۴۴۷	ان چیزوں کی تفصیل -
۴۴۴	جن تک یہ پیغامات نہیں پہنچنے پائے یا جن میں ان کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی، ان کا مال کیا ہوگا؟	۴۴۸	حلال چیزوں کو حرام قرار دینا خدا کا عذاب ہے۔
۴۴۵	لٰكِنِ اللّٰهُ..... شَهِيدٌ وحی منزل من اللہ ہونے کی شہادت -	۴۴۹	وَ اخْذْهُمْ الرِّبَا..... اَلَيْمًا یہ ربو کو جائز سمجھتے تھے۔
۴۴۶	اِنَّ الَّذِیْنَ..... یَکْسِبُوْنَ اس کے بعد بھی جو لوگ اس ضابطہ ہدایت کی صداقت سے انکار کریں گے ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔	۴۵۰	لٰكِنِ الرِّسَالُ سَخُوْنَ..... عَظِیْمًا ان میں سے بھی جو ایمان لے آئے گا، اسے اس کے اعمال کا اجر ملے گا۔
۴۴۷	یَا اَیُّهَا النَّاسُ..... حَکِیْمًا خدا کا آخری رسول تمام نوبہ انسان کی طرف یَا اَهِلَّ الْکِتَابِ..... جَمِیْعًا دین میں غلو مت کرو۔	۴۵۱	اِنَّا اَوْحِیْنَا..... رُبُوْرًا دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے اور ہر رسول کو دیا گیا تھا۔
۴۴۸	عیسائیوں کے مبالغہ آمیز عقائد۔	۴۵۲	وَسُرَّسَلًا..... حَکِیْمًا بعض رسولوں کا بالتصریح ذکر آیا ہے۔
۴۴۹	رسول اللہ کی شانِ اقدس میں غلو۔	۴۵۳	بعض کا نہیں۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟
۴۵۰	قَا مَّا الَّذِیْنَ..... فُجِیْرًا غلو سے مبرا۔ حق پر مبنی ایمان۔ خدا کی عبدیت۔	۴۵۴	ایک اہم سوال -
۴۵۱	یَا اَیُّهَا النَّاسُ..... مُسْتَقِیْمًا قرآن مجید کی خصوصیات کبریٰ۔	۴۵۵	کسی قوم کی تباہی اسی صورت میں حق بجانب قرار پا سکتی ہے جب (ا)
۴۵۲	وہ منزل جس کی طرف یہ کتاب لے جاتی ہے۔	۴۵۶	اس تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔ اور (ا)
		۴۵۷	اس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔
		۴۵۸	ان ہر دو شرائط کے پورا ہونے کا بیان۔
		۴۵۹	سب تک ہدایت پہنچا دی گئی تھی۔
		۴۶۰	(نیز دیکھئے ص ۴۸)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۶۴	۵/۴ یَسْأَلُونَكَ..... الْحِسَابِ	۴۵۱	۴/۱۷۷ یَسْتَفْتُونَكَ..... عَلِيمٌ
۴۶۵	حلال کے ساتھ طیب کا مفہوم۔	۴۵۲	دوسری قسم کے کلاز کی وراثت کے تعلق { حکم سے قانون وراثت کی تکمیل
۴۶۶	ذبح کرنے وقت اللہ کا نام لینا۔		سورة النساء ختم
۴۶۷	شکار ہی جانوروں کو سدھانا۔		
۴۶۸	خدا نے اسے اپنی طرف کیوں منسوب کیا ہے؟		
۴۶۹	۵/۵ الْيَوْمَ أُحِلَّ..... الْخَيْسِرِينَ		
۴۷۰	ان مسائل کی تشریح سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔		
۴۷۱	۵/۶ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ..... تَشْكُرُونَ		
۴۷۲	وضو سے متعلق حکم۔	۴۵۳	۵/۱ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ..... يُرِيدُ
۴۷۳	شید اور سستی میں اختلاف۔	۴۵۴	حرام و حلال کی مزید بحث۔
۴۷۴	اختلاف قرأت۔	۴۵۵	بہیمۃ الانعام کے معانی۔
۴۷۵	مودودی (مرحوم) اور اختلاف قرأت کا عقیدہ	۴۵۶	۵/۲ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ..... الْعِقَابِ
۴۷۶	تیمم۔	۴۵۷	قلاد کا مفہوم۔ تقلید کے معنی۔
۴۷۷	مسح۔	۴۵۸	شعار اللہ کا احترام۔
۴۷۸	۵/۷ وَادْكُرُوا..... الصُّدُورِ	۴۵۹	حج میں معاشی مفاد کا حصول۔
۴۷۹	اطاعت کے لئے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا { کے الفاظ	۴۶۰	۵/۳ حَرَّمَ مَتَّ عَلَيْكُمْ..... شَرِّ حَيْمٍ
۴۸۰	اطاعت کا مفہوم۔	۴۶۱	ازلام (قرعہ اندازی) حرام ہے۔
۴۸۱	۵/۸ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ..... تَعْمَلُونَ	۴۶۲	رسول اللہ کی طرف ایک نخل طرہ روایت { کا انتساب۔
۴۸۲	عدل کی مزید تاکید۔	۴۶۳	دین کی تکمیل۔ نعاء کا اتمام۔
۴۸۳	۵/۹ وَعَدَ اللَّهُ..... الْمُؤْمِنُونَ		
۴۸۴	وٹمنوں سے حفاظت۔ نعت خداوندی ہے { جو تقویٰ اور توکل سے حاصل ہوتی ہے		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸۲	یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا ضمنی تذکرہ۔	۴۷۶	{ وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ سَوَاءَ السَّبِيلِ میشاق بنی اسرائیل کی طرف اشارہ۔ بارہ نقیب۔
۴۸۳	{ اگر تم خدا کی جیتی اولاد ہو تو پھر تم مبتلائے عذاب کیوں ہو؟	۴۷۷	{ خدا کی معیت کس طرح حاصل ہوتی ہے۔
۴۸۴	{ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدِيرٌ	۴۷۸	{ فَبِمَا نَقُضُّهُمْ الْمُحْسِنِينَ مخالفین سے کنارہ کشی۔ لیکن حسن کارنامہ انداز سے۔
۴۸۵	{ فقرہ کے معانی۔ تعلیم خداوندی کی خصوصی ضرورت کس وقت پڑتی ہے۔	۴۷۹	{ وَمِنَ الَّذِينَ يَصْنَعُونَ نصاریٰ سے میثاق۔ تمام انبیاء سے میثاق۔ نقص عہد کی وجہ سے ان میں فرقے پیدا ہو گئے۔
۴۸۶	{ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا کرنا۔ (ا) صحیح اور غلط راستے کی تمیز اس کے سامنے آجائے۔ یعنی اس تک پیغام خداوندی پہنچ چکا ہو۔ اور	۴۸۰	{ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَسْتَقِيمُ انبیاء سابقہ کی تعلیم میں سے بعض کو قرآن میں بیان کر دیا۔ بعض حصہ کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔
۴۸۷	{ (آ) اس میں اس پیغام کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ (ب) ضمناً قانون جرم و سزا کا اہم اصول (نیز دیکھئے ص ۴۴۱)	۴۸۱	{ ہدایت صرف قرآن کے ذریعے مل سکتی ہے سُبُلَ السَّلَامِ اور صَوَاطِیْ قَسْتَقِيمٍ کا تعلق۔
۴۸۸	{ اس کے لئے اس قوم کا زندہ ہونا ضروری ہے۔	۴۸۲	{ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ إِلَيْهِ الْمُحِیْرُ
۴۸۹	{ زندگی اور موت کا قرآنی مفہوم۔		
۴۹۰	{ اسلامی نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ اسکا پروگرام۔ بہی پروگرام حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ حضورؐ کو مشاورت کا حکم۔		
۴۹۱	{ وَآذُ قَالَ الْفَاسِقِينَ		
۴۹۲	{ بنی اسرائیل کو گزشتہ واقعات کی یاد دہانی۔ وَآتِلْ عَلَيْهِمُ الْمُتَّقِينَ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۱	احسانِ کریمانہ کا تقاضا۔ عفو عام { جس سے مقصود اصلاح نفسی -	۴۹۲	”آدم کے دو بیٹوں کا قصہ“۔
۵۰۲	مفتوحین مکہ کی عام معافی - انتقام میں اصلاح -	۴۹۳	انہیں عام طور پر ہابیل وقابیل کہا جاتا ہے۔
۵۰۳	”سبیلہ“ کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے اندکس)	۴۹۴	یہ بس دو آدمیوں کا قصہ ہے۔ حقیقی یا تمثیلی۔
۵۰۴	دولت کے بل بوتے پر جرم کی سزا سے بچا نہیں جاسکتا۔	۴۹۵	ہمدانی کتب تفسیر کی افسانہ طرازی -
۵۰۵	قرآن کی رو سے جرائم اور ان کی سزائیں { حدود اور تعزیرات کی اصطلاحات اسلامی قوانین، اسلامی معاشرہ یا اسلامی نظام ہی میں نافذ کئے جاسکتے ہیں جرم مرتکب (چوری) کی سزا۔	۴۹۶	زمین پر پہلا قتل -
۵۰۶	”قطع ید“ کا مفہوم -	۴۹۷	”حضرت آدم“ کی ”حضرت حوا“ کو بددعا کہ توادرتیری بیٹیاں روتی ہی رہیں گی۔
۵۰۷	ویسے بھی یہ عادی مجرموں کے لئے ہے۔	۴۹۸	”کین بَسَطْتَ..... السَّيِّئِينَ“
۵۰۸	لیکن یہ جرم اس صورت میں قرار پائیگا جب اس کا ارتکاب اسلامی معاشرہ میں ہوگا۔	۴۹۹	لائش کا کیا کیا جائے؟
		۵۰۰	اس کا صحیح مفہوم -
		۵۰۱	اس قتل کا جذبہ محرکہ حسد تھا۔
		۵۰۲	حسد اور وسوسہ انگیز یوں کی تباہ کاریاں!
		۵۰۳	”مَنْ أَجَلِ ذَلِكْ..... لِمُسْرِفُونَ“
		۵۰۴	وہ مقصد جس کے لئے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔
		۵۰۵	انسانی جان کی قدر و قیمت کا عظیم انگیز اصول -
		۵۰۶	”إِنَّمَا جَزَاُ الَّذِينَ..... عَظِيمٌ“
		۵۰۷	”اللہ اور رسول“ سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی مملکت ہے۔
		۵۰۸	”اللہ اور رسول“ سے جنگ۔
		۵۰۹	”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا..... سَرَّحِيمٌ“
		۵۱۰	عدل کا تقاضا،
		۵۱۱	جرم کی سزا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۱۴	{ ۵/۴۲ سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ الْمُقْسِطِينَ	۵۰۸	{ صدر اول کے نظائر جن میں چوری کی سزا نہیں دی گئی
۵۱۵	{ سَحْتِ رِزْقِ حَرَامِ ہے۔ یعنی جس مال سے کچھ پیدا نہ کیا جائے۔	۵۰۹	{ امام ابن حزم کا مسلک۔ کشتی والوں کی مثال۔ قرآن کا معاشی نظام۔
۵۱۵	{ یربو کی ہی دوسری شکل ہے۔ خارج از قرآن اتھارٹی کے فیصلے	۵۱۰	{ پہلے معاشرہ اسلامی بنائیے۔ پھر اس میں تعزیری احکام نافذ کیجئے۔
۵۱۶	{ ۵/۴۳ وَ كَيْفَ يُحْكُمُونَكَ بِالْمُؤْمِنِينَ	۵۱۱	{ غیر اسلامی معاشرہ میں تعزیری احکام کی تتفید خواہ وہ اسلامی احکام کے مماثل بھی کیوں نہ ہوں، سیکولر لازم ہوگی۔
۵۱۷	{ فیصلے کتاب اللہ کے مطابق لینے چاہئیں۔ اصلی تورات میں نور بھی تھا اور ہدایت بھی۔	۵۱۲	{ جرم بغاوت کی سزا۔ ۵/۴۴ اَلَمْ تَعْلَمَ قَدْ يُرْ
۵۱۸	{ ۵/۴۴ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ الْكُفْرُونَ	۵۱۳	{ مرادینے سے مقصود قوت کی نمائش نہیں اس میں حکمت کا پہلو بھی ہے۔
۵۱۹	{ احمدیوں کی مخالفت آفرینی کہ نبی بلا کتاب آ سکتا ہے۔ جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔	۵۱۴	{ ۵/۴۵ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ عَظِيمٌ
۵۲۰	{ اسلامی نظام کسے کہا جائے گا۔ ۵/۴۵ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمُ الظَّالِمُونَ	۵۱۵	{ حضور کو تاکید کہ آپ مخالفین کی تباہی کے خیال سے دلگیر نہ ہوں۔
۵۲۱	{ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان کا حکم یہودیوں کے لئے تھا۔	۵۱۶	{ منافقت بھی کفر ہے۔ ہماری حالت۔
۵۲۲	{ ۵/۴۶ وَ قَفَّيْنَا تَخْتَلِفُونَ	۵۱۷	{ تحریف کی ایک اور شکل۔ الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے۔
۵۲۳	{ قرآن ہمہمین ہے۔ اس کا مفہوم۔ ہر ایک کی شریعت اور منہاج، اپنی وضع کردہ	۵۱۸	{ ہماری تفاسیر میں بالعموم یہی طریق اختیار کیا گیا ہے
۵۲۴	{ خَلَدَا الْاَلْك الْاَلْك۔	۵۱۹	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲۲	ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کا استہزا کریں۔ نہ انہیں جو خود اپنے دین کا مضحکہ اڑائیں۔	۵۲۳	شریعت کے معانی اور مفہوم۔
۵۲۳	ایک نہایت اہم اور عظیم اصول۔	۵۲۴	اقوام سابقہ کی شریعت اور ہماری شریعت
۵۲۳	زندگی کے دو تصورات۔ مذہبی اور خالص مادی۔	۵۲۴	منہاج کا مفہوم۔
۵۲۳	تہذیب مغرب کا اثر عالمگیر ہو رہا ہے۔	۵۲۴	رسول اللہ کو حکم کہ تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں۔
۵۲۳	ہمارے ہاں کی نئی نسل بھی اس سے متاثر ہو رہی ہے۔	۵۲۴	قوانین شریعت، اسلامی مملکت کی طرف سے مرتب اور نافذ ہوں گے۔ اس میں مختلف فقہیں نہیں ہوں گی۔
۵۲۳	لیکن میں ان سے مایوس نہیں۔	۵۲۴	وَأَنِ احْكُمُوا... يَوْمَ قُتُوبِ
۵۲۳	دین کا نظام تمام انسانوں کے فائدے کیلئے ہے۔	۵۲۴	تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہونگے
۵۲۳	پھر اس کی مخالفت کیوں؟	۵۲۴	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ...
۵۲۳	لیکن اس میں قصور خود ہمارا ہے۔ ہم نے اسلام کو دنیا کے سامنے اس کی حقیقی شکل میں پیش ہی نہیں کیا۔	۵۲۴	یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کی ممانعت
۵۲۳	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ... سَوَاءٌ السَّبِيلِ	۵۲۴	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ... وَأَسِعْ عَلَيْهِ
۵۲۳	مسلمان، غیر مذاہب کے خلاف استہزاء اور گستاخی کا تصور تک نہیں کر سکتے۔	۵۲۴	ارتداد اور مرتد کا مفہوم اور انجام۔
۵۲۴	بنی اسرائیل کے بندر، خنزیر اور عبد طاعت بن جانے کا مفہوم	۵۲۴	استبدال قومی۔
۵۲۴	وَإِذَا جَاءُوكُمْ... يَمْنَعُونَ	۵۲۴	عہد صدیقی میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد۔
۵۲۴	مناقت ان کا شیوہ بن چکا ہے۔	۵۲۴	إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ... الْغُلَبُونَ
۵۲۴		۵۲۴	مؤمنین کے دوست۔ اللہ۔ رسول اور مومنین
۵۲۴		۵۲۴	یہی حزب اللہ ہیں جو غالب رہیں گے۔
۵۲۴		۵۲۴	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ... يَعْقِلُونَ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۴۵	{ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ... يُوفُكُونَ	۵۳۷	{ ان کے ابار و رصبان انہیں غلط کاموں سے روکتے نہیں تھے
۵۴۶	{ عیسائیوں کے باطل عقائد۔ الوہیت مسیح۔ تشیت الوہیت حضرت مریم۔	۵۳۸	{ انہوں نے دین کو مصنوعی رسوم اور اپنے کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا ہے
۵۴۷	{ قُلْ أَتَعْبُدُونَ... الْعَلِيمُ	۵۳۹	{ وَقَالَتِ الْيَهُودُ... الْمُفْسِدِينَ
۵۴۸	{ ہر غیر اللہ کی الوہیت کے عقیدہ کا ابطال۔	۵۴۰	{ یہودیوں کی طرف سے استہزاء کی ایک اور مثال
۵۴۹	{ غیر اللہ کو "خدا" بنانے کا جذبہ محرکہ۔ جلب منفعت و دفع مضرت۔	۵۴۱	{ فساد انگیزی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔
۵۵۰	{ کوئی کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔	۵۴۲	{ وَلَوْ أَنَّ... يَعْمَلُونَ
۵۵۱	{ انسانی ذات کا نفع نقصان۔	۵۴۳	{ کشادگی راہیں ان پر اب بھی بند نہیں۔
۵۵۲	{ طبعی زندگی کا نفع نقصان۔	۵۴۴	{ اگر یہ وحی کی تعلیم پر عمل پیرا ہو جائیں تو رزق کے دروازے ان پر کھل جائیں
۵۵۳	{ تو ہم پرستی کا استیصال۔	۵۴۵	{ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ... الْكَافِرِينَ
۵۵۴	{ پیر فقیر۔ اولیاء اللہ۔ کسی میں یہ قوت نہیں۔	۵۴۶	{ رسول اللہ سے ناکید کتاب تبلیغ رسالت کرتے جائیں۔
۵۵۵	{ خود اپنے آپ کو نفع نقصان پہنچانے کی بھی نہیں	۵۴۷	{ حضور کے بعد یہ فریضہ امت پر عائد ہوتا ہے
۵۵۶	{ رسول اللہ کو بھی نہیں۔	۵۴۸	{ حضور کی حفاظت سے مراد آپ کے مشن کی کامیابی
۵۵۷	{ انسانوں کے ہاتھوں سے نقصانات۔	۵۴۹	{ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ... الْكُفْرُونَ
۵۵۸	{ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے	۵۵۰	{ اہل کتاب کو قرآن کی اطاعت کی دعوت
۵۵۹	{ مستبد حکام کی طرف سے مضرت۔	۵۵۱	{ إِنَّ الَّذِينَ... يَجْزَوْنَ
۵۶۰	{ جہنم میں لیڈروں اور عوام کے مکالمات۔	۵۵۲	{ دین کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں۔
۵۶۱	{ محکوموں کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا کہ مستبد حکام کی قوت کا ذریعہ تم تھے۔	۵۵۳	{ صابین کا تعارف۔
۵۶۲	{ تم کھڑے ہو جاتے تو یہ خود بخود گر جاتے	۵۵۴	{ لَقَدْ أَخَذْنَا... يَعْمَلُونَ
۵۶۳		۵۵۵	{ ميثاق بنی اسرائیل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵۷	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... هُوَ مُؤْمِنُونَ ۵ ۸۷-۸۸	۵۵۰	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ..... ۵ ۷۷
۵۵۸	عیسائی راہبوں کی طرح ترکہ لڈاؤ کا مسک اختیار نہ کرو۔	۵۵۱	دین میں غلو۔
۵۵۸	حلال کو حرام قرار دیکر اس سے اجتناب نہ کرو۔	۵۵۱	رسول اللہ کی شانِ اقدس میں غلو۔
۵۵۹	لَا يُؤْخَذُكُمْ اللَّهُ..... تَشْكُرُونَ ۵ ۸۹	۵۵۲	سینکڑوں معجزات حضور کی طرف منسوب۔
۵۵۹	لغو قسموں کا کفارہ۔	۵۵۲	حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔
۵۶۰	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... قَتَلْتَهُمْ ۵ ۹۰-۹۱	۵۵۳	حتیٰ کہ فقہ بھی۔
۵۶۰	خمر، میسرہ، انصاف، ازلام کی ممانعت۔	۵۵۳	پیروں اور مرشدوں کی شان میں غلو۔
۵۶۱	وَاطِيعُوا اللَّهَ..... الْمُحْسِنِينَ ۵ ۹۲-۹۳	۵۵۴	سلاطین کی شان میں غلو۔
۵۶۱	معاشرتی امور میں کوئی بیجا جکڑبندی نہیں۔	۵۵۴	ان سے جرائم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔
۵۶۱	کھانے پینے، رہنے سہنے کے معاملہ میں آزادی۔	۵۵۴	نہ اس دنیا میں، نہ آخرت میں۔
۵۶۲	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... تَحْشَرُونَ ۵ ۹۴-۹۵	۵۵۵	لُعِنَ الَّذِينَ..... ۵ ۷۸-۸۹
۵۶۲	حالتِ احرام میں شکار پر پابندی کی تفصیل۔	۵۵۵	أَصْحَابُ الْجَحِيمِ
۵۶۲	عدل کا عظیم اصول۔ قانون کا اطلاق اس کی تاریخ	۵۵۵	بنی اسرائیل پر ان کے انبیاء کی طرف سے لعنت
۵۶۲	اطلاق سے ہوگا یا بالآخرشوں کا مؤاخذہ نہیں ہوگا	۵۵۵	جرائم اتنے عام ہو گئے تھے کہ کوئی
۵۶۲-۶۳	”ذَوَانِقَامٍ“ کا مفہوم۔	۵۵۵	ایک دوسرے کو روکتا روکتا نہیں تھا
۵۶۴	جَعَلَ اللَّهُ..... سَرَحِيمٌ ۵ ۹۷-۹۸	۵۵۵	اہل کتاب کو رسول اللہ اور قرآن پر
۵۶۴	کعبہ کا مقام اور حج کا مقصود۔	۵۵۵	ایمان لانے کی دعوت۔
۵۶۵	مَا عَلَى الرَّسُولِ..... تَكْفُرُونَ ۵ ۹۹	۵۵۵	عیسائی قدرے، رقیق القلب۔
۵۶۵	رسول کا فریضہ احکام خداوندی کی تبلیغ ہے۔	۵۵۵	ان میں سے بعض ایمان لے آئے تھے۔
۵۶۵	ان احکام کی تعمیل دسمایا مجبوراً نہیں کی جائے گی	۵۵۵	آیت (۵/۸) سے ساتواں پارہ
۵۶۵	دل کی کامل رضا مندی سے کی جائے گی۔	۵۵۵	شروع ہو گیا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۴۲	رسولوں سے پوچھا جائیگا کہ تمہیں تمہاری دعوت کا جواب کیا ملا تھا۔	۵۶۶	۵/۱۰۰ قُلْ لَا يَسْتَوِي تَفْلِحُونَ
۵۴۳	۵/۱۱۰ اِذْ قَالَ اللَّهُ سَحَرُ مَبِينٌ	۵۶۷	نجیث کی کثرت انسان کو مغالطہ میں ڈال دیتی ہے اور اس کے دل میں اس کی طرف کشش پیدا ہو جاتی ہے
۵۴۴	۵/۱۱۱ وَاِذَا وُحِّيتُ مُسْلِمُونَ	۵۶۸	۵/۱۰۱-۱۰۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كُفِرْتُمْ
۵۴۵	وحی کے مفہوم کی تفصیلی بحث۔	۵۶۹	دین کے اصول خدا نے عطا کر دیئے۔ ان کی جزئیات خود اس نے متعین نہیں کیں
۵۴۶	حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کا مفہوم۔	۵۷۰	یہ جزئیات اسلامی مملکت متعین کرے گی۔
۵۴۷	ہدایت بذریعہ حضرت عیسیٰ۔	۵۷۱	۵/۱۰۳ مَا جَعَلَ اللَّهُ يَعْقِلُوْنَ
۵۴۸	ختم نبوت کے معنی سلسلہ وحی کا اختتام ہے۔	۵۷۲	دین کی جزئیات کے تقاضا کی ایک مثال۔
۵۴۹	۵/۱۱۲-۱۱۵ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ اَلْعَالَمِيْنَ	۵۷۳	بجور۔ سائبہ۔ وید۔ عام سبت تو ہم پرستیاں نہیں۔
۵۵۰	حواریوں کی طرف سے ”مائدہ من السّماء“ کی درخواست۔	۵۷۴	۵/۱۰۴ وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ يَهْتَدُوْنَ
۵۵۱	اس اہم کلمہ کی تفسیر اور تشریح۔	۵۷۵	تقلید اسلاف۔
۵۵۲	مچھلی کی تفصیلات۔	۵۷۶	۵/۱۰۵ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ تَعْمَلُوْنَ
۵۵۳-۵۵۴	قرآنی مفہوم۔ معاشی نظام خداوندی۔	۵۷۷	تشریح پہلے (زیر آیت ۵/۱۰۶) گورچکی ہے آیات (۵/۱۰۷-۱۰۸) جلد سوم میں گورچکی ہیں۔
۵۵۵	عید کے معنی۔	۵۷۸	(دیکھئے صفحہ ۱۷۷)
۵۵۶	۵/۱۱۶-۱۱۹ وَاِذْ قَالَ اللَّهُ الْعَظِيْمُ	۵۷۹	۵/۱۰۸ ذٰلِكَ اَدْنٰی الْفٰسِقِيْنَ
۵۵۷	عیسائیوں کے باطل عقائد کی تردید خود حضرت عیسیٰ کی زبانی	۵۸۰	شہادت کی اہمیت۔
۵۵۸	۵/۱۲۰ اِنَّ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ قَدِيْرٌ	۵۸۱	۵/۱۰۹ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ الْغٰیُوْبُ
۵۵۹	خدا کے قدیر کا قانونی مکافات عمل۔	۵۸۲	
۵۶۰	سورة المائدہ ختم		
۵۶۱	(انڈس صفحہ ۵۸۴)		

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مطالب الفرقان

جلد چہارم



آغاز سورۃ آل عمران (سورۃ ۳)

محکمات و متشابہات

الحی القیوم کی حکمرانی کا اثر انسانی حکومتوں پر	۱
خدائے زندہ زندہ انسانوں کو خطاب کے قابل سمجھتا ہے	۲
خدا کے ذوات مقام ہونے کا مطلب	۳
انجیل کی تاریخ	۴
آیات محکمات و متشابہات	۵
عرش خداوندی کا تصور	۶
ذنب اور ذنوب کا مفہوم	۷
عصمت انبیاء کی بحث	۸
مال اور اولاد فتنہ کس طرح بنتے ہیں	۹
خدا کے بندوں کی صفات	۱۰
توحید پر خدا، ملائکہ اور ارباب علم کی شہادت	۱۱
الدین اور الاسلام	۱۲
نبوت اور رسالت	۱۳
جسطا اعمال کس طرح ہوتا ہے	۱۴
شفاعت کے متعلق مروجہ عقائد	۱۵
عزت و ذلت محکومی اور حکمرانی "خدا کے ہاتھ میں ہے"	۱۶
کفار کے ساتھ تعلقات	۱۷
نقیہ کی بحث	۱۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پہلا باب

محکمات و متشابہات

آغاز سورہ آل عمران

(آیات ص ۱ تا ص ۳)

مطالب الفرقان کی تیسری جلد کا اختتام سورہ بقرہ کی آخری آیت پر ہوا تھا۔ زیرِ نظر جلد کی ابتداء سورہ آل عمران سے کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے :-

﴿۳﴾ اَلَمْ نَكُنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (۳)

خدا نے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ کسی سے اپنے قوانین و احکام کی عطا کرے۔ کائنات میں اقتدا علی اسی کا ہے۔ وہ خود زندہ ہے اور ہر ایک کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہ بغیر کسی سہارے کے قائم بالذات ہے اور ہر ایک کو قیام عطا کرتا ہے۔

اَلَمْ : یہ حروف مقطعات میں سے ہے جن کی تشریح مطالب الفرقان کی پہلی جلد ص ۱۰ زیر آیت (۱) کی جا چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

دوسری آیت کے الفاظ وہی ہیں جو سورہ بقرہ آیت (۲۵۵) کے ابتداء میں آئے تھے۔ ان کا مفہوم مطالب الفرقان کی تیسری جلد (۲۳۵-۲۳۱) میں سامنے لایا جا چکا ہے۔ اس میں ایک اضافہ ضروری ہے۔ یہاں پہلے کہا گیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ جس خدا کو حق حکومت حاصل ہے وہ اَلْحَيُّ۔

یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ دوسری جگہ ہے : وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (۲۵۵)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قابلِ اعتماد صرف اس کے قوانین ہو سکتے ہیں جو زندہ ہو۔ جسے کبھی موت نہ آئے۔ اسی کے قوانین غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں (۲۵۵)۔ یہ ظاہر ہے کہ کامل اطمینانِ قلب اور

سکون کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جن کے متعلق یقین محکم ہو کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسی لئے کہا: وَعَنْتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ (۲۱)۔ ”خدا لئے حی و قیوم کے قوانین کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ کرو۔“ اس الحی کے متعلق کہا کہ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (۲۲)۔ یعنی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جس کے متعلق یقین و ایمان ہو کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یہاں قرآن کریم نے کہا ہے کہ دل کے کامل سکون کے ساتھ اطاعت انہی قوانین کی کی جاسکتی ہے جن کے متعلق یقین ہو کہ ان میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ اور ایسے قوانین اس سہنی کے نافذ کردہ ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہے۔ اس ایک شرط (یا خصوصیت) سے انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کی جڑ کاٹ جاتی ہے۔ حکومتیں شخصی ہوں یا جمہوری، ارباب اقتدار کی (موت ہی نہیں، غرض) تبدیلی سے معاشرہ میں جس قدر تہلکہ مچ جاتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عصر رفتہ میں بادشاہ کی موت سے معاشرہ میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا اور (ملکہ سبا کے الفاظ میں) ”بلندیاں لپٹتیاں اور پستیاں بلندیاں میں ل جاتی تھیں“ (۲۳)۔ آج بھی (مثال کے طور پر) امریکہ کے صدر کے انتخابات سے کئی ماہ پہلے، دنیا بھر کی مملکتوں (بالخصوص کمزور اقوام) کے دل دھڑکنے لگ جاتے ہیں کہ نہ معلوم نیا صدر مملکت کی خارجی پالیسی میں کس قسم کی تبدیلیاں لے آئے۔ کم و بیش یہی صورت پارلیمانی نظام میں ہوتی ہے کہ نہ جانیں انتخاب سے کون سی پارٹی برسرِ اقتدار آئے اور وہ معاشرہ کے نظم و نسق اور دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات میں کس قسم کا تغیر و تبدل کر دے؟ لہذا، انسانی حکومتوں کے قوانین اور فیصلے نہ قابلِ اعتماد ہو سکتے ہیں نہ موجب سکون و اطمینان۔ قابلِ اعتماد اور اطمینان بخش وہی قوانین ہو سکتے ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہو۔ اور ایسے قوانین وہی صاحبِ اقتدار (اللہ) نافذ کر سکتا ہے جو الحی (ہمیشہ زندہ رہنے والا) اور اس کے ساتھ القیوم بھی ہو۔ یعنی جس کا اقتدار دوسروں کے سہاروں کا محتاج نہ ہو۔ انسانی اقتدار، خواہ وہ شخصی ہو اور خواہ جمہوری، دوسروں کے سہاروں کا محتاج ہوتا ہے جو نہی وہ سہارے کمزور پڑے، اقتدار متزلزل ہو گیا۔ جمہوری نظام میں تو بعض اوقات ایک دوٹ کا رد و بدل، حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ اس لئے کوئی انسانی نظام القیوم نہیں ہو سکتا۔ یہ خصوصیت بھی اسی خدا کے نظام کو حاصل ہے جو الحی اور القیوم ہے۔

دوسری طرف خدائے زندہ کے قوانین کی اطاعت بھی وہی کر سکتا ہے جو خود زندہ ہو یا جس کے دل میں زندہ رہنے کی

تمنا ہو۔ حضور نبی اکرمؐ سے ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ تمہیں یہ قرآن اس لئے دیا گیا ہے: لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ كَانُوا حَيًّا (۲۴)۔ تاکہ اس کے ذریعے اس شخص

زندہ انسانوں کے لئے قانون

اور اس قوم کو جس میں زندگی کی شق باقی ہو اور وہ زندہ رہنا چاہئے غلط روش کے مرگِ آفریں خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ (۳۰)۔ تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے شکارِ مردہ سزاوار شاہِ باز نہیں (اقبال)

قرآنِ کریم زندگی بخش نظام عطا کرتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۳۱)۔ اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو جو اس پر دگرام کی دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔ لہذا، خدائے زندہ کا

نظام اطاعت اس قوم کو حقیقی زندگی کی توانائیاں عطا کرتا ہے جو زندہ ہو یا اس کے دل میں زندہ رہنے کی تڑپ اور غلبہ ہو۔ مارٹن بوبر (MARTIN BUBER) نے ایک عمیق نکتہ بیان کیا ہے کہ ”تو“ وہی کہہ سکتا ہے جو ”میں“ کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خدائے زندہ کو وہی پکار سکتا ہے جو خود زندہ ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا فَلَئِنْ أَجَبْتَهُ لَئِنْ (۳۲)۔ میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں جو میری پکار کا جواب دے۔ لہذا، اگر ہمیں خدا کی طرف سے پکار کا جواب نہیں ملتا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم زندہ نہیں۔

تمہیں اعتبارِ الفت جو نہ ہو سکا ابھی تک میں سمجھ گیا یقیناً ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے خدائے اپنی پکار کا جواب لینے کے لئے ہمیں اپنے اندر زندگی پیدا کرنی چاہیے یہی وہ زندگی جو آخر کار ”مرگ نا آشنا“ ہو جاتی ہے: لَا يَدْرُؤْنَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (۳۳)۔ اس میں بھرموت نہیں آئے گی۔

زندگانی ہے صدفِ قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کرنے سکے ہو اگر خود نگری و خود گرد و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے مر نہ سکے (اقبال)

مرد مومن جب خدائے الحی القیوم کی صفات (بعد بشریت) اپنے اندر منعکس کر لیتا ہے تو یہ بھی حیِ قدیم ہو جاتا ہے۔ انسان کی طبعی زندگی سہاروں کی محتاج ہوتی ہے لیکن اُسے وہ جیت اہا وید عطا ہو جاتی ہے جو سہاروں کی محتاج نہیں رہتی۔ اور یہ زندگی اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کا ”لا الہ الاہو“ پر ایمان اور اس کے مطابق عمل ہو۔ یعنی یہ ایمان کہ

سروردی نہ یا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کہ ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اور اس قسم کا ایمان اور اس کے مطابق عمل صرف اس کتاب کی رو سے ممکن ہے جس کے متعلق فرمایا :-

[۳۴] نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ

مِنْ قَبْلُ هَٰذَا هُدًى لِلنَّاسِ. وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ. إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ

عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ (۳۵)۔

اس نے (اے رسول) تجھ پر وہ ضابطہ حیات نازل کیا ہے جو سترتا سترحق ہے اور ان تمام خالق و دعاوی کو سچ کر دکھانے والا جو اس سے پہلے آپکے ہیں (مثلاً) حضرت عیسیٰ سے پہلے کے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف نازل کردہ مجموعہ کتب جسے تورات کہہ کر پکارا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی طرف نازل کردہ کتاب جسے انجیل کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ لکھا ہے کہ اس سے پہلے نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے بھیجی تھیں۔ ان کے بعد یہ ضابطہ ہدایت آیا ہے جو حق اور باطل، غلط اور صحیح، کو الگ الگ کر دکھائے گا۔ (۲۵)

جو لوگ ایسے کھلے ہوئے قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کریں گے اور ان سے سرکش رہیں گے، تو (قانون خداوندی کے مطابق) اس رذیل کا نتیجہ سخت نباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ خالی دھمکی نہیں۔ یہ اس خدا کا قانون مکافات ہے جو ایسی قوت رکھتا ہے کہ ہر عمل کو اس کے آخری نتیجہ تک پہنچا دے۔

”الحق“ کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم - آیت (۲۱) - ص ۸۹ اور آیت (۲۲) - ص ۱۹۵ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ مصداقاً لما معکم کی تشریح مطالب جلد دوم - آیت (۲۱) - ص ۸۹ پر کی جا چکی ہے۔ اور فرقان کا مفہوم مطالب جلد دوم - آیت (۲۳) - ص ۲۶۲ میں پیش کیا جا چکا ہے۔

تورات کی تاریخ جلد دوم - زیر آیت (۲۱) بر ص ۸۹ دی جا چکی ہے۔ اب انجیل کی تاریخ پیش کی جانی باقی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کی طرف آئیں، لفظ انتقام کا مفہوم بیان کرنا ضروری ہے جو آریہ زیر نظر کے آخر میں آیا ہے۔ ہمارے

انتقام کا مفہوم | ہاں انتقام کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس میں نفرت، عداوت اور کینہ توڑی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے جو پسندیدہ خصائص نہیں سمجھے جاتے۔ اللہ تعالیٰ ان جذبات (بلکہ ہر قسم کے

انسانی جذبات) سے مبرا ہے اس لئے اس لفظ (انتقام) کو ان معانی میں اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی، اگر کوئی شخص کسی کو اذیت پہنچائے تو اس اذیت کا بدلہ لینے کو انتقام کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کو کوئی اذیت ہی نہیں پہنچا سکتا تو اس کی طرف سے ”بدلہ لینے“ کا کیا سوال؟ انسان اگر قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے اس کا اپنا نقصان ہوتا ہے۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑتا؛ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَكْفُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيَ غَنِيٌّ كَرِيمٌ (۲۴)۔ ”جو سپاس گزاری کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے اور جو خلاف ورزی کرتا ہے (تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال و افعال سے مستغنی ہے۔ اس لئے: إِنْ تَكْفُرُوا أَنتُمْ فِي الْأَرْضِ جُنْدًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ جَمِيدٌ“ (۲۵)۔ ”اگر تم اور کمرہ ارض کے تمام انسان بھی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی پر آرائیں تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا وہ جملہ کائنات سے مستغنی ہے (۲۶) اور ہر حال میں مستحق حمد و ستائش۔ بنا بریں خدا کے لئے یہ

لفظ ان معانی میں بھی استعمال نہیں ہو سکتا جن معانی میں یہ ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے بنیادی معنی یہ نہیں۔ اس لفظ کا مادہ (ن - ق - م) ہے۔ الثَّقَمُ راستے کے درمیانی حصے یا وسط طریق کو کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو سامنے لائیے۔ وہ وسط طریق سے ہٹ کر ادھر ادھر منتشر ہو جائیں تو گڈریا انہیں ہانک کر درمیانی راستے کی طرف لانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اسے کبھی کبھی ”ڈنڈا“ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس سے انتقام کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی غلط روش اختیار کر میوالوں کو صحیح راستے کی طرف لانا۔ جو صحیح راستے کی طرف نہ آئیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہوگا۔ آیت زیرِ نظر میں اس کے ساتھ ”عزیز“ کا لفظ خود اس کی وضاحت کرتا ہے۔ عزیز کے معنی ہیں وہ صاحبِ اقتدار جسے اپنے قوانین کے نفاذ کا اختیار اور قانون شکنی کرنے والوں کو کیفر کرنا تک پہنچانے کی قوت حاصل ہو۔ (مثلاً) فرعون اور اس کی قوم کے جرائم گننانے کے بعد کہا: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ۔۔۔ (۲۶) یعنی جب وہ اس طرح مسلسل اور پیہم ہمارے قوانین کو جھٹلاتے رہے اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کی طرف سے لاپرواہی برتتے رہے تو ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا اور وہ غرقِ دریا ہو گئے۔ یوں ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اسی طرح قومِ مدین (اصحابِ الیکہ) کے متعلق ہے کہ وہ بڑے مظالم کرتے تھے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۲۷) تو ہم نے انہیں ان جرائم کی بنا پر ہلاک کر دیا۔ سورہ سجدہ میں ہے: اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ (۲۸) ہم مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُمُوا (۲۹)۔ سورہ زمر میں مترفین کے متعلق ہے: فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۳۰) ہم نے انہیں ان کے جرائم کی سزا دی۔ سو دیکھو کہ جن لوگوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی ہے ان کا انجام کیا ہوا۔ سورہ دخان میں خدا کی گرفت (مجرمین کے مواخذہ) کو اس کا انتقام کہا گیا ہے (۳۱)۔

خود سورہ آل عمران کی اگلی آیت میں قانونِ مکافات کے سلسلہ میں واضح کر دیا کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۳۲)۔

کائنات کی پسینوں اور بلندیوں میں کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جب اس کے علم کی وسعت کا یہ عالم ہے تو مجرمین کا کون سا جرم ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ سکے۔ یہاں سے بھی خدا کے ذوالانتقام ہونے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔



اب ہم انجیل کی تاریخ کی طرف آتے ہیں میں نے اسے اپنی کتاب ”مذہبِ عالم کی آسمانی کتابیں“ میں تفصیل سے ساتھ

انجیل کی تاریخ

لکھا ہے لیکن موضوع زیرِ نظر کے تسلسل کے لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ اسے یہاں بھی درج کر دیا جائے قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو کتاب حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل کی گئی تھی اس کا نام انجیل تھا (پہ) لیکن تاریخ اس کتاب کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ یعنی نہ وہ دنیا میں کہیں موجود ہے نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا بیٹی؟ آپ کی تشریف برداری کے بعد چونکہ عام عقیدہ کے مطابق عیسائی آپ کی واپسی کے منتظر تھے۔ (اور اصل بات یہ تھی کہ حواریوں کی انقلاب پسند جماعت پر بڑی پریشانی کا زمانہ گزر رہا تھا) اس لئے انجیل کی ترتیب و تدوین کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سکی۔ بعد میں جب عیسائی کلیسا، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی زدِ گاہ بن گیا تو ان مختلف خیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی روش سے اس زمانہ میں قریب (۳۴) انجیل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ انجیل درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات تھیں جنہیں ان روایات کی روش سے مرتب کیا گیا تھا جو اُس زمانے میں عام طور پر رائج تھیں۔ سچ لکھ لکھتا ہے :-

جب (حضرت مسیح) کے دوست اور شاگرد بپڑھے ہو گئے اور یہ دشلیم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص و روایات کو جو عام طور پر زبان زدِ خلایق تھیں۔ یکجا مرتب کر کے آپ کی سوانح عمری تصنیف کی۔ یہی انجیل ہے۔ (ردال مغرب جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۲)

حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے حواریوں کی زبانِ ادا تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ ان (۳۴) انجیل میں سے (سوائے ایک کے) جواب مفقود ہے، کوئی بھی ادا می زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ اُن کے علاوہ ایک بڑی تعداد اُن خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ ان کی تعداد قریب (۱۱۳) تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (متفقہ ۳۲۵ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار انجیل (متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا) رسولوں کے اعمال، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے خطوط اور مکاشفات یوحنا منتخب کر لئے گئے اور باقی انجیل اور خطوط کو وضعی (اپوکریفہ) قرار دے دیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا اسے عہدِ نامہ جدید کہا جاتا ہے۔ دنیا نے عیسائیت میں یہ مقدس آسمانی کتابیں سمجھ جاتی ہیں۔ چاروں انجیل، حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہیں جنہیں آپ کے حواریوں نے مرتب کیا۔ (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے چل کر آئے گا)۔ ”رسولوں کے اعمال“ آپ کے حواریوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ خطوط وہ ہیں جو مختلف کلیساؤں اور دوسرے لوگوں کے نام تبلیغی طور پر لکھے گئے اور مکاشفات، یوحنا حواری کے مکاشفہ پر مشتمل ہے۔

انتخاب

تبیقہ کی کونسل میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب و غریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روم کے اطراف و جوانب سے دو ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے۔ قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان میں باہمی تطبیق و توفیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل کی جائے۔ کونسل کی بحث و جدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ (۱۷۳۸) مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا (۳۱۸) بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ بالآخر انہوں نے ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر کر رکھ دیا۔ صبح آکر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا گیا اور باقی کتابیں مسترد قرار پا گئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئداد میں مذکور ہے کہ

جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سمارا ہوا تھا جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔

(HISTORICAL VIEW OF THE COUNCIL OF NICAEA. BY REV./SSAC BOYLE.)

یہ ہے عہد نامہ جدید کی مقدس آسمانی کتابوں کے انتخاب کی داستان۔ ان کتابوں میں عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق، متی کی انجیل سب سے قدیم ہے۔ لیکن اس کے متعلق تو یہی متعین ہو سکا ہے کہ اس کا مؤلف کون ہے اور نہ ہی یہ کہ یہ کس سن میں مرتب ہوئی۔ دورِ حاضرہ کی تحقیق کا رجحان اس طرف ہے کہ جس حصہ کا مؤلف حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا اب جو کچھ باقی ہے اس کے مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عہدِ تالیف کے متعلق عام طور پر خیال ہے کہ یہ ۷۰ء اور ۸۰ء کے درمیان مرتب ہوئی لیکن پروفیسر بارنٹ کے نزدیک اس کا زمانہ تالیف ۸۰ء اور ۹۰ء کے درمیان ہے۔ بہر حال، زمانہ تالیف ۸۰ء ہو یا ۹۰ء تاریخ کے صفحات میں اس انجیل کا نشان ۳۰ء سے قبل نہیں ملتا۔ یہ انجیل، یونانی زبان میں لکھی گئی تھی اور محققین کا خیال ہے کہ اس کا عبرانی ترجمہ، جیروم نے ۳۸۰ء میں کیا تھا۔ (اگرچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسے کہیں سے خود عبرانی نسخہ مل گیا تھا)۔

مقرس

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سب سے قدیمی انجیل متی کی نہیں بلکہ مرقس کی ہے۔ جس کا ذکر سب سے پہلے یوسیب نے اپنی تاریخی کلیسا میں چوتھی صدی میں کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مرقس نے (جو یہودی الاصل تھا) ۶۰ء میں اسے لکھا تھا۔

لوتا | تیسری انجیل لوقا کی ہے۔ یہ غیر یہودی مؤرخ تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں

اس انجیل کو مرتب کیا۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے۔ اگرچہ اسے حضرت مسیحؑ کے حواری یوحنا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن تحقیق جدید یہ ہے کہ اس کا مؤلف ایک اور یوحنا تھا۔ جو ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔ اس انجیل میں فلسفہ یونان کی پوری پوری چاشنی موجود ہے۔

ان اناجیل کے متعلق موسیوریناں کی تحقیق اور رائے ہر صاحب نظر کے لئے قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے :-
چونکہ (حضرت مسیح کی تشریف براری کے بعد) لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس لئے انہوں نے مستقبل کے لئے کتابیں تصنیف کرنے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ان کے لئے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ جس (شخصیت) کے متعلق انہیں انتظار تھا کہ وہ اسے ہادلوں کے اندر دوبارہ دیکھیں گے۔ اس تصور کو اپنے آئینہ قلب میں آدیناں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان میں اضافے کرنے یا مختلف انداز سے ترتیب دینے یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی ہلک اور تاثر نہ تھا۔ (حیات مسیح۔ ص ۱۲)

دوسری جگہ مذکور ہے :-

ابتداءً اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی۔ اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی بہت کم تھا۔ (ص ۲۱۴)

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مؤرخ رقمطراز ہے :-

میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گیلی کے ماہی گیر کے فلم کی لکھی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں۔ (ص ۱۴۵)

سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر (W. R. INGE.) اپنی کتاب (THE FALL OF THE IDOLS.) میں لکھتا ہے :-

بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گنہگار تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی۔ (ص ۲۶۱)

مقی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیوریناں لکھتا ہے :-

اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں جیسے متی نے لکھا ہے، تو یقیناً وہ (مسیح) یوحنا کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ (یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر میں فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا تھا)

لوقا کے متعلق ریناں کا بیان ہے :-

اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے۔ اس میں کئی فخرے مڑے

ٹوڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔
ہر چہ اناجیل کے متعلق لکھتا ہے :-

یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ (ص ۲۹)

پھر جیسی کچھ یہ کتابیں ہیں ان میں بھی پند و نصائح کے اقوال ہیں۔ شریعت اور ضابطہ کے قوانین کوئی نہیں۔ موسیٰ و یونس کے قصے :-
(حضرت) مسیح کی تعلیم میں علی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ
نے حتمی طور پر کچھ فرمایا۔ اور طلاق کی ممانعت کی۔ (ص ۲۱۳)



اسی طرح پروفیسر (JOAD) اپنی کتاب (GOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ ”اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے
پریشان کر دیا ہے“ (ص ۳۱۵) میں انکے متعلق بہت کچھ پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سٹر (BEVAN) کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ
ہماری قدیمی اناجیل، سینٹ مرقس اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی (حضرت) عیسیٰ نے پطرس کی وفات سے اڑتالیس
سال قبل جو کچھ کہا اس میں سے جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا وہ بھی الہی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ۔ اس لئے (کلیسا کے فیصلہ سے قطع
نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی
مختصر نویس (شارٹ ہنڈ رائٹر) نے اسے لکھ لیا ہو، یا فولوگرز نے محفوظ کر لیا ہو۔ (ص ۳۲۳)

اناجیل کی تعلیم کے متعلق جو لکھتا ہے :-

سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت) عیسیٰ کی تعلیم افسوس ناک حد تک مبہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء، سربراہ اری۔
استعماریت۔ غلامی۔ جنگ۔ قید و بند (دشمنوں کو) زندہ جلانا یا اورنگز کا لیف دینا، غرضیکہ جس چیز کو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم ثابت
کر سکتے ہیں۔ (ص ۳۳۱)



یہ ہے ان اناجیل اربعہ کی تاریخ تدوین۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جو نسخے پہلی صدی عیسوی کے اخیر تک مرتب
ہوئے یا جنہیں چوتھی صدی میں نیقیہ کی کونسل نے منتخب کیا تھا وہ اب تک موجود چلے آ رہے ہیں۔ دُنیا میں اناجیل کے صرف تین
قدیمی نسخے ہیں۔ ایک وٹیکن میں جس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ غالباً پانچویں یا چھٹی صدی کا ہے۔ اس نسخہ میں غلطی
عقید و جدید کی کتابیں یونانی زبان میں ہیں، لیکن مکمل نہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اُس زمانہ میں بائبل میں
ہوں گی ہی اتنی کتابیں جتنی اس نسخہ میں موجود ہیں۔ باقی کتابیں بعد کا اضافہ ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کا ہے جو آج کل بیشش میوزیم میں ہے۔ اس کے متعلق بھی خیال ہے کہ یہ پانچویں صدی سے پہلے کا نہیں۔ یہ بھی یونانی زبان میں ہے اور ناقص۔

تیسرا نسخہ سینا ہے جو روس کے (سابقہ) پایہ تخت پٹروگرڈ میں تھا اور جسے روسیوں نے انگلستان کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ یہ نسخہ چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انجیل مرقس کا آخری باب جس میں حضرت مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کا ذکر ہے موجود نہیں۔ اس لئے اب رفتہ رفتہ یہ خیال نچتہ ہو رہا ہے کہ یہ قصہ بعد کا اور الحاقی ہے۔



چوتھی صدی میں، جیروم نے ان اناجیل کا ترجمہ یونانی زبان سے لاطینی میں کیا۔ یہی ترجمہ اس انگریزی ترجمہ کا ماخذ ہے جو

ترجمہ | شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں) شائع کیا گیا اور جو ”مستند ترجمہ“ کہلاتا ہے۔ ۱۸۳۱ء میں کنٹربری میں، ۱۸۸۱ء عیسائیت کی ایک مجلس بدین غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ناقص ہے اس لئے ایک اور مستند ترجمہ شائع کیا جائے۔ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ کے ناقص رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں اناجیل کے دو قدیمی نسخے (اسکندریہ اور سینا) دریافت نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس لئے کہ انری تحقیقات نے دنیائے تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس نے ۱۸۸۱ء میں ایک اور ترجمہ شائع کیا جسے (REVISED EDITION) کہا جاتا ہے۔ اس کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ میں متعدد مقامات الحاقی ہیں۔ یہ تو ہے ال ”دو مستند“ ترجموں کے باہمی موازنہ کا نتیجہ۔ لیکن انجیل کے جو نسخے بائبل سوسائٹیز کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کی کیفیت بھی یہ ہے کہ ہر نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن سے، اور ہر نئی زبان میں ترجمہ، کسی دوسری زبان میں ترجمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرمن ڈاکٹر میل نے جب عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے ان کا موازنہ کیا تو انیس ہزار اختلافات شمار کئے۔ اور جان جیمس نے اس سے ذرا زیادہ تحقیق کی تو دس لاکھ اختلافات ابھر کر سامنے آ گئے۔ (مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون (GOSPEL) اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجینز اینڈ ایٹھکس کا مضمون (BIBLE) دیکھئے۔

بائبل کا مفسر، پادری ڈمٹرو جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، لکھتا ہے :-

اناجیل کے لکھنے والوں نے یسوع مسیحؑ کے اقوال کو یونانی زبان میں لکھا ہے۔ حالانکہ وہ (حضرت مسیحؑ) اغلباً امی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کا بتوں کو کبھی یہ خیال آیا ہوتا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے بھی جائیں گی۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط، جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے، اصل میں صرف ان ہی کلیساؤں کے لئے مخصوص تھے جن کے نام وہ لکھے گئے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں ان معنوں میں مقدس نوشتے

نہیں سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔

آگے چل کر یہی مقصد رقمطراز ہے :-

ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہیں کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ الفاظ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرنا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس فقرہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس سے وہ خود متعلق ہوتا۔ ابتدائی عیسائی ہزرگوں کی عبارت اور حوالجات کے علاوہ، عہد نامہ جدید کے قریب چار ہزار (مختلف) نسخے یونانی زبان میں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اختلاف عبارت بہت زیادہ ہیں۔



جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی اسی طرح سولہویں صدی (۱۵۴۵ء تا ۱۵۶۳ء) میں ٹرنٹ (TRENT) کے مقام پر ایک اور عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل میں جو اہم مباحث فیصل ہوئے تھے ان کا اجمالی ذکر اس مقام پر کر دیا جائے۔ یہ بیان اس روئداد سے ماخوذ ہے جسے ریمیس ٹریکیٹ سوسائٹی (لندن) نے شائع کیا تھا۔ اس کونسل میں منجملہ دیگر امور ذیل کی تین اہم باتیں زیر بحث آئی تھیں۔

۱۔ اپوکریفہ کی حیثیت کیا ہے ؟

۲۔ کیا روایات اور اناجیل ہم پلہ ہیں ؟

۳۔ اناجیل کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات ہیں انہیں کس طرح رفع کیا جائے ؟

شق اول کے متعلق اس روئداد میں مذکور ہے :-

اگرچہ اپوکریفہ کتابوں کو جیروم نے بائبل کے دلگیت ایڈیشن میں شامل کر دیا تھا لیکن یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ انہیں مستند نہیں سمجھتا تھا۔ . . . لیکن کونسل میں بحث و تجویس کے بعد (سینٹا کروس کی رائے سب پر غالب آگئی، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ

دلگیت ایڈیشن میں جس قدر کتابیں بھی شامل ہیں انہیں آسمانی کتابیں تصور کیا جائے۔ (صفحہ ۲۷-۲۸)

اسی طرح اپوکریفہ کی جعلی کتابیں آسمانی قرار پا گئیں۔

شق دوم کے متعلق کونسل کے اراکین میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ بحث کے لئے پیش ہوا، اور وہ حصہ پڑھا گیا جس میں درج تھا کہ اناجیل اور روایات کو یکساں تقدس اور عظمت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو برٹنی نے اس کی

مخالفت کی اور کہا کہ اگرچہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ان دونوں کا مصنف خدا ہی ہے۔ کیونکہ سچائی جو بھی ہو اس کا سرچشمہ وہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ بھی سچ ہے وہ سب الہامی ہے (مزید برآں) یہ حقیقت کہ بہت سی روایات اب استعمال میں نہیں رہیں اس امر پر دال ہے کہ خدا کا یہ قطعاً منشاء نہ تھا کہ انہیں تقدس و عظمت میں اناجیل کا ہم پلہ سمجھا جائے۔ (۱۹) لیکن اس کے خلاف مخالفت کا ایسا سیلاب اُمڑا کہ اس بیچارے کو معافی مانگنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ جو کچھ بھی فیصلہ ہو گا وہ اسے تسلیم کرے گا۔ چنانچہ یہی قرار پایا کہ روایات کو وحی کا ہم پلہ سمجھا جائے۔

شق سوم کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ اس قدر مختلف نسخوں کا وجود اناجیل کے معانی کو غیر متیقن کر دیتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ایک متفق علیہ نسخہ شائع کر دیا جائے جسے مستند سمجھا جائے۔ (۲۰) چنانچہ یہ طے ہوا کہ چھ ارکان پر مشتمل ایک اور کمیٹی متعین کی جائے جو دنگیٹ کے مختلف نسخوں سے ایک متفق علیہ نسخہ مرتب کرے۔ (۲۱) PALLYICINT کا بیان ہے کہ اس کمیٹی نے ایک طویل رپورٹ پیش کی جس میں اغلاط و اختلافات کی لمبی چوڑی فہرست درج تھی۔ اس کثافت کے ڈھیر کو کوئی بیلاب ہی صاف کر سکتا تھا۔ (۲۲) اس کمیٹی نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد ایک نسخہ مرتب کیا لیکن وہ پورپ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے یہ کام علماء کی ایک مجلس کے سپرد کیا۔ اس کے جانشین (PIOUS - V) نے بھی اس ہم کو جاری رکھا اور بالآخر ۱۵۹۲ء میں ایک نسخہ شائع ہوا۔

اس مستقل مزاج پوپ نے نہ صرف اپنے گرد و پیش بڑے بڑے علماء اور نقاد کی جماعت جمع کی۔ بلکہ خود بھی بڑے جذب شوق سے اس کام میں متہمک ہو گیا۔ اس نے پریس میں بھیجنے سے پہلے اس نسخہ کو حرف بحرف خود دیکھا۔ دوران طباعت میں اسے دوبارہ دیکھا۔ جب چھپ کر آیا تو اسے پھر دیکھا اور اس کی تصحیح کی۔ اس کے بعد اسے مستند قرار دے کر شائع کیا گیا۔ لیکن ابھی یہ نسخہ شائع ہوا ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں اس سے زیادہ صحیح ایک اور نسخہ شائع کیا گیا۔ ان دونوں نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے۔ اس کے بعد ۱۵۹۳ء میں ایک اور نسخہ شائع ہوا جو ۱۵۹۶ء والے نسخہ سے بھی مختلف تھا۔ ڈاکٹر جیمس نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں قریب دو ہزار اختلاف نظر پڑے جن میں بعض آیات پوری کی پوری ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اور بہت سی آیات ایک دوسرے سے متضاد تھیں۔ بایں ہمہ

ان دونوں نسخوں کو کیساں طور پر مستند تصور کیا گیا۔ (۳۳-۳۴)

غور فرمایا آپ نے کہ اناجیل کے ”مستند“ نسخے کس طرح وجود میں آتے رہے۔ یہی مستند نسخے تھے جن کا انگریزی شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں ہوا۔ اور جسے پھر ۱۸۸۱ء میں ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا گیا۔ سوچئے کہ اس آخری نسخہ کو (جو پھر ہرنئے ایڈیشن کے وقت بدلا جاتا ہے) جناب حضرت مسیحؑ کی انجیل سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے؟ حال ہی میں (غالباً ۱۹۶۱ء میں)

بائبل کا ایک جدید انگریزی ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ یہ ماڈرن انگلش (جدید انگریزی زبان) میں ہے۔ سابقہ انگریزی ایڈیشنوں کی خاص زبان تھی — جسے ”بائبل زبان“ کہا جاتا تھا۔



ان اختلافات یا غلطیوں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دورِ حاضرہ کی پیداوار ہیں؟ یہ تو اناجیل کی تالیف کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے۔ مشہور نقاد (CELSOS) قریب سنہ ۱۸۰ء میں لکھتا ہے کہ

دانشہ تحریف عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں میں دیدہ دانشہ فریب کا لانا انداز سے رد و بدل کر ڈالا ہے۔

اس تحریف والہ حلق کے انداز کیا تھے؟ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ عام طور پر ناخواندہ تھے۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ (MOSHEIM) اپنی تاریخ کے حصہ اول (پہلی صدی) باب ۱۸ میں لکھتا ہے:۔
یہ تمام شاگردِ تعلیم سے بے بہرہ اور فلسفہ اور دیگر علوم سے نا آشنا تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اناجیل کے اصل نسخے ان کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ (اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موجود نسخے جو ان حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں دراصل ان کی تالیف نہیں ہیں (کیونکہ وہ تو تعلیم سے بے بہرہ تھے)۔ لیکن اس تحریف اور تغیر و تبدل کی اس سے کہیں گہری وجہ ایک اور تھی۔ یہ وجہ کیا تھی؟ اسے غور سے سنیئے! سینٹ پال (موجودہ عیسائیت کا بانی) انجیل (خطوط پال) میں لکھتا ہے:۔

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کتنا ہنگاموں کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا۔ (رومیوں کے نام ۱: ۱۰)

جھوٹ کی ”عظمت“ غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا عقیدہ ہے؟ اگر جھوٹ بولنے سے ”خدا کی بڑائی“ ظاہر ہوتی ہو تو بلا شک و شبہ جھوٹ بولنے جب جھوٹ کا دروازہ اس طرح چوڑا کھول دیا جائے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے، ظاہر ہیں۔ (MOSHEIM) چوتھی صدی کے متعلق لکھتا ہے:۔

مذہبی صداقت اور پاکبازی کو ان دو خطرناک جماعتوں سے سخت ٹھیس لگی جو اس صدی میں عام طور پر مروج ہو چکی تھیں۔ اول یہ عقیدہ کہ اگر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے کلیسا کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہو تو یہ کذب فریب بڑے ثواب کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ عقیدہ ایک عرصہ سے مروج چلا آتا تھا اور اس نے اس اندلوس بے شمار مضحکہ انگیز روایات، افسانہ طرائیاں اور

مقدس فریب (عیسائیت میں داخل کر کے) رکھ دیئے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کھلے بندوں کر لینا ہو گا کہ اس صدی (چوتھی صدی) میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں اور بڑے بڑے مقدس ولی بھی اس دروغ بافی اور کذب تراشی سے بُری نہ تھے۔

اور اس کا ثبوت ان کی تحریروں سے اور ان کے کارناموں سے باسانی مل سکتا ہے۔ بہمانہ جی چاہتا ہے کہ اس الزام سے کم از کم بڑی بڑی مقدس ہستیوں (مثل فلاں اور فلاں) کو تو مستثنیٰ قرار دے دیں۔ لیکن کیا کیا جائے! سچائی ان بزرگوں کی عقیدت سے کہیں زیادہ قابل احترام ہے اور سچائی کا نقصان ہے کہ انہیں بھی اس الزام کا مورد قرار دیا جائے۔

(چوتھی صدی - حصہ دوم - باب پہلے)

یہی مؤرخ تیسری صدی کے متعلق لکھتا ہے :-

جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ نیکبوں میں دوسروں سے سبقت لے جائیں وہ اس چیز کو نہ صرف جائز ہی سمجھتے تھے بلکہ قابل تحسین بھی کہ

نیک کے مشن کو تصنع اور فریب سے تقویت دی جائے۔ (حصہ دوم - باب پہلے)

اسے نظر انداز نہ کیجئے کہ لکھنے والا کوئی غیر عیسائی نہیں بلکہ عیسائیوں کی دنیا کا ایک بہت بڑا مؤرخ ہے جس کی تاریخ کلیسا ایک مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ اوپر چوتھی اور تیسری صدی کا ذکر آچکا ہے۔ اب دوسری صدی کو لیجئے :-

نلاطونی اور فیثاغورثی مسک کے پیرو، صداقت اور نیکی کے مشن کو، جھوٹ اور فریب کے فروغ دینے کو نہ صرف جائز، بلکہ قابل

تائیس خیال کرتے تھے۔ جو یہودی مصر میں رہتے تھے، انہوں نے (حضرت مسیحؑ سے پیشتر ان لوگوں سے یہ اصول مستعار لے

رکھے تھے۔ جیسا کہ ازمنہ قدیم کی بے شمار متنازعات سے صاف طور پر ثابت ہے۔ عیسائیوں نے اس اصل کو ان دونوں

محرثوں سے حاصل کیا جیسا کہ ان کی تصانیف و کتابوں سے ظاہر ہے جنہیں تصنیف کسی نے کیا اور منسوب کسی اور کی طرف

ہیں۔ (حصہ دوم - باب پہلے)

اس سے بھی پیچھے چلئے اور پہلی صدی کی حالت دیکھئے :-

(حضرت مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے تھوڑا عرصہ بعد آپ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق بہت سی سیرت کی کتابیں لکھی

گئیں جو مقدس فریبوں اور عجوبہ نگاریوں سے بھرپور تھیں۔ یہ کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں جن کی شاید نیت تو خراب نہ

تھی لیکن ان کی تحریروں سے سخت ادھام پرستی اور جہالت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہیں پر پس نہیں۔ بہت سے فریبکاروں نے

خود کتابیں لکھیں اور انہیں مقدس حواریوں کی طرف منسوب کر کے دنیا کے حوالے کر دیا۔ (پہلی صدی - حصہ دوم - باب پہلے)

اندازہ فرمائیے کہ اس مقدس جھوٹ نے جسے سینٹ پال نے بہت بڑا کارِ ثواب قرار دیا تھا، کیا کیا گل کھلائے۔ اور یہ سلسلہ پہلی صدی

لے کم و بیش پچاس انجیلیں آج بھی ایسی موجود ہیں جنہیں اپوکریف کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اصل سمجھ کر مقدس آسمانی خیال کیا

جاتا ہے۔ ان کی اصلیت کے متعلق بھی آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

ہی سے شروع ہو گیا۔ مندرجہ صدر اقتباسات صرف پہلی چار صدیوں کے متعلق ہیں اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ اسی سے لگایے۔ ان ہی حقائق کے پیش نظر خود عیسائیوں کے علماء اب اس امر کا اعلانیہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اناجیل ناقابل اعتبار ہیں۔ انگلیکن چرچ کا بشپ (CHARLES GORE) لکھتا ہے :-

سینٹ کر وٹم کی طرح میرے لئے بھی اس امر کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے متبر ہیں

(THE HOLY SPIRIT AND THE CHURCH)

یہ ہے انجیل کی داستان خود عیسائی مؤرخین، مفکرین اور پادریوں کی زبانی۔ اس سلسلہ میں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ قرآن کریم میں کتب سابقہ (توریت۔ انجیل وغیرہ) کے سلسلہ میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے: ”مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“ (جیسا کہ آیت ۳۳) میں بھی آیا ہے)۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے کتنی بڑی گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو آیت (۳۳) میں پیش کیا گیا ہے اور جس کی تفصیل مطالب جلد دوم زیر آیت (۳۳)۔ ص ۱۸۲ پر دی گئی ہے۔ قرآن جمیع محرف کتابوں کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ انبیاء علیہ السلام کو جو تعلیم دی گئی تھی وہ اُسے سچ کر دکھاتا ہے۔



آیات (۳۳-۳۴) میں قانون مکافات عمل کا ذکر تھا۔ اگلی آیت میں ایک مثال سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں کیا تعلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ہر عمل کا نتیجہ اس عمل کے سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ بڑا غیر محسوس ہوتا ہے اس لئے اس کے مال (انجام کار) — نتیجہ) عمل اور اس کی نتیجہ خیزی کا دیکھنا تو ایک طرف وہ قبل از وقت ان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا۔ وہ نتیجہ آہستہ آہستہ نشو و نما پاتا ہوا آگے بڑھتا ہے تاکہ ایک دن وہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ اب ان کو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس غیر محسوس آغاز کا انجام کیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ اس تمام دوران میں وہ نتیجہ مضمر (LATENT OR POTENTIAL) ہوتا ہے اور آخر الامر (ACTUALISE) ہو کر محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ فرمایا :-

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۵)

۷ قانون مکافات عمل کی توضیح و تشریح کے لئے انڈکس دیکھئے (جو جلد سوم کے آخر میں ملحق ہے)۔

خدا وہ ہے جو جرثومہ تولید کو رحم مادر میں آہستہ آہستہ نشوونما دیتا ہوا محسوس پیکر عطا کر دیتا ہے۔ اس طریق کار کے لئے قوت اور حکمت دونوں درکار ہوتی ہیں جو خدا کو بدرجہ اتم حاصل ہیں۔

اس مثال کی جامعیت پر غور فرمائیے۔ مادہ تولید کو یوں تو ایک قطرہ کہا جاتا ہے لیکن وہ درحقیقت قطرہ بھی نہیں بلکہ ایسا جرثومہ (CELL) ہوتا ہے جسے برہنہ آنکھ (NAKED EYE) دیکھ ہی نہیں سکتی، اسے خوردبین کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا اُس وقت کوئی اس کا تصور تک بھی کر سکتا ہے کہ اس جرثومہ کے اندر پورے کا پورا انسان اپنی جملہ صلاحیتوں کو لئے چھپا بیٹھا ہے؟ جس طرح انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ اسے بھی اپنے حیطہ خیال میں نہیں لاسکتا کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال بھی ایک دن تباہی و بربادی کا جہنم بن کر اس کے سامنے آجائے گا۔

قرآن کریم نے اپنے اس اسلوب بیان اور اندازِ تفہیم و افہام کو اگلی آیت میں بڑی جامعیت سے بیان کیا ہے۔ یہ آیت بڑی اہم ہے لیکن ہمارے ہاں کے (اکثر) مفسروں اور مترجموں نے اسے غلط معنی پہنا کر ایسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں جن سے خدا کی اس کتاب عظیم کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ آیت یہ ہے :-

﴿۳﴾ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۳)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ اور دوسری متشابہات جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑ رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مقہوم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ”ہمارا ان پر ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں“ اور سچ یہ ہے کہ کس چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ (تفہیم القرآن - جلد اول - ص ۲۳۳۔ از ابوالاعلیٰ مودودی (رحم))

اشرف ایڈیشن

لہ انسانی تخلیق۔ اس کی صورت پذیری اور نظریہ ارتقاء کے لئے جلد سوم کے آخر میں انڈکس دیکھئے۔ صَوْنِ کُم کی مزید شرح متعلقہ مقامات میں سامنے آئے گی۔

اس ترجمہ کے نیچے یہ تشریح دی گئی ہے :-

آیات کا غلط مفہوم | مشابہات۔ یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ (ایضاً)

اس تشریح کی روش سے کہا یہ گیا ہے کہ قرآن مجید میں (معاذ اللہ) ایسی آیات بھی ہیں جن کے مفہوم میں "اشتباہ" (شک و شبہ) ہے۔ یہ اس کتاب کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۱۶)۔ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں ریب و تشکیک (شک و شبہ۔ اشتباہ) کی کوئی گنجائش نہیں۔ مودودی مرحوم نے سورہ بقرہ کی آیت (۲) متعلقہ ذبح بقرہ کی تشریح کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اس آیت کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔"

(تفہیم القرآن - جلد اول ص ۸۷) - ایڈیشن ۱۹۵۱ء

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن کریم کو) کتاب مبین (نہایت واضح کتاب) کہہ کر پکارا ہے اور یہاں تک فرمادیا کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَةَ (۱۶)۔ اس کی وضاحت ہم نے خود کی ہے کیونکہ ایسا کرنا ہمارے ذمہ تھا۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین کی اس قسم کی غلط نگہی تھی جس نے قرآن کریم کے متعلق غیر مسلموں کے لئے اعتراضات کے دروازے کھول دیئے۔ دورِ حاضر کے تشریقین میں (ARTHUR J. ARBERRY) کو عام طور پر کشادہ نگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے بھی آیت (۱۶) کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے :-

THE BOOK WHEREIN ARE VERSES CLEAR AND OTHERS AMBIGUOUS

(THE KORAN INTERPRETED VOL : 1. P. 73)

لیکن جب ہم خود کہیں کہ قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں اشتباہ کی گنجائش اور ابہام ہے، تو آبرسی وغیرہ کو کس طرح مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ قرآن مجید کی جن آیات کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہ آئے، بجائے اس کے کہ انہیں مشتبہ یا مبہم قرار دیا جائے، اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے علم کی سطح ہنوز اتنی بلند نہیں کہ ہم اس کے مفہوم کی رفعت تک پہنچ سکیں۔ یہ قرآن کا "نقص" نہیں کہ اس کے حقائق اتنے بلند اور اس کے اسرار ایسے عمیق ہیں۔ یہ نہ تو ہمارے علم و ادراک کی کوتاہی ہے جو ہم ان تک پہنچ نہیں پاتے۔

تری نگاہ نہ دو مایہ ماتھ ہے کوتا
ترا گتہ کہ نخبیل بلند کا ہے گناہ ؟

اب ہم آیت (۱۶) کی طرف آتے ہیں۔ مگر پہلے حسب ذیل الفاظ (بلکہ اصطلاحات) کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

۱۔ محکمات ۲۔ مشابہات ۳۔ ام الکتاب اور ۴۔ تاویل

محکمات (۱) محکمات۔ اس کا مادہ (ح۔ ک۔ م) ہے۔ اَلْحَكْمَةُ گھوڑے کی نگام کو کہتے ہیں۔ بلکہ گھوڑے کو نگام

دے کہ اس کے دونوں جٹروں کو اس طرح کس کس باندھنے کو کہ وہ ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ اس حکم سے مراد ہوتی ہے کسی شے کی حدود اس طرح متعین کر دینا کہ اس کا اہل مقام نمایاں طور پر سامنے آجائے۔ ایسی شے کو مُحْكَم کہاں گے۔ لہذا، محکمیت وہ آیات ہوں گی جن کے الفاظ کے معانی متعین ہوں۔ مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے: حُرِّمْتُ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ (۲)۔ ”تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں“ اس میں لفظ اُم (جمع اقبات) کے معنی ماں کے ہیں جو بالکل واضح اور متعین ہیں بلاسی مادہ سے حکمت، حکم، حکومت۔ وغیرہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ ان کے مفہوم کے لئے تیسری جلد کے آخر میں انڈکس دیکھئے۔ یہاں ہم صرف محکمیت کے لفظ تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔

(۲) تَشَابُه کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور مانند اور مشابہ ہونا۔ اَلشَّيْءُ وَالشَّيْءُ کے معنے ہیں مثل اور مانند۔ تشبیہ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا۔ مُشَابَهَت کے معنے ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا۔ تشبیہات، تمثیلات (PARABLES) استعارات کے الفاظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں۔

لہذا، محکمیت وہ آیات ہوں گی جن میں الفاظ کے (LITERAL) معانی لئے جائیں۔ اور متشابہات وہ آیات جن میں مجازی معانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ابھی سامنے آتی ہیں۔

(۳) ام الکتاب۔ ام (۱-م-م) کے حقیقی (محکم) معنی ماں کے ہیں۔ یعنی جس کے بطن سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مجازی طور پر اس کے متعدد معانی ہیں۔ ان میں سے ایک معنی کسی شے کی اصل، بنیاد، جڑ کے ہیں۔ سورہ النساء کی آیت: حُرِّمْتُ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ (۲)۔ ”تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں“ میں ام کا لفظ اپنے حقیقی معانی میں آیا ہے لیکن ام الکتاب میں اس کا مفہوم مجازی ہے۔ یعنی کتاب کی اصل، اساس، بنیاد۔ جڑ۔ یہاں کتاب کی ان آیات کو جن سے اس کی غرض و غایت، مقصود و منہی، اصل و اساس کے سامنے آتی ہے، ماں کے تشبیہ دے کر، ام الکتاب کہا گیا ہے۔ یعنی (پہلے) میں لفظ اُم کے حقیقی اور مجازی معانی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ عربی زبان بڑی وسیع ہے اور اس میں مرادفات بڑی کثرت سے ہیں۔ اس لئے اس میں مجازی معانی کا انداز عام ہے۔ تفصیل اس کی ”مفہوم القرآن“ کے ابتدائیہ میں ملے گی۔

(۴) تاویل کا لفظ ہمارے ہاں اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے۔ قرآنی آیات کو کھینچ کر ان کے اپنے مفید مطلب معانی متعین کرنا۔ ایسا کرنا معیوب و مذموم ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک شرک ہے۔ قرآنی آیات کا مفہوم وہی لینا چاہیے جسے خود قرآن نے متعین کیا ہے خواہ وہ آپ کے مفاد (حتکہ آپ کے عقیدہ و مسلک نظر سے)

تاویل

کے مطابق ہو یا اس کے مخالفت۔ پہلے سے کوئی عقیدہ یا خیال قائم کر کے، قرآن کی طرف اس مقصد کے لئے رجوع کرنا کہ اس سے آپ کے عقیدہ یا خیال کی تائید ہو جائے (خواہ وہ عقیدہ یا خیال باطل ہی کیوں نہ ہو) شرک ہے۔ اس لئے تاویل کا یہ مفہوم فی الواقعہ معیوب اور مذموم ہے۔ لیکن عربی زبان اور قرآن کریم میں اس کا یہ مفہوم نہیں۔ ان میں اس کا مفہوم ہے کسی بات کا مال۔ انجام۔ آخری نتیجہ۔ مثلاً سورہ النساء میں اسلامی نظام کے بنیادی عناصر (اللہ۔ رسول اور اہل الامر کی اطاعت) کی وضاحت کرنے کے بعد کہا: ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۲۵۷)۔ یہ روش سب سے بہتر ہے اور تم دیکھو گے کہ آخر الامر اس کا نتیجہ کیسا اچھا برآمد ہوتا ہے۔ دوسری طرف، دین کو کھیل تماشے سمجھنے والوں کے متعلق کہا کہ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ (۲۵۸)۔ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا ہے لیکن یہ اپنی روش سے باز نہیں آتے۔ یہ درحقیقت اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی اس روش کا مال اور آخری نتیجہ ان کے سامنے آجائے۔ (لہذا، کوئی زیر نظر میں تاویل کے معنی - ULTIMATE REALITY) ہوں گے۔ کنہ و حقیقت۔ ماہیت و کیفیت۔

ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب آئیے زیر نظر (پل) کی طرف جیسار میں نے پہلے کہا ہے یہ آیت بڑی اہم ہے لیکن اس کے غلط مفہوم نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کی تشریح پوری وضاحت سے کی جائے۔ جن اتفاق سے یہ وضاحت (میری تصنیف) لغات القرآن میں (مادہ ح۔ ک۔ م کے تحت) شرح دسبط سے کی گئی ہے۔ اس جگہ اس کا ملخص پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ اسے پورے غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔

قرآن کریم میں انسانی راہنمائی کے لئے قوانین و ضوابط دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو۔ جیسا کہ حُرِّ مَتَّ عَلَيْكُمْ اَمْهَنْتَكُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے۔

اس قسم کی آیات مُحْكَمَاتٌ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قُلَان میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اُس عالم سے ہے جو ہماری سرحد ادراک سے باہر ہے۔ مثلاً

اللہ کی ذات اور اس کی صفات۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور اس میں اعمال کے نتائج۔ وہاں کی جنت اور جہنم۔ یا انسانی زندگی کا منتہی اور مال۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرّد حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کو جب بھی بیان کیا جائے گا تشبیہ و استعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائے گا۔ یعنی ان کا بیان (SYMBOLICALLY) ممکن ہو گا۔ مثلاً اللہ کے متعلق

کہا گیا ہے: ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (۲۵۵)۔ وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ اور كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۲۵۶)۔ اس کا عرش پانی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْشٌ سے مراد لکڑی یا کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں۔ نہ ہی مَاءٌ سے مراد پانی ہے۔ یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور

مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ لہذا، یہ آیات مُتَشَابِهَاتُ ہیں۔ یعنی ایسی آیات جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالم محسوسات سے باہر کے ہیں ان کی حقیقت، کنہ، ماہیت، یعنی ان کی تَأْوِيلُ۔ یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے بس کی بات نہیں۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غور و فکر سے ہم ان کے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے۔ مثلاً لفظ عَرْشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا مفہوم قوت و اقتدار (AUTHORITY OR CONTROL) ہے۔ یا کَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ میں مَاءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱)۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کس طرح عمل میں لانا (EXERCISE کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (LIFE) کو کس طرح پیدا کیا۔ ان باتوں کی کنہ و حقیقت کو ہم نہیں پا سکتے۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہم علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے: وَمَا أَوْتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۰)۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کا تعلق ہماری ذات اور ان کی تمدنی زندگی سے ہے ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے: وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲۴)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور بٹھا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جاتا۔ یہ لوگ ان مآواءِ العقل حقائق کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کے لئے نظری موٹسکافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرنے رہتے ہیں اور اسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو پست قرار دے کر آسمان کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ اور ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کہہ کر پکارنا ہے۔ یعنی وہ جو عقل و فکر سے کام لے کر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم رکھتا ہے اس لئے ان کے حقائق (TRUTH) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ لیکن ہم ان کی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے۔ یعنی ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“

بھی۔ لیکن خدا ان کی کثرت و حقیقت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اس صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے ۲۶ یا ۴۵)۔

بعض الفاظ کے حقیقی معانی کس طرح فتنہ کا موجب بن جاتے ہیں اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کریم میں ہے :

خدا کے لئے اعضاء انسانی کے الفاظ اَدَلُّكُمْ يَذُرُّوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلْتُمْ اٰيٰتًا اٰنْعَامًا (۱۳۱) ”کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے موشیوں

کو کس طرح اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا؟“ یہاں خدا کے لئے ”یذُرُّوْا“ (ہاتھ) کا لفظ آیا ہے۔ سورہ مومنون میں حضرت نوحؑ کی کشتی سازی کے سلسلہ میں ہے : ”فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنْ اصْنَعْ الْفُلَکَ بِاَعْيُنِنَا (۲۳۶)“۔ ہم نے نوحؑ کی طرف وحی کی کہ وہ ہماری آنکھوں کے تحت کشتی بنائے۔“ یہاں خدا کے لئے ”عین“ (آنکھ) کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح سورہ الطور میں حضور نبی اکرمؐ سے ارشاد ہوا : ”وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّکَ ۚ فَاَنْتَکَ بِاَعْيُنِنَا (۲۵۶)“۔ تم احکام خداوندی پر جم کر کھڑے رہو۔ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔“ یہاں بھی خدا کے لئے ”عین“ کا لفظ آیا ہے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں (ید) یا (عین) کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں گے۔ یعنی دست قدرت اور زیر نگرانی۔ سچ مچ کے ہاتھ اور آنکھیں مراد نہیں لی جائیں گی۔ لیکن ابتغاء فتنہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ہاں دو فرقے وجود میں آ گئے۔ ایک تجسیمیہ اور دوسرا تنزیہیہ۔ تجسیمیہ خدا کو مجسم قرار دیتا ہے اور تنزیہیہ اسے مجسم و شکل و صورت سے منکر تسلیم کرتا ہے۔ ان دونوں میں جس انداز کی سر پھٹول ہوتی رہی ہے تاریخ کے ادراک اس پر شاہد ہیں حالانکہ اس تمام بحث کا فیصلہ قرآن مجید کی ایک آیت کی رد سے ہو سکتا تھا جس میں کہا گیا ہے :

وہ مثالوں سے بھی بلند ہے لَيْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۲۵۶) ”اس کی مثل کوئی شے نہیں“۔ یعنی اس کے متعلق کوئی مثال بھی دی جائے گی تو اس (مثال) کے الفاظ کے بھی حقیقی معنی نہیں لئے

جائیں گے۔ مجازی مفہوم ہی لیا جائے گا۔ ذات خداوندی تو ایک طرف اس کی توصفات کا بھی یہ عالم ہے کہ ”سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ“ (۱)۔ ”یہ لوگ خدا کی صفات بھی جن الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ ان سے منکر و مبرا اور بلند و بالا ہے“ لہذا، ان الفاظ کو بھی حقیقی معانی میں نہیں لینا چاہیئے۔ مجازی معانی میں لینا چاہیئے۔ وہ سمیع و بصیر ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا انسانوں جیسا نہیں۔ سعدی کے الفاظ میں ۔۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم در ہر چہ گفتہ ایم دشنیدیم و خواندہ ایم

قرآن کریم نے اس کی اس طرح وضاحت کر دی لیکن ابتغاء فتنہ (فتنہ جوئی) ہے کہ تجسیمیہ اور تنزیہیہ فرقے پیدا کر رہی ہے !

تجسیم قرآن کریم کے ان الفاظ کے حقیقی معنی لے کر خدا کو ایک محسم کی شکل دے دیتے ہیں۔ اس باب میں وہ کس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ہم نے اوپر عرش کے متعلق بات کی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے :-

عرش خداوندی آسمانوں پر | رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (۱) : (۲)

یا (۳) سال کی راہ ہے۔ اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اس قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھڑوں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

یہ نتیجہ ہوتا ہے آیات متشابہات کے الفاظ کے حقیقی معانی لینے کا۔ انہیں تشبیہات کے رنگ میں بیچے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ مُتَشَابِهَاتٌ میں ایسے حقائق (احکام نہیں حقائق) بھی شامل ہیں جنہیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی عقلی سطح کے مطابق یا ہر زمانہ کا انسان اپنے اپنے زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ یہ قرآنی حقائق کے سمجھنے کا طریق

مختلف عقلی اور عقلی سطح رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ہو سکتا نہ ابدی۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لئے یا ایک سطح کے انسانوں کے لئے ہی مفید ہو سکتا تھا۔ باقی انسانوں کے لئے بیکار ہوتا۔ اس قسم کی کتاب کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت ہو تاکہ ہر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وہ خاصہ ہے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے اندر ایسی وسعت رکھتے ہیں کہ اس سے ہر انسان اپنی اپنی سطح علم و عقل کے مطابق مستفید ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے : سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَكْبِتُوْنَ لَهُمْ اَنْتَهُ الْحَقُّ (۱)۔ ہم انہیں عالمِ نفس و آفاق میں اپنی آیات (نشانیوں) دکھاتے جائیں گے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے۔ ہم عالمِ نفس میں آیات خداوندی کی بات اپنے مقام پر کریں گے۔ سر دست عالمِ آفاق (خارجی کائنات) کو بیچئے۔ اس میں کتنے حقائق ہیں جو زمانہ نہ بدلے قرآن میں تو ایک طرف ابھی کل تک انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ عصر حاضر کے سائنسدانوں نے ان میں سے کئی ایک کو منکشف کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ

خارجی کائنات کے حقائق

سائنسدان، حقائق کائنات کو وضع یا ایجاد نہیں کرتے۔ وہ انہیں صرف منکشف کرتے ہیں۔ یعنی ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا دیتے (DISCOVER)

ہیں۔ قرآن کا اعلان ہے کہ روز کائنات میں سے جو لازمی بے نقاب ہو کر سامنے آئے گا وہ اس کے کسی نہ کسی دعوئے کی صداقت کا ثبوت ہوگا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لئے ایک الگ مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر ہم ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ سورہ الشوریٰ میں ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنَّ دَاكِبَةً وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (۳۲)۔ آیات خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموت (زمین اور دیگر اجرام فلکی) کو پیدا کیا اور ان دونوں میں ذی حیات مخلوق کو پھیلا دیا۔ پھر وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی وقت اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ان دونوں (زمین اور اجرام فلکی) کو بلا دے۔ آپ سوچئے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں تو ایک طرف آج سے چند سال پہلے تک انسان اس کا تصور بھی کر سکتا تھا کہ زمین اور اجرام فلکی میں اس طرح رابطہ پیدا ہو جائے گا کہ چاند کی سطح انسانوں کی سبگاہ بن جائے گی! فضا نوردوں (SPACE CONQUERERS) نے آج اسے حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ باقی رہا قرآن کا یہ دعویٰ کہ اجرام فلکی میں بھی ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق ہے، سو سائنسدان اس کے امکانات کے بھی قائل ہو رہے ہیں اور اس کے لئے ان کی تلاش جاری ہے۔

ان انکشافات سے پہلے، قرآن کریم کی اس آیت (۳۲) کا شمار متشابہات میں ہوتا تھا۔ اب یہ محکمات کے زمرہ میں آگئی۔ لیکن اسی حد تک کہ زمین اور اجرام فلکی میں باہمی رابطہ پیدا ہو سکتا ہے اور ان میں ذی حیات مخلوق کے امکانات ہیں۔ یہ رابطے جن قوانینِ فطرت کی رو سے پیدا ہوتے ہیں، وہ وجود میں کس طرح آئے تھے اور اب کس قوت کے زور پر کار فرما ہیں، اس کا حقیقی علم خدا ہی کو ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کہ کُلُّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۶)۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رہا ہے۔ اور سورج کے متعلق ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۷)۔ سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک فلکیات کے متعلق قدیم بطلمیوسی نظریہ رائج تھا، اجرام فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذہن انسانی میں آ نہیں سکتا تھا۔ جب بعد میں کوپرنیکیس کا نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کس طرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرم گردش ہیں۔ اسی طرح جب ہر شے کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کس مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ جب تک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات مُتَشَابِهَات کی فہرست میں شامل تھیں۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات محکمات کے زمرے میں

داخل ہو گئیں۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کے لئے محکمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کے لئے یہ متشابہات ہی میں داخل ہیں۔ جب تک یہ آیات متشابہات کے زمرے میں تھیں ان کی حقیقت (تأویل) کا علم خدا کو تھا جب یہ محکمات کے ذیل میں آگئیں تو ان کی حقیقت ”سَاسِیْحُونِ فِی الْعِلْمِ“ پر بھی منکشف ہو گئی۔ اسی بناء پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۶)۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو: فَسْئَلُ جِبَہِ خَبِيرًا (۲۷)۔ اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے۔ جب تک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جس نے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کر دیا ہے۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائے گا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خیر ہو جائیں گے۔

لہذا، محکمات و متشابہات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے محکمات و متشابہات ہونے کے مختلف مفاہیم۔ لیکن محکمات ہوں یا متشابہات تمام

آیات اپنی اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالمیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اسی لئے سورہ ہود میں ہے: کَتَبْنَا مُحْكَمًا لَا يَأْتِيهِ غَيَرٌ (۱)۔

قرآن کی تمام آیات محکم ہیں

یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی حامل ہے۔ اس کے حقائق غیر متبدل اور اس کے اصول تغیر ناپذیر ہیں جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے ان کی حقیقت بھی غیر متبدل (مُحْكَمٌ) ہے۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات محکمات ہیں۔ جو آیات ہمارے لئے ہنوز متشابہ ہیں خدا کے نزدیک وہ بھی محکم ہیں۔

اس کے برعکس سورہ زمر میں پوری کتاب کو مُتَشَابِهًا کہا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیْ نَزَّلَ الْحَدِیْثَ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیً (۲۶)۔ لیکن یہاں متشابہ کا لفظ مُحْكَمًا کے مقابلہ میں استعمال ہوا بلکہ مَثَانِیً کے مقابلہ میں استعمال

”مَثَانِیً“ ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آئینے کے آئینے کی طرح ہیں۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز

متشابہات مثنائی کا مفہوم

جائیں۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اس کی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں (نور و ظلمت) باہم مگر مثنائی ہیں۔ اس طرز پر بیان سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفر کا خیال ہے کہ اشیاء پہچانی ہی اپنی اضداد سے جاتی ہیں)۔ لیکن اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم میں متضاد باتوں

کا بیان ہے۔ اس کے متعلق اللہ نے کہہ دیا کہ نہیں۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں (۳۶)۔ اس کی تمام آیات باہم گرد ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں۔ مثلاً: (متضاد اشیاء کو آمنے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ لہذا، قرآن کریم کی آیات مثلاًئی ہونے کے باوجود مُتَشَابِهٌ ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کُنَّا بِأَمْثَلِ شَيْءٍ مِّثْلَيْهِ ہے۔ یا یوں کہیے کہ مُتَشَابِهٌ وہ اسلوب بیان ہے جس میں حقائق کو ملنے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نُورٌ وَهُدًی) اور مثلاًئی وہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اس کی ضد لاکر بات واضح کی گئی ہے۔ میں نے بتویب القرآن میں اعداد کا فلسفہ اور قرآنی اعداد کی فہرست پیش کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد اس آیت (۳۶) کا وہ مفہوم دیکھئے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا ہے۔ اس میں وہ حقیقت سمٹ کر آجاتی ہے جسے گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے :-

آیت ۳۶ کا مفہوم | اس خدا نے، جس کا قانون، کائنات میں اس طرح کا فرما ہے، انسانوں کی راہنمائی کے لئے

یہ ضابطہ حیات بھیجا ہے۔ اس میں ایک حصہ تو وہ ہے جو مستقل اقدار، قوانین اور احکام پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ اصل ضابطہ کی اصل و بنیاد ہے۔ ان امور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر لفظ اپنے متنفس معانی سامنے لے آتا ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو ان حقائق پر مشتمل ہے جو مادی کائنات سے ماوراء ہیں (مثلاً خدا کی ذات یا حیات اخروی وغیرہ)۔ ان حقائق کو سمجھانے کے لئے، انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سو جن لوگوں کے دل، حق کی راہ چھوڑ کر، دوسری طرف جھک جاتے ہیں۔ جو کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ محض فتنہ پیدا کرنے کے لئے ان الفاظ کو پکڑ لیتے ہیں جن سے ان حقائق کو تشبیہ دی گئی ہے (مثلاً خدا کے اقتدار اور کنٹرول کے لئے عرش کا لفظ، اس کے علم کی وسعت کے لئے کرسی کا لفظ)۔ وہ یہ تو ان الفاظ ہی کو اصل و حقیقت قرار دیتے ہیں (مثلاً یہ کہ خدا سچ بچ ایک تخت کے اوپر بیٹھا ہے)۔ اور یا، یونہی، قیاسات کی رُوسے ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی کوشش کرنے ہیں (مثلاً یہ کہ خدا کی ذات کی اصل و حقیقت کیا ہے) اور ایسا کرنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یاد رکھیے، ان میں بعض حقائق تو ایسے ہیں جن کی ماہیت اور حقیقت صرف خدا ہی جانتا ہے۔ البتہ یہ بات، عقل و بصیرت کی رُوسے سمجھ آ سکتی ہے کہ ان کے بیان کرنے سے مقصود کیا ہے۔ اور بعض حقائق ایسے ہیں جن کی حقیقت انسانی علم کی سطح کے بلند ہونے سے سامنے آ سکتی ہے (۳۶) — لیکن انہی لوگوں کے سامنے جو مسلسل غور و تدبیر اور محنت و شاقہ سے علم میں پختگی حاصل کرتے جائیں۔

ان لوگوں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان تشبیہی امور کے متعلق ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے حقیقت

کا بیان ہے اور اس کے بعد غور و فکر سے علی حد بشریت، ان حقائق کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں (۳۶)۔



اگلی آیت میں مغرب کے (مادہ پرست) سائنسدانوں اور قرآنی (الاسخون فی العلم) علم میں پختگی حاصل کرنے والوں) میں بنیادی فرق بتایا گیا ہے۔ مغرب کے (مادہ پرست) سائنسدانوں کا مسلک یہ ہے کہ حقائق کائنات کو منکشف کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے اور پھر ان قوتوں کو اپنے گروہ یا اپنی قوم کے مفاد اور تعمیر و استحکام، اور دوسری قوموں کی تخریب و تضعیف کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ان کے برعکس قرآنی سائنس دانوں (الاسخون فی العلم) کا مسلک یہ ہے کہ ان قوتوں کو ہدایتِ خداوندی (وحی کی راہنمائی) کے مطابق عالمگیر انسانیت کی تعمیر و بلوبیت کے لئے استعمال کیا جائے۔ ان کی دعائیں (آرزوئیں یہ ہوتی ہیں کہ)

[۳/۴] رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (۳)

بارالہا! ہمارے قلوب (جذبات و رجحانات) قرآنی راہنمائی کے بعد کسی اور طرف نہ جھک جائیں اور ہماری صلاحیتیں اسی کی روشنی میں ہر دمند ہوں۔ یہ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اس کی صحیح منزل کی طرف راہنمائی تنہا عقل کی مدد سے نہیں مل سکتی۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی عقل، وحی خداوندی کی روشنی میں کارفرما ہو۔ وہ وحی جو حضراتِ انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتی تھی۔ انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی۔

یہ وہی اولی الالباب (اربابِ علم و بصیرت) ہیں جن کے متعلق اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے :-

إِنَّمَا فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَا يَتَّبِعُ إِلَّا دَلِيلَ الْإِلَهِ الَّذِي يَنْزِلُ إِلَيْهِمْ قِيَامًا وَ قُعُودًا ۖ أَذْ عَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ مِنْ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ سُبْحَنَكَ فَقَدْ عَدَّ ابْنُ النَّاسِ (۱۸۹-۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی پیدائش اور دن رات کی گردش میں قوانینِ خداوندی کی حکیمیت اور ہمہ گیری کی بڑی عظیم نشانیاں ہیں۔

ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے، لیٹے، قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیق و ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت پکاراٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگاہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے تیری ذات، اس سے بہت بلند ہے اور یہ بات تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض و غایت، یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب

کہ زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

ان ارباب علم و بصیرت کی مزید دعائیں آیات (۱۹۳-۱۹۱) کے ضمن میں سامنے آئیں گی۔

آیت (۲۱) میں جن الراسخون فی العلم کا ذکر آیا ہے ان کا اعلان یہ ہے کہ

[۲۱] رَبَّنَا أَنْتَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۲۱)

یہی وہ خدا کی راہنمائی ہے جس کی روش سے انسان اپنے اختلافات چھوڑ کر ایک نقطہ پر جمع ہو سکیں گے۔ یہ اس انقلابی دور میں ہو گا جس کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو گا، اور خدا کے قوانین اٹل ہیں۔

اس دنیا کے علاوہ انسانوں کا اجتماع، اخروی دنیا میں بھی ہو گا، جس کا تشبیہی بیان قرآن میں آیا ہے لیکن انسان اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتا — لیکن اس کی کیفیت اور حقیقت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کے واقع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اس اجتماع کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے مابین اس دنیا میں نزاعی معاملات ہوں گے وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے اور ان کے دلوں کے اندر چھپے ہوئے خیالات اور نیتیں تک بے نقاب ہو جائیں گی۔

(اُخروی زندگی اور یوم قیامت کے لئے جلد سوم کے آخر میں اندکس دیکھئے)

ان کے برعکس :-

[۲۲] إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ (۲۲)

جو لوگ کافر ہوں، ان کی صداقت سے ان کا کمال نہ ہوگا، اپنے لئے دوسری روشنی اختیار کر لیں تو اس سے انہیں کتنے ہی مفاد و عاقل (مال اور اولاد وغیرہ کی کثرت) کیوں نہ حاصل ہو جائیں، غلط روش کے تباہ کن نتائج سے وہ کبھی نہیں بچ سکیں گے۔ ان کی بیدار روش فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کا موجب بنتی ہے، جس میں وہ خود بھی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھی بھی۔ نیز نفسیاتی اضطراب کی وہ آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴)۔

”وقود الناس“ کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول ص ۳۲۸۔ آیت (۲۲)۔

آیات (۸۹-۸۳) میں لوگوں کے جس اجتماع اور جہنم کی آگ کا ذکر ہے اس سے مراد حق و باطل کے وہ تصادمات بھی ہیں

جن کی آخری زدگاہ، جنگ کے میدان ہوتے ہیں۔ یا مخالفین کی وہ تباہی جو دیگر طریقوں سے اس دنیا میں واقع ہو جاتی ہے۔ اسے (تاریخی مثال کے ذریعے) اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

[۳۱] كَذَّابِ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَاۙ فَلَحْظَ هُمْ اِلٰلَہُ بِذُنُوْبِهِمْ
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۳۱)

اس حقیقت پر تاریخ کے ادراک شاہد ہیں (مثلاً) تم قوم فرعون، اور اس سے پہلی قوموں کے طور طریق پر غور کرو، اور ان لوگوں کے انجام کو دیکھو۔ انہوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا اور اپنے لئے دوسری راہیں اختیار کر لیں، تو ان غلط راہوں کے عواقب نے انہیں آن پکڑا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خدا کا قانون مکافات، مجرمین کا پیچھا کس شدت سے کیا کرتا ہے۔

ذنب کے معنی | اس آیت میں ذنوب (واحد ذنب) کا لفظ تشریح طلب ہے۔ اس کے عام معنی تو جرائم ہیں لیکن بعض مقامات پر یہ اس سے مختلف معانی میں بھی آیا ہے، چونکہ اس کے غلط مفہوم سے بہت سی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے اس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

”الذَّنْبُ“ جانور کی دم کو کہتے ہیں۔ اس سے اس کے معنی سریشے کے آخری حصہ یا انجام اور نتیجہ کے بھی لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا سب سے اہم مفہوم جس کے لئے یہ عام طور پر قرآن کریم میں آیا ہے، جرم (جمع جرائم) ہے۔ اس لفظ (ذنب) کو جرم کے معنوں میں استعمال کرنے سے اہل عرب کی ذہانت اور باریک بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک اُن پڑھ قوم زبان کے معاملہ میں اس قدر صاحبِ فراست کس طرح ہو گئی؟ قانون مکافات عمل کی رو سے، کوئی مجرم کہیں چلا جائے، وہ اپنے جرم کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس کا جرم اسی طرح اس کے پیچھے لگا (بلکہ چپکا) رہتا ہے جس طرح جانور کی دم۔ جانور کہیں چلا جائے اس کی دم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس سے اس زبان میں ذنْبُ کا لفظ جرم (ذنب، جرائم) کے لئے آتا ہے۔ آئینہ زیرِ نظر (۳۱) میں ذنوب کا لفظ انہی معانی میں آیا ہے اور شدید العقاب نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ عقاب کے معنی کسی چیز کے پچھلے حصے یا کسی کا پیچھا کرنے کے ہیں۔ اسی سے عاقبت، عقبی وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں۔

اس اعتبار سے ذنْبُ اور عقاب کا مفہوم ایک ہی ہے، یعنی جرائم اور ان کا نتیجہ۔

چونکہ دم (ذنب) ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اس لئے ان اتہامات کو بھی ذنوب کہا جاتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے لگا دیے جائیں جس طرح الْفَقْوَةُ دم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔

لہذا، قرآن کریم میں ذنْبُ (جمع ذنوب) کا لفظ جہاں گناہ یا جرم کے لئے آیا ہے وہاں (بعض مقامات پر) تہمت اور

الزام تراشی کے لئے بھی آیا ہے جو کسی کے خلاف یونہی عائد کر دیئے جائیں۔ یا (بالفاظ صحیح) اس کے پیچھے چپکا دیئے جائیں۔ بنا بریں قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے گا، سیاق و سباق اور قرآن کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں متعین کیا جائے گا کہ اس کے معنی جرائم کے ہیں یا جھوٹی تہمت اور الزامات کے۔

(مثلاً) سورہ الفتح میں حضور نبی اکرمؐ کے متعلق ہے :-

سورہ الفتح کی تشریح | اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِيُعْصِيَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّرَ مِنْ دُونِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (۴۸)
اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے :-

ہم نے تمہیں یہ فتح میں اسی لئے عطا کی ہے تاکہ اللہ تیرے وہ گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں یا جو اس کے بعد سرزد ہوں معاف کر دے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ و دیگر مترجمین)

اس ترجمہ کی رو سے یہ بحثیں چل نکلیں کہ کیا حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی گناہ سرزد ہوتے تھے، بالخصوص حضور نبی اکرمؐ سے! اسے عصمت انبیاء کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذنب کے اس مفہوم کی رو سے، خود حضور نبی اکرمؐ کے گناہوں کو (معاذ اللہ) ثابت کیا جانا اور پھر خدا کی اس نوازش بے پایاں کا (فخر و مباہلات کے ساتھ) تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے اس نے حضورؐ کے سب (اگلے پچھلے گناہ) معاف کر دیئے تھے۔ اس سے جب دل میں غلش پیدا ہوئی کہ حضرات انبیاء کرامؑ سے معصیت خداوندی (گناہ) کس طرح ممکن تھی، تو اس کے جواز میں عجیب و غریب دلائل پیش کئے گئے (مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کہا :-

مودودی مرحوم کی توجہ | میرا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اس لئے ان سے لغزش کا صدور اس بناء پر نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی

وقت ان سے غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بناء پر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں — خدائی صفات کے حامل نہیں۔

رسائل و مسائل حصہ چہارم سسٹا ایڈیشن ۱۳۵۵

جو کچھ مودودی مرحوم نے کہا ہے غور فرمائیے کہ اس سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے؟ اقول تو یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ سے اگر لغزشیں صادر نہیں ہوتی تھیں تو اس میں ان کی سیرت و کردار کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لغزشیں صادر ہونے نہیں دیتا تھا۔ سو چئے کہ اگر صورت یہی تھی تو پھر رسول اللہؐ کی زندگی کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے؟ جس ہستی سے خود خدا لغزش نہ ہونے دے، اس کی زندگی ان انسانوں کے لئے کس طرح نمونہ بن سکتی ہے جن کی لغزشوں

سے حفاظت خدا نہ کرتا ہو۔

دوسرے یہ کہ مودودی (مرحوم) کے الفاظ میں کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان سے لغزشیں سرزد کرا دیتا تھا! (معاذ اللہ صد باد معاذ اللہ)۔ سو چئے کہ اس سے حضرات انبیاء کرامؑ کو کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا! ان لغزشوں کے ذمہ دار وہ خود نہیں ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے یہ لغزشیں سرزد کرا دیتا تھا۔ لوگ ان لغزشوں کو دیکھتے تھے اور انہیں بہر حال اپنی کی لغزشیں قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کے پاس اس بات کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ان لغزشوں کے ذمہ دار وہ نہیں خدا ہے۔ جتنکہ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے! کس قدر (معاذ اللہ) مجبوری تھی خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی!

نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے تو ان سے لغزشیں سرزد کرا دیتا تھا اور پھر ان کی مغفرت کا سامان کراتا تھا! باقی رہی وہ مصلحت جس کے لئے انبیاء کرامؑ سے یہ لغزشیں صادر کرائی جاتی تھیں۔ یعنی یہ کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ وہ انسان ہیں، خدائی صفات کے حامل نہیں۔ سوا اول تو حضور نبی اکرمؐ باریا ر اعلان فرماتے تھے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ دوسرے یہ کہ مخالفین اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ بشر ہی ہیں۔ جانتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کی بشریت کے خلاف اعتراض بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مَا لَ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْسُكُ فِي الْأَسْوَاقِ (۲۵)۔ ”یہ کس قسم کا رسول ہے؟ کہ عام انسانوں کی طرح کھانا پیتا بھی ہے اور بازاروں میں گھومتا پھرتا بھی۔“ ان واضح حقائق کی موجودگی میں لغزشیں صادر کرنا یہ ثابت کرانے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ بشر ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ ذنب کے غلط مفہوم نے کس قدر الجھنیں پیدا کر دیں! اصل یہ ہے کہ گناہ یا جرم احکام خداوندی کی دانستہ خلاف ورزی (معصیت) کا نام ہے۔ اور اس قسم کی معصیت حضرات انبیاء کرامؑ سے سرزد نہیں ہوتی تھی۔ تدبیری امور میں بعض اوقات کسی مقصد کا وہ جانا اور بات ہے۔ اسے نہ لغزش کہا جاسکتا ہے نہ معصیت یا ذنب (جرم)

ان تصریحات کے بعد آئیہ زیر نظر (۴۸) کی طرف آئیے۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کی نبوت کے آخری

زمانے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دے کر کہا کہ یہ عظیم فتح اس لئے دی جا رہی ہے کہ تم ان تمام اتہامات سے ہری الذمہ ہو جاؤ جو تمہارے مخالفین تمہارے

سورہ الفتح کی تشریح

خلاف عائد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور آئندہ عائد کریں۔ مخالفین شروع سے کہتے چلے آ رہے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ نبی نہیں کاہن ہیں۔ شاعر ہیں جو لوگوں کو سب باغ دکھا کر انہیں درغلالتے رہتے ہیں۔ یہ جس قسم کی مملکت اور حکومت کے وعدے کرتے ہیں وہ ایک بھی پورا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ

نے کہا کہ یہ عظیم فتح جس سے مخالفین کی کمر ٹوٹ گئی ہے ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو۔ آخر الامر کون سچا ثابت ہوا۔ اب انہیں آئندہ بھی ایسے الزامات عائد کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ یہ ہیں اس آیت میں ذنب کے معنے۔ باقی رہی مغفرت سوا اس کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم ص ۲۸۶۔ زیر آیت (۸) دیکھیے۔



اس کے بعد آجائے پھر سورہ آل عمران کی طرف۔ آیات (۹-۳۱) کی تشریح میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں ”لوگوں کو جمع“ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اخروی زندگی بھی ہے اور اس دنیا میں حق و باطل کے تصادمات کی آخری منزل بھی جہاں شکر و کفر کا آمناسا منا ہوتا ہے یا دیگر طریقوں سے حق کے مخالفین کی تباہی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے قوم فرعون کی تباہی کا ذکر کیا گیا اور اس کے بعد اس ٹکراؤ کا جو بدر کے میدان میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلے کہا۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتْغْلِبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَيُؤْتَسِرُ الْمُهَادِرُ (۳۱)

جو لوگ اس نظام خداوندی کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں اے رسول! تم ان کے سامنے یہ تاریخی شواہد پیش کرو اور اس کے بعد انہیں متنبہ کر دو کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تمہاری دہر بادی کے جہنم کی طرف جٹکائے جاؤ گے۔ (اے کاش یہ جانتے کہ وہ زندگی کتنی بُری ہوگی)۔

ہم نے جو کہا تھا کہ ”جامع الناس“ سے مراد اسی دنیا میں تصادمات بھی ہیں تو اس کی وضاحت ”سَتْغْلِبُونَ“ نے کر دی۔ یعنی عنقریب تم مغلوب و مغتور ہو گے۔ آیت (۳۱) میں (جو آگے آئی ہے) اس کی شہادت پیش کر دی۔ لیکن اس آیت تک آنے سے پہلے لفظ ”تُحْشَرُونَ“ کی تشریح ضروری ہے کیونکہ اسی سے حشر کا لفظ آتا ہے۔ اس کے بنیادی معنے ”لوگوں کو جمع کر کے“ ہاں کہ کسی طرف لے جانے کے ہیں۔ اس میں جمع کرنے، اٹھانے،

حشر کے معنی

ہانکنے اور کسی طرف لے جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں حشر (حشر) سے مراد یوم قیامت لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اخروی زندگی کے علاوہ اسی دنیا میں لشکر کشی اور نبرد آزمائی کے لئے بھی آیا ہے۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ نے جب بادئی نمل کی طرف لشکر کشی کی ہے تو فرمایا: وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنَّةِ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۱)۔ سلیمانؑ کے لشکر میں شہروں کے مہذب باشندے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شامیوار سب اکٹھے ہو گئے اور انہیں ٹریننگ کے لئے روک کر رکھا گیا: یہاں حشر کا لفظ عسکری اجتماع کے لئے آیا ہے۔ جب یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا ہے تو اس سلسلہ میں سورہ حشر میں ہے: هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ

وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا لِلْحَشْرِ (۹۹) "اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی پہلے حشر کے لئے ان کے گھروں سے نکال باہر کیا" یہ ان کی پہلی دفعہ کی اجتماعی جلا وطنی تھی۔ (ان کی دوسری جلا وطنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی تھی)۔ ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ لفظ حشر اخروی زندگی کے اجتماع کے لئے ہی نہیں آتا۔ اس دنیا میں اجتماع کے لئے بھی آتا ہے۔ شاہ دلیؒ اللہ نے حجتہ البالغہ کتاب الفتن میں یہ دونوں مفاہیم بیان کئے ہیں۔ دیکھئے نقاش القرآن۔ مادہ (ح۔ ش۔ ر) ص ۵۵۔ آیت (۳۲) میں تحشر ول کا لفظ اپنی معانی میں آیا ہے اور اس کی شہادت اگلی آیت میں سامنے آتی ہے جہاں کہا:۔

﴿۳۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِتْنَتِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا فِتْنَةً لِّقَاتِلِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ تَرَىٰ أَنَّهُمْ مُّثَلِّفِيهِمْ رَءَايَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنُصْرِهِ مَن يُشَاءُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ (۳۲)

اس کی ہلکی سی جھلک، تم اس تصادم میں دیکھ چکے ہو جو (ابھی ابھی) بدر کے میدان میں تم، دونوں جماعتوں کے درمیان ہو چکا ہے۔ ایک گروہ، نظام خداوندی کی اقامت کے لئے شمشیر بکف تھا، اور دوسرا گروہ مخالفین کا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے مخالفین کی جماعت بہت زیادہ تھی، (لیکن چونکہ جماعت مؤمنین ایک عظیم مقصد کے لئے میدان جنگ میں آئی تھی، اس لئے اس کے حوصلے بڑے بلند تھے۔ وہ دشمن کے اس گروہ کثیر کو زیادہ سے زیادہ اپنے سے ٹکنا محسوس کرتے تھے اس لئے کہ اپنے سے دگنی تعداد پر کامیابی کا انہیں بہر حال یقین تھا) (۳۲)۔

جنگ بدر کی طرف اشارہ

چنانچہ انہیں فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح، قانون خداوندی کی تائید ان لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے جو صحیح رہنمائی پر چل کر اس کی تائید کو حاصل کر لینا چاہیں جو لوگ

انہیں رکھتے ہیں انہیں اسی ایک واقعہ سے سبق حاصل کر لینا چاہیے کہ ان کی مخالفت کا انجام کیا ہوگا (۳۲-۳۵)۔

جنگ بدر کی تفصیلات سورہ انفال میں دی گئی ہیں اور جو کچھ آیت (۳۲) میں کہا گیا ہے وہ انہی تفصیلات کے پس منظر میں سمجھ میں آسکتا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ جب ہم ان آیات پر پہنچیں تو اس آیت (۳۲) کو بھی ان کے ساتھ ملا لیا جائے اور اس طرح اس جنگ کا پورا نقشہ سامنے آجائے۔ یہاں یہ اصولی بات بتائی گئی ہے کہ حق کی علمبردار جماعتوں کو فتح و نصرت کیوں حاصل ہوتی ہے اور جو حق پر نہ ہوں وہ خاسر و نامراد کیوں رہتے ہیں۔ فرمایا:۔

﴿۳۳﴾ نَرْثِي لِلنَّاسِ حُبَّ الشَّهَادَةِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرَ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلَ الْمُسَوَّمَةَ وَالْأَنْعَامَ وَالْحَرْثَ ۚ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ

عِنْدَكَ حُسْنُ الْمُنَاقِبِ ۝ (۳)

ان دونوں جماعتوں میں جو بنیادی فرق ہے اس کے لئے ایک اصولی بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ انسانی زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں بے شمار پسندیدہ اور خوشنما چیزیں ہیں جو ان کے لئے وجہ جاذبیت ہیں۔ مثلاً بیوی بچوں کی محبت، چاندی سونے (مال و دولت) کے ذخیرے۔ چُپے ہوئے عمدہ گھوڑے۔ مال، مویشی، کھیتی باڑی وغیرہ۔ انسان ان کی طرف کھینچتا

ہے۔ یہ بڑی بات نہیں۔ خدا نے انہیں حرام قرار نہیں دیا
دنیاوی جاذبیتوں اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ (۲۳)۔ لیکن ان ہی چیزوں کو مقصودِ حیات اور منتہا ہے

زندگی سمجھ لینا غلط ہے۔ یہ صرف انسان کی طبعی زندگی کا ساز و سامان ہیں (جو لوگ انہی کو مقصودِ حیات سمجھ لیتے ہیں وہ کسی بڑی قدر اور اصول کی خاطر جان دینا تو ایک طرف، ذرا سی تکلیف گوارا کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جہتِ مؤمنین ہے جس کا ایمان یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور اس کا ساز و سامان مقصودِ حیات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ بلند مقصد ہے انسانی ذات کی نشو و نما جو مستقل اقدار کے تحفظ سے جڑی ہے۔ اس لئے جب دنیاوی مفاد اور بلند اقدار میں تصادم ہوتا ہے (۲۴) تو وہ بلند اقدار کی حفاظت کے لئے دنیاوی مفاد کو بطیب خاطر قربان کر دیتے ہیں اور (یوں) اس بلند مقام کو پا لیتے ہیں جو حقیقی زندگی کے لئے بڑا ہی خوشگوار اور حسین ہے۔

قرآن کریم نے دنیاوی زندگی کے ساز و سامان۔ مل و متاع۔ متاع و اسبابِ شگہ اشیائے زریب و زینت کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تعدی سے کہہ دیا کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الْمَرْئِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ كَذَلِكَ نَفْصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۲۴) (اے رسول! تم ان مسک خائفانِ ہدیت کے پیروکاروں سے پوچھو کہ) وہ کون ہے جو ان زریب و زینت کی چیزوں کو اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو حرام قرار دینے کا اختیار رکھتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ چیزیں اس دنیا کی زندگی میں مؤمنین اور دوسروں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں (اور ہمارے قانونِ طبعی کے مطابق) جن کا جی چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ (۲۵) اس وقت ان کے حاصل کرنے کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں (۲۶)۔ لیکن زندگی کے نئے انقلابی دور میں یہ بلا حزن و شقت حاصل ہوں گی۔ جہاں تک اخروی زندگی کا تعلق ہے وہاں یہ اہل جنت کے لئے مختص ہوں گی۔ صرف اس دنیا کی زندگی کو منتہی سمجھنے والے اپنا حصہ یہیں حاصل کر لیتے اور ختم کر دیتے ہیں (۲۷)۔ بایں ہمہ جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی سامان کشش و جاذبیت اور مستقل قدر (حق) میں ٹکراؤ واقع ہو جائے تو اس وقت مستقل قدر کی حفاظت کے لئے دنیاوی علائق کو قربان کر دینا ایمان ہوگا (اس میں جان تک بھی آجاتی ہے)۔ اس اصول کے لئے، انڈکس (ملحقہ جلد سوّم) میں ”دنیا اور آخرت“ کا عنوان

دیکھئے۔ اس سلسلہ میں سورہ توبہ کی آیت (۹۶) پر بھی غور کیجئے اور سوچئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ فرمایا :-
 قُلْ رِبَّنَا اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَنْزَلْنَاهُمْ وَاَعْلَيْنَاكُمْ وَاَمَّا اَمْوَالُهُمْ فَاَتَتْهُمْ مِمَّا هُمْ
 وَتَجَارَعَتْ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنْ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِيْ
 سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِ يَّوْضَعُ وَاَللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹۶)۔

اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہل خاندان اور مال و دولت جو تم کھاتے
 ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے
 کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسول (نظام خداوندی) اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ عزیز
 ہو گئی، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تاکہ قانونِ خداوندی کی رو سے، اس کے ظہور نتائج کا وقت
 آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، اور ہر اذہر نکل جائے۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں مال اور اولاد، ان کے لئے فتنہ (سنار کی بھٹی یا دعویٰ ایمان کے پر کھنے کی کسوٹی) بن جاتے ہیں:

وَاَعْلَمُوْا اَنَّهٗمْ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۲۵ ذ ۲۶) تم اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ

مال اور اولاد فتنہ

(انفرادی مفاد کے مقابلہ میں انسانیت کے مفاد کلی کو اپنا نصب العین قرار دینے کے راستے میں

سب سے بڑی رکاوٹ، مال اور اولاد کی کشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی کشش تم پر غالب آگئی تو یہ چیز تمہاری تباہی کا موجب بن
 جائے گی۔ لیکن اگر تم نے ان کی کشش و جاذبیت کے باوجود، انسانیت کے مفاد کلی کو ترجیح دی، تو تم اس کٹھالی میں سے کنڈ
 بن کر نکلو گے اور دیکھو گے کہ نظامِ خداوندی کی طرف سے اس کا کس قدر عظیم بدلہ ملتا ہے۔ بیوی بچے بیشک اپنے اندر کشش و
 جاذبیت کے باوجود اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ لیکن جب کبھی اس کشش، اور محبت اور بلند اقدارِ خداوندی میں تضاد ہو
 تو اس وقت اس کشش کو ان اقدار کے راستے میں روک نہیں بن جانا چاہیئے (۲۵ ذ ۲۶)۔ اسی صورت
 میں یہ بیوی بچے فتنہ ہی نہیں بلکہ تمہارے دشمن بن جاتے ہیں۔ فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَنْفُسِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ
 وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوٌّ لَّكُمْ (۲۷)۔ اسی لئے وارننگ دے دی کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ فَاَمْوَالُكُمْ وَلَا
 اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۸)۔

اے جماعتِ مؤمنین! دیکھنا۔ تمہاری کیفیت یہ نہ ہو جائے کہ مال اور دولت اور اولاد کی محبت تمہیں قوانینِ خداوندی کے

اتباع سے غافل کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اس سے انہیں سخت نقصان پہنچے گا۔

جو لوگ دنیاوی سامانِ نیست کو اصل و مقصود سمجھ لیتے ہیں ان کے متعلق کہا :-

۳
۱۳

قُلْ أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ ذِكْرًا لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِدَّةَ سَبْعٍ مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
الْأَنْفُسُ خَلْدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ مُبْصِرٌ بِالْعِبَادَةِ (۱۵۴)

بے رسل! ان سے کہو کہ آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسی چیز کا نشان بتاؤں جو اس تمام ساز و متاع سے کہیں بہتر ہے۔ یعنی شگفتگی اور شادابی کی ایسی زندگی جس کی بہاروں پر کبھی غزاں نہیں آسکتی۔ جس میں تمام رفقاء (انہی کی طرح) پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں ہر قدم، قانونِ خداوندی کی سہم آمنگی میں اٹھتا ہے یعنی کتاب اللہ کے مطابق (۱۵۴-۱۵۳)۔ یہ زندگی ان سعادت مند لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت رکھتے ہیں۔ اور ملتی ہے ان کے اعمال کے بدلے میں جو خدا کی نظروں کے سامنے سہتے ہیں۔

جنت اور اس کی تفصیل۔ نیز ازواج (واحد زوج) کے مفہوم کے لئے جلد سوم کے آخر میں اللہ کس دیکھئے۔ اور رضوان من اللہ کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۲۶ زیر آیت (۱۵۴) دیکھئے۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ ”رضوان من اللہ“ قرآن مجید کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ (۲۸-۲۶) سے ظاہر ہے۔ نیز (۱۵-۱۴) سے۔ مندرجہ بالا آیت میں بصیر بالعباد کہا گیا ہے۔ یعنی ”خدا کے بندے“۔ اب ان عباد کی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں :-

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا آمَنًا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۵۳)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشو و نما دینے والے کے ضابطہ قوانین کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی کوشش اور آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تمام غلط باتوں کے اثرات سے محفوظ رہیں جو مخالفین ان کے پیچھے چپکا دیتے ہیں تاکہ ان کا دامن ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر نہ رہ جائے اور وہ اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو تعمیری مقاصد میں صرف کر کے، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ و قید نیران معمولی لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے بھی جو لڑہنی اتفاقاً یا سہواً سرزد ہو جاتی ہیں۔ (۲۸۹-۲۹۰) د (۱۵۳)۔

اس آیت میں ذنوب کا لفظ پھر آیا ہے اس کا مفہوم آیت (۱۵۴) کے تحت واضح کیا جا چکا ہے۔ الزامات اور اتہامات کے علاوہ اس میں وہ معمولی لغزشیں بھی آجاتی ہیں جو مؤمنین سے سہو و خطا کی بنا پر سرزد ہوں (۱۵۴)۔ جیسا کہ سورہ النجم میں کہا گیا ہے: الَّذِينَ يَخْتَابُونَ كُتُبَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْقَوَاعِشَ إِلَّا اللَّكَمَ (۱۵۴)۔ ”مؤمن تمام بڑے بڑے جرائم سے محتسب رہتے ہیں۔ البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی نادانستہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو قابلِ ملامت ہو (۱۵۴)۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ اس کی خود اصلاح کر لیتے ہیں (۱۵۴)۔ اور ان کے اعمالِ حسنہ کے تعمیری نتائج ان کی اس قسم کی معمولی لغزشوں سے پیدا ہونے والے

نقصانات کی تلافی کر دیتے ہیں (۳۱۶)۔ یہی مغفرت سے مراد ہے (دیکھئے جلد دوم ص ۲۸۶۔ آیت ۲۸) اور انکار کے لئے جلد اول ص ۳۲۶ آیت ۲۸)۔

اگلی آیت میں ان عباد اللہ (مؤمنین) کی مزید صفات کا بیان ہے۔ فرمایا :-

الْصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُتَّعِفِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (۳۱۷)

یہ لوگ، اپنے نصب العین پر ثبات و استقامت سے جھے رہتے ہیں اور ہر نفلت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

اپنے دعوائے ایمان کو عملاً سچ کر کے دکھاتے ہیں۔

ہر وقت، قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو اپنی کے مطابق صرف کرتے ہیں۔

اپنی محنت کے حاصل کو، نوع انسان کی پردریش کے لئے کھلا رکھتے ہیں، اور اپنے ہر ہرپ و گرام کو مشروع کرنے سے پہلے

اس امر کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے پاس پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے۔ دشمن سے بچاؤ کے لئے بھی، اور خود

اپنے دل میں پیدا ہونے والے خدشات کی مدافعت کے لئے بھی۔

اس آیت میں صَبْر (الصابرین) کے لئے دیکھئے (مطالب الفرقان جلد دوم ص ۲۲۲ آیت ۲۵)۔ اِنْفَاق (المتقین) کے لئے۔

جلد اول ص ۱۵۱ آیت ۲۸)۔ اور مغفرت (المستغفرین) کے لئے جلد دوم ص ۲۸۶ آیت ۲۸)۔

صَدَق (مادہ ص - د - ق) کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ ایسا وسیع المعنی کہ اس کی وسعت، لغات القرآن کے قریب چھوٹی

میں بھی بیشکل سما سکتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ لفظ کذب (جھوٹ) کی ضد ہے اور جب انسان

کا دل اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کذب کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے صدق کے معنی ہوں گے قلب اور

زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا۔ اس کے عام معنی سچ کئے جاتے ہیں لیکن عربی زبان تو بڑی وسیع اور

عمیق ہے۔ ان کے ہاں صدق کے بنیادی معنی قوت کے ہیں اور یہ لفظ سچ کے لئے اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ سچ میں قوت

ہوتی ہے اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس لئے آپ دیکھ لیجئے کہ صادق اور صدیق کا مفہوم کیا ہوگا۔ صَدَقَ اور صَدَّقَ

کے معنی ہیں جو کچھ زبان سے کہا جائے اسے سچ کر دکھایا جائے۔ ان ہی کو صادقین کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے جلد سوم ص ۱۵۲-۱۵۳

زیر آیت (۳۱۷) دیکھئے اور جھوم جھوم چلیے۔

قَانِتِينَ (مادہ ق - ن - ت) کے بنیادی معنی ہیں کسی دعوے کو لے کر کھڑے ہو جانا۔ اُسے قائم کر دینا اور گرنے سے

روک دینا۔ القنوت کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا۔

قَانِتِينَ

لیکن ان معانی کے لئے تو اور الفاظ بھی (عربی زبان اور قرآن مجید میں) آتے ہیں۔ پھر قانتین کی خصوصیت کیا ہے؟ یہ نکتہ غور طلب

ہے۔ اپنے میزبیل کمیٹی کی ان کاٹریوں کو دیکھا ہوگا جو سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتی ہیں۔ ان میں پانی بھرا ہوتا ہے اور ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں چھڑکاؤ کرنا مطلوب ہوتا ہے ان کا کارک کھول دیا جاتا ہے اور ان میں سے بقدر ضرورت پانی نکلتا چلا جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں سَقَائِرُ قَدِیْتُ اس مشکیزے کو کہتے تھے جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ جہاں ضرورت ہو صرف وہیں اس کا منہ کھلے۔ لہذا اس کا جامع مفہوم ہے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور انہیں صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو الْقَنُوتُ کہتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ مردِ مؤمن یا جماعتِ مؤمنین کی کیسی منفرد اور منفعت بخش خصوصیت ہے۔

مستغفرین بالاسحار | اب آئیے مستغفرین بالاسحار کی طرف۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے صبح کے وقت اٹھ کر استغفار کرنا۔ استغفر اللہ ربی کی تسبیح پڑھنا، مغفرت کے معنی آپ دیکھ چکے ہیں۔ استغفار کے معنی ہیں مغفرت طلب کرنا، حفاظت چاہنا، سامانِ حفاظت طلب اور ہتیا کرنا۔

السَّحَرُ کے معنی ہیں ہر چیز کا کنارہ۔ اس اعتبار سے رات کے آخری حصہ کو سَحَرُ کہتے ہیں۔ یا صبح سے ذرا پہلے کا وقت۔ چونکہ اس سے دن کا آغاز ہوتا ہے اس لئے ابتدائے کاروبار کے وقت کو بھی سَحَرُ کہتے ہیں۔ جس کی جمع اسحار ہے۔ زیرِ نظر آیت میں یہی مفہوم زیادہ موزوں ہے۔ نہیں یہ لوگ (مؤمن) اپنے پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے سامنے پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے۔ اگر اسحار سے مراد صبح کا وقت بھی لے لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ ہر صبح، آغازِ کار سے پہلے اس امر کا جائزہ لے لیتے ہیں کہ اس دن کے پروگرام کے سلسلہ میں پورا پورا سامانِ حفاظت موجود ہے۔ الفاظ کے ان معانی کی رُو سے، مؤمنین کی خصوصیت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یوں تو مؤمنین کی خصوصیات قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے آتی ہیں لیکن سورہ احزاب کی آیت ۳۵ (۳۳) میں (مؤمنین اور المؤمنات) کی خصوصیات بڑی جامعیت سے یک جا بیان ہوئی ہیں۔ اس آئینہ جلیلہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیجئے اور مفہوم القرآن میں بھی اس کا مفہوم بھی۔ (نیز ۲۳/۱۱)



اس سورہ کا آغاز اس دعوے کے ساتھ ہوا تھا کہ لا الہ الاہود (۱)۔ جملہ اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے

سوا کسی کو نہیں۔ اس دعوے کی شہادت میں کہا ۱۔

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ قَائِمٌ لَا إِلَهَ

إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲)

اس کا مفہوم بعد میں لکھا جائے گا۔ سہر دست اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ کہا یہ گیا ہے کہ اس دعوے کی شہادت خود خدا دیتا ہے۔ ملائکہ

دیتے ہیں اور ارباب علم دیتے ہیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی شہادت کا تعلق ہے گواہ کی شہادت اس کے زبانی یا تحریری بیان کی رُو سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

خدا کی شہادت | کا بیان اس کی کتاب ہے اور اس کتاب کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ توحید ہے۔ یعنی لا الہ الاہو۔ آپ قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، یہی نقطہ ہے جس کی توضیح و تشریح قدم قدم پر ملتی ہے۔ کہیں دلائل و براہین کی رُو سے کہیں تاریخی شواہد کی بناء پر کہیں تعلیم و تلقین کے ذریعے۔ اسلام تمام کا تمام اس محور کے گرد گردش کرتا ہے۔

ملائکہ کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۹۵ و ۶۶) میں کی جا چکی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جہاں تک عالم خلق (ہماری محسوس کائنات) کا تعلق ہے ملائکہ سے مراد فطرت کی قوتیں اور ان کے بروئے کار لانے کے عناصر ہیں۔ قرآن کریم نے دعویٰ توحید کے اثبات کے لئے جو فطرت کی شہادت پیش کی ہے تو یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ سائنس کا مسئلہ یہ ہے کہ قوانین فطرت کے دو اساسی اصول (FUNDAMENTALS) ہیں۔ ایک قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) اور دوسرے وحدۂ فطرت (UNIFORMITY OF NATURE)

ملائکہ کی شہادت

وحدت فطرت سے مراد یہ ہے کہ قوانین فطرت ساری کائنات پر یکساں طور پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں یہاں سے وہاں تک وحدت ہے، اس سے پہلے تو اس وحدت کی شہادت کرۂ ارض تک محدود تھی۔ اب جو خلا نور دی کی ہم شروع ہوئی ہے تو دیکھا یہ گیا کہ جن قوانین کے مطابق انسان کرۂ ارض پر زندہ رہتا اور نقل و حرکت کرتا ہے وہی قوانین چاند پر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ وہاں بھی زندگی ان ہی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ اس لئے اس نے کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهُ (۳۳)۔ کرۂ ارض پر بھی وہی اللہ ہے۔ اسی کے قوانین کارفرما۔ اور سماء میں بھی وہی اللہ۔ (نیز سورۃ النحل میں ہے: وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا آلَ إِبْرَاهِيمَ أَهْلًا يَكُونُوا مَكْرَهُمُ الْفِتْنَةُ ۚ إِنَّهُمْ مُطَاعُونَ)۔ اِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ (۱۶۰)۔ ارشاد خداوندی ہے کہ تم ایسا نہ سمجھ لینا کہ انسانی زندگی میں اور خدا کا اقتدار کارفرما ہے اور خارجی کائنات میں اور خدا کا یہ قطعاً غلط تصور ہے۔ اللہ دو نہیں۔ صرف ایک ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلَهِ فَكُنَّا آلَهُ ۚ كَفَسَدَتَا (۱۶۱)۔ اگر کائنات میں خدا کے سوا اور بھی اللہ (ارباب اقتدار) ہوتے تو اس میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس عجیب العقول کا رگہ کا نظم و نسق اس حسن و خوبی سے کبھی نہ چل سکتا۔ اس میں کوئی شے بھی اپنے ٹھکانے پر نہ رہتی۔ سب کچھ درہم برہم ہو جاتا۔ یہ قانون کی وحدت ہے جس سے یہ سلسلہ اس محکمیت سے قائم اور

وحدت کائنات

کارفرما ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہماری نگاہ کی محدودیت ہے جس سے ہمیں کائنات الگ الگ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ درنہ حقیقت تمام کائنات ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ — لہو خورشید کا ٹپکے

اگر ذرے کا دل چیریں — لہذا، اگر کائنات ناقابل تقسیم وحدت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ وحدت قانون یا وحدت اللہ ہے۔ بنابرین ساری کائنات فطرت کی قوتیں اور اس میں نافذ العمل قوانین اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ لا الہ الاہو۔ یہ ہے ملائکہ کی شہادت۔

اور یہی شہادت ارباب علم پیش کرتے ہیں۔ آج علوم سائنس کے محققین اپنی مدت العمر کی تحقیق و تدقیق کے بعد اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ساری کائنات وحدت قانون کی مظہر ہے۔ قرآن کریم نے علماء کہا ہی سائنس دانوں کو ہے (۳۵/۲۸-۲۹) لیکن آیت ۲۹ میں) اس نے اولو العلم کے ساتھ ”قائماً بالقسط“ کی بھی

ارباب علم کی شہادت

شرط عائد کی ہے۔ یوں تو قسط کا لفظ عدل کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی راہ اختیار کرنا۔ یہاں یہی مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ کائنات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اقل و درم میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ اندکس سے متعلق مقامات دیکھئے۔ وہاں کائنات کے متعلق افراط و تفریط کا نظریہ بھی آپ کے سامنے

آجائے گا — ایک نظریہ اس کے وجود کا انکار کر کے اسے انسانی تخیل کی تخلیق کہنے والوں کا ہے۔ دوسرا نظریہ مادی کائنات اور انسان کی مادی زندگی کو حیدر آخر قرار دینے والوں کا۔ بالقسط، نظریہ ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اور انسان کی مادی زندگی اسی سلسلہ کی آخری کڑی نہیں۔ علاوہ ازیں خارجی کائنات اور قانون مکافات عمل میں ایک گہرا تعلق ہے۔

”قسط“ کے معنی اگر عدل و مساوات لئے جائیں تو اولو العلم قائمہ بالقسط کا مفہوم ہوگا، وہ ارباب علم و بصیرت جو قوانین خداوندی کے مطابق نظام قائم کرتے ہیں اور وہ نظام اقتدار خداوندی کی زندہ شہادت بن جاتا ہے۔ ان تشریحات کی روشنی میں اس آیت کے اس مفہوم کو دیکھئے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا ہے :-

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی (۳۵/۲۸) کہ کائنات میں اقتدار اعلیٰ، خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اس حقیقت کبریٰ کی شہادت ایک تو، خود ذات خداوندی کا تصور دہنیا کرتا ہے کہ اگر کائنات میں ایک سے زیادہ، صاحب اقتدار قوتیں ہوں تو یہ تمام سلسلہ درہم بہرہم ہو جاتا (۳۵/۲۹)۔ یہ تصور کتاب اللہ پر غور و فکر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے خدا کی شہادت کا ذریعہ اس کی کتاب بن جاتی ہے۔

اس کے بعد اس کی شہادت کائناتی قوتیں بہم پہنچاتی ہیں جن کے مطالعہ اور مشاہدہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات ایک وحدت ہے اور اس میں ایک عالمگیر قانون کارفرما ہے۔

پھر، اس کی شہادت وہ صاحبان علم و بصیرت بہم پہنچاتے ہیں جو عدل و مساوات کی بنیادوں پر معاشرہ کا نظام قائم

کرتے ہیں۔ اس نظام کے زندہ نتائج، ان کی شہادت کی دلیل بنتے ہیں۔

یہ تمام شہادتیں انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہیں کہ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف ذاتِ خداوندی کو حاصل ہے۔ اور یہ

تمام سلسلہ اس کے بے مثال غلبہ و قوت اور بے نظیر حکمت کے مطابق سرگرم عمل ہے۔

اور جلد کائنات کا، ایک اللہ کے قوانین کے تابع سرگرم عمل رہنا، الاسلام ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳۸)

یہی الاسلام ہے

الدین — یعنی خدا کا مقرر کردہ نظامِ حیات، وہی الاسلام ہے جسے تم کائنات میں کار فرما دیکھ رہے ہو اور جس کی

شہادت تمہیں ارض و سما کے گوشے گوشے میں مل رہی ہے۔

ارض و سما سے کسی امر کی شہادت مل رہی ہے اس امر کی کہ ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے (۳۸) اسی نظام کا نام

الاسلام ہے۔ (اسلام اور دین کے متعلق انڈکس میں متعلقہ مقامات دیکھئے)۔ یہی الدین حضراتِ انبیاء کرامؑ ان لوگوں کے

لئے لے کر آتے رہے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے اس میں اختلافات پیدا کر دیئے۔ آیت کا باقی ماندہ حصہ یوں ہے۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُولَٰئِكَ شَيْءٌ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعْثًا

بِمُؤَيَّدِهِمْ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۳۹)

اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنی صرف اقتدارِ خداوندی کی محکومیت جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے (۳۸-۳۹)۔

اور یہی وہ نظامِ حیات ہے جو تمام کائنات اور نوعِ ان کے لئے قانونِ خداوندی کے مطابق تجویز ہوا ہے۔ یہ کوئی

نیا نظام نہیں۔ تمام انبیاء سابقہ اسی نظام کو لے کر آتے رہے لیکن ان کے بعد ان کے متبعین، باہمی صداقت سرکشی

کی بنا پر، اس میں اختلافات کرنے لگ جاتے۔ اس طرح یہ نظام، اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس نہ رہتا، اور وہ دوسری

طاہروں پر چل نکلتے — اور اس کا نتیجہ بھی بھگتتے۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات نتائج مرتب کرنے میں دیر نہیں لگا یا کرتا۔

اس کے بعد ہے :-

فَإِنْ حَاجَّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۚ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

وَالْأُمِّيِّينَ ۚ عَاسَلِمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدْ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ

الْبَلَاغُ ۚ وَاللَّهُ بِبَصِيرَةٍ بِالْعِبَادَةِ (۴۰)

یہی حالت اس وقت ان لوگوں کی ہے جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ سو اگر یہ تم سے اس باب میں جھگڑا

تنازعہ کریں تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے لئے جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو کرلو (جہاں تک میرا پناہ اور اس جماعت کا تعلق ہے جو

میرے پیچھے چلتی ہے ہم نے اپنی تمام توجہات اسی نظام کی تشکیل پر مرکوز کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد تم ان لوگوں سے جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں اور ان سے بھی جو کسی آسمانی کتاب کے مدعی نہیں پوچھو کہ وہ اس نظام کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ اس کی اطاعت کریں گے تو زندگی کی کامرانیوں کی راہیں ان پر کھل جائیں گی۔ لیکن اگر یہ اس سے روگردانی کریں گے تو ہم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ تمہارا فریضہ ان تک پیغام بچھا دینا ہے۔ (ماننا نہ ماننا ان کے اپنے اختیار کی بات ہے)

اس کے بعد جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ خدا کا قانون مکافات تمام انسانوں کے اعمال پر نگاہ رکھتا ہے۔

لفظ اُحٰی کے معنی مطالب الفرقان۔ جلد دوم ص ۳۳۔ آیت (۱۸) میں دیئے گئے ہیں۔

بہاؤ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یعنی ساری نوع انسان سے۔ قرآن تمام

نوع انسان کے لئے (یعنی ہر زمانہ کے تمام انسانوں کے لئے) مکمل۔ آخری۔ ابدی

تمام نوع انسان کو دعوت

واحد ضابطہ حیات ہے۔ اس سے اس کی دعوت ہر زمانہ میں تمام انسانوں کے

لئے ہے۔ اہل کتاب سے مطالبہ کے متعلق۔ مطالب الفرقان جلد اول ص ۸۳۔ آیت (۱۸)۔ جلد دوم ص ۱۸۲۔ آیت (۱۸)۔ جلد سوم۔

ص ۱۸۲۔ آیت (۱۸)۔ آیت (۱۸) کے الفاظ بھی کم و بیش آیت (۱۸) جیسے ہیں۔ نزول قرآن کے بعد راہ ہدایت پر وہی سمجھا

جائے گا جو قرآن کا اتباع کرے گا۔ یہ دین خداوندی کا (LATEST EDITION) ہے اور ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ کیلئے۔

اسی کے معنی تھم نبوت ہیں۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ كَمَا تَوَلَّوْا

کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی تو یہ ان کا منصب نبوت تھا۔ لیکن یہ وحی ان کی ذات تک محدود رہنے کے لئے نہیں ملتی تھی۔ ان

کا فریضہ تھا کہ وہ اسے دوسرے انسانوں تک بھی پہنچائیں۔ یہ ان کا منصب رسالت تھا۔ اس اعتبار سے نبی اور رسول ایک

ہی شخصیت کو کہا جاتا تھا۔ نبوت کے ساتھ اگر رسالت نہیں تھی تو نبوت بلا مقصد

نبوت اور رسالت کا مفہوم

تھی۔ اور اگر رسالت کے ساتھ نبوت نہیں تھی تو رسالت بے معنی تھی۔ اگر پیغام ہی نہیں

تھا تو پیغام رسائی کیسی؟ بہر حال، رسالت، وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا فریضہ تھا۔ اس وحی کو دوسروں تک اس

لئے پہنچایا جاتا تھا کہ وہ اپنی غلط روش سے احتراز بہت کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کریں۔ اسے ہدایت کہا جاتا ہے ایک حبیب مشفق

کی طرح، نبی کے قلب پر سوز کی انتہائی آرزو ہوتی تھی کہ اس کے مخاطب راہ ہدایت پر آجائیں تاکہ وہ اپنی غلط روش کے نہاہ کن نتائج

سے بچ جائیں۔ وہ ان فی فکر میں اپنی جان تک گھلا لیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو اس سے کہنا پڑتا کہ تیرا فریضہ اس پیغام کو ان

لوگوں تک پہنچا دینا اور اس طرح صحیح راستے کی نشاندہی کر دینا ہے۔ انہیں صحیح راستے پر چلا دینا تیری ذمہ داری نہیں۔ اس کا ماننا نہ ماننا ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ اس میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں انڈکس میں متعلقہ مقامات دیکھئے۔ حضور کو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَخْبَيْتَ..... (۲۸) جن سے تمہیں محبت ہے تم انہیں بھی راستے پر چلا نہیں سکتے۔ انہیں صرف راستہ دکھا سکتے ہو۔ اس لئے بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۲۹) جو کچھ خدا کی طرف سے تم پر نازل کیا جاتا ہے تم اسے دوسروں تک پہنچا دو۔ یہی تمہارا فریضہ ہے۔ اور اس کا اعلان بار بار کر دو کہ مَا عَلَيَّ السُّؤَالِ اِلَّا الْبَلِّغُ (۳۰)۔ اس رسول کے ذریعے اس پیغام کو تم تک پہنچا دینا ہے۔ (۳۱ ۳۲ ۳۳ وغیرہ)۔

رسول کا فریضہ صحیح راستے پر چلا دینا نہیں

اس سلسلہ میں ایک مقام بڑا اہم سامنے آتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضور کے دل میں کبھی یہ خیال گذرا ہو گا کہ جس مقصد کے لئے میں اتنے عرصہ سے مصروف تگ و تازہ ہوں، کیا وہ میری زندگی میں برومند ہو کر سامنے آجائے گا یا میری ساری عمر تکلیفیں بڑھاتے کرتے اور صعوبات بھیلے ہی گذر جائے گی، بظاہر ہے کہ اس قسم کے خیال کا دل میں آنا فطری امر تھا اور یہ آرزو بڑی معصوم تھی۔ لیکن

آپ کو معلوم ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے اس کا کیا جواب ملا؟ جواب یہ ملا کہ وَانِ مَّا دُرِّيْتَكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَذَرْنَا لَكَ فَاتَّمَا عَلَيْكَ الْبَلِّغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۳۱)۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نظام تمہاری زندگی میں قائم ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری وفات کے بعد ایسا ہو۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارے ذمے اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ کب برومند ہو گا، اس کا فیصلہ ہمارا قانون کرے گا۔ اور ہمارے قانون میں کسی کی خاطر بھی رعایت نہیں برتی جاتی۔ وہ اٹل اور بے لچک ہے۔ وہ کسی کا لحاظ نہیں کرنا کسی کی رو رعایت نہیں کرتا۔

تیری زندگی میں یا تیرے بعد

اس میں ہمارے لئے بڑا سبق کموز نکلتا پوشیدہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہاری مالووسی کی بیشتر وجہ یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی ذمہ داریاں از خود اپنے سر لے لیتے ہو جو درحقیقت تمہاری ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ اور پھر تم ان میں کامیابی بھی اپنے حسابی قاعدہ کی دوس سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اور جب نتیجہ اس کے مطابق برآمد نہیں ہوتا تو تم مالووس ہو جاتے ہو۔ مقصد کوئی بھی ہو، تمہاری ذمہ داری اس کے حصول کے لئے اپنی حد استطاعت تک کوشش کرنا ہوتی ہے۔ اپنی منشاء کے مطابق نتیجہ برآمد کرنا نہیں۔ کوشش اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس کے متعین کرنے میں کئی ایسے عناصر کارفرما ہوتے ہیں جو تمہاری حد استطاعت سے باہر ہوتے ہیں۔ لہذا تم اس مقصد کے حصول کے لئے امکان بھر کوشش کئے جاؤ۔ یہی تمہاری ذمہ داری ہے اور چونکہ تم اس سے اپنی استطاعت کے مطابق عہدہ برآ ہوتے چلے جا رہے ہو، اس لئے تمہارے لئے مالووسی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اب آگے بڑھیں، سابقہ آیت میں حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ ان مخالفین سے کہہ دو کہ اگر تم میری تائید کے باوجود اپنی غلط روشنی سے باز نہیں آؤ گے تو اس کا تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کے بعد کہا :-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِالْآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ لَا يَفْزِلُونَ
الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ لَافْتِنَسُهُمْ يَعْدَ ابِ إِلَيْهِ (۳۲)۔

جو لوگ اس ضابطہ حیات کی صداقت سے انکار کرتے ہیں اور اس کی طرف دعوت دینے والے انبیاء کی تخریب کے ناحق رہنے ہو جاتے ہیں اور انہیں قتل کرنے پر اثر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو قتل کرنے پر بھی جو قوانین خداوندی کے مطابق عدل و مساوات کا نظام قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ تو ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ ان سب کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور آخلامرآن پر سخت تباہی آئے گی۔

قتل انبیاء و رسل اور قتل بغیر الحق کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم ص ۳۰۴-۳۰۱ آیت (۳۱) میں گزر چکی ہے۔ کسی قوم کی جبرمانہ دہنیت کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ جو شخص انہیں غلط کاموں کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرے یا جو لوگ معاملات کے فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لیں اور عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں وہ ان کے درجے آزار ہو جائیں اور انہیں جان تک سے مار دیں جو قوم اس درجہ حدود فراموش ہو جائے اس کے راہ راست پر آنے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ یہودیوں کی ایسی ہی حالت ہو چکی تھی (تفصیل انڈیکس میں بنی اسرائیل کے عنوان کے تحت دیکھیے) ان کی اہم انگیز تباہی کے متعلق کہا :-

أُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۳۱)
یہ لوگ ہیں کہ جو کچھ یہ کرنے ہیں دنیا میں ان کے کسی کام آسکے گا، نہ آخرت میں اور نہ ہی کوئی ایسا ہوگا جو

ان کی کسی قسم کی مدد کر سکے۔

”حبط اعمال“ کے الفاظ آیت (۳۱) میں بھی آئے تھے۔ (جلد سوم ص ۳) لیکن وہاں اس کی تشریح نہیں کی گئی تھی کہ اعمال رائیگاں کئے

۱۔ حضرت عیسیٰ نے یہودیوں سے کہا تھا کہ ”تم پر افسوس ہے کہ تم تو نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور تمہارے باپ دادا نے ان کو قتل کیا تھا (لوقا۔ ۱۱: ۴۷) کم از کم پانچ نامور انبیاء کے قتل کا ذکر تو یہودی بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔

(JESUS : AN HISTORIAN'S REVIEW OF THE GOS PELS ,
BY MICHAEL GRANT (1977) P.139.)

چلے جاتے ہیں۔ اس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اس کا پورا پورا اطلاق ہم پر ہو رہا ہے۔

حِطَّ اَعْمَالُكَامَطْلَب | حِطَّتِ الدَّابَّةُ حَبَطًا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی اچھی چراگاہ میں پہنچ کر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کر سکے۔ اس سے اس کا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے۔ لغت کے اعتبار سے اس میں درد و الم کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔

حِطَّ اَعْمَالُ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے سورہ کہف کی حسب ذیل آیات پر غور کیجئے :-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۚ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ مُخِطَئَاتُ أَعْمَالِهِمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸-۱۹)

اے رسول! ان سے کہو کہ کیا ہم بتائیں کہ وہ کون ہیں جو اپنی سعی و عمل میں سخت نقصان میں رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں طبعی زندگی کی مفاد کوششوں میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ بڑے خوشحال سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں، اور اس کے قانون مکافات اور اخروی زندگی کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے ان کے وہ کام جنہیں وہ بہت اچھا سمجھ رہے ہیں، رائیگاں چلے جائیں گے۔ اس حد تک رائیگاں کہ ان کا وزن معلوم کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔

یہاں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے کہ کہا یہ نہیں گیا کہ سب سے زیادہ نقصان میں وہ لوگ رہیں گے جو کچھ کریں گے نہیں۔ کہا یہ گیا ہے (الْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا) کہ وہ کام تو بہت کریں گے اور کام بھی ایسے جنہیں وہ بہت اچھا سمجھتے ہوں گے۔ بڑے نیک کام سمجھ کر سر انجام دیں گے (يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا)۔ لیکن وہ سب رائیگاں چلے جائیں گے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کے لئے حَبَط کے ان معانی کو سامنے لائیے جنہیں ادھر بیان کیا گیا ہے۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اس کا جزو بدن بن جائے تو اس سے اس کی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ و توانا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا چارہ ہضم نہ ہو تو پیٹ پھول جاتا ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے لیکن یہ درحقیقت فربہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع دابستہ رکھتا ہے لیکن وہ درحقیقت اس کی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اسے قرآن ”حِطَّ اَعْمَالُ“ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جو اچھے نتائج کی توقع ان سے دابستہ کی گئی ہو ان نتائج کا مرتب نہ ہونا حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کر سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں مگر ایسا نہ ہو تو ان کی ساری محنت اکارت

چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُولَئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲۱) انہی کے لئے آیا ہے۔ لہذا، اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصور یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں۔ اچھے اور بُرے اعمال کا معیار اللہ کی کتاب ہے۔ جو اعمال اس کی رُوسے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ سرانجام دیں۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اہل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے۔ اگر ہم اپنا ذکر کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو دیسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائیگاں جائیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس نظام کے ظاہری ارکان و شعائر و باقی رہ جاتے ہیں لیکن ان کی روح (غرض و غایت) باقی نہیں رہتی۔ مذہب پرست قوم ان ظواہر (FORMS) کو اصل دین سمجھ کر بڑی شدت (اور نہایت نیک نیتی) سے ان پر کار بند رہتی ہے۔ ان کے لئے بڑی مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صعوبات جھیلتی ہے۔ ایثار اور قربانی کرتی ہے۔ وقت، توانائی، مال و دولت صرف کرتی ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ وہ بڑے ثواب کا کام کر رہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت ان کی خوش فہمی کو پختہ سے پختہ تر کرتی رہتی ہے لیکن ان کے یہ کام کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ یہ سب رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والوں کو بے عملوں کے مقابلہ میں زیادہ نقصان اٹھانے والے (اخصسین اعمالاً)۔ اس لئے کہا کہ جو لوگ کچھ نہیں کرتے ان کا وقت، توانائی، مال و دولت تو ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن ان (کام کرنے والوں) کا یہ سب کچھ ضائع جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا ہماری یہ حالت نہیں۔ ہم میں سے ان لوگوں کو چھوڑ بیٹھے جو (مذہبی پیشوائیت کی اصطلاح میں) اسلامی شعائر کے پابند یا دیندار نہیں۔ انہیں لیجئے جو بڑے دیندار، متقی، پرہیزگار ہیں۔ نماز روزے کی شدت سے پابندی کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان کاموں کے لئے وہ کس قدر مشقتیں برداشت کرتے اور مال و دولت صرف کرتے ہیں لیکن ان کے ان کاموں سے کیا وہ نتائج برآمد ہوتے ہیں جو اس زمانے میں ہوتے تھے جب یہی کام دین (نظام خداوندی) کے پروگرام کے عناصر تھے؟ اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم، ص ۵۳-۵۴۔ آیت (۲۱)۔ ظاہر ہے کہ جب مذہبی اعمال اس دنیا میں وہ خوشگوار نتائج برآمد نہیں کرتے تو وہ آخرت میں کس طرح نوزد فلاح کا موجب ہو سکیں گے؟ یہ ہے ”حَبِطَتِ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ کا مفہوم۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوان ”دنیا“ اور سوچئے کہ جس قوم کے اعمال اس طرح رائیگاں جائیں وہ کس قدر گھٹائے میں رہتی ہے!

آیت (۳۳) میں کہا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُکْفِرُوْنَ بِآیَاتِ اللّٰهِ - جو لوگ قوانینِ خداوندی سے کفر برتتے ہیں، ذیل کی آیت میں اس کی وضاحت کر دی کہ آیاتِ خداوندی سے کفر برتنے کا مفہوم کیا ہے فرمایا :-

اَلَمْ تَدْرِ اِلٰی الَّذِیْنَ اٰتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکَثِیْثِ مِیْدُ عَوْنٍ اِلٰی کَثِیْثٍ اللّٰهُ لَیَحْکُمُ ۳۳ ۲۳ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۳۳)۔

یہ، اہل کتاب وہ ہیں جنہیں اس ضابطہِ خداوندی کا جواب، مکمل شکل میں قرآن میں آیا ہے ایک حصہ دیا گیا تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ اس مکمل ضابطہ کی طرف لپک کر آتے (۳۳)۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں اس ضابطہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان کے باہمی معاملات کا فیصلہ کرے، تو ان میں کا ایک گروہ (بالخصوص ان کے مذہبی پیشوا) اس سے روگردانی کرتا ہے۔ ان لوگوں کی مفادپرستیوں نے ان کی ذہنیت ہی ایسی بنا دی ہے کہ انہیں جب بھی حق کی طرف دعوت دی جائے یہ اس سے روگردانی کریں۔ کتاب اللہ کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ جملہ اختلافی امور کا فیصلہ اس کی رو سے کیا جائے۔ یہی کفر و اسلام کا خط امتیاز ہے۔ (۳۳) و (۳۴) ذ (۳۴)۔

اس میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ سابقہ اہل کتاب کو ”کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا“ یعنی ان کی طرف جو کتاب بھیجی گئی تھیں ان میں ایسا ضابطہ حیات نہیں تھا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک مکمل ہو۔ مکمل ضابطہ حیات اب آیا ہے: تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدًا لَا مُبَدِّلَ لَکَلِمَتِہٖ ۝ (۳۴)۔ علاوہ اس کے کہ کتب سابقہ اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہی تھیں وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ حیات بننے کے لئے دی ہی نہیں گئی تھیں۔ یہ وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد اہل کتاب کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی تھی۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ کتاب اللہ پر ایمان لانے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کئے جائیں۔ یہی کفر اور ایمان میں خط امتیاز ہے: وَ مَنۡ تَمَّ یَحْکُمۡ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ ایمان کا مفہوم اَلْکٰفِرُوْنَ (۳۵)۔ جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے اختلافات دور کئے جائیں (۳۵، ۳۶)۔ ان ارشاداتِ خداوندی کی روشنی میں سوچئے کہ ہم مسلمانوں کا شمار کس زمرے میں ہو رہا ہے ؟

سوال یہ ہے کہ وہ لوگ اہل کتاب۔ بالخصوص یہود کتاب اللہ کی طرف کیوں نہیں آئے تھے؟ اس کا نہایت جامع جواب مختصر الفاظ میں دے دیا کہ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے شفعاۓ انہیں جہنم کے

عذاب سے چھڑائیں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّ غَرَّ هُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۳۳)

یہ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات پر ان کا ایمان ہی نہیں۔ یہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ ہمیں جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔

اور اگر ہمیں وہاں جانا بھی پڑے گا تو محض چند دنوں کے لئے (۳۳)۔ اس کے بعد جنت کے وارث ہم ہی ہوں گے۔ یہ

عقیدہ ان کا خود ساختہ ہے اور اس نے انہیں دین کے بارے میں سمجھت فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

نجات کے متعلق بنی اسرائیل کے عقائد کی تفصیل۔ مطالب الفرقان۔ جلد دوم ص ۲۲۹-۲۳۰۔ آیت (۳۳)۔ میں گزر چکی ہے۔ وہیں شفاعت کا مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہودیوں نے عذابِ جہنم سے نجات حاصل کرنے کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کر رکھے تھے، لیکن تھیئے! آپ یہ کہہ کر آگے نہ بڑھ جائیئے کہ یہ یہودیوں کے عقائد تھے۔ ہمارا ان سے کیا تعلق؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے بھی اس باب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جہاں تک حصولِ جنت کے آسان طریقوں کا تعلق ہے اس کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم ص ۲۹۹۔ آیت (۳۳) میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ عذابِ جہنم سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمارے

ہاں کس قسم کے عقائد مرتب ہیں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن اس مقام پر صرف دو ایک احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے مشکوٰۃ شریف میں (بخاری اور مسلم

نجات بذریعہ شفاعت

کے حوالے سے) یہ روایت درج ہے کہ قیامت میں جب گنہگار تمام انبیاء و کرام سے (شفاعت کرانے کے معاملہ میں) مایوس ہو جائیں گے تو وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ حضور ان سے زبانی گئے کہ

میں شفاعت کا اہل ہوں (اور تمہاری سفارش کروں گا)۔ پھر میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں حاضری کی اجازت

طلب کروں گا خداوند تعالیٰ مجھ کو اجازت مرحمت فرمائے گا۔ اور میرے دل میں اپنی حمد و ثناء کے الفاظ ڈالے گا کہ میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثناء کروں گا (وہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثناء کروں گا۔

اور مسجد میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائیگا۔ محمد! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے میں سنوں گا۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہتا ہے یا جائیگا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا اے پروردگار! میری امت کو بخش دے۔ پروردگار! میری امت

کو بخش دے۔ خداوند تعالیٰ فرمائیگا جاؤ اور دو رخ سے ان لوگوں کو نکال لو جس کے دل میں جو برا بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور پروردگار

کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اور اسکے بعد رب العزت میں دوبارہ حاضر ہوں گا اور خدا کی حمد و ثناء ان ہی الفاظ میں کروں گا

اور پھر مسجد میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا۔ اے محمد! اپنا سر اٹھا۔ کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔

مانگ جو مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا پر درگاہ میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ کہا جائے گا جاؤ اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر یادانی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال دو۔ چنانچہ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا اس کے بعد پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا اور خدا کے حضور میں حاضر ہو کر انہیں الفاظ میں خدا کی حمد و ثناء کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمد! اپنا سراٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ جو مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا پر درگاہ میری امت میری امت (یعنی میری امت کو بخش دے) کہا جائے گا جاؤ۔ اور جس شخص کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال دو۔ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر درگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں حمد و ثناء کروں گا پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمد! اپنا سراٹھا کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ دیا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا۔ اے پر درگاہ! ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور کوئی عمل نہ کیا ہو) خداوند تعالیٰ فرمائے گا ان لوگوں کی سفارش تیرا حق نہیں ہے قسم ہے اپنی عزت کی۔ اپنے جلال کی اور اپنی ذاتی اور صفاتی عظمت اور بزرگی کی میں ہی ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالوں گا۔ جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو گا۔ (بخاری و مسلم)

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ — جلد دوم - صفحہ ۳۱۶ - ۳۱۵)

آپ نے غور فرمایا کہ سہارے ہاں بھی جہنم سے نجات حاصل کرنے کے عقائد یہودیوں کے عقائد سے کم نہیں! یہودی شفاعت کو انبیاء تک ہی محدود نہیں رکھتے تھے۔ اس میں اپنے مرشدان طریقت (رہبان اور اولیاء) کو بھی شامل کرتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے عقائد ہیں۔ اس کی تفصیل تصوف پر میری زیر کتابت تصنیف میں ملے گی (جو اُمید ہے اس جلد کی اشاعت سے پہلے شائع ہو جائے)۔ نمونے کے طور پر آپ صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے چشتیہ خاندان کے خواجگان میں خواجہ معین الدین چمیری کا نام سرفہرست آتا ہے ان کے ملفوظات (دلیل العارفین) میں مرقوم ہے کہ ایک مجلس میں انہوں نے فرمایا :-

بروز قیامت انبیاء اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

پیران طریقت کے ذریعے نجات

ان کے کندھوں پر کبیل پڑے ہوں گے۔ ہر ایک کبیل میں کم و بیش

ایک لاکھ تانے کے تانگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور پیچھے ان کے ان تاگوں کو پکڑیں گے اور

اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامہ فحش سے فارغ نہ ہو۔ پھر حق تعالیٰ انہیں بل صراط پر پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پریدوں کے اس بنیاد پر رہیں گے کہ راستے کو ایک دم زدن میں بہ برکت پکڑے رہنے اس کلیم کے طے کریں گے اور دروازہ بہشت پر پہنچ کر دارالنعیم میں داخل ہوں گے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہودی کتاب اللہ کی طرف اس لئے نہیں آنے تھے کہ وہاں قانون مکافات عمل کی رو سے ہر جرم کی پاداش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اس قسم کے عقائد وضع کر رکھے تھے۔ سو جب عقیدہ یہ ہو کہ ہم جو جی میں آئے کریں ہمارے شفعاء ہمیں عذاب جہنم سے بچالیں گے تو پھر جرائم سے مجتنب کیوں رہا جائے! اس میں ایک بڑا اہم نکتہ مضمر ہے۔ ہم اپنے ہاں بڑھتے ہوئے جرائم کا رونا روتے رہتے ہیں اور نہرا کر کوششوں کے باوجود ان میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جسے قرآن کریم نے یہودیوں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بنیادی عقیدہ یہی ہے کہ گنہگار رسول اللہ کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ سو جب گناہوں (جرائم) کی منزل ہی نہیں ملے گی تو ان سے مجتنب کیوں رہا جائے۔ اس قسم کے عقائد قوم کو ارتکاب جرائم پر جرات دلاتے ہیں۔ یاد رکھیے! یہ صرف خدا کے قانون مکافات عمل پر یقین محکم ہے جس سے انسان جرائم سے مجتنب رہ سکتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانون مکافات عمل ہے۔ (انڈکس۔ سے آپ کو اس کی تفصیل مل سکے گی)۔ اس مقام پر بھی، یہودیوں کے اس غلط عقیدہ کو بیان کرنے کے بعد کہا کہ

فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتَهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ تَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۳۴)

لیکن ان کی یہ عود فہمی، انہیں خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ اس قانون کی رو سے ہر ایک کو، اس کے عمل کا پورا پورا بدل مل جاتا ہے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔

اس کا مظاہرہ ایک تو ابھی ہو جائے گا، جب یہ میدان جنگ میں سامنے آئیں گے اور ذلت و خواری سے، یہاں سے نکلنے جائیں گے (۵۹)۔ اور پھر حیاتِ اخروی میں بھی، اسی قسم کی رسوائیاں ان کے حصے میں آئیں گی۔ کسی کی سفارش مکافات عمل سے بچا نہیں سکے گی۔

اس بنیادی قانون مکافات کی تشریح — کہ ہر ایک کو اس کی سعی و عمل اور صلاحیت و استعداد کے مطابق پھل ملتا ہے اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُوْتُيَ الْمُلْكِ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ
وَتُعْزِّدُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

۳
۲۵

قَدِيرٌ ۝ (۳۶)

لیکن جس عظیم مقصد کے لئے قرآن کریم نے اس اصول کو بیان کیا تھا
ہم اے ہاں کے ترجموں نے اس سے بالکل برعکس نتیجہ پیدا کر دیا۔

حکومت اور عزت مشیت خداوندی سے

اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے۔

تو کہ یا اللہ۔ مالک سلطنت کے۔ تو سلطنت دیوے جس کو چاہے۔ اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے۔ اور عزت

دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے۔ تیرے ہاتھ ہے سب خوبی۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (ترجمہ مولانا فاضل)

اس قسم کے ترجموں سے انسان مجبور محض ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن کریم کی تعلیم کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ اس کا تعلق مسئلہ
تقدیر سے ہے جس کی بابت پچھلی تینوں جلدوں میں بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ انڈکس میں عنوانات ”خدا کا تصور“۔

”خدا انسانی اعمال کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے“ ”تقدیر“۔ ”مکافات عمل“۔ ”اختیار و ارادہ“ وغیرہ دیکھئے۔ یہ بات واضح ہو
جائے گی کہ ”من یشاء“ اور ”من تشاء“ جیسی اصطلاحات سے مراد ہوتی ہے ”خدا کے قانون مشیت کے مطابق“۔ اور قانون مشیت

کے متعلق اس نے واضح کر دیا ہے کہ ان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اور کائنات میں ہر بات قانون علت و معلول
(LAW OF CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ہوتی ہے۔ یہی خدا کا قانون مشیت ہے۔ خود آئیہ زیر نظر میں

خدا کے متعلق کہا ہے کہ یَدُكَ الْخَبِيرُ۔ یعنی خدا کی طرف سے ہمیشہ خیر“ سرزد ہوتی ہے۔ شر کی تو اس کی طرف نسبت بھی
نہیں کی جاسکتی۔ اب کسی قوم سے بغیر کسی وجہ کے سلطنت چھین لینا یا کسی کو یوں ہی بلا سبب ذلیل کر دینا، خیر نہیں کہلا

سکتا۔ یہ تو کبیر شر ہے۔ خدا نے استخلاف فی الارض، استبدال و استخلال قومی، اور ذلت و بستی کے متعلق غیر متبدل قوانین
متعین کر رکھے ہیں (دیکھئے انڈکس) اور یہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ غیر متبدل قوانین و اقدار کے مطابق

اختیار کا استعمال سب سے بڑا خیر ہے۔ شر امریت (ڈکٹیٹر شپ) کا خاصہ ہوتا ہے۔ (دیکھئے عنوان آمر) اس لئے خدا کی حکومت
کسی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں قانون کی حکمرانی ہے۔ اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مالک اور ملک کے الفاظ تو پہلے آچکے ہیں (جلد اول، ص ۲۷، آیت ۱۷) اس میں ہر قسم کا اقتدار شامل ہے عزت کے

معنی، غلبہ، تسلط، قوت کے ہوتے ہیں اور ذلت کے معنی ذلت، کمزوری اور پستی کے۔ یہاں عزت
عزت کے معنی اور ذلت ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں۔ قرآن کریم نے کسی کو ”یونہی ذلیل کرنے“ کی تردید

بڑے واضح انداز میں کی ہے۔ کہا کہ ان کی کیفیت عجیب ہے کہ جب اسے کشائش حاصل ہوتی ہے تو پھولا نہیں سماتا۔ لیکن جب اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا: **فَيَقُولُ سَرَّيْنِي أَهَانَنِ؟** (۱۹)۔ فرمایا کہ اس سے کہو کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ یہ ذلت تمہاری اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ معاشرہ میں جو تمہارا جانا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے جن پر کوئی اتنا دڑھکتا تھا ان کے سامانِ ذیبت کی نکر نہیں کرتے تھے۔ چاہتے تھے کہ دنیا بھر کا مال تمہارے پاس آجائے۔ یہ تھے تمہارے وہ اعمال جن کی وجہ سے تمہیں اس ذلت کا سامنا کرنا پڑا (۱۶-۱۹)۔ یاد رکھو! خدا کسی کو یونہی بلا وجہ ذلیل نہیں کیا کرتا۔ عزت و ذلت ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خدا نے ہر عمل کے نتیجے کے لئے قوانین مرتب کر رکھے ہیں۔ (إِنَّمَا عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدَرٌ)۔ ان نصیحتات کی روشنی میں آیت (۱۶) کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے :-

ان سے کہہ دو کہ دنیا میں کوئی قوم بھی خدا کی چہیتی اولاد نہیں۔ ہر قوم کے ساتھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق برتاؤ ہوتا ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ ہر ایک کو، اس کی سعی و عمل کا پھل ملتا ہے۔ (۲۰)۔ ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق منتین ہوتے ہیں (۲۱)۔ اس قانون کے مطابق عزت و عظمت اور غلبہ و اقتدار اسے ملتا ہے جس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے (۲۲، ۲۳) اور جب وہ اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرے جس سے صلاحیت باقی نہ رہے، تو اس سے عزت و اقتدار چھین جاتا ہے (۲۴، ۲۵)۔ اس قانون کا سرشتہ خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے اس لئے اسے اس پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے کہ اس کے خلاف کچھ نہ ہونے پائے۔

اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ یہاں ہر بات (خدا کے مقرر کردہ) قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے (اپنے مخصوص انداز میں) نظامِ کائنات کی شہادت پیش کی ہے۔ فرمایا :-

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ
وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْمِي مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۶)

قرآن کریم نے قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول متعدد مقامات پر بیان کئے ہیں (دیکھیے اختلافِ ییل و نہار)۔ تو میں یہ گردشِ دولابی جاری رہتی ہے جو قوم اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اسے عروج نصیب ہو جاتا ہے۔ جو ان صلاحیتوں کو کھودیتی ہے وہ قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے۔ وہ اس کی وضاحت کہیں اختلافِ ییل و نہار سے کرتا ہے کہیں تغیراتِ موت و حیات سے۔ (۲۷) اگر دشمنِ ییل و نہار کے لئے اس

نے عام طور پر ”تولج“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (دیکھیے ۲۶، ۳۱، ۳۳، ۳۵، ۳۶)۔ اس کے مادہ (و۔ل۔ج) کا مفہوم ہوتا ہے کسی شے کا کسی دوسری شے کے اندر آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر داخل ہونا۔ تُولِجُ الْاَيْدِيَ فِي النَّهَابِ کی مثال میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جس طرح دل اور بات کا تغیر آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر ہوتا ہے اسی طرح قوموں میں تغیر بھی بڑا غیر محسوس اور بتدریج ہوتا ہے۔ دوسری مثال تَخْرِجُ الْاُخْيَ مِنْ اَلْمَيْتِ وَتُخْرِجُ الْمَيْتَ مِنَ الْاُخْيِ ذِکْرِ دِی گئی ہے۔ موت اور حیات کے وسیع مفہوم کے لئے انڈکس دیکھیے (بالخصوص جلد اول ص ۳۲۶ زیر آیت ۲۱)۔ طبعی موت اور حیات کے متعلق بھی قرآن کا بیان (اور سائنس کی تحقیق) یہی ہے کہ بے جان مادہ سے کس طرح زندگی کی نمود ہوتی ہے اور زندہ اجسام کس طرح بے جان مادہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ (۲۶، ۳۱، ۳۳، ۳۵) لیکن اس نے زمین مردہ کو حیات تازہ ملنے کی تشبیہ زیادہ نمایاں طور پر دی ہے کیونکہ اس کا مشابہ آسانی سے ہو سکتا ہے اور ہر کس و ناکس کر سکتا ہے۔ (۳۵، ۳۶) اور اسے اس نے منجملہ آیات خداوندی کہہ کر پکارا ہے (۳۱)۔ ”آیت“ کے معنی ہونے میں ایسی علامت جس سے کسی حقیقت کی نشاندہی ہو سکے۔ یہ تشبیہات و تمثیلات کس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں؟ اس حقیقت کی کہ

اَوْ مِنْ كَانَ مِثْلًا فَاحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ نُورًا اَيُّ شَيْءٍ يَمْ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَافٍ مِنْهَا شَيْءٌ كَذَلِكَ هُنَّ اَرْبَعٌ لِّلْكَافِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۱)

دو! اس مثال پر غور کرو کہ ایک شخص (یا قوم) مردہ ہے۔ اسے زندگی عطا ہوتی ہے اور اسے ایسی تبدیل دی جاتی ہے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص (یا قوم) ہے جو گھٹاؤ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا۔ سوچو کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں! (کبھی نہیں) یہی حالت ان حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کی ہے۔ انہیں (چمکاؤ کی طرح) اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے اور روشنی ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ اس لئے یہ وحی خداوندی کی جگہ اپنے خود ساختہ معتقدات و رسومات میں بہت خوش رہتے ہیں۔

یہ ہے ان لوگوں کی وہ فوت و حیات جس کی وضاحت کے لئے مختلف مثالیں دی گئی ہیں۔

آیت (۳۱) کا آخری ٹکڑہ ہے تَرُدُّنَّ مِنْ شَعَارٍ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ ”رُزْق“ کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں

میں گزر چکی ہے (دیکھیے انڈکس)۔ بالخصوص جلد اول ص ۱۰۵۔ زیر آیت (۳۱)۔ یہاں **رُزْقٌ بِغَيْرِ حِسَابٍ** اتنا دھرا دینا کافی ہے کہ ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ کے معنی یہ نہیں کہ خدا رُزْق کو یونہی لگا دیتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے معاشی نظام کے تحت حصولِ رُزْق کے لئے جدوجہد کرتی ہے اسے اس کے اپنے اندازوں

سے بھی کہیں زیادہ رزق متا ہے۔ قرآن کا معاشی نظام تو ہم نے دیکھا نہیں (اگرچہ اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ دیکھئے اندکس) لیکن خدا کے طبعی قوانین کے مطابق جدوجہد سے جس قدر بغیر حساب رزق ملتا ہے اس کا مشاہدہ تو ہم نے خود کر لیا ہے۔ ہمارے ہاں کاشت کار اپنے قدیم طریقوں کے مطابق کھیتی باڑی کرتا چلا آ رہا تھا، اس سے (خطہ پنجاب کی اچھی سے اچھی زمینوں سے بھی) بیس پچیس من فی ایکڑ سے زیادہ گیہوں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قوانین زراعت کی جدید تحقیقات کی رو سے جب بیج، آلات اور کھاد وغیرہ میں تبدیلی کی، تو اسی زمین سے سو سو من گیہوں پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر خود کاشت کار حیران تھا۔ یہ ہے بغیر حساب رزق ملنے کی ایک پیش پا افتادہ سی مثال۔ اگر ان طبعی قوانین کے ساتھ اقدار خداوندی بھی شامل ہو جائے تو پھر کس طرح "بغیر حساب" رزق ملے گا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے !



گزشتہ آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں انسانوں کے دو گروہ ہمارے سامنے آجاتے ہیں — ایک وہ جو قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کریں، دوسرا گروہ وہ جو ان قوانین سے اعراض برتے اور اپنے خود ساختہ آئین و ضوابط کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔ اقل الذکر گروہ کو جماعت مؤمنین کہہ کر پکارا جائے گا اور آخر الذکر کو کفار کا گروہ جس میں جماعت مؤمنین سے باہر کے سب لوگ شامل ہوں گے۔ قرآن کریم نے انسانوں کی بنیادی تقسیم اسی طرح کی ہے جب کہا ہے کہ **هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** (۱۶۲)۔ اللہ وہ ہے جس نے تم سب سب انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہو گیا اور دوسرا مؤمنین کا۔ اسلام مذہب

دو قومی نظریہ

نہیں کہ ان دونوں گروہوں میں محض نظری عقائد کا فرق ہو۔ یہ تو الدین ہے جس کی رو سے کفر اور اسلام دو جداگانہ فلسفہ ہائے حیات۔ دو الگ الگ نظامائے زندگی ہیں اور مؤمن اور کافر (یعنی حزب اللہ اور حزب الشیطان) دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس نے جماعت مؤمنین کو واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ کفار تمہارے نظام کے بدترین دشمن ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہوگی کہ وہ اقل تو تمہارے نظام کو قائم ہی نہ ہونے دیں۔ اور اگر قائم ہو جائے تو اسے مٹا کر چھوڑیں۔ سو ظاہر ہے کہ جن دو گروہ دہوں کے مقاصد زندگی ایک دوسرے کے اس قدر مخالفت ہوں ان میں

کفار کے ساتھ تعلقات

باہمی دوستداری اور رائزداری کے تعلقات کس طرح قائم ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم کفار (یعنی غیر مسلموں) کے ساتھ "انسانیت" کے سلوک کی تاکید کرتا ہے لیکن ان کے ساتھ دوستداری نہ تعلقات اور رائزداری روابط سے بڑی سختی سے روکتا ہے۔ (اس سلسلہ میں جلد اول - ص ۵۹ - آیت ۱۶، ۱۷ - آیت ۱۶ دیکھئے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ
ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُوا وَيُحَذِّرُكُمْ
اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۳۷)

۳
۳۷

ظاہر ہے کہ اس نظام کی رو سے دنیا کے انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے — ایک وہ جو اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرتا چاہیں گے۔ انہیں مؤمنین کہا جائے گا۔ دوسرے وہ جو اس کی مخالفت کریں گے — یہ کفار یعنی نہ ماننے والے کہلائیں گے — ان دونوں گروہوں میں اصولی اختلاف اور مخالفت ہوگی۔

اب ظاہر ہے کہ جماعت مؤمنین کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں ہوگا کہ وہ جماعت کفار کو اپنا دوست اور رفیق بنائے۔ انہیں یہ تعلقات صرف مؤمنین کے ساتھ وابستہ رکھنے ہوں گے۔ جو ان (مخالفین کو اپنا) دوست بنائے گا، اس کا نظام خداوندی سے کسی قسم کا تعلق ہاٹی نہیں رہے گا (۱۹-۲۰، ۲۲-۲۴، ۲۶-۲۷)۔ (لہذا، اسے جماعت مؤمنین!) اتنا ہی نہیں کہ تم ان سے دستدراز نہ تعلقات نہ رکھو بلکہ تمہیں ان سے) بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے اور اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان تیار رکھنا چاہئے۔ تمہیں بڑی شدت سے خدا کے قانونِ مکافات کی احتیاط اور نگہداشت کرنی چاہئے۔ وہی تمہارا آخری مقام اور پناہ گاہ ہے۔

چونکہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی بحث جلد اول میں تفصیل سے کی جا چکی ہے اس لئے اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ زیرِ نظر آیت میں ایک ٹکڑہ ایسا ہے جس کی وضاحت نہایت ضروری ہے اور وہ ہے: إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُوا (۳۷) ان الفاظ کے غلط مفہوم کی رو سے اس آیت (۳۷) کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے

مؤمنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

(تفہیم القرآن - مودودی مرحوم) جلد اول - ص ۲۴۲ - ایڈیشن ۱۹۷۷ء

آگے پڑھنے سے پہلے ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔ آپ نے سابقہ جلدوں میں بھی دیکھا ہوگا اور اس جلد میں بھی اس سے پہلے کہ بعض مقامات پر مودودی مرحوم کی تحریروں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور زیرِ نظر آیت کا ترجمہ بھی انہی کی تفہیم القرآن

سے پیش کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات پر مودودی مرحوم کی تحریریں کو خاص طور پر پیش کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین کی تفاسیر میں بھی بہت کچھ ایسا ہے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے لیکن ہمارے ہاں کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل پر ان کا کوئی اثر نہیں۔ وہ ان سے بالعموم برگشتہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مودودی مرحوم سے بہت

مودودی مرحوم کے حوالے کیوں! متاثر ہیں اور انہیں اسلام کا صحیح ترجمان سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مودودی مرحوم نے جو کچھ قرآنی تعلیم کے خلاف لکھا ہے یہ نوجوان طبقہ اسے بھی عین اسلام سمجھ چکا ہے۔ سجد ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں سے اس قسم کی (غیر اسلامی) تعلیم کے اثرات محو کر کے اس کی جگہ صحیح اسلام ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مودودی مرحوم کی تحریریں کے حوالوں سے میرے پیش نظر یہ مقصد ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیں۔

مودودی مرحوم نے اس آیت کا جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی رو سے بات یوں ہوئی کہ عام حالات میں کفار کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طریقہ عمل اختیار کر لیا جائے تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ معاف ہے۔ یعنی ایسے حالات میں دل میں تو ان کے خلاف عداوت اور نفرت کے جذبات رکھے جائیں لیکن بظاہر ان سے دوستداری کے تعلقات کا مظاہرہ کیا جائے۔ آپ سوچئے کہ ظاہر اور باطن میں اس قسم کے تضاد کو منافقت نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا! قرآن کریم نے منافقین کی جس شدت سے مخالفت کی ہے اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ اس شدت کا یہ عالم ہے کہ اس نے جہنم کے درِ قسفل (سب سے نچلے درجہ میں کفار کو نہیں بلکہ منافقین کو بتایا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے نزدیک منافقت، کفر سے بھی بدتر ہے۔ کفر میں مخالف کھلے بندوں سامنے آتا ہے

منافقت

لیکن منافقت میں وہ دوستداری کے فریب انگیز نقاب میں پیٹھ میں چھرا گھونپتا ہے۔ کہا جائے گا کہ مودودی مرحوم اس قسم کی منافقت کو مخالفین کی ضروریوں سے محفوظ رہنے کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن منافقت دوسروں کی ضروریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہی تو اختیار کی جاتی ہے۔ اس لئے غیر مسلموں کی منافقت اور مودودی مرحوم جس قسم کی منافقت کو مسلمانوں کے لئے جائز قرار دیتے ہیں ان میں فرق کیا ہے؟ اگر فریق مخالف سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو منافقت اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ صداقت ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کا نام ہے اور اس کا صحیح ٹسٹ (TEST) خوف کی حالت میں ہونا ہے۔ اگر خوف کی حالت میں حق چھپانے کی اجازت ہو تو پھر منافقت قابلِ مذمت کیسے قرار پاسکتی ہے۔ مؤمن کا تو شعار یہ ہے کہ :

بہرِ خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے اندل سے قلندروں کا طریق

مودودی مرحوم نے اپنے اس نظریہ کے تحت کہ بحالتِ خوف منافقت اور ریاکاری کی اجازت ہے ہماری نوجوان نسل کو

مودودی مرحوم کی تعلیم | ”اسلام“ کی کس قسم کی تعلیم ہے اسکا اندازہ دو ایک مثالوں سے لگائیے۔ کوئی بیس پچیس سال

جماعت سازی کے وقت جن بلند آہنگ اصولوں کو پیش کیا تھا اب سیاست کے میدان میں پہنچ کر ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

اصول شکنی | اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کر رہا ہوں تو کون سے جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں (معاذ اللہ۔
صد بار معاذ اللہ) خود رسول اللہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے الفاظ میں :-

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے

سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی

پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اسے نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موانی اور غلام زادوں کو امارت کے مناسب

دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت

دی کہ ”الاکھۃ من قریش“۔ ”امام قریش میں سے ہوں؟ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساکین

کے ہر عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل جلد چہارم رستا ایڈیشن۔ ص ۳۲۹-۳۳۰)

انہوں نے مودودی مرحوم پر یہ الزام بھی لگایا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا :-

دروغ گوئی | راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک

بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات

میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (حوار نیچے دیکھیے)

اور اپنے اس مسلک کی تائید میں یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ (مقبول ان کے)

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جیب حضورؐ نے سامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو

بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۷ء۔ ص ۵۳۰-۵۳۱)

آپ سوچئے کہ جن نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اسلام کی یہ تعلیم راسخ کر دی جائے، ان پر مشتمل کس قسم کی قوم وجود میں آئے گی؟

مودودی مرحوم کا (آیت ۱۲۶ کا) جبر ترجمہ اور نقل کیا گیا، اس کے نیچے انہوں نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے :-

اگر کوئی مؤمن کسی دشمن اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت

ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر آمیزش کرے کہ گویا انہیں میں سے ایک آدمی ہے۔

(تفہیم احکامات۔ ایضاً۔ ص ۲۴۴)

موردی مرحوم اگر اس قسم کی تعلیم کو اپنے خیالات کے طور پر پیش کرتے تو ادربات تھی، لیکن (قیامت تو یہ ہے کہ) وہ اس تعلیم کو ارشادات خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ان خیالات کا ماخذ کیا ہے اس کی نشاندہی ان کا اگلا قسط نوٹ کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تفتیہ کرنا پڑے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہئے کہ (ایضاً)
تفتیہ شیعہ حضرات کی ایک مشہور مستمداً اصطلاح ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے مطالب الفرقان میں کسی مقام پر کوئی فرقہ وارانہ بحث نہیں چھیڑی۔ یہاں بھی میں نے شیعہ حضرات کا جو نام لیا ہے تو کسی فرقہ وارانہ نظریہ کی رو سے نہیں لیا۔ ایسا صرف یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ موردی مرحوم نے جو تفتیہ کی تلقین کی ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ تفتیہ شیعہ حضرات کی ایک اصطلاح ہی نہیں۔ ان کے ہاں یہ دین کے مسلمات بلکہ اساسات میں سے ہے۔ ان کے نزدیک تفتیہ کیا ہے اور دین میں اس کا مقام کیا اسے ہم ان کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب ”اصول کافی“ سے نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں تفتیہ کے عنوان سے ایک الگ باب ہے۔ اس میں لکھا ہے :-

(۱) فرمایا حضرت ابو جعفر علیہ السلام نے کہ مخالفین سے بظاہر میل ملت رکھو اور باطن میں مخالفت رکھو جب کہ حکومت بار پچھڑ اطفال ہو۔
(کتاب الشافی - جلد دوم - ص ۲۲۲)

(۲) حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے ابراہامیت کو اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے بلکہ چاہئے یہ کہ نا اہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں۔ ہمارے دوستوں سے ہمارا سلام کہو اور کہو کہ رحم کرے اللہ اس بندہ پر جو کجائے تفتیہ ہمارے مخالفوں سے اپنی دوستی ظاہر کرے (ص ۲۲۵)
(۳) آپ نے فرمایا اے یلیمان اتم اس دین پر ہو۔ کہ جس نے اسے چھپا یا خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا خدا نے اسے ذلیل کیا (ص ۲۲۵)
(۴) فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے کہ تفتیہ میرا دین ہے اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے۔ جس کے لئے تفتیہ نہیں اس کے لئے دین نہیں۔ (ص ۲۲۴)۔

کتاب الشافی جلد اول میں ہے :-

(۱) جس نے ابو عبد اللہ کو فرماتے سنا، جو شخص یہ جانتا ہے کہ ہم نہیں کہتے مگر حق تو اس کو چاہئے کہ اکتفا کرے اس پر جو ہم سے

۱۔ کتاب اصول کافی“ عربی زبان میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ایک ممتاز شیعہ عالم سید ظفر حسن امرہوی نے کیا ہے اور اسے شمیم بک پلو، ناظم آباد ملہ سرچی نے کتب الشافی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مندرجہ بالا اردو ترجمہ اسی کتاب سے مقبوس ہے۔

جانا ہے۔ اور اگر ہم سے کوئی بات ایسی سنی جو حکم خدا کے خلاف ہو تو سمجھ لے کہ ہم نے تم سے دشمنوں کے ضرر کا دفع چاہا ہے۔

یعنی بصورت تقیہ اس کو بیان کیا ہے۔ (ص ۲۰)

یہ ہے وہ تقیہ جس کی تلقین مودودی مرحوم نے فرمائی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیت (۱۲۲) کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس آیت کا پہلا حصہ منفی حکم پر مشتمل ہے۔ یعنی کہا یہ گیا ہے کہ تم کفار سے دوستداری کے تعلقات مت رکھو۔ اس کے دوسرے حصے میں مثبت حکم ہے جس کے لئے کہا ہے کہ اتنا ہی کافی تمہیں کہ تم ان سے قطع علائق کر لو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تم ان سے محتاط رہو اور اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرو۔ یہاں اللہ کے معنی ”بلکہ میں (حوالہ کے لئے دیکھئے الاتقان سیوطی)۔ اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ ان سے دوستداری کے تعلقات نہ رکھو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر لو۔

جہاں تک ان سے ڈر کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اس کی نفی تو خود اس سے اگلے ٹکڑے نے کر دی جہاں کہا کہ
وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ۔ یعنی ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈر تو قانون خداوندی کی خلاف ورزی سے ہونا چاہیئے۔
وَاللَّهُ الْمَصِيرُ تمہاری آخری پناہ گاہ وہی ہے۔ جسے ایسی محکم پناہ گاہ میسر ہو اسے انہوں نے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟
خدا سے ڈرنے کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد دوم، ص ۱۵۱۔ آیت (۱۲۲) میں گزر چکا ہے۔

اگلی آیت میں اس مفہوم کی تشریح اور بھی وضاحت سے کر دی جہاں کہا کہ اگر تم میں کوئی ایسا ہے جو ان مخالفین سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کرنا چاہتا (واضح رہے کہ یہ مخالفین — قریش، اپنی مسلمانوں کے بھائی بند تھے) تو بجائے اس کے کہ وہ بدل میں کچھ اور رکھے اور ظاہر کچھ اور کرے، مناسب یہ ہے کہ وہ کھلے بندوں ان سے جا ملے۔ اس کا یہ فیصلہ اور طرز عمل اس کے لئے بھی بہتر ہو گا (کہ وہ منافقت کے نفسیاتی مرض سے بچ جائے گا) اور جماعت مؤمنین کے لئے بھی بہتر کہ انہیں ناقابل اعتماد ”رَفَقَاء“ سے نجات مل جائے گی۔ فرمایا :-

قُلْ إِنْ تَخْشَوْنَ مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُونَ أَوْ يُعْلَمُهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي

الْأَرْصِطِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۲۳)

۳
۲۸

ہم نے بات بالکل واضح کر دی ہے۔ اس کے بعد جو تم میں سے سمجھتا ہے کہ وہ ان (مخالفین) سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کر سکتا (یا کرنا نہیں چاہتا) تو وہ ادھر سے ہٹ کر کھلے بندوں ان کے ساتھ جا ملے۔ یہ غلط ہے کہ تمہارے دل میں کچھ اور ہو اور ظاہراً روش کچھ اور — اس روش سے بالآخر حاصل کیا ہو گا، جب کہ حالت یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، وہ خدا کے قانون مکافات سے کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ تمہارے دل کے پردے کیا شے

میں کائنات کی ہستیوں اور بندوں میں جو کچھ ہے، وہ ان سب سے باخبر ہے۔ اور صرف باخبر ہی نہیں، سب پر کنٹرول بھی اسی کا ہے۔ کیونکہ یہ سب اس کے مقرر کردہ قوانین کے تحت رد و عمل ہیں۔

میزانِ خداوندی میں نہ ہارا فیصلہ تمہاری ظاہر اور دل کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ ان کے اعمال کی رو سے ہوگا جن میں نگاہ کی خیانتیں اور دل کے ارادے بھی شامل ہوتے ہیں :-

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ اَلْوَا
اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهَا اَمَدًا اَبْعَدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ وَاللّٰهُ سَمْعٌ وَّعَيْنٌ
بِالْعِبَادِ هُ (۳۰۹)

اس قانونِ مکافات کے مطابق، ہر شخص، ظہور نتائج کے وقت اپنے اپنے کام کے نتیجہ کو — خواہ وہ خوش آئند ہو یا ناپسند — اپنے سامنے موجود پائے گا، اگرچہ وہ ہزار جان سے چاہے گا کہ اس کے اعمال کا ناپسندیدہ نتیجہ اس سے کوئی دور رہے۔ (لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا)۔ اس لئے خدا کے قانونِ مکافات سے ہر وقت محتاط رہنا چاہئے۔

انفرادی طور پر تمہیں اس قانون کی سخت گیری شاید خوش آئند نہ ہو، لیکن اگر تم انسانیت کے مفاد کل کو سامنے رکھو، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قانونِ مکافات کی سخت گیری نوعِ انسان کے لئے باعثِ رافت و رحمت ہے۔ اس لئے کہ اگر قانونِ عدل کی گرفت ڈھیل پڑ جائے، یا وہ دغا میں برتنے لگ جائے، تو ان لوگوں کے لئے جیسا حال ہو جائے۔



سابقہ آیات میں مؤمنین، کفار اور منافقین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مقصود نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے راستہ صاف کرنا تھا۔ اس کے لئے فرمایا :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۱۰)

اب اس نظام کی عملی تشکیل کی طرف آؤ۔ اس کے لئے ان (مؤمنین) سے کہہ دو کہ اگر تم اس نظامِ خداوندی کو واقعی دل سے پسند کرتے ہو، تو تم اس کی پوری پوری اطاعت کرو اور میرے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ خدا کا نظام تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما کرے گا۔ اور تمہاری کوششوں کو ثمریاد۔ تمہاری کوتاہیوں اور نادانستہ لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون، تخریبی قوتوں کے خلاف سپر کام بھی دیتا ہے اور ان لوگوں کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔

”خدا کے ساتھ محبت“ کی تشریح مطالب الفرقان - جلد سوم - ص ۱۳۱ - زیر آیت (۱۶۵) کی جا چکی ہے۔ اس سے مراد احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ اور اس کا عملی طریق :-

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝ (۳)

پس یہ ہے، نظام خداوندی کی تشکیل و استخراج کا عملی طریقہ یعنی قانون خداوندی کی پوری پوری اطاعت۔ لیکن اپنے اپنے طور پر نہیں، بلکہ اجتماعی حیثیت سے (اس نظام کے مرکز، یعنی) رسول کے فیصلوں کے مطابق، قانون خداوندی کی اطاعت۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد بھی یہی سلسلہ قائم رہے گا اور نظام اسلامی کی اطاعت، بمنزلہ ”خدا و رسول“ کی اطاعت کے ہو جائے گی (۳)۔

”اللہ اور رسول“ کی اطاعت سے مقصود ہے اس نظام خداوندی کی اطاعت جو سب سے پہلے نبی اکرم کے مقدس ہاتھوں تشکیل پذیر ہوا تھا۔ اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ (انڈکس میں اسلام - اسلامی نظام - اللہ - اللہ - حکومت خداوندی - نظام خداوندی کے تابع دیکھیے)۔

اس آیت کے بعد ایک نیا موضوع شروع ہوتا ہے اس لئے ہم اس باب کو یہیں ختم کرتے ہیں۔



دوسرا باب

داستان حضرت مریمؑ و حضرت عیسیٰؑ

(ماں اور بیٹا دونوں انقلابی)

- ۱۔ تذکرہ حضرت زکریاؑ
- ۲۔ پیدائش حضرت یحییٰؑ
- ۳۔ حضرت مریمؑ کے کوائف حیات
- ۴۔ معبدوں اور ہیکلوں کی جیسا سوز حالت
- ۵۔ حضرت مریمؑ کا انقلابی اقدام
- ۶۔ داستان حضرت عیسیٰؑ
- ۷۔ پیدائش
- ۸۔ آپؑ کی طرف منسوب کردہ معجزات
- ۹۔ انقلابی دعوت
- ۱۰۔ ہیکل کے اجبار و رہبان اور رومن حکومت کے خلاف
- ۱۱۔ واقعہ تصلیب کی اصلیت
- ۱۲۔ مباہلہ کے معنی
- ۱۳۔ ہماری گروہ بتدیاں
- ۱۴۔ نوری انسان کی آزادی کا عظیم منشور
- ۱۵۔ بحوثِ سذت رسول اللہ
- ۱۶۔ اُمت کا فریضہ - امر بالمعروف و نہی عن المنکر

دوسرا باب

حضرت عیسیٰ کی داستانِ حیات

(ماں اور بیٹا دونوں داعی انقلاب)

(آیت ۳۲ تا ۳۴)

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَالْإِسْمَاعِيلَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۚ
ذُرِّيَّتَهُ أَعْصَمَهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۳۳-۳۴)

۳
۳۳-۳۴

ان آیات کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: "اللہ نے پسند کیا، منتخب کیا، چن لیا۔ آدم اور نوحؑ کو۔ اور ابراہیمؑ کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان سے۔ جو اولاد تھے ایک دوسرے کی۔ اور اللہ سنے والا اور جاننے والا ہے۔" اصطفتی (ماہ ص. ف. د) کے معنی ہیں: خالص کرنا، ومصطفیٰ (کسی بلند مقصد کے لئے منتخب کرنا۔ فضیلت دنیا۔ یہاں آدم کا لفظ حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے۔ اس سے (بالعموم) آدم کے نبی ہونے کی دلیل لائی جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم ص ۶۳-آیت (۱۱۱) میں لکھا جا چکا ہے اس سے یہ استدلال صحیح نہیں۔ اقل تو اس لئے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ (اصطفیٰ) غیر نبی کے لئے بھی آیا ہے۔ اور دوسرے یہاں آل ابراہیمؑ اور آل عمران کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آل ابراہیمؑ میں ہر ایک نبی تو نہیں تھا۔ اور عمران کا نام زمرہ انبیاء میں نہیں آیا، چہ جائیکہ آل عمران میں سے بھی ہر فرد نبی ہو۔ عمران کا لفظ ایک تو اسی آیت میں آیا ہے اور اس کے علاوہ دو جگہ اور۔ ایک اس آیت سے اگلی آیت میں جہاں (حضرت) مریمؑ کی والدہ کو: اِمْرَاۃٌ عَمْرٰۤیۃٌ (۱۱۲) میں جہاں پھر (حضرت) مریمؑ کو "عمرن کی بیٹی" کہا گیا ہے۔ کہا یہ جانتے ہیں کہ عمران حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام تھا لیکن ایسا بالتحقیق نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن کریم سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ لفظ خود بنی اسرائیل۔ یا ان کے کسی خاص قبیلے کے لئے بولا جاتا تھا۔ آیت (۱۱۲) میں (حضرت) مریمؑ کو اُحْمَرُوْنَ کہا گیا ہے۔ اس سے بھی ان کا بنی اسرائیل سے متعلق ہونا ظاہر ہے۔ اور (۱۱۲) میں اِمْرَاۃٌ کے معنی

ہوتی کئے جائیں تو عمران حضرت مریم کے والد کا نام قرار پائے گا اور انہیں اسی نسبت سے "عمران کی بیٹی" (۶۶) کہا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب آل عمران کو آل ابراہیم سے الگ کہہ کر پکارا گیا ہے تو اس سے مراد بنی اسرائیل ہوں گے کیونکہ وہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حضرت ابراہیم کی ذریت ہی سے تھے لیکن وہ اپنی نسبت (حضرت) ابراہیم کے بجائے، حضرت یعقوب (اسرائیل) کی طرف کرتے تھے۔ اصل میں شاخ اسرائیل ہویا شاخ اسماعیل ان سب کا سلسلہ (تورات کے بیان کی رو سے) حضرت نوحؑ ہی سے شروع ہوتا ہے۔

میرے خیال میں آیت (۲۲) میں مختلف انبیاء کرام کے بجائے "مختلف ادوار کا ذکر ہے۔ اسی لئے میں نے ان آیات (۳۳-۳۴) کا مفہوم یوں پیش کیا ہے :-

جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے (۲۲)؛ یہ نظام پہلی بار نہیں بھیجا گیا۔ اس مقصد کے لئے، مختلف زمانوں میں، مختلف حضرات اور اقوام کو منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً، انسان کی تمدنی زندگی کا ابتدائی دور جسے "داستان آدم" کے مثیلی انداز میں بیان کیا جا چکا ہے (۳۰-۳۸)۔ پھر دعوت نوحؑ کا دور۔ آل ابراہیم کا دور۔ اسی کی ایک شاخ، آل عمران (یعنی سلسلہ موسیٰ و ہارون) کا دور اور اب آل ابراہیم کی دوسری شاخ، آل اسماعیل کا دور آیا ہے۔

یہ سب ایک دوسرے کی نسل سے تھے۔ ان کا یہ انتخاب یونہی عمل میں نہیں آگیا تھا۔ نہ ہی اس بناء پر کہ ان کا تعلق کسی خاص نسل سے تھا۔ یہ اس خدا کی طے کردہ اسکیم کے مطابق ہوا تھا جو سب کچھ سننے والا، اور تمام حالات کا جاننے والا ہے۔

سورہ آل عمران کا عمودی موضوع حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی داستان حیات ہے۔ اگرچہ ان کی داستان کے مختلف کوائف قرآن مجید کے متعدد مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن چونکہ اس کی ابتداء سورہ آل عمران سے ہوتی ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان سے متعلق واقعات ایک ہی مقام پر درج کر دیئے جائیں تاکہ یہ تمام منتشر گوشے یک جا سامنے آجائیں۔ لیکن اس سے پہلے حضرت زکریا اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰ کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ خود حضرت مریم کی مہیکل کی زندگی کی داستان کا آغاز دکنڈھا نہ کدیا (۲۴) سے ہوتی ہے۔ یعنی "خدا نے اسے زکریا کی کفالت میں دے دیا۔"

حضرت زکریا (علیہ السلام)

قرآن مجید میں حضرت زکریا کی داستان حیات اس نقطہ کے گرد گردش کرتی ہے کہ وہ سن رسیدہ ہو چکے تھے لیکن ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں (حضرت) یحییٰ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ حضرت زکریا کے دل میں اولاد کی خواہش تو (نقائے بشریت کے تحت) غالباً اکثر رہتی ہوگی لیکن اس نے جن حالات میں ایسی شدت اختیار کی، کہ وہ دعا بن کر ان کے ہوں

پر آگئی، قرآن کریم نے اسے بڑے حسین اور بلیغ نفسیاتی انداز سے بیان کیا ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) حضرت مریمؑ کو ان کی ماں نے بچپن ہی میں سہیل کی نذر کر دیا تھا اور وہاں اسے حضرت زکریاؑ کی کفالت میں دے دیا گیا تھا۔ وہ بچی ان کے لئے بمنزلہ بیٹی کے تھی اس لئے وہ اس سے بزرگ نہ پیار اور پدرانہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن اس قسم کی باتیں کرتے کرتے، ان کے دل میں اپنی اولاد کی آرزو نے جوش مارا تو:-

هٰذَا لَكَ دُعَاؤُكَ يَا رَبِّهٖ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ (۳۸)

۳
۳۸

اسی دقت انہوں نے خدا سے دعا کی کہ، اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے بھی اپنے ہاں سے اچھی (طیب) اولاد عطا فرما۔ ہینک تو دعاؤں کا سننے والا ہے۔

ان کی دعا ابھی لبوں پر تھی کہ

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهِيَ قَائِمَةٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِرَبِّیْهِ
مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا مَّحْصُورًا ۚ اَوْنِدْبًا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳۹)

۳
۳۸

وہ ابھی قربانگاہ میں کھڑا خود دعا تھا کہ ملائکہ نے آواز دی اور کہا کہ اللہ تمہیں ایک بیٹے (یحییٰ) کی بشارت دیتا ہے۔ وہ تو نبی خداوندی کو سچ کر دکھانے والا ہو گا۔ ایک بڑی جماعت کا لیڈر۔ صاحب نظم و ضبط۔ اور بلند صلاحیتوں کا مالک بنی۔

یہاں محراب کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں مساجد میں محراب وہ جگہ ہے جہاں امام کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں یہ سہیل یا معبد میں ایک خاص مقام ہوتا تھا۔ اس لفظ کا مادہ (ح۔ر۔ب) ہے جس کے معنی جنگ کرنے یا خون بہانے کے ہیں۔ یہودیوں کے مراسم عبادت میں قربانی (بلکہ سوختنی قربانی) کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

محراب

اس کے لئے ان کے معبد میں ایک مخصوص مقام ہوتا تھا جہاں جانوروں کی قربانی دی جاتی تھی (ان کا خون بہایا جاتا تھا)۔ اس مقام کو محراب کہتے تھے۔ حضرت زکریاؑ اس مقام پر کھڑے ہوئے دعا تھے کہ ملائکہ نے بیٹے کی بشارت دی۔ محراب یہودیوں کے معبد میں قربانگاہ تھی لیکن ہم نے اپنی مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کے لئے جو جگہ مخصوص کی تو اسے محراب کہہ کر پکارنے لگے۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف من جانب اللہ، ملائکہ کی وساطت سے کس طرح وحی آتی تھی، اس کی حقیقت کے متعلق ہم نہ کچھ جان سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے۔ وحی خاصہ نبوت تھی اور کوئی غیر نبی اس کی کتبہ و ماہیت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس موضوع پر

اب جس طرح امامت کے لئے باہمی جھگڑے ہوتے ہیں اور نوبت سر بھڑتل تک پہنچ جاتی ہے تو اس سے ”محراب“ پھر سے اپنے حقیقی معانی (جنگاہ) کا مظہر بن گیا ہے۔

سابقہ جلدوں میں شرح و بسط کے ساتھ بحث ہو چکی ہے (انڈکس میں متعلقہ مقامات دجی - نبوت - رسالت وغیرہ دیکھئے)۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ملائکہ نے کس طرح حضرت زکریاؑ سے کلام کیا۔ قرآن کریم وحی کو کلام اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ حضرت زکریاؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹے کی جو بشارت ملی تو اس میں ایک نکتہ بڑا لطیف ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِحَسْبٰی۔ ہماری نگاہ تو یہیں ٹپکتی ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بیٹے کا نام یحییٰ تھا اور ان کا شمار زمرۃ انبیاء میں ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تمہیں یحییٰ کی بشارت دی جاتی ہے۔ حضرت یحییٰ کی پیدائش سے پہلے تو ان کا نام یحییٰ نہیں تھا۔ بچے کا نام تو اس کی پیدائش کے بعد رکھا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یحییٰ کیوں کہا؟

بڑھاپے کی اولاد۔ اور وہ بھی اکلوتا بیٹا جو دعائیں مانگ کر ملا ہو، وہ ایسا پیارا اور گونا گونا باب اور بے بہا مزارع ہوتی ہے کہ ماں باپ ہر وقت اس کی خیریت کے لئے متفکر رہتے ہیں۔ وہ خدا سے دعائیں کرنے رہتے ہیں کہ مولانا تعالیٰ! تو نے یہ بیٹا عطا کیا ہے تو اسے زندگی عطا کرنا۔ یہ جتنا رہے۔ خیر خیریت سے رہے۔ ماں باپ کا یہی نفسیاتی خدشہ ہوتا ہے جس سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہم غیر شعوری طور پر ایسے بچوں کا نام ”جیونا“ اللہ رکھا۔ اللہ دتہ۔ وغیرہ رکھتے ہیں۔

یحییٰ حیات ہی سے ہے۔ اس کے معنی ہیں جیتا رہنے والا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لفظ میں کس طرح ایک بیٹے کی بشارت کے ساتھ حضرت زکریاؑ کے بڑھاپے کے دساؤس کی بھی تسکین کا سامان فراہم کر دیا! حضرت زکریاؑ نے ”طیب اولاد“ کے لئے دعا مانگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ہی اس ہونے والے بچے کی ان خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جن سے اس کے ”طیب“ ہونے میں کوئی کلام نہیں رہتا۔

حضرت یحییٰ کی خصوصیات پہلی خصوصیت سیداً (مادہ - س. و - د) سواد، قوم کے بہت بڑے حصے یا کثیر تعداد کو کہتے ہیں اور سید، صاحب سواد کو۔ یعنی وہ سردار جس کے ساتھ بہت سی جماعت ہو۔ دوسری خصوصیت حصّہ (مادہ - ح. ص - م) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ”روک دینے“ کے ہوتے ہیں۔ یہیں سے محصور حصّہ وغیرہ کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔ محصور کے معنی اپنے آپ پر ضبط رکھنے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن سید (قوم کا سربراہ) ہونے کی جہت سے، اس کا مفہوم ”نظم و ضبط رکھنے والا“ زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جو اپنے آپ پر بھی کنٹرول رکھے اور اپنی جماعت پر بھی۔ ضبط خویش، نظم و ضبط جماعت کی اولیں شرط ہے۔

اس کے ساتھ ہی صالح۔ یعنی جس کی انسانی صلاحیتیں برومند ہو جائیں۔ اور سب سے آخر (بلکہ اول) نبوت۔

ان خصوصیات کا حامل، جیتا رہنے والا بیٹا، (حضرت یحییٰ علیہ السلام)

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی خوشخبری تو سن لی لیکن بشریت کے تقاضوں سے جو خیالات ان کے دل میں ابھرے قرآن کریم نے ان کا ذکر نہایت لطیف انداز سے کیا ہے۔ ۳۹ قَالَ رَبِّ آتِنِي كُتُوبًا غُلَامًا (۳۹)۔ یہاں آتی کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ کہا کہ بارالہا! میرے ہاں اولاد ہونے کا یہ کون سا وقت ہے؟ وَقَدْ بَلَغَتْنِي الْكِبَرُ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اتنا ہی نہیں۔ وَاصْرَافَتِي عَاقِرًا۔ اور میری بیوی بانجھ ہے؟ تو ان موانعات کے باوجود، کیا مجھے سچے معجز کا بیٹا عطا ہوگا یا جس طرح یہ بیٹی مریم مجھے ملی ہے، اسی طرح کا بیٹا ملے گا! جواب ملا کہ كَذٰلِكَ اَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۳۹)۔ نہیں۔ تمہارے ہاں وہ بیٹا اسی طرح پیدا ہوگا جس طرح ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سابقہ جلدوں میں بتا چکے ہیں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین کے سامنے جب ایسی آیات آتی ہیں جن میں مایشاء یا ما نشاء کے الفاظ آتے تو ان الفاظ کا ترجمہ ”جیسے چاہتا ہے“ اور ”جیسے چاہتا ہے“ کر کے، یہ لکھ دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں لیکن ہم سابقہ جلدوں میں (وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایسا کچھ اپنے قانونِ مشیت کی رو سے کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں اس قانون سے مراد قوانینِ فطرت یا طبیعی قوانین ہیں اور انسانی زندگی میں اس سے مطلب قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ مخلوق خداوندی میں خدا کا ہر فیصلہ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں: كَذٰلِكَ اَفْعَلُ مَا يَشَاءُ کے متعلق بھی ہمارے مفسرین اور مترجمین نے یہی کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ”ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں“ اور اس کے بعد کہا کہ خدا نے انہیں اپنی مشیت سے بیٹا عطا کر دیا۔ لیکن اگر (اور تو اور صرف) اولاد کے معاملہ میں ہی مایشاء کا قرآنی مفہوم سامنے رکھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے :-

يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ اِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذَّكَوٰرَ ۚ اَوْ يَزْوِجُہُمْ ذُكْرًا اَوْ اِنَاثًا ۚ يَفْعَلُ

مَن يَشَاءُ عَقِيْمًا ۚ اِنَّہٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (۵۰-۴۹)

اس کا ترجمہ کیا جانا ہے :-

وہ بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹیاں اور بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹے۔ یا انہیں دیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں اور کر دیتا ہے جس کو چاہے بانجھ۔ اب میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ انہوں نے تحقیق کر لیا ہے کہ لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے اور لڑکا کیوں۔ جوڑے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور عورت یا مرد بانجھ کس طرح ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے مایشاء کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ قصہ حضرت زکریاؑ میں تو خود قرآن کریم نے ”كَذٰلِكَ اَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ کی تفسیر بیان کر دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

وَأَصْلَحْنَا لَهُ، ثُمَّ ذُجِّهَ (۲۷)۔ زکریا میں تو کوئی نقص نہیں تھا۔ اس کی بیوی میں نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اصلاح ہو گئی۔ یعنی مناسب علاج کرنے سے وہ نقص دور ہو گیا اور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ أَصْلَحْنَا لَهُ میں دونوں باتیں آ جاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ حضرت زکریا میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کی بیوی میں نقص تھا۔ سو اس کی اصلاح ہو گئی اور وہ بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ ہے مائشعہ کی تفسیر۔ یعنی خدا کے قانون طبعی کے مطابق اس پر حضرت زکریا نے خدا سے عرض کی۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا
رَمْزًا وَذَكَرُكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَابْتَغِ الْوَسِيلَةَ (۲۸)

۳۰

زکریا نے کہا کہ اس باب میں میرے لئے کوئی خاص حکم ہو تو فرما دیجئے۔ خدا نے کہا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم تین دن تک اچھے بھلے ہونے کے باوجود، لوگوں سے اس بات کو نہ کہو (۲۸)۔ قانون خداوندی کو شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو۔ اور باقی (جس طرح تمہارا معمول ہے) اپنے ذوق کی تکمیل میں صبح و شام مصروف رہو۔

یہودیوں میں روزہ کی حالت میں بات کرنا بھی ممنوع تھا (۱۹)۔ حضرت زکریا کو جو کہا گیا کہ تین دن تک لوگوں سے بات نہ کرو۔ تو غالباً انہیں روزہ رکھنے کے لئے کہا گیا ہو گا۔ (ذکر۔ اور تسبیح کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ انڈکس کی مدد سے وہاں دیکھ لیا جائے)۔

انجیل میں حضرت زکریا کا ذکر | اس مقام کے علاوہ حضرت زکریا کا ذکر آیات (۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰) میں بھی آیا ہے۔

ان آیات میں کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کا ذکر یہاں ضروری ہو۔ حضرت عیسیٰ کا ذکر (۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰) میں آیا ہے۔ یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ انجیل میں حضرت زکریا کو کاہن کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً لوقا کی انجیل میں ہے :-

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ایساہ کے فریق سب سے زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون

کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشیع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سامنے حکموں اور

قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کی اولاد نہ تھی کیونکہ الیشیع یا تھتھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔۔۔۔۔ (لوقا ۱-۵)

یہودیوں کے مہیکل میں کہا نت بہت بڑا منصب تھا۔ کاہن پیش گوئیاں کرنے والے کو کہتے تھے اس لئے ان کے ہاں نبی کی اصطلاح رائج

لے قانون طبعی کے مطابق اولاد پیدا ہونے کی ایک نہایت بلیغ دلیل عیساہیوں کے عقیدہ ابن اللہ کی تردید میں آگے چل کر سامنے آئے گی۔

تھی جس کا ترجمہ کاہن کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بہت سے نامور بزرگوں کے لئے نبی کا لفظ آتا ہے، لیکن قرآن کریم میں نبی کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے نبوت پانے والا۔ بنا بریں، بعض وقت یہودیوں کے کسی ”نبی“ اور قرآنی نبی میں التباس ہو جاتا ہے۔ ہمیں انہی حضرات کو نبی کہنا چاہیے جنہیں قرآن مجید میں زمرہ انبیاء کرام میں تبصریح شامل کیا گیا ہے۔ ان کے سوا، یہودیوں کے نبی ”کاہن“ تھے۔

حضرت یحییٰ کو انجیل میں یوحنا پتسمہ دینے والا (JOHN, THE BAPTIST) کہہ کر پکارا گیا ہے اور انہیں ایک فقیر بادی نشین کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رد سے، حضرات انبیاء کرام، رامہب اور درویش نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو بڑی عظیم انقلاب آور شخصیتیں ہوتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن نے حضرت یحییٰ کو سید اور حضور کہا ہے۔ یعنی ایک کثیر جماعت کا سربراہ جو ان کا نظم و ضبط قائم رکھتا تھا۔ اس جماعت کے متعلق تو ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا؛ جسے تاریخ نے ایسینی (ESSENEES) سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت یحییٰ اس جماعت کے سربراہ تھے اور ان کا مقصد یہودیوں کی مستبد حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنا تھا۔ چند سال اُدھر اٹلی کے ایک نامور مؤرخ (MARCELLO CRAVERI) نے حضرت عیسیٰ کی سوانح عمری (LIFE OF JESUS) کے نام سے شائع کی تھی جو بعض اہم حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتی ہے وہ اس میں حضرت یحییٰ کے متعلق رقمطراز ہے :-

(حضرت یحییٰ) نظم و نسق حکومت کی خواہیوں کو ایک ایک کر کے گتاتے اور لوگوں سے کہتے کہ اب یوم مکانات قریب ہے۔ ظالموں کی حکومت کا شجرِ خبیثہ جڑ سے کٹ جائے گا (اس جہاد میں) بنی اسرائیل سب کے سب ختم ہو جائیں تو بھی اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جس کے ہاتھوں باطل کا تختہ الٹ جائے گا (P-83)۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ”وعظ“ ایک فقیر بادی نشین کے نہیں ہو سکتے۔ ایک عظیم مصلح (خدا کے رسول) کے انقلاب آفریں اعلانات جنگ قرار پا سکتے ہیں۔ اور یہی رسول کا منصب ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلابی زعمیم کو حکومت کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے (معلوم ہوتا ہے کہ) اس نے انہیں قتل کرا دیا۔ لیکن انجیل نے اسے بھی (حسب معمول) انسانی رنگ دے دیا ہے۔ متی کی انجیل میں ہے :-

اس وقت چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودس نے یسوع کی شہرت سنی اور اپنے خادموں سے کہا کہ یہ یوحنا پتسمہ دینے والا ہے۔ وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے اس لئے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہیرودس نے اپنے بھائی فیلس کی بیوی ہیرودیس کے سبب یوحنا کو پکڑ کر باندھا اور قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے کہ یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ اس کا رکھنا تجھے روا نہیں۔ اور وہ ہر چند اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ اسے نبی جانتے تھے۔ لیکن جب ہیرودس کی

سالگرہ ہوئی تو میرودیا سس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر ہیرودس کو خوش کیا۔ اس پر اس نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا کہ جو کچھ تو مانگے گی، تجھے دوں گا۔ وہ اپنی ماں کے سکھانے سے بولی کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر تھال میں ہمیں مجھے منگوا دے۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور ہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ اور آدمی بھیج کر قید خانے میں یوحنا کا سر کٹوا دیا اور اس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا۔ اور وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی۔ اور اس کے شاگردوں نے اس کی لاش اٹھالی اور اسے دفن کر دیا۔ اور جاکر یسوع کو خبر دی۔ (متی کی انجیل باب ۱۴ - آیات ۱-۱۲)

یہ قصہ پھر شاعروں اور ادیبوں کے ہتھے چڑھا اور ”قص سلوی“ کے نام سے وجہ رنگینی مجالس بنتا چلا گیا۔ لیکن قرآن کریم میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔



حضرت مریم (علیہا السلام)

زیر نظر سورہ (آل عمران) میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی داستانِ حیات بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے اس داستان کو خاص اہمیت دی ہے (جس کی وجہ آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ اس لئے اس نے اسے (زیر نظر سورہ کے علاوہ) دیگر متعدد مقامات پر بھی اسے جستہ جستہ بیان کیا ہے۔ لیکن (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کی اہمیت، نیز اصول تعریف آیات کے پیش نظر اس مکمل داستان کو اسی مقام پر سامنے لے آیا جائے۔ اس میں ذرا سی دشواری یہ ہے کہ بعض مقامات پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کا ذکر الگ الگ آیا ہے اور بعض مقامات میں ان دونوں کے کوائف یک جا ہیں۔ اس کا حل یہ نظر آتا ہے کہ پہلے حضرت مریم کے سوانح حیات پیش کر دیئے جائیں اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے احوال و کوائف کے ضمن میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے وہ مقامات (داستان حضرت عیسیٰ کے ساتھ) سامنے لے آئے جائیں۔ اس سے یہ منتشر موتی، سلک گہر کی طرح زینتِ دہ اور ارق اور فروغِ دہ اربان ہو جائیں گے۔

حضرت مریم کا ذکر قرآن مجید میں

① — پیدائش، نام، اور ہیكل کی نذر - (۳۶-۳۷)

② — ہیكل کی زندگی میں رزق - (۳۶)

③ — (صطفیٰ و فضیلت) - (۳۱)

④ — ہیكل کے پیاریوں کی مشرّعہ اندازی - (۳۳)

- ⑤ _____ ملائکہ کی طرف سے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری (۳۴-۳۳)۔
- ⑥ _____ یہودیوں کی طرف سے بہتان (۱۵۶) د (۱۹)۔
- ⑦ _____ حضرت عیسیٰ کی پیدائش (۱۹-۱۶)۔
- ⑧ _____ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ، آیات میں (۹۱) د (۲۳)۔
- ⑨ _____ بنت عمران (۶۶)۔
- ⑩ _____ حفاظت عصمت (۹۱) د (۶۶)۔

داستان حضرت مریم کے سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر اہمیت کیوں دی

۳
۳۱

ہے — ایسی اہمیت کو فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكَ ذَظَهَرَكَ وَاصْطَفٰكَ عَلٰی نِسَاء الْعٰلَمِیْنَ" (۳۱)۔ انہیں اس

دور کی (یا اقوام عالم کی) دوسری عورتوں پر فضیلت اور برگزیدگی عطا فرمائی۔ یہ بہت بڑا امتیاز ہے جو انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی کون سی خوبی

اس قدر برگزیدگی کی وجہ

تھی جس کی بناء پر انہیں اس قدر عظیم فضیلت کا اہل قرار دیا گیا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اولوالعزم نبی کی والدہ تھیں اس لئے انہیں مستحق فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو جہہ تو قابل تسلیم قرار نہیں پاسکتی۔ والدہ تو ہر نبی کی تھی۔ سو اگر نبی کی والدہ ہونا مستحق فضیلت قرار پاتا ہے تو ہر نبی کی والدہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے (حضرت مریم کے علاوہ) حضرت موسیٰ کی والدہ کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں کہ انہوں نے حکیم خداوندی کی اطاعت میں اپنے نوزائیدہ بچے کو دریا میں بہا دیا، (۲۷)۔ ایک اولوالعزم نبی کی والدہ ہونے کے علاوہ ان کا یہ عمل کہ انہیں نے حکیم خداوندی کی اطاعت میں اپنی مانتا کو قربان کر دیا، وجہ تحسین تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسطقی کا مستحق انہیں بھی قرار نہیں دیا۔ والدہ ہونا تو ایک طرف نبی کے ساتھ کوئی رشتہ بھی قرآن کریم کی رو سے، معیارِ تکریم اور وجہ فضیلت قرار نہیں پاتا۔ اس کی رو سے وجہ تکریم جو ہر ذاتی ہے نہ کہ محض رشتہ داری۔ جہاں تک رشتہ داری کا تعلق ہے، قرآن کریم نے حضرت نوح کے بیٹے، حضرت ابراہیم کے باپ اور حضرت لوط کی بیوی کا، ان کے کفر اور معصیت کی وجہ سے مجرمین کی صف میں شمار کیا ہے (۶۶) اور ان انبیاء کرام کے ساتھ ان کی رشتہ داری نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اس کے برعکس اس نے فرعون جیسے "اِنَّا دَکُمُ الْاَعْلٰی" کے مدعی کی بیوی کا تذکرہ اس کے ایمان کی وجہ سے تحسین و ستائش کے ساتھ کیا ہے (۶۶)۔ لہذا، معیارِ خداوندی کی رو سے کسی نبی کا رشتہ دار ہونا وجہ فضیلت قرار نہیں پاسکتا۔ (مولانا) جاتھی کے الفاظ میں۔

بندی عشق شدی ترک نسب کن جاتی! کہ دیں ماہ قلال ابن قلال چیزے نیست

لہذا، حضرت مریمؑ کی فضیلت اس بنا پر نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں۔

اس سے بڑھ کر وجہ فضیلت یہ ”معجزہ“ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں بن باپ کے بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے کے عقیدہ کے متعلق تو بعد میں بات کی جائے گی، اس مقام پر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر حضرت مریمؑ کے ہاں بن باپ بیٹا پیدا ہوا تھا تو یہ معجزہ کس کا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہ حضرت مریمؑ کا معجزہ نہیں تھا کیونکہ مرد کے اختلاط کے بغیر استقرار حمل اور بچے کی پیدائش میں ان کا (حضرت مریمؑ کا) کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس لئے یہ ان کا معجزہ کیسے قرار پاسکتا ہے؟ اگر یہ واقعہ کسی (CREDIT) کا مستحق تھا تو حضرت مریمؑ کو اس کا (CREDIT) کس طرح پہنچ سکتا تھا؟ حضرت مریمؑ تو ایک طرف اسے تو حضرت عیسیٰؑ کا بھی معجزہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ (مرد جب عقیدہ کے مطابق) ان کے بن باپ پیدا ہونے میں ان کا بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اگر یہ معجزہ تھا تو اسے بہر حال اللہ تعالیٰ کا معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن آپ کچھ وقت کے لئے اپنے جذبات کو الگ رکھ کر سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس معجزہ کے دکھانے کے لئے جو طریق اختیار فرمایا اس نے اس معصوم بچی (مریمؑ) کو کتنی مشکلات میں مبتلا کر دیا! آپ سوچئے کہ اگر ایک جوان، ناکتخدا (غیر شاہی شدہ) لڑکی کو حمل قرار پا جائے اور اس طرح اس کے ہاں لڑکا بھی پیدا ہو جائے، تو معاشرہ

بن باپ پیدائش کے عقیدہ کا اثر

میں اس کی حالت کیا ہوگی؟ کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہے گی؟ کیا وہ اپنے گھر والوں کے ہاں جاسکے گی؟ کیا وہ اس معاشرہ کا سامنا کر سکے گی۔ سوچئے کہ اس کی زندگی کس قدر اجیرن ہو جائے گی۔ کہا جائے گا کہ اس میں حضرت مریمؑ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایسا اللہ تعالیٰ نے کر دیا تھا۔ لیکن ایسا کہتے وقت اس پر غور کیجئے کہ کیا حضرت مریمؑ کے پاس اس کا کوئی ثبوت تھا کہ اس حمل میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ ایسا خدا نے کر دیا ہے۔ کیا وہ اسے کسی صورت میں بھی ثابت کر سکتی تھیں؟ وہ تو ایک طرف رہیں، کیا حضرت عیسیٰؑ بھی کسی طرح یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ان کی والدہ اس باب میں بے گناہ ہیں اور ان کا حمل خدا کی طرف سے تھا۔ اگر انہوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا تھا — جو نہیں کیا تھا — تو سوال دعویٰ کرنے کا نہیں۔ سوال تو اس دعویٰ کی صداقت کے لئے ثبوت بہم پہنچانے کا تھا۔ ایسا ثبوت جس سے معاشرہ مطمئن ہو جائے کہ حضرت مریمؑ واقعی بے گناہ تھیں۔ ان کا حمل خدا کی طرف سے تھا۔ آپ سوچئے کہ اگر اسے خدا کا معجزہ سمجھا جائے تو اس معجزہ کے مضمرات کیا تھے؟ پھر ایسا معجزہ جسے کوئی معجزہ مانے ہی نہیں اور اسے معجزہ ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل اور ثبوت نہ ہو، اس معجزہ کا مقصد کیا تھا؟ اب بھی جو لوگ (خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان) حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اسے عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ اسے کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے۔ لہذا، یہ بات بھی حضرت مریمؑ کے لئے وجہ فضیلت قرار نہیں پاسکتی۔



قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ وَالَّتِي أَحْصَتْ
فَرْجَهَا د ۶۱، ۶۲) اور اسی کو ان کے لئے وجہ فضیلت قرار دیا ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حفاظتِ عصمت بینکِ پاکیزہ کردار کے لئے ضروری ہے لیکن اس میں حضرت مریمؑ کی کون
سی انفرادیت تھی؟ دنیا میں بدکار لوگوں کو چھوڑ کر، اکثریت ان کی ہے جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں مرد بھی شامل
ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ تو یہ بھی کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس میں حضرت مریمؑ کی پوزیشن منفرد ہو۔

اور یہی وہ نکتہ ہے جسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم نے حفاظتِ عصمت کے سلسلہ میں دو نمایاں کردار پیش کئے ہیں۔ مردوں میں سے حضرت یوسفؑ اور عورتوں میں سے
عورتوں میں سے حضرت مریمؑ۔ داستانِ حضرت یوسفؑ میں آپ ان حالات پر نگاہ ڈالئے جن میں انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت
کی تھی۔ وہ مصر کے گورنر (عزیز مصر) کے گھر میں ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس کی بیوی نے ان پر ڈور سے ڈالنے

شروع کئے۔ لیکن وہ اس کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہوئے۔ اس نے اپنی اس مذموم کوشش
میں ہر قسم کا حربہ آزما کر دیکھ لیا حتیٰ کہ معاشرہ کے ممتاز گھرانوں کی اور عورتیں بھی اس کی
دم سادہ ہو گئیں۔ اس نے انہیں کمرے کے اندر گھیر کر اس کے دروازے بند کر دیئے۔ وہ اس پر پلا چھڑا کر بھاگ نکلتے۔ جب ترغیب سے
کام نہ نکلا تو وہ ترہیب پر اتر آئی۔ اس نے انہیں قید تک کی دھمکی دے دی۔ لیکن ان کے پلئے استقامت میں اس سے بھی ذرا
نغزش نہ آئی۔ حتیٰ کہ اس نے انہیں قید کرا دیا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت یوسفؑ نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ لہذا، محض
حفاظتِ عصمت کوئی ایسی امتیازی خصوصیت نہیں جسے وجہ فضیلت قرار دیا جائے۔ اس قسم کے حالات میں — ترغیبات کی
ہر کشش کو ٹھکراتے اور ترہیبات کے ہر خطرہ کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے حفاظتِ عصمت فی الواقعہ مستحق تحسین و تہنیک ہوتی
ہے۔ اور اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن کریم نے اس پاکیزہ داستان کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے تاکہ وہ نوعِ انسان کے لئے
نمونہ کا کام دے۔

حضرت مریمؑ کے ضمن میں معاملہ اس سے بھی سخت تھا۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے اس پس منظر کا سامنے لانا بیحد ضروری
ہے جس میں یہ واقعہ سرزد ہوا تھا۔ اور یہ قصہ تفصیل طلب ہے۔



یہودی معاشرہ میں فحاشی پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی معاشرہ میں فحاشی اور اخلاق باختگی اس قدر عام ہو چکی
تھی کہ ان میں عصمت کی اہمیت کا احساس تک باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس معاملہ میں اس

قدر و درود فراموش ہو چکے تھے کہ اپنی فحاشیوں کو ”شرعاً جائز“ قرار دینے کے لئے اپنے اسلاف کے مذہبی پیشواؤں کی نجی زندگی کی نہایت شرمناک تصاویر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ قطع نظر ان حیا سوز افسانوں کے جو خود تورات میں بعض انبیاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، ہم ان کو الفت و احوال میں سے دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں جو انسائیکلو پیڈیا آف ریسیٹر اینڈ انٹیکس (جلد سوم) میں عصمت (CHASTITY) کے زیر عنوان درج ہیں۔ آپ نے ہندوؤں کے مندروں میں ”دیو داسیوں“ کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ جوان لڑکیاں اپنی زندگی دیوتاؤں کی ”خدمت“ کے لئے وقف کر دیتی ہیں اور مندر کے ہجاریوں اور یا تواریوں (نارٹین) کی جنسی ہوس کی تسکین کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کے ہاں اس مذہبی فحشہ گری

مذہبی فحشہ گری

(RELIGIOUS PROSTITUTION) کا رواج تھا (اور ہے) اسی طرح یہودیوں کے ہاں بھی یہ قبیح رسم

عام تھی۔ ان کے معابد (TEMPLES) میں اس قسم کی عورتیں یہی ”فرائض“ سرانجام دیتی تھیں۔ مستند ادیب کہ ان کے ہاں اس قسم کے مرد بھی ہوتے تھے اس سے تو ہم لوہ کی جو حیا سوز داستان قرآن کریم میں مذکور ہے وہ باسانی سمجھ میں آجائے گی۔ ان عورتوں کو (QEDESHAM) اور ان مردوں کو (QADESHOTH) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ عورتیں (اور غالباً مرد بھی) اپنی آمدنی یہودواہ (یہودیوں کے خدا) کی نذر کر دیتی۔ عام طور پر ان عورتوں کی شادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اگرچہ بعض اوقات ایسا کر بھی لیا جاتا تھا انسائیکلو پیڈیا مذکورہ۔ جلد سوم۔ ص ۲۹۷۔ یہودیوں کے ہاں ایک قصہ مشہور تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ تمر (TAMAR) نامی ایک فاحشہ عورت کس طرح (QADESHAH) کا بھیس بدل کر (ENAIM) غالباً کسی معبد کا نام ہے) کے دروازے پر بیٹھ گئی اور اس طرح اس نے یہودہ (JUDAH) کو اپنے دام تزدیر میں پھنسا لیا۔ (ایضاً۔ ص ۲۹۷)۔ واضح رہے کہ (JUDAH) حضرت یعقوب کے چوتھے بیٹے کا نام تھا جس کی طرف نسبت کر کے بنی اسرائیل اپنے آپ کو یہودی کہتے تھے۔ گویا مذکورہ بالا واقعہ ان کے اس مقدس مورث اعلیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔

مذکورہ صدر انسائیکلو پیڈیا میں مشہور یونانی مؤرخ (HERODOTUS) کے حوالے سے، فلسطینیوں کے عام معاشرہ

کے متعلق لکھا ہے:-

اس ملک کی ہر عورت کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ کسی معبد میں اجنبی مرد سے جنسی اختلاط کرے۔ اس ”قریبہ“ کی ادائیگی ہر طبقہ کی عورتوں کے لئے لازمی تھی، حتیٰ کہ ان عورتوں کے لئے بھی جو امراء کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بڑے شانہ انداز سے وہاں جاتی تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ یہ سب عورتیں اپنے سر پہ ایک تاگہ لپیٹ کر درو قطاروں میں ایک

دوسرے کے آنے سے جانے جاتیں اور درمیان میں راستہ چھوڑ دیتیں۔ اجنبی یا تریوں میں سے جس کی پسند میں جو عورت آجاتی وہ اس کی طرف چاندی کا سکہ پھینک دیتا اور اس سے (معبد کی) دیوی کے نام پر خود سپردگی کا مطالبہ کرتا۔ اس پر وہ اس کے ساتھ ہولیتی اور اس کی جنسی ہوس کا تقاضا پورا کرتی۔ (جلد سوم - ص ۹۸)۔

مذہبی پیشواؤں کی حالت | یہ تو تھا عام پبلک کا حال۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت ان سے بھی گئی گزری تھی۔ یہودیوں کے ہاں مذہبی پیشواؤں میں ربتی (RABBI) کا مقام خاصا بلند تھا۔ مذکورہ صدر

انٹیکلوپیڈیا میں لکھا ہے :-

کہا جاتا ہے کہ ربتی (ABBAR ARIKA) جب بھی (DARDAESHIR) کو ملنے جاتا تو عام منادی کرا دی جاتی کہ کیا کوئی عورت اس کے قیام کے دوران اس کی بیوی بننے کے لئے تیار ہے؟ اسی طرح کا اعلان ربتی (NACHMAN) کے لئے بھی کیا جاتا جب وہ (SHECHANZIB) کی ملاقات کے لئے جاتا۔ جب ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ حالت تھی، تو ان کے عوام کی بے راہ روی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں زندگاری روزمرہ کا معمول بن چکی تھی۔ یہ شلم کی تباہی کے زمانے میں زانیوں کی اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ ربتی (JOHANAN) نے اس کی سزا کا خیال ہی ترک کر دیا تھا (ایضاً ص ۹۸)۔

ان دو چار مثالوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ ان میں مرکزی حیثیت یروشلم کے ہیکل کو حاصل تھی۔ یہودیوں کے ہاں شروع میں خانقاہیت (MYSTICISM) کا رواج نہیں تھا اس لئے ہیکل شرعی رسوم و مناسک ہی کا مرکز تھا۔ اس کی حیثیت خانقاہ (MONASTERY) کی نہیں تھی۔ یہ بعد کی اختراع تھی۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہاں یہ رواج حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کچھ ہی عرصہ پہلے شروع ہوا تھا۔ ابتداء ہیکل میں صرف (مرد) راہب ہونے لگے تھے جو عمر بھر تہجد کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے۔ (قرآن کریم نے ان کے احبار، علماء، کے ساتھ رہبان۔

ہیکل کی راہبات | مشائخ کا ذکر بھی کیا ہے۔ ۹۸)۔ اس کے بعد وہاں راہبات کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا (جیسے عیسائی خانقاہوں میں (NUNS) ہوتی ہیں)۔ شروع میں ہیکل کا ضابطہ یہ تھا کہ راہبات زمانہ قبل از بلوغ تک ہیکل میں رہتی تھیں پھر اس میں بہتر تعلیم کی گئی کہ انہیں ساری عمر راہبہ کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔ عام حالات میں انہیں تجربہ کی زندگی بسر کرنی ہوتی تھی لیکن بعض خاص حالات میں ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ ان کی شادی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ نہ تو ان پجاریوں کی جماعت سے باہر کسی سے شادی کر سکتی تھیں اور نہ ہی ہیکل کو چھوڑ کر جاسکتیں۔ اس ضابطہ کی خلاف ورزی مندرجہ جرم کا ارتکاب قرار پاتا تھا ان کی شریعت کسی راہبہ کی پجاریوں کے باہر کسی مرد سے شادی کو جائز نہ سمجھتی تھی۔ اس سے وہ زنا تصور کرتے تھے اور اس کی اولاد کو ولد الزنا۔

اس پس منظر میں داستانِ حضرت مریمؑ کی طرف لوٹیں۔

یہودیوں کے ہاں ایک طبقہ تھا جسے نذریین یا مندریین کہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ یا تو خود اپنے آپ کو خدا کی نذر کر دیتے تھے یا ان کے اہل خاندان ایسا کر دیتے تھے۔ بعض اوقات والدین بچے کی ولادت سے پہلے ہی اسے نذری بنا دیتے تھے اور وہ ساری عمر نذری رہتا تھا۔ نذریوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ عہدِ شباب ہی میں ان کا مرتبہ انبیاء کے برابر ہو جاتا ہے۔ ولادتِ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں نذریوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ لوگ ہیکل میں یا دیگر معابد اور خانقاہوں میں راہبوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، پہلے تو صرف مرد راہب ہوتے تھے لیکن بعد میں لڑکیاں بھی راہبہ بن جاتی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والدین کا تعلق اسی فرقہ سے تھا۔ یہیں سے قرآنِ کریم داستانِ حضرت مریمؑ کا آغاز کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۳۳)

۳
۳۳

جب آلِ عمران کی ایک عورت نے اپنے بچہ کی منت مانی کہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے کو تمام دنیوی علاقوں سے آزاد کر کے تیرے لئے وقف کرتی ہوں (کہ وہ تیرے مقدس گھر، ہیکل کی خدمت کرے)۔

والدہ حضرت مریمؑ کی منت

اے میرے پروردگار! تو میری اس نذر کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تو سب

کچھ جاننے والا ہے اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس حسنِ نیت اور خلوص سے یہ منت مانی ہے۔

قرآنِ کریم نے ایک لفظ (مُحَرَّرًا) سے دنیا داری کی زندگی اور راہبوں کی زندگی میں واضح فرق کر کے بتا دیا۔ راہب دنیاوی علاقوں سے آزاد ہو کر، یعنی دنیا ترک کر کے (گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے)۔

اس کے بعد ہے:-

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ وَلَئِنَّ الذَّكَرَ لَأَكْرَمُ ۚ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي مُسَوِّمُهَا مَرْيَمَ ۖ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ (۳۴)

۳
۳۵

اس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ، لڑکا ہوگا، جو ہیکل کا راہب بن جائے گا۔ اور اپنی پوری عمر اس خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ لیکن اس کے ہاں پیدا ہوئی لڑکی! اس سے اس کے دل میں خیال گزرا کہ لڑکا پیدا ہوتا

تو زیادہ اچھا تھا۔

لیکن خدا کو خوب معلوم تھا کہ اس کے ہاں جو لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ کن خوبوں کی مالک تھی، اور اس نے، آگے چل کر، خانقاہیت کی غیر خداوندی قیود کو توڑنے میں، کتنے بڑے انقلاب کا موجب بنا تھا۔ لہذا، اگر وہ لڑکا ہوتا تو، اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر حال اس کی ماں نے کہا کہ میں اس کا نام مریم رکھتی ہوں۔ اور اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کرتی ہوں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے اور (جب یہ بعد میں شادی کرے تو) اس کی اولاد کو، شیطان مردود کے سادس سے محفوظ رکھے۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اگرچہ راہبات (لڑکیاں) بھی ہیکل کی خدمت کرتی تھیں لیکن اسباب (مرد) بہر حال ان سے بہتر خدمات سرانجام دے سکتے تھے۔ اس اعتبار سے حضرت مریمؑ کی والدہ نے دل میں کہا کہ اگر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ لیکن اس لڑکی نے جس طرح لڑکے سے بہتر ثابت ہونا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی مقام پر اس کا بالتصریح ذکر نہیں کیا۔ ایمائی انداز میں کہا کہ **وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَصَّعَتْ**۔ اس کی والدہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی جو خدا جانتا تھا۔ یہ ویسا ہی انداز تھا جیسا تخلیق آدم کے منہ میں ملائکہ کے اعتراض کے جواب میں کہا گیا تھا کہ **اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** (پڑھ)۔ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے“ (تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد دوم میں گزر چکی ہے)۔

دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں ہیکل کا قانون یہ تھا کہ راہبات سن بلوغ تک ہیکل میں رہتی تھیں۔ اس کے بعد وہ عام نیادی زندگی بسر کر سکتی تھیں۔ اس لئے حضرت مریمؑ کی والدہ نے (حضرت مریمؑ اور اس کی اولاد کو دسائس شیطانی سے محفوظ رہنے کی دُعا مانگی تھی۔

(حضرت مریمؑ کی والدہ نے سچی کا نام مریم رکھا۔ مریم سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ یا عابدہ اور خدا مہ کے ہیں۔

لیکن حضرت مریمؑ کے کوالت حیات کو سامنے رکھ کر، عربوں کی نگاہ ایک اور طرف بھی گئی۔ وہ: **اَلْمَرْیَمُ مِمَّنْ اَنۡشَا** اس عورت کو کہتے تھے جو نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرے لیکن مردوں کے ساتھ (جرات اور بیباکی سے) بائیں کر سکے۔ حضرت مریمؑ کی یہی خصوصیت تھی جس کی بناء پر انہوں نے تحیر انگیز انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

حضرت مریمؑ کی والدہ نے خدا کے حضور یزید رائے پیش کیا اور :-

ملہ ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ عام خیال بھی کارفرما ہو جس کی رو سے لڑکے کو بہر حال لڑکی سے بہتر سمجھا جاتا ہے "خوا کی بیٹیاں" بیچاری

شروع سے معتبہ چلی آرہی ہیں۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (۳۴)۔

اس کے رب نے اس کی منت کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور مریم کی پرورش اور نگہ پر داحت کا نہایت عمدہ انتظام کر دیا۔
یعنی اسے زکریا جیسے نیک اور پاکباز ان کی کفالت میں دے دیا۔

اس طرح (حضرت) مریم، ہیکل میں پرورش پا کر جوان ہوئی اور اپنی پاکباز زندگی کی بنا پر مقتدرین اور ہیکل کے زائرین کا مرجع بن گئی۔
لیکن اس مقام پر قرآن کریم ایمائی انداز میں ایک ایسی بات کہہ گیا ہے جس سے نگاہ کا رخ اور سمت مڑ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہیکل کے پجاریوں نے راہبات سے متعلق مضابطہ میں یہ ترسیم کر لی تھی کہ راسیہ کو ان پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنی ہوگی جب شادی کا "شرعی جواز" موجود ہو تو پھر (ان پجاریوں کی) نگاہوں کا آلودہ ہو جانا چنداں مستعد نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس راہبہ (مریم) کو حضرت زکریا کی کفالت سے نکال کر اپنی کفالت میں لے لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس "کفالت" کے پردہ میں ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس مقصد کی طرف بھی قرآن مجید نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس باب میں ان میں باہمی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی اور جب تصفیہ کی کوئی اور صورت باقی نہ رہی تو انہوں نے طے کیا کہ قرعہ ڈال لیا جائے جس سے نام کا قرعہ نکل آئے اسی کی تحویل میں اس لڑکی کو دے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس داستان کے ضمن میں رسول اللہ سے فرمایا کہ یہ تمام باتیں آپ کو وحی کے ذریعہ بتائی جا رہی ہیں ذالک من انباء الغیب نوحيه اليك۔ ورنہ :-

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ (۳۴)

۳
۳۳

اے رسول! تو ان پجاریوں کے پاس نہیں تھا جب وہ (مریم کی کفالت کے لئے) قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ نہ ہی تو اس وقت ان کے پاس تھا جب وہ اس معاملہ میں باہمی جھگڑا کر رہے تھے۔

آپ ہیکل یا خانقاہ کے اس ماحول پر نگاہ ڈالیے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ یہودیوں کے پیشواؤں کی جنسی ہوسائیل کو بھی سامنے رکھیے۔ مندرجہ بالا جھگڑوں اور قرعہ اندازیوں کی لم سمجھ میں آجائے گی اور حضرت زکریا (جن کی کفالت میں لڑکی اب تک تھی) کے ان خدشات کا بھی اندازہ ہو جائے گا جسے قرآن مجید میں اشارتوں بیان کیا ہے کہ

كَلَّمَاهَا عَلَىٰ نَبَاتٍ مُّكْرَرٍ ۖ أَلَمْ تَرَيَا الْيَتِيمَ إِنَّا لِلِّهِ هَدً ۖ

۳
۳۶

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ بِرُزُقِهِ عَلِيمٌ ۖ

جب کبھی زکریا کا گزر عبادت گاہ کے اس گوشے کی طرف ہوتا جہاں مریم مقیم تھیں اور وہ اس کے پاس کھانے پینے کی

ہیکل میں رزق | چیزوں کو دیکھتا تو اس سے پوچھتا کہ (بیٹی!) تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں۔ اللہ اپنی مشیت کے پیمانوں کے مطابق اس طرح

سامان رزق مہیا کر دیتا ہے جو عام طور پر لوگوں کے دہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

حضرت زکریا کے اس قسم کے سوالات سے مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہیکل کے پجاریوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں جو اس طرح مریم کے زیادہ قریب آنا چاہتا ہو؟ حضرت مریم بھی ان کے سوال کی لم کو پالیتیں اور انہیں مطمئن کر دیتیں کہ اس قسم کے شبہات اور خدشات کی کوئی بات نہیں، معتقدین اور دائرین انہیں بربنائے عقیدت یہ چیزیں ”فی سبیل اللہ“ دے جاتے ہیں اس لئے آپ کسی قسم کا وسوسہ دل میں نہ لائیے۔ ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میری طرف اس قسم کی پیش رفت کر سکے۔ میں انہیں خوب پہچانتی ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے اپنی حفاظت کر سکوں۔ آپ بے فکر رہیے۔

مندرجہ بالا آیت میں جو حضرت مریم نے کہا ہے کہ ”هو من عند الله“ (یہ چیزیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں) تو ہمارے مفسرین

عند اللہ رزق

نے ”حسب عادت“ اسے بھی عجیب و غریب معانی پہنائے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا (حضرت) مریم کی کوٹھڑی پر سات سات تالے ڈال دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، جب ریل ان چیزوں کو حضرت مریم کو دے جاتے تھے، (اس طرح کہ خدا کے نبی، حضرت زکریا تک کو بھی اس کا علم نہیں ہونے پاتا تھا! بالجب!) ایسے انسانوں سے ان (مفسرین) حضرات کے ذوق العجب و پسندی کی تسکین تو بیشک ہو جاتی ہے لیکن وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اس سے (یعنی اس بات سے کہ حضرت زکریا ان کی کوٹھڑی پر سات سات تالے لگا دیا کرتے تھے) حضرت مریم کے متعلق (معاذ اللہ) کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے! — اس مریم کے متعلق جس کی حفاظت عصمت کو خدا و جبرِ مطلق قرار دیتا ہے! ”هو من عند الله“ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ آپ آج بھی کسی خانقاہ کے درویش سے پوچھئے کہ آپ کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟ تو وہ بلا تامل جواب دے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے۔ وہ ہر ایک کا رزاق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جسے وہ صاحب، اللہ کی طرف سے (من جانب اللہ) کہتے ہیں وہ ان کے معتقدین کے پیش کردہ نذرانے ہوتے ہیں۔ یہی بات راہبہ مریم نے کہی تھی۔

اس مقام پر ایک ثانیہ کے لئے رُکئیے اور (حضرت) مریم کی قلبی کیفیت کو سامنے لائیے۔ وہ اب جوان ہو چکی تھیں۔ خانقاہ

کی زندگی میں کنواری راہبات کی طرف پجاریوں کی لچائی ہوئی نظریں جس بری طرح اٹھتی تھیں، وہ انہیں اچھی طرح بجانتی تھیں۔

وہ ان (بظاہر) مقدس پجاریوں کی زیرِ نقاب اور پس پردہ زندگی کا سرور و مشاہدہ کرتی تھیں کہ وہاں ”ہر گرج کو ہے برہ معصوم

کی تلاش“۔ وہ یہ بھی دیکھتی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کس طرح اسے اپنی تحویل میں لینے کے لئے کوشاں ہے۔ ان حالات میں اس

پاکباز، معصوم لڑکی کے احساسات کو سامنے لائیے۔ وہ ان ہوس پرستوں کے خود ساختہ ”قوانین شریعت“ کی رو سے ہیکل کو جھوٹ

نہیں سکتی تھی۔ وہ ہیکل سے باہر کسی مرد سے حسب منشاء شادی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہیکل کے پجاریوں کی سیرت و کردار کے پیش نظر وہ ان میں سے کسی کے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ سوچئے کہ وہ کس قدر بے بس تھی۔ کس قدر پابزنجیر تھی۔ وہ دن رات اسی کشمکش میں مبتلا رہتی تھی۔ جب اس کے قلبی اضطراب نے انتہائی شدت اختیار کر لی تو سنت اللہ کے مطابق، اس کے دل میں خدا کی طرف سے یہ اطمینان پیدا کر دیا گیا کہ وہ گھیرائے نہیں۔ ایسے سالانہ پیدا کر دیئے جائیں گے کہ وہ ہیکل کی ہوس کا رانہ فضا سے نکل کر اپنی مرضی کے مطابق، گھر کی پاک اور صاف زندگی بسر کرے اور اس طرح راہ درسم خانقاہیت کے خلاف جہاد کر کے اپنے دور کی تمام عورتوں (بالخصوص رامیات) سے ممتاز ہو جائے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں :-

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ۝ (۳۱)

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا :-

اور جب ملائکہ نے مریم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ وہ تمہیں نہایت پاکیزہ زندگی عطا کرے گا اور تم اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے ممتاز ہو جاؤ گی۔

یہاں ہم نے طہرہ کے مفہوم، پاکیزہ زندگی عطا ہونا لیا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ مذہبی پیشوا اور یہودیوں کا معاشرہ تیرے خلاف جو الزامات تراشے گا اور بہتان لگائے گا، وہ بھی سب دور ہو جائیں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے حضرت مریم کو پیغام دیا۔ ملائکہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم میں تفصیل سے لکھا گیا ہے

(انڈکس مدد سے حوالے دیکھ لئے جائیں) وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ملائکہ، مؤمنین کے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرنے کا بھی موجب بنتے ہیں۔ مثلاً جنگ بدر کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جب معرکہ شدت اختیار کر گیا تو خدا

نے ملائکہ سے کہا کہ مجاہدین کو تائید و خمدی کی بشارت دو لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ (۳۱) کہ اس سے ان کے دلوں کو اطمینان

سکون حاصل ہو جائے : فَتَبَشِّرُوا الَّذِينَ آمَنُوا (۳۲) اور ان کے پاؤں جم جائیں۔ انہیں استقامت حاصل ہو جائے

جو میدان جنگ میں کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ سورہ توہ میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے (۳۳) سورہ صحر

میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ اس طرح کا نزول ملائکہ خاص خاص شخصیتوں تک محدود

نہیں۔ ایسا نزول عام مؤمنین پر بھی ہوتا ہے۔ فرمایا :-

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا

وَابَشِّرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ هُمْ اُولَئِكَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْعُوْنَ ۝ (۳۱-۳۲)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے، اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں (۳۱-۳۲) اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۱۲۵-۱۲۷، ۱۲۸-۱۳۰، ۱۳۱-۱۳۲)۔

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے ہوگا جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقین حکم اور عمل پریم کا)۔ اسی انداز کا نزول ملائکہ حضرت مریم کی طرف بھی ہوا تھا۔ (ملائکہ کا ایک اور مفہوم ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔

واضح رہے کہ ملائکہ کا ایک فریضہ وحیِ خداوندی کو حضراتِ انبیاء کی طرف پہنچانا بھی تھا۔ لیکن یہ صرف انبیاء تک محدود تھا۔

نبوت مردوں تک محدود تھی | غیر انبیاء کی طرف وحی نہیں آتی تھی۔ (اس کی تفصیل مابلقہ جلدوں میں وحی — رسالت کے عنوان کے تحت دیکھئے) حضرت مریم نبی نہیں تھیں (ایسے

بھی نبوت مردوں تک محدود تھی)۔ (۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱)۔ ملائکہ کی طرف سے اس قسم کی بشارتیں کس طرح ملتی ہیں ہم اسے نہیں جان سکتے۔ لیکن قرآنِ کریم سے اتنا واضح ہے کہ مقصد ان سے قلوب میں نفسیاتی تغیر و اطمینان و سکون پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی قسم کا اطمینان حضرت مریم کے دل میں بھی پیدا کر دیا گیا جو شکستِ پیغم سے طلسمِ بیچ و تاب نہیں رہا تھا۔ انہیں اس کا اطمینان ہو گیا کہ انہیں ہیکل کی رہبانیت کی زندگی چھوڑ کر، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں کہا گیا ہے۔

يٰۤاٰمَرُؤِمُ اَقْنَبِيْ لِرَبِّكِ وَاَسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ۝ (۳۳)۔

اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرے اور خالقِ ہیت کی غیر خداوندی پابندیوں کو توڑ کر، اپنی فطری صلاحیتوں کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا تہیہ کرے۔ اور یوں، اس تجرد اور علیحدگی کی زندگی کو چھوڑ کر اسی طرح قوانینِ خداوندی کی پابندی کرے جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ باقی دنیا سے کٹ کر خالقِ ہیت کی زندگی بسر کرنا، اطاعتِ خداوندی نہیں۔

ہیکل کو چھوڑنے کا فیصلہ اور اقدام کس قدر عرصہ طلب اور صبر آزمائش تھا اور یہ مرحلہ کس قدر جانکاه اور کٹھن تھا، اس کا ہم آج صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس میں حضرت مریمؑ کے لئے سب سے پہلے خود اپنے خلاف جنگ لڑنے کا مرحلہ تھا۔ وہ ایک انتہائی مذہب پرست گھرانے کی بچی تھی۔ اس لئے شریعت کے احکام کی پابندی کا احساس بچپن ہی سے اس کے رگ و پے میں حلول کر چکا تھا۔ پھر وہ مندرجہ (ہیکل کی نذر کردہ) تھی اس لئے راہبہ کی زندگی اس کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ بتا بریں یہ معتقدات اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ ان اعتقادات کے خلاف قدم اٹھانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اور پھر وہ بھی ایک عورت، بلکہ یوں کہیے کہ ایک راہبہ کے لئے!

ہیکل کی ان پابندیوں کو توڑ کر (حضرت) مریمؑ نے اسی معاشرہ میں رہنا تھا۔ سب سے پہلے خود اپنے والدین کے ہاں جنہوں نے اسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا سوال یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو، جو راہ درسم خانقاہ بیت کو توڑ کر آئی ہے، کس طرح قبول بلکہ برداشت کر سکیں گے؟ پھر عام معاشرہ میں بھی وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔

سب سے سخت مخالفت کا اندیشہ مذہبی پیشواؤں (بالخصوص ہیکل کے بجا رہیوں) کی طرف سے تھا۔ ان کا "شرعی اقتدار" بڑا سخت گیر تھا۔ اول تو ایک راہبہ کا ہیکل کو چھوڑ جانا ہی کچھ کم خلاف شریعت نہ تھا۔ پھر اس کا کسی عام آدمی سے شادی کرنا تو ناقابل معافی جرم تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ اس قسم کے نکاح کو شرعاً جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لہذا، ان کی طرف سے جو کھرام چپنا اور بچایا جانا تھا، اس کا تصور بھی بڑا ڈراؤنا تھا۔ علاوہ ازیں، ان کا سیاسی اقتدار بھی کچھ کم نہ تھا۔ انہیں ہر قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل تھے اور صرف منرائے موت کے لئے رونی گورنر کی توثیق کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سے کم ہر قسم کی منراہہ خود سے سکتے تھے۔ اور موت کی سزا کی صورت میں گورنر کی تصویب محض رسمی سی ہوتی تھی۔

یہ تھے مستقبل کے متعلق اس فیصلے کے عواقب جو حضرت مریمؑ کے پیش نظر تھا۔ سوچیے کہ یہ کتنا بڑا ابتلا تھا۔ اور وہ بھی ایک معصوم لڑکی کے لئے!

لیکن وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کی تعلیم و تربیت نے اس کے اندر انقلابی روح پھونک دی تھی۔ اس نے آنے والے ان تمام خطرات اور خدشات کا اچھی طرح اندازہ لگایا، اور اس کے بعد خدا کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے یَسْمِدُ اللّٰہِ مَجْبِرٌ بِہَا وَ مُسَرِّہَا کہہ کر، اپنے آپ کو ان طوفانوں کے حوالے کر دیا، اور اس طرح اس انقلاب کی بنیاد رکھ دی جس نے انہوں کی خود ساختہ رسم خانقاہیت کی زنجیروں کو توڑنا تھا۔ ماں (حضرت مریمؑ) نے اس انقلاب کی ابتداء کی اور (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) نے اس کی تکمیل کر دی۔ یہی وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ماں بیٹے دونوں کو آیات اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۲۳)

اب یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو اس قدر بلند مقام کیوں عطا فرمایا تھا۔ وہ فی الحقیقت اس کی مستحق تھیں۔

حضرت مریمؑ کے بقایا کو اللہ حیات، حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ جلیلہ کے ضمن میں آئیں گے جو اب زینتِ دہ قرطاس ہیں۔
(ضمناً) آیت (۳۱) کا وہ حصہ تو پہلے آچکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مہیکل کے پجاری حضرت مریمؑ کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے کس قدر ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔ اسی آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ (۳۱) ”اے رسول! ان واقعات کا علم ہم تمہیں بذریعہ وحی دے رہے ہیں“ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ (بلکہ دیگر انبیاء کرام) کے سلسلہ میں جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے اکثر و بیشتر مقامات پر وہ تورات اور انجیل میں بیان کردہ واقعات سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ توراۃ اور انجیل وغیرہ کتب سابقہ میں تحریف ہو چکی ہے اس لئے ان میں بیان کردہ واقعات صحت پر مبنی نہیں۔ صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی قرآن کریم کے اس دعویٰ کو چیلنج کرتے رہے اور تحدی کے ساتھ کہتے رہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے کہ جو واقعات اس میں مذکور ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کے بالمقابل توراۃ اور انجیل میں بیان کردہ واقعات محرف ہیں۔

قرآن میں بیان کردہ واقعات کی صداقت

اس سے پہلے تو اس قسم کا ثبوت پیش کرنا مشکل تھا لیکن اب جو جدید ریسرچ (تحقیق) کا دروازہ کھلا ہے تو خود یہودی اور عیسائی محققین نے جو انکشافات کئے ہیں وہ تورات اور انجیل میں بیان کردہ واقعات کی تغلیط کرتے ہیں اور قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات کی تائید۔ اس قسم کی تحقیقاتی کتابیں اب بکثرت شائع ہو رہی ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی خود ہی اپنے سابقہ دعاوی سے دست بردار ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں قرآنی دعاوی کی تصدیق خود اس کے مخالفین کی تحقیقات کی رو سے ہوتی جا رہی ہے۔



حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)

حضرت عیسیٰؑ نبی تھے قرآن مجید میں ان کا شمار زمرۂ انبیاء کرامؑ میں کیا گیا ہے (۶/۸۶، ۳۳/۲، ۱۳/۱۳)۔ ہم ان کی نبوت پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ یعنی کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول اللہ کے ساتھ تمام انبیاء کی نبوت پر بھی ایمان نہ لائے۔ یہی حضرت عیسیٰؑ کا صحیح مقام ہے اور نبوت و رسالت سے بلند تر مقام اور کو نہا ہو سکتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں انہیں ایسی خصوصیات کا حامل قرار دیا جاتا ہے جس میں کوئی اور رسول شریک نہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ (۱) وہ بن یاپ کے پیدا ہوئے تھے۔ (۲) وہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ اور (۳) وہ قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے اور (۴) امام مہدی کی معیت میں اسلام کا غلبہ ان کے ہاتھوں ظہور میں آئے گا۔ ان عقائد کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے جزو ایمان بن گئے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک بات سے بھی انکار کرے تو اس پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاتا ہے اور اسے دائرۃ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کسی عقیدہ کی اس سے بڑھ کر اہمیت کیا ہوگی کہ اسے مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کی شرط قرار دے دیا جائے؟ یہ عجیب ماجرا ہے کہ عیسائیوں میں ایسے ایسے مؤرخ، محقق اور مصنف گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں، جو ان میں سے کسی بات کے بھی قائل نہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان کے قائل نہیں بلکہ وہ اپنی تحقیقات کی رو سے ان کی کھلے بندوں تردید کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ اس کے باوجود عیسائی انہیں دائرۃ عیسائیت سے خارج نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ان سے انکار کرتا ہے، اور قرآن کی سند کے ساتھ انکار کرتا ہے، تو اسے دائرۃ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے، مسلمانوں میں ان عقائد نے اس قدر اہمیت اور شدت کیوں اختیار کر لی، یہ نکتہ گہرے غور و غوض سے سمجھنے کے قابل ہے۔

نبی اکرمؐ نے جب قرآن مجید دنیا کے سامنے پیش کیا تو یہودیوں اور عیسائیوں پر اس کی براہ راست زد پڑتی تھی۔ وہ اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیم کو اس کے مقابل لاہی نہیں سکتے تھے۔ وہ کتابیں محض تھیں اس لئے ان کی تعلیم، خدا کی خالص وحی کی حریت ہو نہیں سکتی تھی (قرآن مجید نے جو چیلنج دیا تھا کہ اس کی دیا کم از کم اس کے کسی حصے کی) مثل اور نظیر لا کر دکھاؤ، تو اس چیلنج کو انہوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کو قرآن کریم سے افضل کیا، اس کا ہم پایہ بھی ثابت نہیں کر سکتے، تو انہوں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ اور وہ ترکیب یہ تھی کہ اپنے نبیوں (حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ) کو مسلمانوں کے نبی (رسول اللہ) سے افضل ثابت کر دو۔ اس سے مسلمان مات کھا جائیں گے۔

لیکن قرآن کریم کی رو سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہی حربہ استعمال کیا جس سے اسلام کی صحیح تعلیم اور گوشوں میں بھی مسخ کی گئی تھی۔ یعنی انہوں نے تھوڑی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری وضعی روایات کے ذریعے کتب روایات میں اس طرح داخل کر دیا کہ انہوں نے احادیث رسول اللہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب ان کے لئے میدان صاف تھا۔ مسلمان جب بھی ان کے مقابلہ میں آئے۔ وہ اپنی کتابوں سے ایسی احادیث پیش کر دیتے

جن سے ان کے رسول، حضور نبی اکرمؐ سے افضل ثابت ہوں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مناظروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان مناظروں میں وہ ہماری کتب روایات سے ان احادیث کو پیش کرتے تھے اور مسلمان مناظران کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ان وضعی روایات کے اس شدت اور کثرت سے پیش کئے جانے کا نتیجہ تھا کہ یہ عقائد مسلمانوں کا جزو و ایمان قرار پا گئے۔

یہودیوں کی سازش | یہودیوں نے اس باب میں کیا کیا، اس کی تفصیل مطالب القلندر، جلد سوم، ص ۸۶-۸۷ زیر آیت ۲ دی جا چکی ہے۔ مختصر یہ کہ

۱۔ انہوں نے مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام کیا کہ حضور نبی اکرمؐ (نبوت ملنے کے بعد) قریب پندرہ برس تک کعبہ کے بجائے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے بیت المقدس کا مقام (کعبہ کے مقابلہ میں) کس قدر بلند ہو جاتا ہے؟ چنانچہ ہمارے ہاں اب تک بیت المقدس کو قبلہ اول کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

۲۔ شب معراج میں حضورؐ کعبہ سے بلوہ راست آسمانوں کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔ پہلے بیت المقدس گئے۔ وہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا اجتماع ہوا۔ وہیں سے حضورؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور پھر وہیں واپس آئے۔ اس سے بھی کعبہ کے مقابلہ میں، بیت المقدس کی عظمت واضح ہے۔

۳۔ شنب معراج، اللہ تعالیٰ نے دن رات میں سچاس نمازیں فرض کیں اور حضورؐ اس تحفہ خداوندی کو لے کر واپس تشریف لے آئے۔ راستے میں حضرت موسیٰؑ ملے اور انہوں نے کہا کہ اتنی نمازیں آپ کی اُمت سے نہیں پڑھی جائیں گی۔ خدا کے حضور جانیے اور انہیں کم کرائیے۔ اس پر حضورؐ حضرت موسیٰؑ کے کہنے پر کس طرح بار بار بارگاہ خداوندی میں تشریف لے گئے، اس کی تفصیل جلد سوم (حوالہ مذکور میں) گزر چکی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ کی پوزیشن حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں کیا نظر آتی ہے!

۴۔ انہوں نے اس قسم کی روایات وضع کر کے ہماری کتابوں میں شامل کر دیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان ان روایات کی سند سے انکار کر دیں گے کیونکہ ان کے نزدیک سند اور حجت قرآن مجید تھا اور قرآن مجید میں اس قسم کی کوئی بات مذکور نہیں اس کے لئے انہوں نے یہ پیش بندی کی کہ اپنے اس عقیدہ کو کہ وحی خداوندی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وحی کتاب اللہ میں درج ہوتی ہے اور دوسری وحی کتب روایات میں مسلمانوں میں بھی عام کر دیا۔ (اس کی تفصیل اندکس میں وحی کے زیر عنوان دیکھئے)۔ اس طرح انہوں نے ان روایات کو وحی خداوندی کا درجہ دے دیا کہ مسلمان ان سے انکار ہی نہ کر سکیں۔ حالانکہ ان (مسلمانوں) کے ہاں یہ عقیدہ بھی رائج ہو گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان)۔

عیسائیوں کی سازش

یہ کچھ یہودیوں نے کیا۔ عیسائیوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ ۱۱ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ (۲) وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اور (۳) قیامت کے قریب دوبارہ نازل ہوں گے۔ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی قرآن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے بھی روایات وضع کیں جن میں ان عقائد کو حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا اور پھر ان روایات نے ہماری کتب احادیث میں جا پالی۔ اس طرح یہ عیسائیوں کے عقائد ہی نہ رہے۔ خود مسلمانوں کے عقائد بھی بن گئے۔ اب عیسائی مناظروں کے لئے مقابلہ کی بڑی گنجائش نکل آئی۔ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے رسول کا (معاذ اللہ) ہمارے رسول سے مقابلہ کرو۔

۱۔ ہمارے رسول کی پیدائش معجزہ۔ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ تمہارے رسول عام انسانوں کی طرح، سلسلہ توالد کے ذریعے پیدا ہوئے، کہو! کون بڑا ہوا؟

۲۔ ہمارا رسول زندہ آسمان پر موجود ہے اور تمہارا رسول زیر زمین مدفون۔ کیسے کون بڑا ہوا؟

۳۔ تمہارے رسول کا دعویٰ تھا کہ ان کا لایا ہوا دین، تمام ادیان پر غالب آئے گا۔ یہ دعویٰ نہ تمہارے رسول کے ہاتھوں پورا ہوا، نہ ان کی امت کے ہاتھوں۔ یہ ہمارے رسول کے ہاتھوں پورا ہو گا۔ کیسے کس کا مقام زیادہ بلند ٹھہرا؟

۴۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے صحابی (حواری) ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مسلمان عیسائی مناظروں پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ تھا تمہارے رسول کی تعلیم کا نتیجہ؟ نیکے پاس اس کا کوئی جواب نہ

حواری اور صحابہ

تھا کیونکہ یہ بات انجیل میں موجود تھی۔ اس کا جواب ایک وضعی روایت کی رو سے بخاری میں داخل کر دیا۔ اس میں کہا گیا ہے:-

حضرت ابن عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ

کئے حشر میں اٹھائے جاؤ گے۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیم ہیں۔ اس دن

میرے کچھ صحابہؓ بائیں جانب (جہنم کی جانب) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ اس پر اللہ فرمائے

گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے (یعنی مرتد ہو گئے تھے) جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں

کہوں گا، جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰ) نے کہا تھا کہ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ۔

الحی قولہ العنیز الحکیم۔ (بخاری۔ اردو ترجمہ۔ جلد دوم ص ۱۲۹)

اس سے وہ مسلمان مناظروں کا منہ بند کر دیتے تھے۔ (اس روایت کے وضع کرنے میں اور کیا مقصد پوشیدہ تھا اس کی بابت آگے چل کر بات کی جائے گی)۔

وہ یہ دعویٰ کرتے تھے (اور کرتے ہیں) اور مسلمان ان کی تردید نہیں کر سکتے تھے (نہ کر سکتے ہیں) کیونکہ یہ ان کی کتب روایات

میں موجود ہیں اور ان کی اہمیت اس قدر ہے کہ ان سے انکار کرنا بالاد اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ جواب ان کا قرآن کریم سے دیا جاسکتا تھا لیکن قرآن تو ہمارے ہاں غلافوں میں لپیٹ کر زینت و طاق لسیاں بنا دیا گیا ہے۔

علاوہ انیس ایک اور بات بھی غور طلب اور تأسف انگیز ہے۔ اس دورِ علم و بصیرت میں عیسائیت ان عقائد کی بنا پر بات کھا رہی ہے۔ اسلام کو اس کے مقابلہ میں نکھر اور ابھر کر بلند ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن جب ہم ان عقائد کو اسلام کا جزو قرار دے دیتے ہیں تو ہم بھی مفت میں مات کھا جاتے ہیں۔ اس طرح اسلام، عیسائیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس قسم کی وضعی روایات عیسائیت کو کس قدر فائدہ اور اسلام کو کس قدر نقصان پہنچانے کا موجب بن رہی ہیں؟ میرے ہاں مغربی ممالک کے عیسائی مفکر، مؤرخ اور سائنسدان آتے ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ان عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کس قسم کے دلائل دیتے ہیں۔ میں جب ان سے کہتا ہوں کہ قرآن مجید اس قسم کے عقائد کی تائید نہیں کرتا تو انہیں حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ جب اسلام کو قرآن خالص کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ لیکن دائے افسوس کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اسے کفر سے تعبیر کرتی ہے!

میں نے حضرت عیسیٰ کے کوالف حیات، قرآن کریم، کتب اناجیل اور عیسائی مؤرخوں کی تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں بڑی شرح و بسط سے مرتب کر کے اپنی کتاب ”شعلہ مستور“ میں شائع کئے ہیں۔ اس کتاب سے اس پیامبر انقلاب کی منترہ زندگی نکھر کر سامنے آ جاتی، اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پھیلے ہوئے غلط (خلاف قرآن) عقائد کی تردید ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب (مطالب الفرقان) میں ان موضوعات کے متعلق قرآنی آیات کی روشنی میں بحث تو کی جائے گی لیکن وہ بہر حال مختصر ہوگی، کیونکہ تفصیل میں جانے سے تو (مطالب الفرقان کی) زیرِ نظر پوری کی پوری جلد اس ایک موضوع کی نذر ہو جائے گی۔ جو حضرت زیادہ تفصیل سے رکھتے ہوں وہ ”شعلہ مستور“ کا مطالعہ فرمائیں۔



پیدائش (عیسائیت کے نقطہ نظر سے)

حضرت عیسیٰ کے کوالف حیات کے سلسلہ میں سب اہم سوال ان کی پیدائش سے متعلق ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) عیسائیوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ آپ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی۔ اور یہی عقیدہ مسلمانوں میں بھی رائج چلا آ رہا ہے۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں شروع میں یہ عقیدہ نہیں تھا۔ یہ بعد کی اختراع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیکل کو چھوڑنے کے بعد حضرت مریم نے اپنے ہاں کے ایک شخص سے شادی کی تھی جس کا نام یوسف تھا اور وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ چنانچہ اناجیل میں حضرت عیسیٰ

کو بالخصوص یوسف تجار کا بیٹا کہا گیا ہے ۔

متی کی انجیل میں ہے :-

جب یسوع یہ تئیس ختم کر چکا تو اب ہوا کہ وہاں سے روانہ ہو گیا اور اپنے وطن میں آکر ان کے عبادت خانے میں انہیں ایسی تعلیم دینے لگا کہ وہ حیران ہو کر بولے کہ اس کو یہ حکمت اور معجزے

یوسف کا بیٹا

کہاں سے مل گئے ۔ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں ؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہودا نہیں ؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں ؟ (متی . باب ۱۳ . آیات ۵۵-۵۳)

یوحنا کی انجیل میں ہے :-

فلپ نے تم ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے تورات میں اورینوں نے کیا ہے ، وہ ہمیں مل گیا ہے ۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے ۔

دوسری جگہ ہے :-

اور انہوں نے کہا . کیا یوسف کا بیٹا یسوع نہیں ہے جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں . اب کیوں کر کہتا ہے کہ میں آسمان سے آتا ہوں ۔ (یوحنا . باب ۶ . آیت ۴۲)

لوقا کی انجیل میں ہے کہ ایک دفعہ یحییٰ میں مسیح بھڑ میں کھو یا گیا . اور اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈتے رہے جب وہ مل گیا تو وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اس سے کہا . بیٹا ! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا ؟ دیکھ . تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے ۔

دوسری جگہ ہے :-

اور اس کا باپ اور اس کی ماں ان بانوں پر جو اس کے حق میں کہی جاتی تھیں تعجب کرنے لگے ۔ (لوقا . باب ۶ . آیت ۳۳)

مشہور عیسائی مؤرخ رینان (RENAN) نے حیات مسیح (LIFE OF JESUS) کے نام سے ایک بڑی محققانہ کتاب لکھی ہے . وہ اس میں لکھتا ہے :-

آپ (حضرت عیسیٰ) طبقہ عوام سے متعلق تھے . آپ کے والد یوسف اور آپ کی والدہ مریم دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے . دستکاری ان کا پیشہ تھا (حضرت مسیح کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑے آپ ہی تھے مادری زبان آپ کی آرمی تھی آپ کے والد کا انتقال جلد ہو گیا اور اس کے بعد حضرت مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں . یہ وجہ ہے کہ (حضرت مسیح عام طور پر "ابن مریم" کے نام سے مشہور ہوئے

آپ نے اپنے والد کے اتباع میں بخاری کا پیشہ اختیار کیا (ص ۴۶ لغایت ص ۴۹)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں کسی کو اس کا خیال تک بھی نہیں تھا کہ ان کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات (کہ وہ یوسف بخار کے بیٹے تھے) ان کے متبعین کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھی۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہودیوں کی مذہبی پیشوائیت نے فتویٰ صادر کر رکھا تھا کہ (حضرت) مریم کا یوسف سے نکاح شریعت موسوی کی رو سے ناجائز تھا۔ چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ کو (معاذ اللہ) ولد الحرام قرار دیتے تھے۔ عیسائی اگرچہ حضرت عیسیٰ کے متبعین تھے لیکن وہ بھی شریعت موسوی کے پابند تھے اس لئے کہ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے۔ وہ شریعت موسوی کی پابندی کرانے کے لئے آئے ہیں۔ اس شریعت کی رو سے ان سے یہودی پیشواؤں کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اعتراضات اور ان کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے طرح طرح کے چیلے تراشے۔ انہوں نے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان میں زن و شوئی کے تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ انجیل متی میں ہے:-
اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں (مریم) کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہو گئی۔ (متی۔ باب ۱۱۔ آیات ۲۳-۱۸)

اطلی کے ایک نامور مصنف (MARCELLO CRAVERI) نے (LIFE OF JESUS) ”حیاۃ مسیح“ کے نام سے ایک بڑی دلچسپ اور پراز معلومات کتاب شائع کی ہے جس میں اثری اور تاریخی تحقیقات کی روشنی میں عجیب و غریب اکتشافات کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عیسائی پیشوائیت نے یوسف اور مریم کے تعلقات کی گتھی کو سلجھانے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ان کی یاہی شادی تو ہو گئی تھی لیکن :-

مریم یوسف سے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتی تھی — فرشتوں کی سی محبت — اور یوسف بھی مریم کو باعصمت نگاہوں سے دیکھتا تھا — یہ جوڑا کیسا تھا؟ ایک کنواری بیوی کا کنوارا خاوند۔ (ص ۳۵)

لیکن اس سلسلہ میں ابھی ایک اور دشوار گزار مرحلہ باقی تھا۔ اناجیل میں یہ بھی مذکور تھا کہ حضرت عیسیٰ کے بہن بھائی بھی تھے۔ اس سے (حضرت) مریم اور یوسف کے زنا شوئی کے تعلقات کا ثبوت ملتا تھا اور عیسائیت اس تصور کو برداشت نہیں کر

۱۰ (MICHAEL GRANT) نے لکھا ہے کہ حضرت مریم کے لئے ”کنواری“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ عیسائیت

میں بعد کی اختراع ہے۔ اصل عبرانی زبان میں اس کے لئے جو لفظ آیا ہے اس کا صحیح ترجمہ ”جوان لڑکی“ ہے۔ ”کنواری“ کے

لئے دوسرا لفظ ہے۔ (ص ۴)

سکتی تھی کہ وہ اپنے ”خدا“ کی والدہ کو جنسی کثافتوں میں ملوث دیکھے۔ سی مشکل کے حل کے لئے (بقول کرا دیرنی) کبھی یہ سوچا گیا کہ وہ بچے یوسف کی پہلی بیوی کے لطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اور کبھی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی بہن تھے۔ (۳۱) ہم اناجیل کی تاریخ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں کہ موجودہ عیسائیت، سینٹ پال کی اختراع ہے۔ چنانچہ اس نے اس گتھی کو سمجھانے کے لئے ”ابن اللہ“ کے عقیدے کی طرح ڈالی۔ رومیوں کے نام اس کے ایک خط میں مذکور ہے :-

”مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤد کی نسل سے پیدا ہوا لیکن پاکیزگی روح کے اعتبار سے ادرمردوں میں سے جی اٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا۔“
(رومیوں کے نام۔ باب ۷۔ پیرامک)

ایک مشہور مسیحی عالم دینیات، ریوانڈ چارلس اینڈرسن سکاٹ نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے جس کے دوران وہ کہتا ہے :-

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ”ابن اللہ“ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔ یہ ابن اللہ“ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی انبیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو ”خدا کا بیٹا“ کہہ کر صاف کر دیا ہے۔

اس بظاہر نچے سے بیج سے جو شکوہ مچوٹا اور جس نے پھر رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی، اس کی رو سے کبھی حضرت عیسیٰ کو خدا اور کبھی اقنوم ثلثہ (باپ۔ بیٹا۔ روح القدس) کا ایک جہد قرار دیا گیا اور کفارہ کا عقیدہ وضع کر کے اعمال سے نجات پائی۔ سینٹ پال کے بعد جب ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تو اس میں اس بحث نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ

جو شخص یہ دعوے کرے کہ کسی وقت میں خدا کے بیٹے کا وجود نہیں تھا۔ یا پیدا ہونے سے پہلے وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے بہت کیا گیا۔ یا کسی ایسے جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں۔ یا وہ مخلوق یا متغیر ہے۔ ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے

اس فتوے کو شاہنشاہ قسطنطین نے ہزور نافذ کر دیا۔ (ملاحظہ ہو، معرکہ مذہب دسائیس۔ اردو پیر)۔ انان بعد ٹرنٹ کی کونسل میں اس عقیدہ نے اس ایمان کی شکل اختیار کر لی کہ

ہم ایمان لائے رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ الہ۔ اور نور نور ہے۔ عین خدا ہے۔ موجود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔

جب حضرت مسیح کو یہ مقام دیا گیا تو حضرت مریم کا مقام تصویر میں آسکتا ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق مقدس کلیسا کا فیصلہ ہے کہ

حضرت مریم کا مقام | وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالک ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے محبت خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے اس لئے وہ ہماری سزاؤں سے انکار نہیں کر سکتی۔۔۔۔ ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔

(CATHOLIC SCHOOL BOOK - P. 158)

۱۹۵۰ء میں پوپ (PIOUS, XII) نے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ حضرت مریمؑ بھی اپنی وفات کے بعد بہ جسد عنصري آسمان پر اٹھالی گئی تھیں۔ ۱۹۵۴ء کی رسومات میں ”ملکہ مریم“ کے عنوان سے ایک جدید تقریب کا اضافہ کیا گیا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۶۴ء میں حضرت مریمؑ کو ”مادر کلیسا“ کے ممتاز ترین لقب سے نوازا گیا۔

(CRAVERI - PP. 41-42)

یہ ہے (مختصر الفاظ میں) عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ کی تاریخ، ہم نے اس سلسلہ میں بعض دیگر عقائد کا ذکر بھی اس لئے کر دیا ہے کہ جب آگے چل کر قرآنی آیات (۵۵-۷۲) ہمارے سامنے آئیں گی تو باسانی سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کریم کس عقیدہ کی تردید کر رہا ہے۔ اس کے بعد آئیے قرآن کریم کی طرف۔



پیدائش (قرآنی نقطہ نگاہ سے)

قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے برعکس لے اس نے اس عقیدہ کی تردید ایسے جامع انداز سے کی ہے جس کی روشنی میں اس کے متعلق کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس نے ابن اللہ کے عقیدہ کی متعدد مقامات میں یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ ”سُبْحٰنَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ“ (۱۱۱) ”وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ اس کے ہاں بیٹا ہو۔“ سورہ توبہ میں ہے کہ ان کا یہ عقیدہ، اقوام سابقہ کے اسی قسم کے کافرانہ عقیدہ کی تقلید ہے: ”فَاَتَلٰہُمْ اللّٰہُ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ“ (۱۱۲) ”خدا انہیں غارت کرے۔“ یہ صحیح راستہ چھوڑ کر کس طرف بہکے چلے جاتے ہیں۔ سورہ مریم میں ہے: ”مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ ذَلٰلٍ سُبْحٰنَہٗ“ (۱۹۱) ”یہ خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔“ وہ اس قسم کے باطل تصورات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔“ (نیز ۲۳)

لیکن جس دلیل محکم کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ سورہ النعام میں ہے۔ سابقہ جلدوں میں عالم امر اور عالم خلق کے

متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک نظر دوبارہ دیکھ لیجئے (انڈکس کی روشنی میں) امر خلق اور تقدیر کے عنوانات میں تفصیل مل جائے گی)۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پروگرام کے دو گوشے ہیں۔ گوشہ اول، عالم امر ہے جس میں تخلیق کے متعلق پروگرام طے پاتا ہے اور پھر جس شے کی تخلیق مقصود ہوتی اسے پہلی بار وجود میں لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلی بار کی تخلیق، علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے قانون کے تابع نہیں ہوتی۔ اسے تو نیست یا عدم (NOTHINGNESS) سے ہست یا وجود (EXISTENCE) میں لایا جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی شے وجود میں آجاتی ہے تو پھر وہ خدا کے قانون علت و معلول کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ کوئی استثناء نہیں ہوتی۔ یہ خدا کی اہل روش (سنت اللہ) ہے جس میں وہ کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ (۳۲/۳۳)۔

اس پس منظر میں سورہ انعام کی اس آیت کو سامنے لائیے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کی جہالت دیکھئے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کی اولاد بھی ہے۔ جب ان سے یہ کہا جائے کہ اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ خدا قادر مطلق ہے۔ وہ جو جی میں آئے کر سکتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ کہا ان کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ جس طرح جی چاہے کر سکتا ہے۔ اس کی یہی قدرت مطلقہ ہے جس کی رو سے وہ اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ — بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶۱) لیکن یہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ اس کے عالم امر سے متعلق ہے۔ عالم خلق ہر بات اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتی ہے، تولید (اولاد پیدا ہونے) کے متعلق اس کا قانون یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کا نتیجہ ہوتی ہے: اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی (۹۹) یہ ہے قانون خداوندی جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لہذا، بیٹا پیدا ہونے کے لئے خاوند اور بیوی دونوں کا ہونا لازمی ہے: اَتٰی يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَّذَكَرٌ فَكُنْ لَهُ صٰلِحَةً (۱۰۱)۔ اور جب خدا کی بیوی نہیں تو اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے؟ اب ظاہر ہے کہ جب خدا کے قانون کے مطابق :-

۱۔ اولاد کے لئے مرد اور عورت، خاوند اور بیوی دونوں کا وجود لازمی ہے۔

۲۔ خدا کی بیوی نہیں اس لئے اس کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

۳۔ اسی قانون کی رو سے، کسی عورت کے ہاں مرد کے اختلاط کے بغیر اولاد پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد کے لئے مرد اور

عورت دونوں کا وجود اور اختلاط لازمی ہے۔ جب خدا کے ہاں بیوی کے بغیر بیٹا پیدا نہیں ہو سکتا تو (حضرت مریمؑ کے ہاں خاوند کے بغیر بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس طرح ایک دافع اور محکم دلیل کی رو سے بن باپ کے بیٹے کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی۔ حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدہ کی اسی ایک آیت سے نفی ہو جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم - ص ۳۲۳ - آیت ۲۱)۔

اب آپ قرآن مجید کی دیگر متعلقہ آیات کا مفہوم، مذکورہ بالا حقیقت کی روشنی میں دیکھئے۔ تو بات بالکل منہ پر جائے گی۔



حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے متعلق واقعات کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

إِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللَّهَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ أَهْمُهُ
الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ
وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳۵-۳۴)

اسی سلسلہ میں ملائکہ نے مریم سے کہا تھا کہ خدا تمہیں، اپنی طرف سے، ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے۔ یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیح (اور عیسیٰ ابن مریم ہوگا) (یعنی صفاتی نام المسیح - ذاتی نام عیسیٰ - اور کنیت ابن مریم) دنیا میں صاحبِ دجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے -

تندرست و توانا - چھوٹی سی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور نچتر عمر تک پہنچنے والا (۳۵) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاکبازان - اس سے ان کی توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے تھے کہ وہ، خالقِ ہمت کی شریعت کے علی الرغم، متاہل زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ خود یا اس کا بچہ، کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ضروری تھا۔

ہم نے آیت (۳۴) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت مریم کی طرف ملائکہ کا نزول ایسے ہی تھا جیسے (قرآن کریم کی رو سے) ان کا نزول مؤمنین کی طرف ہوتا ہے لیکن زیرِ نظر آیات میں حضرت مریم کو ملائکہ کی طرف سے ہونے والے بیٹے کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ سوال و جواب

۱۔ یُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس امر کی تبلیغ کرے گا بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت

کس طرح کی جائے اور اس کی تبلیغ کا سلسلہ بڑی عمر تک جاری رہے گا۔ (مولانا عنایت اللہ گجراتی نے ایسا ہی مفہوم لیا ہے)

کا سلسلہ بھی مذکور ہے۔ اس اعتبار سے یہاں ملائکہ کا ایک اور مفہوم سامنے آتا ہے۔ ملائکہ (جمع ملائکہ) کے ایک معنی پیغام رساں کے بھی ہیں اور یہاں یہ مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت زکریا کی تعلیم کا نتیجہ تھا (جو خدا کے رسول تھے) کہ حضرت مریم کے دل میں دسم خالقانیت کے توڑنے کا انقلاب آفریں خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ہیکل چھوڑ آنے کا اقدام کیا۔ اس پروہاں کے معاشرہ کے ردِ عمل کی ہمت پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان حالات میں کسی شخص کا حضرت مریم کے ساتھ شادی کرنے کا مسئلہ بھی کچھ آسان نہیں تھا۔ اس سے بھی معاشرہ اور مذہبی پیشوائیت کے طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑتا۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ مشکل مرحلہ بھی حضرت زکریا کی کوششوں سے طے ہوا۔ انہوں نے یوسف بنجار کو اس وادی پر خار میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا

حضرت زکریا کا پیغام رساں

اور یہ سلسلہ جنبانی انہی کی طرف سے ہوئی۔ یہ پیغام رساں ان ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پردگرم حضرت زکریا کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہو گا اور انہوں نے اس کے مطابق یہ اقدامات کئے ہوں گے۔ اس مفہوم کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دوسرے مقام پر (حضرت مریم کی طرف آنے والے کو) رسول کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنی قاصد یا پیغامبر کے ہیں (۱۹)۔ آیت (۲۰) میں ملائکہ کہا ہے تو اس سے سلسلہ جنبانی کا ابتدائی دور سامنے آتا ہے اور آیت (۱۹) میں جہاں رسول (واحد) کہا ہے تو اس سے اس کا آخری مرحلہ معلوم ہوتا ہے جہاں یوسف کے ساتھ یہ معاملہ طے پا گیا تھا۔

آیت (۲۰) میں ”يُبَشِّرُكَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ“ آیا ہے۔ اس میں کلمہ کے عام معنی (ایک بات) بھی ہو سکتے ہیں لیکن قرآن کریم میں کلمہ کا لفظ قانونِ خداوندی کے معنوں میں بھی آیا ہے (مطالب الفرقان - جلد دوم - ص ۱۳) اس لئے یہاں وہ معنی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ خانقاہ کی رہبانیت اور تہجد کی زندگی خلاف قانونِ خداوندی تھی اور متاہل اور ازدواجی زندگی قانونِ خداوندی کے مطابق۔ حضرت مریم کے سامنے یہی قانونِ خداوندی پیش کیا گیا تھا۔ دوسرے مقام پر اس مفہوم کی وضاحت اور تائید ہو جاتی ہے جہاں کہا کہ ”وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَةٍ مِّنْهَا وَكُنْتِ بِهَا“ (حضرت)

کلمہ کا مفہوم

مریم نے قوانین و احکامِ خداوندی کو سچ کر دکھایا۔ ”سورۃ النساء میں ہے: كَلِمَتُهُ اَلْقَهَا اِلٰی صَدِیْمَ (۱۱)۔“ خدا کا حکم یا قانون جسے مریم کی طرف (بوساطت حضرت زکریا) بھیجا گیا تھا۔ اس سے درحقیقت یہودیوں کے اس اعتراض کی تردید مقصود تھی جس کی رو سے وہ کہتے تھے کہ (حضرت) مریم کا نکاح بھی خلافِ شریعتِ خداوندی تھا اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰ) کی پیدائش بھی خلافِ شریعت۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خود ساختہ عقیدہ کی تردید یہ کہہ کر کر دی کہ حضرت مریم کا نکاح اور اس کے بیٹے کی پیدائش قانونِ خداوندی کے عین مطابق تھی۔

عیسیٰ اور مسیح کے معنی

آیت (۱۱۳) میں اس مولود کا نام عیسیٰ، لقب مسیح اور کنیت ابن مریم بتائی گئی ہے۔ عیسیٰ، عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مبارک یا سید (مردار) کے ہیں۔ انجیل میں لفظ

یسوع آیا ہے جسے انگریزی زبان میں (JESUS) لکھا جاتا ہے۔

مسیح کا لفظ مسیح سے ماخوذ ہے جس کے معنی جسم پر کسی چیز کے ملنے کے ہیں۔ زیتون کا تیل ملنا، یہودیوں کے ہاں ایک مبارک مذہبی رسم تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے لئے اس لقب میں ایک گہرا مفہوم بھی پوشیدہ تھا۔ اُس زمانے میں بادشاہوں کی تاجپوشی کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں ان میں اولیں رسم زیتون کے تیل کا مسیح بھی تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ ایسا انقلاب لانا چاہتے تھے جس سے بنی اسرائیل، رومیوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے ایک آزاد حکمران قوم بن جائیں۔ اس سچ سے انہیں یہودیوں کا بلو شاہ کہا جاتا تھا۔ (یہ وہ فرد جرم تھے جو رومی حکومت نے ان کے خلاف عائد کی تھی)۔ حضرت عیسیٰ کو مسیح کہہ کر پکارنے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی تھا۔

اس کے بعد آئیے ابن مریم کی طرف۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہہ کر پکارا گیا ہے (مثلاً ۲/۱۲۹)

ابن مریم کیوں؟ | ۲۵۳، ۱۵۴، ۱۱۶، ۱۱۷) حضرت عیسیٰ کی بن باپ کے پیدائش کے قائل اپنے عقیدہ کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی لایا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن مریم کہہ کر پکارا ہے (ان کے باپ کی طرف

ان کی نسبت نہیں کی) جس سے ظاہر ہے کہ ان کا باپ کوئی نہیں تھا۔ یہ دلیل جس قدر زور ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ساری اقوام کے ہاں یہ رواج تھا کہ ماں اور باپ میں سے جو زیادہ مشہور ہو ان کی اولاد کی نسبت اس کی طرف کرتے تھے۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ (اور حضرت ہارون) کے والد کا نام کہیں نہیں آیا۔ جہاں ضرورت پیش آئی ہے "ام موسیٰ" کہا گیا ہے۔

(مثلاً ۲۸) حلقہ حضرت موسیٰ کے بھائی، حضرت ہارون، حضرت موسیٰ کو "ابن ام"۔ میری ماں کے بیٹے، کہہ کر مخاطب کرتے

ہیں (۱۵۰، ۲۰۰) تو کیا اس سے بھی یہ سمجھا جائے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ تاریخ

میں دیکھئے۔ سادات کی جو پہلی سلطنت قائم ہوئی تھی، اُسے "بنی فاطمہ" کی سلطنت کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کی جو اولاد حضرت

فاطمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی وہ بنی فاطمہ کہلائی۔ ان کی جو اولاد دوسری بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئی انہیں علوی کہا جاتا

ہے۔ حضرت علیؓ کے ایک بیٹے کا نام محمد تھا لیکن وہ ابن الحنفیہ کی کنیت سے مشہور ہیں (حنفیہ ان کی والدہ کا نام تھا)۔ بنی ہاشم

کی صاحبزادی زینبؓ کی بیٹی (مامہ) بنت زینت کی کنیت سے متعارف ہیں۔ اپنے والد، ابوالعاص کی نسبت سے نہیں۔ اس

قسم کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ خود ہمارے ہاں (بالخصوص دیہات میں) ابھی تک یہ رواج ہے کہ خاوند اور بیوی

میں سے جو زیادہ مشہور ہو، ان کی اولاد کو اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ "غلام رسول" — کپڑا غلام رسول۔

(کون سا غلام رسول)۔ ”ادہ عیشال داپتر“ (وہ عائشہ کا بیٹا)۔

حضرت عیسیٰ کے ماں باپ میں سے ان کے والد یوسف نجار کا نام صرف اناجیل میں ملتا ہے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ان کے برعکس حضرت مریم کی شہرت (اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد آج تک) ساری دنیا میں ہے۔ اور سیکل کے پیشواؤں کا ٹکراؤ ہی حضرت مریم کے ساتھ تھا۔ بنا بریں حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہہ کر ہی پکارا جاسکتا تھا۔ وہ ابن یوسف کی کنیت سے پہچانے ہی نہ جاتے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب (حضرت مریم کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو اُسی وقت اس مولود کی خصوصیات اور منفرد صفات کا ذکر کیوں ضروری سمجھا گیا۔ — وَحَيْثُهَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۚ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَمِنَ الصَّابِرِينَ ۝ (۵۴-۵۵)۔ اس کی لم مختصر الفاظ میں آیات کے مفہوم میں بتائی گئی ہے۔ راہبہ کی زندگی ترک کر دینے سے حضرت مریم کا دل جن وساوس کی آماجگاہ بن رہا تھا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے اس بندھن کو توڑنے کی ہمت تو کر لی لیکن جب ان کے سامنے بیٹے کا ذکر آیا تو وہ وساوس هجوم کر کے ابھر آئے۔ عقیدہ یہ تھا کہ خلافت شریعت اولاد، خدا کے غضب کی مورد ہوتی ہے۔ یہ غضب خداوندی بچے پر کس شکل میں اتر انداز ہو سکتا ہے اس کے متعلق بڑی بڑی توہم پرستانہ حکایتیں مشہور ہوتی ہیں۔ فلاں کے ہاں ناجائز بچہ پیدا ہوا تو گونگا تھا، بہرہ تھا، اندھا تھا، مفلوج تھا، بد شکل تھا، اس کا چہرہ حیوانوں جیسا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے قصے ہمارے ہاں اب بھی مشہور ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی توہم پرستی کا عورت پر اس قدر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس کا ہونے والا بچہ سچ مچ خارق عادت (ABNORMAL) پیدا ہوتا ہے۔ (اس قسم کی مثالیں خود میرے مشاہدہ میں بھی آئی ہیں)۔ حضرت مریم کے دل میں اس قسم کے وساوس بھی پیدا ہوتے تھے اور انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ جب مذہبی پیشوا اس بچے کی پیدائش کو خلافت شریعت قرار دیں گے تو وہ معاشرہ میں کس قدر بدنام ہوگا! حضرت مریم کے دل سے اس قسم کے وساوس کو دور کرنے کے لئے انہیں تسلی دی گئی کہ تم کوئی خدشہ نہ کرو، تمہارا بچہ (بفضل ایزدی) تندرست و توانا، چھوٹی عمر میں اچھی اچھی باتیں کرنے والا، بڑی عمر تک پہنچنے والا، عمدہ صلاحیتوں کا مالک، دُنیا میں صاحبِ وجاہت ہوگا جیسا کہ ان کے مذہبی پیشواؤں کے فتوؤں کے علی الرغم خدا کے ہاں بھی مقرب۔

اس انداز کے اطمینانِ قلب اور تسکینِ خاطر سے حضرت مریم کو ازدواجی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا گیا! اُف! مذہب کی پیدا کردہ توہم پرستانہ رسوم کو توڑنے کے لئے کتنے بڑے جہاد کی ضرورت ہوتی ہے!

اس کے باوجود، عمر بھر تجدد کی زندگی گزارنے والی راہبہ کا زناشوی کے تعلقات کے احساس سے گھبراہٹنا البعد از قیاس

نہ تھا۔ حضرت مریمؑ نے کہا کہ یہ دروگاہ! تیرا حکم تو مجھ تک پہنچ گیا، لیکن۔

قَالَتْ مَتَىٰ آتَىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۖ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۳۶)

اس پر مریمؑ نے (ذکر یا کی طرح ۳۶) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں ایک کنواری ماہرہ ہوں — ماہرہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ — اس کے جواب میں اس سے وہی کچھ کہا گیا جو ذکر یا سے کہا تھا (۳۶) کہ یہ خدا کے اس قانونِ مشیت کے مطابق ہو گا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے — خدا کے قانونِ مشیت کی رو سے تخلیق کے دو مراحل ہیں۔ ایک عالمِ سر جسے سمجھنے کی خاطر، پلاننگ کا مرحلہ کہہ لیجئے۔ اور اس کے بعد دوسرا مرحلہ وہ جب وہ شے محسوس شکل اختیار کرنے لگ جائے اس پوری ایکسٹیم کا آغاز زادہ (مشیت) خداوندی کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے (۲/۱۱۷، ۳۲/۵)

”انی یكون له ولد“ یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت زکریاؑ نے اس وقت کہے تھے جب انہیں بھی بیٹے کی پیدائش کی بشارت دی گئی تھی۔ (اس کی تفصیل آیت ۳۶ کے تحت گزر چکی ہے)۔ یعنی ان کے سامنے، اپنی اور اپنی بیوی کے اس وقت کے حالات تھے جن کی رو سے وہ سمجھتے تھے کہ ایسے میں ان کے ہاں اولاد کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد جب وہ موانعات دور ہو گئے جو اولاد کی پیدائش کے راستے میں حائل تھے، تو خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ ایسی ہی صورت حضرت مریمؑ کو درپیش تھی۔ وہ ماہرہ کی حیثیت سے تجربہ کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شدید مخالفت کے پیش نظر ہیکل چھوڑنے کے بعد انہیں ازدواجی زندگی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس لئے ان (حضرت مریمؑ) کے لئے بھی بیٹے کی پیدائش کی بشارت وجہ تعجب تھی۔

قرآن کا اندازِ بیان | اس مقام پر ایک ضمنی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں جس میں تمام واقعات زمان و مکان کے تعین کے ساتھ مسلسل بیان کئے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس میں واقعات کا زمانی تسلسل نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر ان میں کچھ (GAPS) بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں تدبر و تفکر سے، اس پیش کردہ واقعات میں تسلسل بھی سمجھ میں آ جاتا ہے اور خلا (GAPS) بھی پُر ہو جاتے ہیں۔ اس نکتہ کو زیرِ نظر واقعہ میں بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

بہر حال، حضرت مریمؑ کو (حضرت زکریاؑ کی وساطت سے موصول ہونے والی اس) بشارت پر تعجب ہوا جو ان حالات میں بالکل فطری تھا۔ اس مقام پر تو انہوں نے كَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ کہا ہے۔ سورہ مریم میں ہے: كَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ ۚ لَكُمُ الْفُتُورُ (۱۹)۔ یہاں ”میں بشارت“ بغیا کے مقابلہ میں آیا ہے۔ بغیا سے مراد ناجائز اختلاط ہے۔ اس تشریح

کئی دوسے آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی حضرت مریمؑ نے کہا کہ میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ صورت یہ ہے کہ میرا نکاح بھی نہیں ہوا اور میں (معاذ اللہ) حرام کاری کی ترکب بھی نہیں ہوئی۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ۔ کہ یہ خدا کے اس قانونِ مشیت کی رو سے ہوگا جس کے مطابق نام تخلیق ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ تمہارے لئے (یعنی حضرت مریم کے لئے) کوئی الگ طریق یا عمل اختیار کیا جائے گا۔ حضرت زکریا کے استعجاب کے جواب میں بھی ایسا ہی کہا گیا تھا۔ یعنی كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۲۱)۔ اور اس ”يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ کے بعد کہا تھا کہ حضرت زکریا کے ہاں اولاد ہونے کے راستہ میں جو رکاوٹ تھی اسے دور کر دیگیا۔ یعنی ان کی بیوی کا طبعی نقص (علاج معالجہ سے) دور ہو گیا اور اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یہ ”يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ“ کی تفسیر۔ ایسا ہی حضرت مریم کے مسئلہ میں ہوا۔

اس کے بعد ہے ”اِذَا قُضِيَ اَمْرٌ اَفَاتَمَّ يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”جب وہ (خدا) کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا۔ اور وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ (كُنْ فَيَكُونُ) کے غلط مفہوم سے، اسی مقام پر ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم کے دیگر مقامات پر بھی عجیب و غریب الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں وضاحت بیان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے جلد اول ص ۲۲-۱۶۔ آیت ۱۔ ص ۹۲-۲۸۳۔ آیت ۲۱۔ جلد دوم ص ۳۳۔ آیت ۲۱۔ جلد سوم ص ۱۸۔ آیت ۲۱)۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب کسی شے کی تخلیق کے متعلق خدا کے عالم امر میں فیصلہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس تخلیقی اسکیم کے عمل پیرا ہونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام مراحل طے کرنے کے بعد نقطہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ (مثلاً

اَمْرًا اِذَا نَمَّا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۳۸) جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے "کُنْ فَيَكُونُ" تو اس کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب خدا کسی اسکیم کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کا تخلیقی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام مراحل طے کرتی، رفتہ رفتہ اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔
یہ ہے مفہوم کُنْ فَيَكُونُ کا۔

اس کا غلط مفہوم لینے والے سمجھتے ہیں کہ جو نبی خدا کہتا ہے کُنْ ہو جاتا وہ شے فی الفور اپنی مکمل شکل میں وجود میں آ جاتی ہے۔ اس مفہوم کی رو سے وہ ان الفاظ (کُنْ فَيَكُونُ) کو حضرت عیسیٰ کی (بن باپ) پیدائش کے لئے بھی سند اور دلیل کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا فیصلہ کیا تو کہا کہ کُنْ (ہو جا) اور حضرت عیسیٰ پیدا ہو گئے۔

لیکن قرآن کریم میں ہے کہ فَحَمَلَتْهُ (۱۹)۔ حضرت مریم کو حمل قرار پایا۔ فَجَاءَهَا الْمَخَاضُ (۱۹)۔ اور وہ دروزہ میں مبتلا ہوئی۔ یعنی وہ ان تمام مراحل میں سے گزری جن سے بچے کی پیدائش کی سلسلہ میں عام عورتیں گزرتی ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ نے اپنے متعلق فرمایا کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ (۱۹)۔ میں سلامتی کا مظہر ہوں اس دن سے جب میری ولادت ہوئی۔ یعنی جس طرح عام بچے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح وہ بھی پیدا ہوئے۔ لہذا، یہ تصور ہی غلط ہے کہ ادھر خدا نے کہا کُنْ۔ اور ادھر حضرت عیسیٰ وجود میں آ گئے۔ اس کے بعد ہے: ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝ (۱۹)۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم کی مبنی بر حقیقت سرگزشت جس کے بارے میں یہ لوگ اس قدر اختلاف رکھتے ہیں اور باہمی جھگڑتے ہیں۔ یعنی ایک گروہ یہود کا ہے جو اس کی پیدائش کو (معاذ اللہ) ناجائز قرار دے رہا ہے۔ اور دوسری طرف عیسائی ہیں جو انہیں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۚ سُبْحٰنَہٗ ۚ اِذَا قَضٰی اَمْرًا اِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (۱۹)۔ یہ خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ خدا کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ اس قسم کے تصورات سے بہت بلند ہے۔ وہ ایک اسکیم کا ارادہ کرتا ہے اور پھر وہ اپنے ضروری مراحل طے کرتی ہوئی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت مریم کی تسکین خاطر کے لئے ان کے بچے (حضرت عیسیٰ) کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا۔ اگلی آیت میں بات بالکل واضح کر دی کہ

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَرَسُولًا اِلٰی

بَنِي إِسْرَءِیْلَ ۚ (۳۸-۳۷)

۳
۳۷-۳۸

(مریم کو یہ بھی بتایا گیا کہ تیرا بچہ عالم بظکوں جیسا نہیں ہوگا) خدا کی اسکیم یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا اور

اس حیثیت سے انہیں کتاب و حکمت — یعنی توراۃ اور انجیل — کی تعلیم دے گا۔ (آیت ۸۴ کا باقی حصہ بعد میں آئیگا)۔
رسولاً الیٰ بنی اسرائیل سے ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ سے پہلے، انبیاء کرام خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے۔ عالمگیر رسالت حضور ہی کا خاصہ تھا۔



یہ ہے جو کچھ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق سورہ آل عمران کی ان آیات میں آیا ہے۔ ان کے بن باپ کے پیدا ہونے کے عقیدے کے قائل اسی سورۃ کی آیت ۷۵ کو بھی بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے: **اِنَّ مَثَلَ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (۸۴)**۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے۔ اور چونکہ ان کے تصور کے حضرت آدمؑ "بن باپ" پیدا ہوئے تھے اس لئے (وہ کہتے ہیں کہ) حضرت عیسیٰؑ بھی ان کی مثل بن باپ ہوئے۔

پہلی بات تو یہ دیکھئے کہ ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے ("بن باپ" کے پیدا ہونے والے حضرت عیسیٰؑ کسی طور پر بھی حضرت آدمؑ کے مثل قرار نہیں پاسکتے۔ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ماں کے بغیر پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن حضرت آدمؑ، باپ اور ماں دونوں کے بغیر وجود میں لائے گئے تھے۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے کی مثل کیسے ہوئے؟ علاوہ ازیں، حضرت عیسیٰؑ (جیسا کہ خود ان کی زبانی اوپر درج کیا جا چکا ہے) باقاعدہ پیدا ہوئے تھے (يُوْمَ وُلِدْتُ) لیکن حضرت آدمؑ تو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ انہیں تو ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے مٹی کا ایک ٹپٹلا بنا دیا گیا تھا؛ پھر دونوں ایک دوسرے کے مثل کیسے ہوئے؟

نیز حضرت آدمؑ کی پسلی کو چیر کر اس میں سے ان کی بیوی کو نکالا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ تو ایسا ماجرا نہیں گزرا تھا۔ پھر یہ مثل کیسے ہوئے؟

آپ سوچیے کہ اس قسم کے خود تراشیدہ عقائد کی رُو سے، خدا اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ یعنی خدا دو شخصیتوں کو ایک دوسرے کا مثل قرار دیتا ہے حالانکہ مثل ہونے کی کوئی شرط بھی ان میں موجود نہیں۔

آدمؑ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۷۴ - آیت ۲۱) میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد "آدمی" ہے، نہ کہ کوئی خاص فرد اور آدمی (انسان) کی تخلیق کے متعلق اُسی جلد میں (ص ۷۳ - آیت ۲۲) تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ وہ کس طرح، عمل ارتقا کے مطابق، غیر جاندار مادہ (طین یا تراب) سے شروع ہو کر، پیکر انسانی تک پہنچا۔ قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ تم اپنے باطل عقائد کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ قرار دیتے ہو اور ان کی پیدائش بن باپ کے بتاتے ہو حالانکہ :-

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ طَخَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۳/۵۸)

۳
۵۸

خدا کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہر آدمی کی پیدائش کی ہوتی ہے۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا غیر ذی حیات مادہ (مٹی) سے ہوتی ہے۔ پھر وہ خدا کی مقررہ اسکیم کے مطابق مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکر بشریت میں آجاتا ہے۔ اسی طرح عیسے کی پیدائش ہوئی تھی۔ (وہ نہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ نہ ہی وہ خدا کے بیٹے ہیں)

اس کے بعد ہے :-

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُتَارِكِينَ ۝ (۳/۵۹)

۳
۵۹

یہ ہے اس معاملہ کی اصل و حقیقت جسے تیرے رب نے بیان کر دیا ہے۔ سو اس باب میں کسی بخت و بدل کی گنجائش نہیں۔

اس مقام پر اتنا اضافہ غیر محل نہ ہو گا کہ (انجیل کے بیان کی رد سے) حضرت عیسیٰ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً متی کی انجیل میں ہے :-

تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا کہ اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آ پہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جاتا ہے۔ (متی باب ۲۶۔ آیت ۴۵)



حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ مکرمہ حضرت مریم کے متعلق فرمایا :-

نَفْخُ رُوحٍ

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (۲۱/۲۱)

اور اس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے یہودیوں کی خود ساختہ شریعت کے علی الرغم عیسیٰ جیسا بیٹا

عطا فرمایا اس طرح جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمشہ ڈال کر اسے صاحب اختیار و ارادہ انسان بنایا جاتا ہے۔

یہاں فیہا مؤنث کا صیغہ ہے۔ دوسرے مقام پر فَنَفَخْنَا فِيهِ (۲۱/۲۱) میں مذکر کا صیغہ ہے۔ مقصود دونوں جگہ جیم حضرت

مریم میں جنین (حضرت عیسیٰ) ہے۔ یہ نفخ روح حضرت عیسیٰ کی منفرد خصوصیت نہیں۔ قرآن کریم کی رد سے ہر انسان کے سلسلہ

میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم۔ ص ۱۵-۱۴۔ آیت ۲۱ میں گزر چکی ہے)۔ یعنی انسان کو حیوانات سے

متیز کرنے کے لئے "نفخ روحنا" کے الفاظ آتے ہیں (دیکھئے ۱۵/۲۹ د ۳۲/۹ د ۳۸/۲۴)۔ اگر "نفخ روح" سے بن باپ

پیدائش ثابت ہوتی ہے تو پھر مران کی پیدائش کو بن باپ ماننا پڑے گا۔



حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر سورہ مریم میں بھی آیا ہے۔ موضوع کے تسلسل کی جہت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کو بھی اسی مقام پر سامنے لے آیا جائے۔

سورہ مریم میں آیت ۷ سے لے کر آیت ۱۵ تک حضرت زکریا اور پیدائش حضرت یحییٰ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان آیات کو درج کریں اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آنا چاہیے کہ (جیسا کہ آیت (۳۵-۳۴) کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے) حضرت زکریا نے حضرت مریم کی پرورش کی تھی اور ان ہی کے زیر تربیت وہ پروان چڑھی تھیں۔ ان ہی کی تعلیم کا اثر تھا جس سے وہ راہ و رسم خانقاہیت کے ٹوڑنے کا انقلابی قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو گئیں تھیں۔ اس کے بعد حضرت زکریا نے ہی ان کے نکاح وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔

پیدائش حضرت عیسیٰ کی مزید تفصیلات | حضرت زکریا خدا کے رسول تھے۔ حضرت مریم اور پیدائش حضرت عیسیٰ کے متعلق حضرت زکریا پر خدا کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی تھی

وہ اس کے مطابق ان اقدامات کی تدبیر کرتے تھے اور وحی کے ذریعے حاصل شدہ ہدایات کو حضرت مریم تک پہنچاتے تھے۔ اس داستان کی ان کڑیوں کو پیش نظر رکھنے سے، قرآن مجید کے وہ مقامات باسانی سمجھ میں آجاتے ہیں جو ان کڑیوں کو پیش نظر رکھنے سے) بہت سی الجھنوں کا باعث بنتے ہیں۔ سورہ مریم میں آغاز داستان یوں ہوتا ہے:-

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكَثِيبِ مَرْيَمُ إِذْ اتَّخَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۹)

اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن مجید) میں لوگوں سے مریم کی داستان بیان کر۔۔۔ اس کا آغاز اس وقت سے کرب

وہ ہیکل کو چھوڑ کر (اپنے گاؤں) — ناصرہ چلی گئی تھی، وہاں سے جانب شرق واقع تھا۔

خلفاء کی زندگی کو ترک کرنے اور اس پر لوگوں کی طعن تشنیع سے اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ معاشرہ سے الگ تھک رہنے

لگی — فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا قَت (۱۹)۔ اس کے بعد ہے: فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

بَشَرًا مَوْجَّاه (۲۰) عام طور پر ان الفاظ کے معنی کئے جاتے ہیں ”پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اس

کے آگے آدمی پورا“ یہ ترجمہ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ترجمہ القرآن میں ہے۔ اور اسی ترجمہ سے وہ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں

جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی وضاحت کے سلسلہ میں حاشیہ میں لکھا گیا ہے:-

یعنی حضرت جبریل نوجوان خوبصورت مرد کی شکل میں پہنچے جیسا کہ فرشتوں کی عادت ہے کہ عموماً خوش منظر صورتوں میں متمثل ہوتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے آیات (۳۵-۳۴) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ ملائکہ انسانی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ قرآن کریم نے بالخصوص کہا ہے کہ ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آ سکتے۔ لہذا، قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کے پیش نظر، یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت جبریلؑ بشکل انسانی حضرت مریمؑ کے پاس آئے تھے۔ ہماری تفاسیر میں اس ضمن میں کیا کچھ لکھا گیا ہے میں اسے یہاں درج نہیں کرنا چاہتا تھا (یا یوں کہئے کہ اس کی ہمت نہیں پاتا تھا) لیکن قارئین کو یہ بتانے کے لئے کہ ان تفاسیر میں کس قسم کی افسانہ پردازیاں ہوتی ہیں، دو ایک تفسیری تشریحات نمونہ پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ اور وہ بھی سینے پر پتھر رکھ کر (اور قارئین کے ذوق سلیم سے بصد معذرت)۔

شیخ اکبر ابن عربیؒ، سربراہ درودہ صوفیاء کے سرخیل ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

جبریل کس انداز سے حضرت مریمؑ کے پاس آئے تھے! (معاذ اللہ) | فرشتہ بشری صورت میں خوبصورت نوجوان بن کر اس

لئے آیا تھا کہ وہ (حضرت مریمؑ) اسے دیکھ کر خیال دوڑائے اور اس کا اثر قبول کرے جیسا کہ ایسے موقع پر طبعی طور پر دل میں خیال پیدا ہو جایا کرتا ہے، اور اس کی (حضرت مریمؑ کی) شہوت بھڑک اٹھے اور اسے انزال ہو جائے جیسا کہ خواب میں احتمال ہو جاتا ہے تو وہ اس کے رحم میں ٹپک جائے اور اس طرح حمل ٹھہر جائے اور اس سے بچہ پیدا ہو جائے۔ (استغفر اللہ)

(بحوالہ بحر قلزم - مولانا غایت اللہ اشرفی - ص ۱۱۵)

شیخ اکبر (ابن عربیؒ) صوفیاء کے امام ہیں۔ اہل شریعت انہیں سند تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حضرت مریمؑ اور جبریلؑ کے افسانے، میں اہل شریعت حضرات بھی ان سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ علماء اہلسنت کے مستند امام نسفیؒ، اپنی تفسیر مدارک میں، اور علاء ابن السعدیؒ اپنی تفسیر میں، جو تفسیر کبیر کے حاشیہ پر درج ہے، فرماتے ہیں :-

جبریل ایک روشن چہرے، گھنگرے بالوں والے، بے ریش تندرست جوان آدمی کی صورت میں مریمؑ کے سامنے ظاہر ہوا۔ اہل سنت ہی کے ایک اور معتبر مفسر قاضی بیضاویؒ نے فرمایا ہے :-

جبریل ایک بے ریش تندرست خوبصورت نوجوان کی صورت میں متمثل ہو کر مریمؑ کے پاس اس لئے آیا تاکہ مریمؑ اس کے کلام سے مانوس ہو جائے اور اس سے مریمؑ کی شہوت بھڑک اٹھے اور ہجبان سے لطف مریمؑ کے رحم میں پہنچ کر حمل ٹھہر جائے۔ اہل حدیث کے مایہ ناز مفسر علامہ ابن کثیرؒ نے اسے جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان کے تو تصور سے بھی حیا مانع ہے۔ لیکن (بہ امر مجبوری) انہیں بھی دیکھ لیجئے۔ فرماتے ہیں :-

جبریل نے مریمؑ کے گریبان میں پھونک ماری تھی۔ وہ نیچے اتری حتیٰ کہ اس کے فرج میں اس طرح داخل ہو گئی جس طرح

ماں باپ (میاں بیوی) باہمی اختلاط کرتے ہیں۔

ہمارے متاخرین میں شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی نسبتاً اعتدال پسند اور معقول قرار دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس باب میں وہ بھی دوسروں سے پیچھے نہیں۔ وہ فرماتے ہیں ۱۔

پھر حضرت مریمؑ کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری و جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے۔ جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے ایک الگ مکان میں غسل کرنے کے لئے گئیں۔ اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک کامل غلقت جو ان کی صورت میں جبریلؑ کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریمؑ نے ان کو دیکھا۔ اور وہ خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں۔ ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا اور دل سے اللہ کے حضور دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے۔ پھر اس کو ایک عجیب حالت پیش آئی۔ طبیعت میں قوائے نسیہ کا بیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے.... حضرت جبریلؑ نے جب ان کے حال کو دیکھا تو ان کے ستر میں پھونک لگا دی۔ اس پھونک سے اس میں تاثر پیدا ہوا اور وہ منترل ہو گئیں۔ حضرت مریمؑ کے نطقہ میں مرد کے نطقہ جیسی قوت تھی اس لئے وہ حاملہ ہو گئیں۔

(بحوالہ مولانا غایت اللہ اثری کا کتابچہ بہتان الصریح علی الریح در مریم و ایسج۔ صفحہ ۵۴۔ مرقعہ طلوع اسلام۔ فردوسیؒ)

اور اہل حدیث کے ممتاز عالم، نواب صدیق حسن خاں (مرحوم) نے تو حد ہی کر دی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت مریمؑ کے پاس آنے والا

جبریلؑ نہیں تھا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام خود ایک کامل انسان کی شکل بن کر حضرت مریمؑ کے سامنے اکھڑا ہوا اور باتیں کرتے کرتے اس کے اندر داخل ہو کر خارج ہوا تو اس کا بیٹا کہلایا۔ (بحوالہ ایضاً ص ۸)

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدے سے کس کس قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور انہیں کس کس طرح حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں (معاذ اللہ)۔

۱۔ بینینوں اقتباسات سید عبدالقیم صاحب کی کتاب! حقیقت ایسج (۱۸-۱۹) سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ مرزا غلام احمد قادیان اپنے متعلق کہتے ہیں ۱۔

مریمؑ کی طرح عیسیٰؑ کی روح مجھ میں نفع کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس سے

زیادہ نہیں، بذریعہ اسی الہام کے مجھے مریمؑ سے عیسیٰ بنا لیا گیا۔ اس طور سے میں ابن مریمؑ ٹھہرا۔ (کشتی نوح، ص ۴)

بحوالہ مولانا اثری

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ حضرت مریمؑ کے خواب کا ہے۔ میں بھی کبھی اسی خیال کا تھا لیکن قرآن کریم میں مزید غور اور تحقیق سے کچھ اور بات سمجھ میں آئی۔

روح کے معنے وحی کے بھی ہیں (دیکھئے لغات القرآن) اور حبیب خدا کا رسول، وحی خداوندی کی رو سے حاصل شدہ کسی حکم

کو دوسروں تک پہنچاتا ہے تو اسے بھی، ان لوگوں کی طرف وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے خدائے اپنے

کسی رسول کی وساطت سے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی طرف حکم بھیجا کہ بچے کو دریا میں بہا دے تو اُسے اَفْحِنَا

إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ (۲۸) کہا گیا۔ ان تصریحات کی روشنی میں: وَآرَمَلْنَا إِلَيْهَا رُحْنًا کے معنے ہوں گے — خدائے

حضرت زکریاؑ کی وساطت سے حضرت مریمؑ کی طرف پیغام بھیجا — حضرت زکریاؑ نے یہ پیغام اس شخص کی معرفت بھیجا جسے

انہوں نے حضرت مریمؑ کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے منتخب اور آمادہ کیا تھا۔ (یعنی انا جیل کے بیان کی رو سے یوسف نجار) بَشَرًا

سویا سے یہی نوجوان مراد ہے۔ اب رہا لفظ تمثیل۔ سوغت کی رو سے اس کے معنے ”داستانِ زدن“ یعنی بات کرنے کے بھی

آتے ہیں۔

لہذا آیت (۱۹) کے معنے یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ ان پریشانیوں میں افسردہ خاطر رہتی تھیں کہ حضرت زکریاؑ نے ان کی

طرف خدا کا پیغام دے کر ایک نوجوان کو بھیجا۔ اس اجنبی جوان کو دیکھ کر حضرت مریمؑ نے کہا: قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ

إِنْ كُنْتَ نَقِيًّا (۱۹)۔ ”اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمن کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں“ اس

نوجوان نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں: قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹)۔ ”میں تیرے،

رب، کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں“ یہاں لفظ ”رب“ سے مراد اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کے لغوی

معنوں میں ”پرورش کرنے والا“ (مربی) لیا جائے تو اس سے مراد حضرت زکریاؑ ہوں گے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مفہوم زیادہ قرین

قیاس ہے — اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ (خدا) تجھے ایک عمدہ نشو و نما پانے والا بچہ عطا کرنا چاہتا ہے۔

ان الفاظ سے نظر بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا اس نوجوان نے کھٹ سے یہ الفاظ کہہ ڈالے لیکن — ایک تو اس

لئے کہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے، قرآن کریم کسی واقعہ کی تمام کڑیاں بالترتیب خود ہی بیان نہیں کر دیتا۔ ان کے درمیان (GAPS)

چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اپنے فہم و بصیرت سے انہیں پُر کر لیں۔ اسے (FILL IN THE BLANKS) کا طریق کہتے ہیں

جو ادبی نقطہ نگاہ سے بڑا لطیف انداز بیان ہوتا ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے پہلے فتمثل کے لفظ نے اس طرف

اشارہ کر دیا تھا کہ اس نوجوان نے ساری بات بڑی تفصیل سے بیان کر دی تھی اور اس کا ملخص یہ تھا کہ مشیت خداوندی یہی چاہتی

ہے: قَالَتْ إِنِّي يَكُونُ بِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا (۲۰) جیسا کہ آیت (۲۰) کے تحت بیان

کیا جا چکا ہے، حضرت مریمؑ نے کہا کہ میں نے شادی کی ہے اور نہ ہی میں (معاذ اللہ) حرام کاری کی مرکب ہوئی ہوں، تو میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَٰئِلٍ (۱۹) اس نے کہا کہ ایسا کچھ خدا کے قانون تخلیق کے مطابق ہوگا۔ — یہی الفاظ آیت (۲۱) میں آئے ہیں۔ نیز حضرت یحییٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں بھی (آیت ۳۷ میں) آئے ہیں۔ اور یہ بات بھی (خدا کے ہاں) طے شدہ ہے کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ خدا کا رسول ہوگا۔ اس طرح وہ لوگوں کے لئے رحمت خداوندی کا موجب اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ بنے گا: وَلَنَجْعَلَنَّ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا (۲۱)۔

چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہوتے گئے۔ (حضرت) مریم کے دل سے ضوابط خانقاہیت سے سرکشی برتنے کے عواقب کا خیال دور ہو گیا۔ ان کی شادی اس شخص سے ہو گئی: فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَٰتٍ بِهِ مَكْنَانًا قَصِيًّا (۲۱)۔ مریم کو ہونے والے بچہ کا حمل فرار پا گیا۔ لیکن چونکہ اس معاشرہ میں طعن و تشنیع نے ابھی تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا، انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اس کاؤں سے کہیں دور چلے جائیں تاکہ بچے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو۔

اس داستان کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات اُس مقام پر بیان ہوں گے جہاں سورہ مریم ہمارے سامنے آئے گی۔ اُس سورہ میں اس تمام سرگزشت کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ... (۲۱) یہ ہے عیسیٰ ابن مریم کی صحیح صحیح سرگزشت جس کے بارے میں لوگ اس قدر اختلاف کرتے ہیں سچی بات خدا ہی بیان کر سکتا تھا۔ سو اس نے بیان کر دی۔

اور اسی ارشاد خداوندی کے نتیجہ میں میں بھی عرض کر دل لگا کہ یہ ہے پیدائش حضرت عیسیٰ کے بارے میں وہ حقیقت جسے میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھا ہوں۔ اس کے باوجود جو حضرات یہی سمجھیں کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے، انہیں ان کا عقیدہ مبارک۔ میں ان سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر کفر و ایمان کا مدار ہو۔



اس کے بعد آجائے پھر سورہ آل عمران کی طرف جس کی آیت (۲۱) کے یہ الفاظ سامنے آچکے تھے کہ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ۔

حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے رسول تھے۔ پوری آیت اس طرح ہے:۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ ۚ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَأُبْرِئُ

۳
۴۸

الْأَكْمَدَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ يَٰذَاؤُنَ اللَّهِ؟ وَأَنْتَ تُكْمِلُ بِمَآثِ الْكُلُونِ وَمَا تَدْخِرُونَ لَا
فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّا فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ لِّكُم إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ (۳۸)

اس آیت میں پھر ایک (بظاہر) مشکل مقام آجاتا ہے جس کا تعلق حضرت عیسیٰ کے ”معجزات“ سے ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے، کچھ تمہیری گفتگو ضروری ہے۔ اس آیت کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

معجزات اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشان لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک ٹھیسہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرِ ذاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

(تفہیم القرآن - جلد اول - ابوالاعلیٰ مودودی - ایڈیشن ۱۹۵۷ء - ص ۵۳-۵۴)

انہیں حضرت عیسیٰ کے معجزات قرار دیا جاتا ہے اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن میں اور بڑپن میں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے تو مٹی کی چڑیاں بنا کر ان میں پھونک مارتے تھے تو وہ اڑنے لگ جاتی تھیں۔ باقی معجزات بعد کی عمر کے بتائے جاتے ہیں۔

مذاہب کی دنیا میں معجزات کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اس کے برعکس دین کی عمارت علم و بصیرت پر استوار ہوتی ہے۔ معجزہ کے معنی ہوتے ہیں ایسا واقعہ جو فطرت کے قوانین کے خلاف ظہور میں آئے اور اس کے سمجھنے سے عقل عاجز آجائے۔

اس بیج سے دین میں صرف وحی معجزہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی کنہ اور ماہیت غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کی کنہ اور ماہیت تو سمجھ میں نہیں آ سکتی لیکن جو کچھ وحی

میں کہا جاتا ہے (یعنی وحی کا متن) وہ علم و بصیرت اور فہم و تدبیر کی رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ہم نے مطالب الفرقان (جلد اول) ص ۳۹۹ زیر آیت (۳۸) میں بتایا تھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ اپنی دعوت دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتے لیکن محسوسات کا خوگر انسان ان کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں محسوس نشانات، یعنی معجزات طلب کرتا۔ کتب سابقہ تو معرفت ہیں اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کے مطالبات کے جواب میں انبیاء کرامؑ کیا ارشاد فرماتے تھے۔ لیکن نبی اکرمؐ کے سلسلے میں قرآن نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ حضورؐ کی طرف سے اس قسم کے مطالبات کا جواب انکار میں دیا جاتا رہا (تفصیل مذکورہ بالا)

لے یہی الفاظ آگے چل کر اس مقام پر بھی آئے ہیں جہاں حضرت عیسیٰؑ نے اپنا دعوئے نبوت پیش کیا تھا۔

حوالہ میں دی جا چکی ہے)۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہ السلام کے سلسلہ میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جن سے نظر بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے ”معجزات“ دکھائے تھے۔ انہی مقامات میں ایک مقام حضرت عیسیٰ سے بھی متعلق ہے جس کا ذکر آئیہ زیر نظر (۸۸) میں آیا ہے اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم اس خدا پر ایمان لاتے ہیں جو اس حیرت انگیز کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ تو اس بات کے تسلیم کرنے میں ہمیں کیا تاویل یا توقف ہو سکتا ہے کہ خدا اس قسم کے واقعات ظہور میں لایا تھا جو خارجی عادت یا فوق الفطرت تھے اور جن کی کثرت و حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ خدا قادر مطلق ہے اور وہ ہر آن ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن کر سکتا ہے“ اور کرتا نہیں“ میں بڑا فرق ہے۔ ہم مطالب الفرقان کی سابقہ جلد میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اب یہ سلسلہ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلتا رہے گا اور وہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کرے گا۔ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن اللہ کے عقیدہ کی تردید بھی اسی دلیل کی رو سے کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قادر مطلق تو ایسا ہے کہ وہ اس عظیم کارگاہ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے لیکن اب اس نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کائنات میں سب کچھ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوگا۔ اس لئے وہ اب ایسا نہیں کرے گا کہ عورت اور مرد کے اختلاط کے بغیر بچہ پیدا ہو جائے۔ یہ خود خدا کا فیصلہ ہے (کہ وہ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا)۔ لہذا، جو شخص یہ کہتا ہے کہ اب کوئی واقعہ خلاف قانون فطرت ظہور میں نہیں آ سکتا وہ اللہ تعالیٰ کے اسی غیر متبدل فیصلہ کی رو سے ایسا کہتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ اگر معجزات سے مراد خلاف فطرت واقعات کا ظہور میں لانا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (ظہور معجزات سے) اپنے عظیم اصولوں کو توڑا بھی (یعنی اسی اصول کو کہ وہ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا) تو اس سے حاصل کیا ہوا؟ (مثلاً اگر) حضرت عیسیٰ نے سچ مچ

”معجزات“ سے حاصل کیا ہوا؟

مٹی کی چیلوں کو اڑا کر دکھا دیا۔ اندھوں کو بینائی عطا کر دی۔ جذامیوں کو ہاتھ پھیر کر اچھا کر دیا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے سامنے مردوں کو زندہ کر دیا، تو اس سے ہوا کیا؟ ان لوگوں میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لایا، نہ ہی ان کی مخالفت میں کوئی فرق آیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے (یہودیوں کے اعتراف اور اعلان کے مطابق) حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا اگر حضرت عیسیٰ نے ایسا کچھ، سچ مچ کر کے دکھایا ہوتا تو کیا اس کا نتیجہ یہی نکلتا؟ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی سدنک، یونہی اپنے بالوں سے دودھ کے قطرے نکال کر دکھاتا ہے، یا اس کی پھونک سے سرخ ریشوں کو شفا ہو جاتی ہے تو ایک دنیا اس کی گردیدہ اور متفقہ ہو جاتی ہے۔ اور اسی کی نہیں بلکہ اس کے مرنے کے بعد، اس کی قبر تک کی پرستش کرنے لگ جاتی

ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عیسیٰ ایسے ایسے خیر العقول معجزات دکھائیں اور یہودی ویسے کئے ویسے ان کے دشمن اور جان کے لاگو رہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ ”معجزات“ ویسے نہیں تھے جیسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔



یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ پھر ان واقعات کے متعلق کیا کہا جائے گا جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اور جنہیں معجزات کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے کہ دجی کا یہ انداز چلا آیا ہے کہ اس میں اکثر امور کو مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ میں نے نبویہ القرآن میں قرآنی مثالوں کی ایک مبسوط فہرست دی ہے۔ انجیل میں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کا خاص طور پر یہی اسلوب بیان تھا۔ آپ زیادہ نہیں صرف متی کی انجیل کو دیکھئے۔ اس میں قدم قدم پر مثالوں کے ذریعے سمجھائی گئی ہیں۔ (مثلاً حضرت عیسیٰ نے فرمایا :-

تمثیلات

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو (۲۸) رنگ دروازے سے داخل ہو کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے ... (۲۹) اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا ... پھر اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش پیش (اس کے بعد کئی تمثیلات درج ہیں۔ مثلاً) انگریزی باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل۔ شہزادے کی شادی کی تمثیل وغیرہ۔

(۱- متی - باب ۱۳)

متی کی انجیل باب ۱۳ میں لکھا ہے :-

اس نے ایک اور تمثیل انہیں سنائی کہ آسمان کی بادشاہت اس خمیر کی مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں ملا دیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا۔ یہ سب باتیں سیور نے بھیڑ سے تمثیلوں میں کہیں اور بغیر تمثیل کے وہ ان سے کچھ نہ کہتا تھا۔ تاکہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ

میں تمہیں کہنے کو اپنا منہ کھولوں گا۔ (زبور) (متی - ۳۵-۳۳)

متی باب ۱۳ آیت دس میں ہے :-

شاگردوں نے پاس آکر اس سے کہا تو ان سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے؟ اس نے جواب میں ان سے کہا اس لئے کہ تم کو آسمان کی بادشاہت کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے مگر انہیں نہیں دی گئی ... میں ان سے تمثیلوں میں اس لئے باتیں کرتا ہوں کہ دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور سمجھتے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ کا انداز بیان یہی تھا کہ وہ بلند حقائق کو تمثیلات کی رو سے واضح کیا کرتے تھے۔ اس سے

یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ زیر نظر آیت (۸۴) میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ تشبیہات ہیں۔ تشبیہات میں استعمال کردہ الفاظ کے معانی لغوی نہیں لئے جاتے بلکہ مجازی لئے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ اسلوب عام تھا اور چونکہ قرآن کریم اسی زبان کے اسلوب کے مطابق نازل ہوا ہے اس لئے ایسے مقامات پر اس قسم کے الفاظ کے معانی لغوی نہیں بلکہ مجازی لئے جائیں گے۔ امام ابن قیم نے لکھا ہے :-

عرب کے لوگ کلام میں مجازی معانی بھی لیتے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں بات کرنے کے کئی طریقے اور کئی

مجازی معانی

ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قلب، تعذیم، تاخیر، غنث، تکرار، خفاء، اظہار، تعریض، اشباح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے۔ خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔ غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپ کو مجاز کے ایوان میں مل سکتے ہیں۔۔۔۔۔

قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا قرآن کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر سکتا۔ (قرطبن۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۳ بحوالہ لغات القرآن۔ جلد اول)

اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم پیش کیا ہے۔ مگر آپ زیر نظر آیت کے الفاظ کے مجازی معانی لئے کر اس کا مفہوم سامنے لے آئیں تو جو کچھ حضرت عیسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ وحی کے بسیط حقائق کو سمجھانے کے لئے خود قرآن کریم نے اسی قسم کی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ وَكُنُوزُهُمْ نَارٌ مِّنْ لَّهِمْ يَحْمَوْنَ (۸۴)۔ ہم چاہتے تھے کہ اس خاک افتادہ قوم کو آسمان کی بلندیوں تک

پہنچا دیں لیکن یہ (بد نصیب قوم) زمین کی پستیوں کے ساتھ چپٹے رہی اور اس نے اوپر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا۔ یہ تشبیہ خود ہمارے ہاں بھی عام ہے۔ کمزور و ناتواں قوم کو پابندِ قفس، بے بال و پر پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے اور قوی اور توانا قوم کو فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے شاہین سے۔ اقبالؒ نے (زندہ) اُمتِ مسلمہ کے متعلق کہا ہے کہ

پَرْدِ دُرُوسِ گِردوں یگانہ نگاہِ اُو بشارِ آشیانہ

اور ہم خاک آلودہ بے بال و پر، قوم سے کہا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشیت پرے داری

بیامں باتو آموزم طسلیقِ شاہبازی را

یہی اپرندے کی تشبیہ حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔

جہاں تک مردوں کو زندہ کرنے کی تشبیہ کا تعلق ہے یہ بھی قرآن کریم میں عام استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے،

اَدَمَسَ كَانَ مَيْتًا فَاحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا (۳۳)۔ "ذرا سوچو کہ کیا وہ قوم جو پہلے مردہ تھی۔ اسے ہم نے زندگی عطا کی۔ اور اسے ایسی نورانی شمع دی جس کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ وہ خود صحیح راستے پر چلے بلکہ نوریہ ان کو بھی صحیح راستہ دکھائے، ان لوگوں کی مانند ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہوں اور ان سے نکلنا ہی نہ چاہیں؟" سورہ انفال میں مؤمنین کو خطاب کر کے کہا ہے کہ اَسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۳۴)۔ "تم اللہ اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں حیات تازہ عطا کر دے گی"۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ نے کہا تھا۔

اکمہ (مادہ ۸ - م - ۵) اندھے کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو صحیح راستے پر نہ چلے بلکہ جو ہنی جدھر چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ نیز کِمَہ فَلَانٌ کُنْے معنی ہوتے ہیں اس کی عقل جاتی رہی۔ (لغات القرآن)

اسی طرح برص، جذام (کوڑھ یا بھلہری) کو بھی کہتے ہیں اور اس زمین کو بھی جس پر سرسبزی اور نمد و تازگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ہو۔ بالکل ویلن اور خیر ہو چکی ہو۔ (لغات القرآن)

آپ بنی اسرائیل (یہودیوں) کی اُس زمانے کی زبوں حالی کو نگاہ میں لائیے اور پھر ان تشبیہات پر غور کیجئے جن کی رو سے حضرت عیسیٰ نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا علاج کس طرح ہو سکتا ہے ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔ (۳۸) کا مفہوم

کی۔ میں نے اپنی تمثیلات اور تشبیہات کی روشنی میں (مفہوم القرآن میں) زیر نظر آیت (۳۸) کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:-

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سے یہ بھی کہا کہ تمہارا بیٹا عام لوگوں جیسا نہیں ہوگا۔ خدا اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور یوں اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ (۳۹)

وہ اس قوم سے جس کے عودق مردہ میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی، کہے گا کہ میں تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔

میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیات نو عطا کر دوں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی (۴۰)۔

یہ آسمانی روش تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری قوم کی دیران کھیتی جس پر تازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

مختصر یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے ایک نئی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔
میں تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصروفیت میں لائے ہو اور کس قدر ذخیرہ (HOARDING) کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے۔
اس قانون اور نظام میں تمہارے لئے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کرو۔

(یہ الفاظ (۳۰) میں بھی آئے ہیں)

یہ تھے انقلاب آفرینی کے وہ ”معجزات“ جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آسمانی پیغام کی رو سے قوم بنی اسرائیل کے سامنے پیش کئے۔
معاشی انقلاب | ان انقلابات کی نوعیت کیا تھی اسے تو آگے چل کر بیان کیا جائے گا لیکن جس معاشی نظام کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کی ایک جھلک ہمیں انجیل متی کے پچھلے باب میں ملتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متبعین سے کہا :-

اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا..... یاد رکھو! کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا.... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے.... فضا فضا میں اڑنے والے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔ (آیات ۲۶-۱۹)

انجیل متی باب ۶، آیت ۲۵ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اعلان کیا :-

اے محنت کشو! اے بوجھ سے دیے ہوئے مزدور سب میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دوں گا۔

انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا اس کا نقشہ کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے :-

اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ

کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۴-۴۴)

دوسری جگہ ہے :-

اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا مال نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں

مشترک تھیں۔۔۔ اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر کئی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک چیز کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال - ۳۵-۳۶)

اس نظام رلوبیت کی مزید تفصیل اس مقام پر ملے گی جہاں حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں انسانوں کی محتاجی سے چھڑا کر اپنے ہاں سے رزق عطا کرے۔ (۱۱۵-۱۱۴) یہ تھا وہ نظام جسے حضرت عیسیٰ نے اس تمثیلی انداز میں بیان کیا تھا کہ میں جانتا ہوں جو کچھ تم صرف میں لاتے ہو اور جو کچھ چھپا کر رکھتے ہو۔

یہ حقیقت کہ کتب اناجیل میں جو ”واقعات“ بطور معجزات بیان ہوئے ہیں وہ فی الحقیقت واقعہ شدہ امور نہیں تھے بلکہ حضرت عیسیٰ نے جو کچھ تمثیلات کی زبان اور استعارات کے رنگ میں سمجھایا تھا، انہیں بعد کے سوارخ نگاروں (متبعین اناجیل) نے سچ مچ کے واقعات کی شکل میں پیش کر دیا، اب خود دنیائے عیسائیت میں مرکز تحقیق و توجہ بن رہی ہے۔ حال ہی (۱۹۷۸ء) کو الف حضرت مسیح سے متعلق ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے JESUS: AN HISTORIANS REVIEW OF THE GOSPELS. اور اس کے مصنف ہیں تادریخ عیسائیت کے بڑے نامور عالم، (MICHAEL GRANT) انہوں نے اپنی کتاب میں حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کردہ معجزات کی حقیقت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ خود حضرت عیسیٰ ان ”معجزات“ کو محض تمثیلات سمجھتے تھے۔ (ص ۳)۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے :-

خالص نارنجی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معجزات فی الواقعہ ظہور میں نہیں آئے تھے۔ (مؤرخ تو ایک طرف) انجیل کا نامور مرتب، سینٹ جون (یوحنا) بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا۔ مثلاً جب وہ ”مردے کے جی اٹھنے“ جیسا سب سے زیادہ ناممکن الوقوع معجزہ بیان کرتا ہے تو وہ اسے استعارہ ہی قرار دیتا ہے (ص ۳۹)۔ انجیر کے درخت والے معجزہ کو لوقا محض تمثیلی بیان قرار دیتا ہے۔ (ص ۴۲)

بحث کے آخر میں پروفیسر گرانت نے لکھا ہے کہ اور تو اور، خود حضرت مسیح بھی ”معجزات“ کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے شاگردوں نے کہا کہ معجزات ان سے بھی ظہور میں آتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ”یہ امر قابل مسرت نہیں ہے کہ فطرت کی قوتیں تمہارے سامنے جھک جاتی ہیں، قابل مسرت یہ بات ہے کہ تمہارے نام آسمانی تختی پر نقوش ہو جائیں“ (ص ۴۴)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ معجزات کے متعلق جو ہم نے کہا ہے کہ یہ ”واقعات“ کا بیان نہیں بلکہ بلند اور بسیط حقائق کو سمجھانے کا مثیلی انداز ہے، تو خود دنیا ئے عیسائیت کے ارباب علم و تحقیق اب اسی نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔



ہم بات کر رہے تھے حضرت عیسیٰ کی انقلابی دعوت کی جسے وہ تمثیلات اور استعارات کے رنگ میں پیش فرماتے تھے اس دعوت کی تفصیلات سے پہلے آپ ان دو آیات کو دیکھ لیجئے جو آیت (۳۸) کے تسلسل میں آتی ہیں۔ یعنی

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَلِإِحْلَآ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي
حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا
إِنَّا اللَّهُ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوا هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۳-۵۹)

وہ بنی اسرائیل سے یہ بھی کہے گا کہ یہ قانون، جو مجھے وحی کے ذریعے ملا ہے، کوئی نیا قانون نہیں۔ یہ ان باتوں کو سچا کر دکھائے گا جو، اس سے پہلے، تورات میں آچکی ہیں۔ اور جو خود ساختہ پابندیاں تم نے (شرعیّت کے نام سے) خواہ مخواہ اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں، ان سے تمہیں آزاد کر دے گا۔ نیز (حلال و حرام کی) ان پابندیوں سے بھی جو تم پر تمہارے جبرم بجاؤ کی سزا کے طور پر عائد کی گئی تھیں۔ (۱۶۰، ۱۶۱، ۱۱۸)۔

غرضیکہ وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے نشو و نما دینے والے کا قانون حیات لایا ہوں۔ تم اس قانون خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم اس طرح کرو جس طرح میں کہتا ہوں۔ (اس سے تم میں وہ اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جو دین کا مقصود ہے)۔

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ تمہاری اور میری، سب انسانوں کی، نشو و نما کا ذمہ دار خدا ہے، اس لئے، حکومت صرف اسی کی اختیار کی جاسکتی ہے۔

یہ ہے وہ سیدھی اور متوازن راہ جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔



حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریم اور ان کے شوہر کس طرح اپنے وطن سے دور چلے گئے تاکہ بچے کی پیدائش ان لوگوں کے سامنے نہ ہو جو ان کے اس قدر مخالف تھے۔ سورہ مریم میں بتایا گیا ہے کہ راستے میں کس طرح اس بچے کی پیدائش ہوئی اور اس وقت حضرت مریم کے اضطراب کا کیا عالم تھا — اسی طرح جیسے وضع حمل کے وقت عورتوں کی حالت ہوتی ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ پریشانی (دیکھئے آیات ۱۹-۲۴)۔

پیدائش کے بعد اور وطن کی طرف واپسی کے زمانے کے دوران حضرت عیسیٰ (بلکہ یوں کہئے کہ اس خاندان) لے کہاں اور

وطن کی طرف مراجعت

کیسے زندگی بسر کی اس کے متعلق اناجیل سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سلسلے میں قرآن کریم سے فقط ایک اشارہ ملتا ہے جس میں کہا گیا ہے: **وَاَوْثِنْهُمْ اِلٰی رَبُّوْكَ ذٰلِكَ قَوْلُ**

وَمَعِيْنٌ ۙ (۲۳)۔ ہم نے انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مصر کا کوئی علاقہ تھا لیکن رینان کہتا ہے کہ یہ کتبہ قانا کے علاقہ کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ یہ اس اجنبی دیار میں کتنے عرصے تک رہے اس کے متعلق اناجیل میں منفرد بیانات ملتے ہیں۔ عام طور پر کہا گیا ہے کہ مراجعت وطن کے وقت حضرت عیسیٰ کی عمر سات برس کی تھی یا زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی۔ جب آپ نے تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو، انجیل لوقا کے مطابق، آپ کی عمر اکتیس برس کی تھی۔ رینان نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت آپ کی عمر تیس برس تھی اور اس کے قریب اٹھارہ ماہ بعد واقعہ تصدیق ظہور میں آگیا تھا۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی مدت نبوت قریب ڈیڑھ سال تھی، اور بعض بیانات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین برس۔

قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں اس لئے وہ اس قسم کی بحثوں میں نہیں پڑتا۔ اسے حضرات انبیاء کرام کی تعلیم اور ان کے پیدائش انقلاب سے واسطہ ہوتا ہے اور وہ اسی کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ جب حضرت مریم وطن واپس آئیں (یا جب حضرت عیسیٰ نے فریضہ رسالت کی ادائیگی کا آغاز فرمایا) تو حضرت عیسیٰ سواری پر آئے تھے (۱۹)۔ اور انہوں نے اعلان فرمایا کہ **اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اَشْنٰی اَلْکِتٰبَ وَجَعَلْنِیْ نَبِیًّا ۙ** (۱۹)۔ میں خدا کا عہدہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصب نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب حضرت عیسیٰ کو نبوت مل چکی تھی۔

ان اسور کی تفصیل سورہ مریم کی آیات (۳۴-۳۶) میں پیش کی جائے گی لیکن ان میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ آیات (۲۹-۳۶) میں ہے:-

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُہٗ ۚ قَالُوْۤا اِمْسِیْ ۖ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۚ یٰۤاُخْتَ ھٰرُوْنَ مَا کَانَ
اَبُوکَ اِمْرًا سَوِیًّا ۚ وَمَا کَانَتْ اُمُّکَ بَغِیًّا ۚ فَاَمَّا رَتُّ الْیَمٰنِۭۃِ قَالُوْۤا کَیْفَ نُنَکِّمُکَ مِنْ کَانَ فِی
الْمُهْدِ صَبِیْثًا ۚ (۲۹-۳۶)

اسی طرح عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ میاں بیوی، اس بچے کو لے کر، کسی دور مقام میں جا بسے وہ بڑا ہوا۔ شربت نبوت سے سرفراز کیا

گیا تو اس کی والدہ اسے سواری پر ساتھ لے کر اپنے وطن میں واپس آئی۔ (ایک تو لوگوں کے نزدیک، مریم کی یہ حرکت ہی

کچھ کم قابل اعتراض نہ تھی کہ اس نے راہبر بن جانے کے بعد، ہیکل کے ضابطہ کے خلاف اس طرح متاہل زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اجارہ دہ بیان کی خود ساختہ شریعت اور ان کی سیرت و کردار کے خلاف سختی سے نمکتنہ چینی ہوتی تھی (چنانچہ وہ لوگ مریم سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا انوکھا بیٹا کر آگئی !

وہ (حضرت مریم) سے کہتے کہ اے اُختِ ہاردن ! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا۔ نہ ہی تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم تو ایک شریف، مذہب پرست، پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھی۔ تم نے یہ کیا کیا، اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی ؟)۔

اس کے جواب میں وہ خود کچھ نہ کہتی بلکہ عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کر دیتی کہ اپنی بات کا جواب اس سے لو۔ (بوڑھے اجارہ دہ بیان، اپنی پیشوائیت کے گھمنڈ میں، نہایت نخوت و تکبر سے کہتے کہ) کیا ہم اس سے بات کریں جو ابھی کل تک جھولا جھولتا تھا !

ان آیات کا مطلب، مذکورہ بالا مفہوم سے واضح ہے لیکن عجوبہ پسند طبائع کو ان میں بھی ایک معجزہ نظر آتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو تسلی دینے کے لئے ان کی طرف یہ پیغام پہنچایا تھا کہ تمہارا بیٹا تندرست و توانا اور نہایت اعلیٰ خصائل کا حامل ہوگا : **وَيَكَلِّمُهُ النَّاسُ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا** (۱۵) ”وہ بچپن میں بھی تندرست بچوں کی طرح باتیں کرے گا اور عمر بھی بڑی پائے گا۔“ اس آیت سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ معجزانہ طور پر جھولے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کی تائید میں سورہٴ مریم کی آیت (۱۹) یہ کہہ کر پیش کر دی جاتی ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ ابھی جھولے میں تھے جب حضرت مریمؑ نے اس بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مجھ سے نہ پوچھو۔ اس بچے سے پوچھو۔ اور ہیکل کے مقدسین نے جواب میں کہا تھا کہ ہم اس بچے سے کیا پوچھیں جو جھولے میں لیٹے ہوئے ہے ؟ یہ سن کر اس بچے (حضرت عیسیٰؑ) نے جھولے سے جواب دیا کہ ”میں خدا کا عبد ہوں۔ اس نے مجھے نبوت اور کتاب عطا کی ہے۔“ (۱۹)۔ اس سے حضرت عیسیٰؑ کا یہ معجزہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جھولے ہی میں اپنی نبوت کا اعلان کر دیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آیات (۱۵) اور (۲۷-۲۹) کا جو مفہوم ہم نے پیش کر دیا ہے اس کی روشنی میں اس باب میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ جھولے میں لیٹا ہوا طفل شیر خوار یہ نہیں کہے گا کہ خدا نے مجھے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور مجھے کتاب دی ہے۔

اس زمانے میں بنی اسرائیل کی کیا حالت تھی اسے مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں بڑی تفصیل سے پیش کیا جا چکا ہے (ان مقامات کو "بنی اسرائیل" کے تحت انڈکس کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے)۔ مختصراً یہ کہ ذلت اور دنائت کی کوئی ایسی خرابی نہیں تھی جو ان میں پیدا نہ ہو چکی ہو اور محتاجی و محکومی کی کوئی زنجیر ایسی نہیں تھی جس میں وہ کھڑے ہوئے نہ ہوں۔ ان کی حالت اُس زمانے سے بھی ابتر تھی جب حضرت موسیٰ

بنی اسرائیل کی حالت

ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ اُن رومیوں کا استبداد (جن کی محکومی کے شکبے میں یہ جکڑے ہوئے تھے) فرعون کے استبداد سے بھی زیادہ استخوان شکن تھا اور ان کے احبار و رہبان کی ابلہ فریبیاں اور مکاریاں، ہامان اور اس کے جنود سے بھی زیادہ۔

موجب سلب و نہب۔ یہ تھی وہ قوم جسے حیاتِ نوعطا کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے تھے۔ عیسائیت کی مروجہ تعلیمات کی رو سے حضرت مسیحؑ کی شخصیت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس انداز کا ہے کہ ان کی زندگی ایک تارک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاہد گوشہ نشین کی سی تھی۔ ان کی تعلیم کچھ اس قسم کی سی تھی کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔

جو شخص تمہارا کرتہ لینا چاہے اسے اپنا چغہ بھی اتار کر دے دو جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جاؤ۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی کا (غلط) نقشہ

سے بھی محبت کر دو۔ شر کا مقابلہ نہ کر دو۔ ظالم سے ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کر دو وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آئند اور دلآویز نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ انقلابِ عظیم کی دعوت لے کر آتے تھے۔ ان کی بعثت

کا مقصد ظلم و جبر کی قوتوں کے شکبے توڑ کر مظلوم و مقہور انہوں کو آزادی اور سر بلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی دعوت انقلاب

اس نصب العین کی نقیب تھی کہ خدا کے آزاد پیدا کردہ انہوں کو ملوکیت، سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت اور اس قسم کی

دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جاسکتا۔ حضرت عیسیٰ یقیناً اسی انقلابِ آفریں اور جہادِ انگیز پیغام کے داعی تھے۔ ان

کے سامنے دو محاذ تھے جن سے انہوں نے ٹکرائی تھی۔ مذہبی پیشوائیت (یعنی ہیکل کے پجاریوں) کا محاذ اور رومن حکومت،

یعنی قیصر کا محاذ۔ بظاہر یہ دو محاذ الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا باہمی گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ نہ ملوکیت

مذہبی پیشواؤں کی تائید کے بغیر قائم رہ سکتی ہے اور نہ ہی مذہبی

حضرت عیسیٰ کے انقلابِ آفریں و عطا

پیشوائیت حکومت کی عطا کردہ قوت کے بغیر زندہ۔ حضرت عیسیٰ

نے اپنے جہاد کا آغاز مذہبی پیشوائیت کی مخالفت سے کیا۔ وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک حق گو

پیغمبر انقلاب کی طرح ان سے پوری جرات کے ساتھ کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید چمکتا ہے تو اسے اپنے سے دو نا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کون سا بڑا ہے۔ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دھکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو ٹھیکر کو تو چھانتے ہو اور اؤنٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو — جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔ اے سانپو، اے رافعی کے

بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ (متی باب ۲۳ - آیات ۱-۳۶)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ

دیکھو! یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی نڈی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کر دو اور مالو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور وہ اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تو تھے مذہبی پیشوائیت کے خلاف حضرت عیسیٰ کے نعرہ ہائے انقلاب۔ جہاں تک رومیوں کی حکومت کی جگہ حکومتِ خداوندی کے قیام کا تعلق ہے۔ اناجیل میں اس کی تفصیل تو نہیں ملتی لیکن کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آجاتی ہے، اور دورِ حاضرہ کی تحقیقات سے اس کی تائید بھی ہو رہی ہے۔ انجیل متی میں ہے کہ آپ نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا :-

اے حضرت عیسیٰ کے یہ انقلاب فریں وعظ، مطالب الفرقان، جلد دوم - ص ۱۶۳ پر دیئے جا چکے ہیں لیکن موضوع کے تسلسل کے لئے انہیں یہاں درج کرنا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

یہ نہ سمجھ کر میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ بیٹے کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ (متی ۱۰: ۳۸-۳۹)

انجیل برنباس کی فصل ایک سو اڑتیس میں ہے:-

حکومت خداوندی کے قیام کے داعی | تب ملک کے لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنا لیا جائے۔ اس کے بعد فصل ایک سو اٹالیس میں ہے کہ انہوں نے فرمایا:-

عسقریب کاہنوں کے سردار اور قوم کے شیوخ مجھ پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور رومی حاکم میرے قتل کا حکم طلب کریں گے کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کا ملک غصب کر لوں گا۔

رومی حاکموں کا اندیشہ تو قابلِ فہم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کانہوں کے سردار اور مشائخ حضرت عیسیٰ کی کیوں مخالفت کرتے تھے حالانکہ وہ تو ان ہی کی آزادی اور سر بلندی کے لئے اپنی جان کی بازی رگائے ہوئے تھے؟ ان کے اس خوف اور ہراس کی وجہ انجیل برنباس میں یہ ملامت انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے:-

مذہبی پیشوائیت کے خطرات | تب ان لوگوں نے کانہوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کو ناپا جاتا ہے۔۔۔۔۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

آپ نے غور کیا کہ مسئلہ سارے معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھتا ہے تھے۔ اسکے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکور نظام حکومت خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دین کے نظام میں مذہبی اور سیاسی دونوں دائرے حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

سیکولر حکومت کی ثنویت | اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری ثنویت سے اجنبی ہیں اور ہماری ثنویت کی کوئی پروا نہیں کرتے جیسے ہم ان کی ثنویت کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے

ہیں کہ جو چاہیں کریں پس اگر ہم نے غلطی کی تو جہاز رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جاسکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ص ۱۲۲)

انجیل برنباس میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ ”ان لوگوں کو یہی خیال دامنگیر تھا کہ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے اپنے آپ کو بادشاہ بنالیا تو پھر کیا نتیجہ ہوگا“ جیسا کہ مذہبی پیشوائیت کا شیوہ ہے، انہوں نے حکومت سے ساز باز کی کہ اس فتنے کو (جو مذہبی پیشوائیت اور حکومت دونوں کے لئے خطرہ جان تھا) جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ انجیل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلے انہوں نے کوشش کی کہ حضرت عیسیٰ سے حکومت کے خلاف کچھ کہلو کر انہیں پکڑ وادیا جائے چنانچہ متی کی انجیل میں ہے کہ

اس وقت فریسیوں نے جاگرمشورہ کیا کہ اسے کیونکر باطل میں پھنسائیں؟ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہودیوں (یعنی حکومت کے جاسوسوں) کے ساتھ اس کے پاس

یہودیوں کی سازش

بھیجا اور انہوں نے کہا اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا کیونکہ تو کسی کا طرفدار نہیں رہیں ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیرہ دینا مردا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا۔ اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو۔

متی (۲۶-۱۵)

جب آپ ان کے دامنِ تزدیر میں گرفتار نہ ہوئے تو انہوں نے وہ حربہ استعمال کیا جو مذہبی پیشوائیت کے ترکش کا آخری تیر ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ کے خلاف یہ جرم عائد کر کے کہ یہ مسیح موعود ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے، انہیں مفتری علی اللہ قرار دے دیا۔ اور اس طرح انہیں صلیب دینے کے لئے ”شرعی جواز“ پیدا کر لیا۔ لیکن وہ کسی کو سزائے موت اپنے اختیار سے نہیں دے سکتے تھے اس کے لئے انہیں رومی گورنر سے توثیق کرانے کی ضرورت تھی۔ اس طرح وہ انہیں ایک مجرم کی حیثیت سے کشاں کشاں گورنر کی عدالت میں لے گئے (MARCELLO CRAVERI) جس کی کتاب (THE LIFE OF JESUS) کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے لکھا ہے کہ جب رومی گورنر نے یہودیوں کے جرم سے پوچھا کہ مسیح کا کیا جرم ہے تو انہوں نے کہا:-

یہ شخص لوگوں سے کہتا ہے کہ انہیں خراج مت ددا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے۔ (ص ۳۸۵)

اس پر گورنر نے پوچھا کہ جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے بتاؤ کہ میں اسے کیا منرا دوں۔

منرائے موت | تو انہوں نے کہا کہ اسے صلیب دے دو۔ (ص ۳۹)

اس پر گورنر نے حضرت مسیح کی منرائے موت کے فتویٰ پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ انجیل متی میں ہے کہ جب آپ رومی سپاہیوں کی حراست میں تھے تو انہوں نے (معاذ اللہ) آپ کا تمسخر اڑایا:-

۱۔ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ محرف نظر آتا ہے۔ اس لئے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان مذہبی پیشواؤں نے آپ کو پھنسانے کے لئے کس قسم کے حربے استعمال کئے تھے۔

انہوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری بیٹن اس کے گرد جمع کر دی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قذری چھڑپنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب! اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چپے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ (متی ۲۷/۳۱-۲۷/۲۴)۔

اور ان تمام تفصیل کے بعد ایک حتمی شہادت! رد میل کے ہاں قاعدہ تھا کہ جس شخص کو صلیب پر لٹکاتے اس کے ساتھ ایک تختی آویزاں کرتے جس پر لکھا ہوتا کہ اس شخص کو کس جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہے۔ انجیل میں ہے کہ جو تختی حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر لٹکائی گئی تھی اس پر لکھا تھا ۱۔

یہودیوں کا بادشاہ (متی ۲۷/۲۴)

ہم نے ان تفصیل کو یہ بتانے کے لئے درج کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ اس خدا فراموش اور محکوم و مغلوب قوم کو روح اور بدن دونوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں آزادی کا راستہ دکھایا جائے۔ عصر حاضر کی تحقیق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

مسٹر (CECIL ROTH) اپنی مشہور تاریخ (A SHORT HISTORY OF THE JEWISH PEOPLE) میں لکھتا ہے :-

حضرت مسیحؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی ارباب حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالہ دار درسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ ان کے سامنے دو مقصد تھے۔ ایک طرف آپ اس مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیر دل کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسری طرف انہیں اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔



ہم نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی تفصیل اناجیل اور دیگر مآخذ کی مدد سے (سردست بلا تنقید و تبصرہ) پیش کی ہیں۔ قرآن مجید نے ان تفصیل کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک لفظ میں اس طرح سمو کر رکھ دیا ہے کہ ایں ایجاز میں سارے اطناب سمٹ کر آجاتے ہیں۔ ہم سورہ آل عمران کی آیت (۵۰) تک پہلے لکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد ہے :-

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْخَوَارِجُ
فَحَنُّ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَأَشْهَدُ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ه رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا

أَنْزَلْتُ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (۵۲-۵۱)

جب حضرت عیسیٰ نے محسوس کیا کہ یہودی ان کی مخالفت میں بہت آگے بڑھ رہے ہیں اور نہ معلوم وہ اگلا قدم کیا اٹھائیں تو انہوں نے اپنے رفقاء کی جماعت کو بلایا اور انہیں اس خطرہ سے آگاہ کر کے کہا کہ بتاؤ تم میں سے کون میرے اس خدائی مشن میں میرا مددگار ہوگا تو انہوں نے بیک زبان کہا کہ ہم آپ کے رفیق اور مددگار ہوں گے۔ ہم اس مشن کی صداقت پر پورے پورا یقین رکھتے ہیں آپ دیکھ لیں گے کہ ہم آپ کی کس طرح اطاعت کرتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کیا کہ ہم اس منابطہ ہدایت پر ایمان لاتے ہیں جسے تو نے نازل کیا ہے۔ ہم اس مقصد کے لئے تیرے اس رسول کا اتباع کریں گے۔ تو ہمیں ان لوگوں کے ذمے میں شمار کر لے جن کی زندگیاں اس قسم کے اقرار اور ایمان کی حلیتی جاگتی شہادت ہوتی ہیں۔

یہ داستان تو اسی تسلسل کے ساتھ آگے چلنی چاہیے تھی لیکن ہم تقوڑی دیر کے لئے روکتے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ قرآن کی نگاہ

حضرت عیسیٰ کے حواری

اکس قدر کشادہ اور اس کا دامن کس قدر وسیع ہے۔ اناجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بارہ حواری (شاگرد) تھے۔ ان میں سے ایک شاگرد (یہودا اخزولوطی) نے غداری کی اور چند سکنوں کے عوض حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرادیا۔ باقیوں کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت مسیح کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے سامنے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے (متی ۲۶)۔ یہ ہیں وہ حواری جنہیں عیسائیت میں ”رسول“ کہہ کر پکارا جاتا ہے جو اناجیل کے مؤلف ہیں اور جن سے مذہب عیسائیت آگے چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن کریم کو دیکھئے کہ وہ ان حواریوں کی کستور بند سیرت پیش کرتا ہے۔ ایسی بلند سیرت کہ وہ جماعت مومنین سے کہتا ہے کہ تم بھی اپنے اندر ان ہی جیسا کیریکٹر پیدا کرو۔ ارشاد خداوندی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِحَوَارِيِّتِهِ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ . . . (آل عمران ۶۹)۔ اسے جماعت مومنین اتم نظام خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے اپنے رسول کے اس طرح رفیق اور مددگار بن جاؤ جس طرح جب (حضرت) عیسیٰ نے کہا تھا کہ خدا کے دین کی خاطر میرا مددگار کون ہوگا، انہوں نے کہا تھا کہ ہم اللہ کے دین کی خاطر تمہارے مددگار رہوں گے۔

یعنی عیسائی اپنے پیغمبر کے رفقاء کا کردار یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان سے غداری بھی کی اور مصیبت کے وقت ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس قرآن ان کی سیرت و کردار کو مثالی قرار دیتا ہے یہ ہوتا ہے فرق خدا کی طرف سے نازل شدہ سچی تعلیم اور محرف و جی میں !

آیت (۵۳) میں کہا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ نے پیش آنے والے خطرہ کا احساس کیا۔ اس سے الگی آیت میں ہے۔

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (۵۳)

۳
۵۳

مخافین نے حضرت عیسیٰ پر ہاتھ ڈالنے کے لئے بڑے خفیہ طریقے اور تدبیریں شروع کر دیں ان کے مقابلے میں خدا نے (انہیں بچانے کے لئے) محض اسباب اور ذرائع پیدا کر دیئے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے تجویز کو وہ طریقے بہر نوع بہتر جوتے ہیں۔

حیات و وفات مسیح کا مسئلہ | یہاں سے حضرت عیسیٰ کا ایک نیا باب واہوتا ہے جس کا تعلق مسئلہ حیات و وفات مسیح سے ہے اور (جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، عیسائیوں کے انباغ میں اس نے) خود ہمارے ہاں ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ یہ گویا کفر اور ایمان کا معیار بن گیا ہے۔ بنا بریں اسے تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہونے تھے اسی طرح اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے اور اب قیامت کے نزدیک آسمان سے نازل ہوں گے۔ ہم نے یہ دونوں عقیدے عیسائیوں سے مستعار لئے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ عیسائیوں نے کسی سازش کے تحت ان عقائد کو ہماری کتب روایات میں داخل کر دیا اور اس طرح وہ ہمارے ہاں متواتر چلے آ رہے ہیں۔

یہودی ایک آنے والے مسیح کے منتظر تھے تاکہ وہ انہیں ذلت و پستی کی زندگی سے نکال کر پھر سے غلبہ و قوت عطاء کر دے۔ (بہر قوم جو ضعیف اور ناتوانی کا شکار ہو کر خود اعتمادی سے محروم ہو جائے اپنے آپ کو یہ فریب دے لیتی ہے کہ ایک آنے والا آئے گا اور ہمیں بام عروج پر پہنچا دے گا)۔ ان کے اس عقیدہ سے کئی فریب کار لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور جھوٹی نبوت کا دعوے کیا۔ یہودی اس قسم کے مدعیوں کی مخالفت بھی کرتے تھے اور

آنے والے کا انتظار | آنے والے کے عقیدے پر جم کر بیٹھے بھی رہتے تھے (یہ حالت ہر اس قوم کی ہوتی ہے جو کسی آنے والے کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے چنانچہ یہی حالت ہم مسلمانوں کی بھی ہے قرآن مجید میں رسول اللہ کے بعد کسی آنے والے کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ جب نبوت کو ختم کر دیا گیا تو پھر کسی اور مامور من اللہ کے آنے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا) بہر حال یہودی آنے والے مسیح کے انتظار میں تھے۔ جب حضرت عیسیٰ نے اس کا دعوے کیا تو وہ بچے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کی اس

شدید مخالفت کی وجوہات ظاہر ہیں۔ اول تو وہ حضرت مریم کے اس انقلابی اقدام کی بناء پر جس سے انہوں نے اس کی رسم خالقائیت کو توڑ کر رکھ دیا تھا، وہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہی کو جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ دوسرے حضرت عیسیٰ نے ان کی

مذہبی پیشوائیت کے خلاف جس شد و مد سے جہاد شروع کر رکھا تھا اس میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی انہوں نے حضرت مریمؑ سے جو کہا تھا کہ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا قَسِيًّا (۱۹) اور اس پر یہ کہہ کر اضافہ کیا تھا کہ مَا كَانَ الْبُؤْسُ اَمْرًا سَوِيًّا وَمَا كَانَتْ اُمَّتُكَ بَغِيًّا (۲۰) — یعنی وہ ان سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا بیٹا لے کر آگئی! نہ تیرا باپ بُرا آدمی تھا نہ تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ تم تو ایک پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کہا، اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی — تو اس سے وہ اپنی مخالفت کی وجہ جواز پیدا کرتے تھے — لیکن اس کی حقیقی وجہ وہی تھی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ میں وہ علامات پائی جاتی تھیں جو یہودیوں کی کتب سابقہ میں آنے والے سے متعلق مذکور تھیں۔ دوسرے، حضرت عیسیٰؑ کا انقلاب آفرین پیغام مذہبی پیشواؤں کی فریب کاریوں، سرمایہ داروں کی خون آشامیوں اور رومی حکومت کے استبداد کی چکی میں پسے والے عوام کے لئے بڑی کشش اپنے اندر رکھتا تھا۔ ہیکل کے سرغنہ پجاریوں کے دل میں اس سے خطرہ لاحق ہو گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اس تعلیم سے متاثر ہو کر عوام ان کے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہوں۔ انہوں نے اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ایک گہری تدبیر سوچی یہودیوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ جسے صلیب دیا جائے وہ لعنتی موت مرتا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کر دیا جائے تو عوام کے دل سے ان کے تقدس کا احساس بھی ختم ہو جائے گا اور یہ کاٹا بھی ہمیشہ کے لئے نکل جائے گا۔ انہیں نے اس مقصد کے لئے حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ یہ تھا ان کا وہ پلان جسے قرآن نے ”وَمَكَرُوا“ (۲۱) سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہ عزائم پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ شدہ شدہ یہ خبریں حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے رفقاء (حواریوں) تک پہنچ رہی تھیں۔

حضرات انبیاء کرام کی جو داستانیں قرآن کریم میں مذکور ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ جب حالات نہایت نازک ہو جاتے تھے

تو انہیں اس مقام سے ہجرت کر جانے کا حکم مل جاتا تھا۔ یہی نازک گھڑی حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں بھی آپہنچی۔ اس کی مدافعت کے لئے مشیت خداوندی میں جو تدبیر تھی اسے قرآن نے

حضرت عیسیٰؑ کی ہجرت

”مَكَرَ اللَّهُ“ (۲۲) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ”خدا کی مخفی تدبیر“ قرآن کریم میں حضور نبی اکرمؐ کی ہجرت کے سلسلے میں بعینہ یہی الفاظ آئے ہیں۔ سورہ انفال میں ہے: ”وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُ بِكَ دَيْنُكَرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمُنْكَرِينَ“ (۲۳)۔ اے رسول! تم اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے مخالفین (قریش مکہ) اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ ادھر اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے اور ادھر ہماری مشیت بھی اپنی تدبیروں میں لگی ہوئی تھی (اس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ) کارگر تدبیر ہماری ہی مشیت کی ہوئی“

رسول اللہ کی ہجرت

یہ تدبیر کیا تھی اور وہ کس طرح کارگر ہوئی اُسے سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (۱) ”یعنی خدا اپنے بندے کو راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف لے گیا“ (تفصیل میری کتاب معراج انسانیت میں ملے گی) یہ رسول اللہ کی ہجرت تھی، اور اسی قسم کی ہجرت کا اہتمام حضرت عیسیٰ کے لئے بھی کر دیا گیا۔ ان کے خلاف یہودیوں نے بڑا وسیع جال پھیلا رکھا تھا۔ اس لئے آپ کو ان کی دست برد سے بچانے کے لئے تدبیر بھی ذرا مختلف اختیار کرنی پڑی۔

حضرت عیسیٰ موت سے تو نہیں ڈرتے تھے (کوئی مردِ مومن بھی موت سے نہیں ڈرتا چہ جائیکہ حضراتِ انبیاء کرامؑ موت سے ڈر جائیں!) لیکن انہیں اس کا احساس ضرور ہو گا کہ اگر انہیں صلیب پر لٹکا دیا گیا تو وہ عوام کی نگاہوں میں ملعون قرار پا جائیں گے۔ آپ کی اس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مطمئن رہو۔ تم صلیب پر نہیں لٹکائے جاؤ گے: اِنِّیْ مُتَوَقِّئُکَ۔ ”تم اپنی طبیعت موت مرو گے“ اور تم ملعون نہیں قرار پاؤ گے: وَنَاْفَعُکَ اِلَیْ ”ہمارے ہاں تمہارے مدارج بہت بلند ہوں گے“ وَ مَظْهَرُکَ مِنَ الدِّیْنِ کَافَرٌ مَّوْءَا ”تمہیں یہ لوگ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ ہم تمہیں ان کی

دسترس سے بہت دور لے جائیں گے اور یہ لوگ جو تمہارے خلاف جھوٹے الزامات تراشتے ہیں ان سے تمہاری بریت ہو جائے گی۔ تم اپنے رفقاء سے بھی یہ کہہ دو کہ وہ گھبراہٹیں نہیں۔ اس وقت تو وہ کمزور اور مغلوب ہیں لیکن: وَجَاعِلُ الدِّیْنِ اَتَبَعُوْکَ ۳۴ ۵۴ ”خوفاں کے ذریعے اور الٰہی یومِ النقیمة“۔ ”تھوڑے ہی عرصے کے بعد تمہارے یہ متبعین تمہارے مخالفین

(یہودیوں) پر غالب آجائیں گے اور ان کا یہ غلبہ عرصہ دراز تک قائم رہے گا“ یاد رکھو! اس قسم کی کشمکش کے فیصلے ہر شخص یا سرگردہ کی اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کی رد سے ہوتے ہیں۔ جس سے کسی کو مضر نہیں۔ ہر مجرم اس کی طرف کھینچے کھینچے چلا آتا ہے: ثُمَّ اِلَیْ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلَفُوْنَ۔ (۳۵)

انجیل میں ہے کہ یہودیوں کی سازش سے حکومت نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا اور انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ لیکن صلیب پر ان کی موت واقع نہیں ہوئی۔ وہ بہت روز زندہ تھے کہ صلیب پر سے اتار لئے گئے۔ ان کے ہی خواہشوں نے انہیں ایک مصنوعی

قبر میں جاٹا یا جہاں ان کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور پھر وہ وہاں سے آسمان کی طرف اٹھ گئے جہاں وہ زندہ موجود ہیں اور دوبارہ نازل ہو کر دنیا میں عیسائیت کا غلبہ قائم کریں گے۔ اس کے برعکس یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ (۳۶)۔

صلیب کا بیان۔ انجیل کی رو سے

۱۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صلیب پر جان دے دی تھی اور بعد میں زندہ ہو کر آسمان پہنچے گئے۔

”ہم نے عیسیٰ بن مریم کو صلیب دے کر لعنتی عورت کو مار دیا تھا“ اور یہ بات ان دونوں عیسائیوں اور یہودیوں میں وجہ نزاع ہی نہیں، موجب نفرت اور باعث عداوت چلی آ رہی ہے۔ مسلمان اپنے مروجہ عقیدے کی بناء پر عیسائیوں کے ہمنا ہیں اس فرق کے ساتھ کہ عیسائی کہتے ہیں کہ ان کے نذول کے بعد عیسائیت کو غلبہ حاصل ہو گا اور مسلمان کہتے ہیں کہ آپ اور امام مہدی (جن کا ظہور اُس زمانے میں ہو گا) اسلام کو دیگر مذاہب عالم پر غالب کر دیں گے۔ (یہودی ابھی تک آنے والے مسیح کے منتظر ہیں)

واضح رہے کہ یہ عقیدہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں جو اگر ان کے مذہب کو تمام مذاہب عالم پر غالب کر دے گا۔

آنے والے کا عقیدہ

ہندو کلنکی اوتار کا انتظار کرتے ہیں، بدھ مت کے پیرو متیا بدھ کا، بخوسی عیسائیوں کی طرح منتظر کو زندہ آسمان پر تصور کرتے اور آخری زمانے میں اس کی آمد کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ آنے والا ان کے مذہب کو دیگر مذاہب پر غالب کر دے گا اور جب ان کے مذہب کو اس طرح غلبہ حاصل ہو جائے گا تو پھر قیامت آجائے گی۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ جب ہندو مت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور مسلمانوں کے یہ آنے والے ”قرب قیامت سے پہلے اکٹھے ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب کے غلبہ کے لئے تمواres سونت لیں تو اُس وقت پچارے انسانوں کا کیا حشر ہو گا؟ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی قیامت اور کیا ہو گی جس کا ظہور اسی کرۂ ارض پر ہو گا۔ قرآن کریم نے واقعہ صلیب کی اصلی شکل کیا بتائی ہے اسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس وقت یہ

دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ مروج ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ

حیات مسیح کے عقیدہ کی سند!

آسمان پر اٹھائے گئے تو اس کی سند میں کیا کہا جاتا ہے؟ اس کی سند میں وہ روایات پیش کی جاتی ہیں جو ہماری کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ علامہ مآدِی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں ان تمام روایات پر تنقید کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ سب وضعی اور غیر معتبر ہیں۔ (یہ تنقید طلوع اسلام کی اشاعت بابت اگست۔ ستمبر اکتوبر دسمبر ۱۹۵۳ء اور جنوری۔ فروری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی)۔ اس تنقید کا اعادہ یہاں ناممکن ہے۔ اور ویسے بھی ہمیں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم اپنی بحث کو قرآن کریم تک محدود رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کے مؤیدین نے قرآن کریم سے کس طرح سہارا لیا ہے یہ نکتہ غور طلب بھی ہے اور اس کے ساتھ دلچسپ بھی۔ آیت (ہر) میں جو کہا گیا ہے: اِنِّیْ مُتَوَدِّعٌ ذَرَّافِعْلَکَ اِلٰی۔ یہ حضرات اس کا ترجمہ کرتے ہیں میں نے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا اپنی طرف۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن) اس میں یہ حضرات ”اِلٰی“ (اپنی طرف) کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کو اپنی طرف

ترفع الی السماء

اٹھالیا۔ یعنی انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا اور وہ وہاں زندہ موجود ہیں اور وہیں سے قیامت کے قریب نازل ہوں گے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ یہ سہارا کس قدر محکم ہے !

جب ذہن الہی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو وہ کسی بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف محسوسات کو حقیقت سمجھتا تھا اس لئے اس نے اپنے معبودوں کو بھی محسوسات کا لباس اوڑھایا اور انہیں مٹی اور پتھر کی صورتوں میں اپنے سامنے رکھا۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ خدا کا مندرہ تصور پیش کرتے تھے لیکن ان کے بعد جب الہ کی تعلیم مسخ ہو جاتی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو ان کے متبعین خدا کو محسوس پیکروں میں ڈھال لیتے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے تصورات کو باطل قرار دیا اور کہا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (۲۳/۱) خدا ان تمام تصورات سے بلند و بالا اور پاکیزہ مندرہ ہے جسے یہ اپنے ذہنوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ وہ محسوس پیکر نہیں رکھتا اس لئے نہ وہ کسی خاص مقام میں مقیم ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کے لئے کسی خاص جگہ جانے کی ضرورت ہے : هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۲۴/۱) جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور تَحْشُرُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۲۵/۱) ہم ان کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں؛ وَلَكِنْ لَا تَبْصُرُونَ (۲۶/۱) لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ تھا خدا کا وہ تصور جو قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ وہ خدا جو زمان اور مکان کی نسبتوں سے بند اور محدودیت و محسوسیت کی ادنیٰ سی آلائش سے بھی پاک ہے۔ اس سلسلے میں اس مختصر سی گفتگو کو بھی دیکھئے جو ہم نے مطالب الفرقان کی تیسری جلد (۲۲/۱) زیر آیت (۲۸/۱) 'قرب خداوندی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ قرب خداوندی سے مراد خدا اور بندے کے درمیان ایسا فاصلہ نہیں جسے محسوس پیمانوں سے ماپا جائے۔ اس سے مراد بلندئی مدارج ہے۔ اس ضمن میں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ کا مفہوم اندکس کی مدد سے بھی دیکھئے۔

خدا کے متعلق قرآن کے اس پیش کردہ تصور کی رو سے : ذَا فَعْلِكَ الْاٰتِ (۲۷/۱) اور : بَلْ تَفَعَّلُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۲۸/۱) میں "اَلِ الْاٰتِ" سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں ممکن ہے جس کی طرف اس نے حضرت عیسیٰؑ کو اٹھالیا۔ ہم قرآن کریم کے مختلف مقامات سے "الیہ" کا مفہوم واضح کر سکتے تھے لیکن اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی (یہ تفصیلی بحث آپ کو میری کتاب شعلہ مستور کے صفحات ۸۹-۸۸ اور مطالب الفرقان جلد سوم ص ۱۱۳ میں ملے گی جہاں : اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۲۹/۱) کا مفہوم بیان کیا گیا ہے)۔ یہاں قرآن کریم کے صرف دو مقامات کا حوالہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ اَلِ الْاٰتِ سے مراد کوئی ایسی سمت یا جہت نہیں جو اُس مقام کی طرف لے جاتی ہو جہاں خدا ممکن ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین ہجرت کی تو فرمایا : اِنِّیْ مُہَاجِرٌ اِلَی رَبِّیْ (۲۹/۱)۔

اَلِ الْاٰتِ کا مفہوم

”میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں“ دوسری جگہ ہے ”إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَقْدِرُ عَلَيَّ“ (۲۹) ”میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا“ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے۔ وہ اس طائفی ماحول کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف منتقل ہو گئے تھے جہاں وہ خدائی پروگرام کو آزادانہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

باقی رہا لفظ رَفَعَ تو اس کے معنی بلند ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم میں ان معانی میں متعدد مقامات میں آیا ہے مثلاً سورہ یوسف میں ہے: ذَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ لَّسَاءُطٍ (۱۲) ”ہم اپنی مشیت کے مطابق بلندی درجات عطا کر دیتے ہیں۔“

یانبیٰ اکرمؑ کے متعلق ہے: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴) ”ہم نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا“ سورہ اعراف میں ہے: وَلَوْ شِئْنَا لَافْتَحْنَا لَكُمُ الْبَابَ فَأَخْرَجْنَا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي كُنتُمْ تُكَذِّبُونَ (۱۲۴) ”ہم چاہتے تھے کہ اپنی تعلیم کی رد سے اسے بلند مقامات عطا کر دیتے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپٹ گیا“ حضرت ادریسؑ کے متعلق توریت کے ساتھ مکمل

رفع کے معنی | کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا ہے: وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹) ”ہم نے اسے نہایت بلند مقام عطا کر دیا۔“ رفعت مدارج عطا کرنے کی جہت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ کہا ہے۔ یعنی بلند مدارج عطا کرنے والا“ (۲۰)۔

ان تصریحات کی رد سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو کہا ہے کہ ذَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۱۲) ”بل رفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْنَا“ (۱۳) تو اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا انہیں اٹھا کر اپنی طرف (آسمان پر لے گیا) اس کے معنی واضح ہیں۔ یہودیوں کا دعوئے تھا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے۔ اس کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وَمَا قُلُواکُمْ وَمَا صَلَبُوهَا (۱۴)۔ ان کا یہ دعویٰ ہی سرے سے غلط ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مار دیا۔ وہ نہ ان کے ہاتھوں صلیب دیئے گئے نہ لعنتی موت مرے۔ خدا نے انہیں اپنے ہاں بلند مدارج عطا کئے۔



قرآن کریم نے خدا کے متعلق ایسا منظرہ تصور دیا تھا جو مقام کی نسبتوں سے بلند اور جہت کی اضافتوں سے بالاتر تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے جو کچھ پہلی امتوں کے ساتھ گزرا وہی کچھ صدراقل کے بعد ہمارے ساتھ ہوا۔ ہمارے ہاں بھی خدا کو محسوس پیکروں میں ڈھالا گیا۔ حتیٰ کہ تجسیم نامی ایک فرقہ پیدا ہو گیا جس نے خدا کو محسوس شکل میں ڈھال دیا اور جب خدا محسوس قالب میں ڈھل گیا تو اس کے رہنے کے لئے کوئی مقام بھی متعین کرنا پڑا۔ عیسائیوں کے ہاں خدا کے متعلق یہ تصور

یہ بحث مختصراً پہلے باب میں گزر چکی ہے۔ وہیں وہ حدیث بھی درج کی جا چکی ہے جو آگے آرہی ہے۔ ربط موضوع کے تقاضا سے ہم نے

عام تھا کہ وہ آسمانوں کے اوپر ہے چنانچہ ان کی مشہور دعا میں ہے :-

آسمانوں کے اوپر خدا | اے ہمارے باپ! جو تو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے (باب - آیت ۱۷۱)۔

اسی جہت سے انہوں نے اپنے پیغمبر، حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا کہ خدا نے انہیں اپنے ہاں آسمان پر اٹھالیا۔ جب مسلمانوں نے خدا کو محسوس پیکر میں ڈھالا تو اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وہ آسمانوں کے اوپر عرش پر متمکن ہے۔ اس سلسلے میں متعدد روایات وضع کی گئیں۔ مثلاً احادیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے :-

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اکہتر، بہتر یا تہتر سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکریاں ہیں جن کے گھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش الہی ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

جب خدا کو اس قسم کے عرش پر بٹھا دیا گیا تو اِنِّیْ تَرٰ اَفْعٰلَکَ اِلٰہِیْ کا مفہوم لینے میں کوئی دشواری نہ رہی کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنی طرف اٹھالیا اور وہ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین کی طرف نازل ہوں گے۔ علاوہ اس کے کہ یہ تمام تصورات قرآن کے خلاف اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لئے ہوئے ہیں، عصر حاضر کی افلاکی تحقیقات کی رُو سے ان آسمانوں کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے جن کا تصور اس قسم کی روایات میں دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے افلاکی کائنات کے متعلق جو کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا خلائی تحقیق ایک ایک قدم پر اس کی صداقت کی شہادت بہم پہنچائے چلی جا رہی ہے (یہ بہر حال ایک جداگانہ موضوع ہے)۔



یہ حقیقت کہ حضرت عیسیٰؑ بھی دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح وفات پا چکے ہیں قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے۔ ان کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں دو ایک شہادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ **وفات مسیحؑ** | حضرت عیسیٰؑ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیری یا تیری والدہ کی پرستش کیا کریں۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ معاذ اللہ میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ باقی رہے یہ لوگ جو میرے اُمتی ہونے کے مدعی ہیں، سو ان کے متعلق میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ **وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ** ”جب تک میں ان میں رہا ان کا نگہبان رہا: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ“ (۵/۱۱۷)۔ لیکن جب تو نے مجھے وفات دے

دی تو اس کے بعد ان کا نگران تو ہی ہو سکتا تھا۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی کے دو ہی مرحلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ مرحلہ جس میں وہ اپنے متبعین میں رہے۔ اس کے بعد ان کی وفات کے بعد کا مرحلہ۔ اس میں اس درمیانی مرحلہ کا کوئی ذکر نہیں جس میں وہ تمام عقیدے کے مطابق، آسمان پر چلے گئے۔ اس سے واضح ہے کہ اپنے متبعین میں رہنے کے بعد ان کی وفات ہو گئی تھی۔

سورہ مریم میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے دعوائے نبوت پیش کیا تو انہوں نے یہ بھی کہا: **وَأَوْصِيَنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا** (۱۹) کہ اللہ نے مجھے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دے رکھا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ (مردہ عقائد کی رو سے) آسمانوں پر زندہ موجود ہیں اور لاکھوں کروڑوں برس تک وہاں رہیں گے تو وہاں آپ ان احکام خداوندی کی تعمیل کس طرح کرتے ہوں گے؟ صلوٰۃ کے متعلق تو کہہ دیا جائے کہ وہ وہاں نماز پڑھ لیتے ہوں گے لیکن زکوٰۃ کے فریضہ کی ادائیگی آپ کس طرح کرتے ہوں گے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اور آخری بات یہ کہ سورہ مائدہ میں ہے کہ **مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ذُئِمَّتْ صِدْقُهُ كَمَا نَايَا مُكَلَّانِ الطَّعَامِ - أَنْظُرْ كَيْفَ بُكِّيتَ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ إِلَىٰ يَوْمِ فَكُورِهِ** (۵)۔ مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا ایک رسول تھا۔ ویسا ہی رسول جیسے رسول اس سے پہلے اپنے اپنے وقتوں میں آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ اور اس کی ماں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ بڑی راست باز خاتون تھیں۔ وہ دونوں عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ یعنی انہیں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں کوئی فوق البشر (طبعی) خصوصیت حاصل نہیں تھی۔ تم غور کرو کہ ہم کس وضاحت سے تمام امور بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد تم اس پر بھی غور کرو کہ یہ لوگ بایں ہمہ کس طرف الٹے پھر رہے ہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔



ان تصریحات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر واقعہ صلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم نے اس کی وضاحت ایک لفظ میں کر دی ہے۔

یہودی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکایا اور وہاں انہوں نے چلا چلا کر جان دے دی اور

اصل واقعہ کیا تھا؟ اس طرح وہ (معاذ اللہ) یعنی موت مرے۔ عیسائی، یہاں تک تو سب متفق تھے (اور متفق ہیں) کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ انہوں نے

صلیب پر جان دے دی اور بعض کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر مرے نہیں تھے۔ انہیں صلیب پر سے اتار لیا گیا اور ایک خفیہ مقام پر قبر میں رکھا گیا تھا۔ جہاں سے وہ اٹھ کر آسمان کی طرف چلے گئے تھے۔

صلیب کے متعلق اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی صورت موجودہ پھانسی کی سی نہیں تھی جس پر لٹکنے سے ایک جھٹکے میں جان نکل جاتی ہے۔ وہ کڑاں (+) کی شکل کے دو شہتیر ہوتے تھے۔ مجرم کے ہاتھوں اور پاؤں میں منجیں ٹھوک کر اسے ان کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس کی فوراً جان نہیں نکل جاتی تھی بلکہ وہ ان منجیوں کی اذیت، بھوک پیاس کی شدت اور موسم کی سختی کی وجہ سے سسک سسک کر جان دیتا تھا۔ بعض مجرموں کی صورت میں تو اس میں دو دو تین تین دن لگ جاتے تھے۔ اور صلیب سے اتارنے وقت ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں بھی توڑ دی جاتی تھیں۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر صرف دو تین گھنٹے رہے اور وہاں سے اتارنے وقت ان کی ہڈیاں بھی نہیں توڑی گئیں۔ بہر حال اس داستان کے اتنے حصے تک تو (یہودی اور عیسائی) سب متفق ہیں کہ حضرت مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ

ذَقُّوْهُمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيسٰى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اَخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اَتْبَاعُ الظُّلُمِؕ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ (۱۵۷)

یہ لوگ (یعنی یہودی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ) ہم نے مسیح ابن مریم کو ذلت کی موت مار دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نہ اسے قتل کر کے ذلت کی موت مارا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا۔ ہوا کچھ اور یہ سمجھے کچھ اور — اور یوں ان پر اصل بات مشتبہ ہو کر رہ گئی۔ جو لوگ اس واقعہ کی جزئیات میں ماہمی اختلاف کرتے ہیں

معاملہ مشتبہ ہو گیا

اصل بات کا انہیں بھی علم نہیں۔ وہ بھی محض ظن و قیاس کی بنیاد پر باتیں کرتے ہیں۔ یقینی بات

یہی ہے کہ انہوں نے اسے مارا ہی نہیں۔

وہ ملعون نہیں ہوا : بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ اللہ نے اس کے مداح بلند کر دیئے (تفصیل اس کی آیت ۱۵۷ کے تحت پہلے گزر چکی ہے)۔

یہ قرآن کریم کا بہت بڑا دعویٰ ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو چیلنج ! مَا قَتَلُوْهُ (حضرت مسیح کے صلیب پر جان دینے) کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ یقینی طور پر کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے لیکن : مَا صَلَبُوْهُ (حضرت عیسیٰ کو صلیب بھی نہیں دی گئی) کے متعلق تو ان میں سے کسی کو کسی قسم کا شبہ نہیں تھا۔ لہذا قرآن مجید کا یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ میں ایک عرصے تک اس باب میں غور کرتا رہا اور امکان بھر تحقیق بھی کی کہ جسے صلیب پر لٹکایا گیا تھا اگر وہ حضرت عیسیٰ نہیں تھے تو وہ کون تھا؟

میری سوچ کا رخ اس سمت کو جانا تھا کہ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی سیرت اور کردار کے متعلق جو کچھ کہا ہے (اور جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اپنے رسول کو تنہا چھوڑ دیا ہو کہ یہودی انہیں گرفتار کر کے صلیب پر لٹکا دیں۔ کچھ ایسا ذہن میں آتا تھا کہ انہوں نے ایسی تدبیر کی ہوگی جس سے حضرت عیسیٰؑ پہلے ہی وہاں سے نکل گئے اور اس کے بعد اس خیال سے کہ یہودی اور عمال حکومت انہیں وہاں نہ پا کر ان کی تلاش میں نہ نکل کھڑے ہوں، انہوں نے عظیم کا نامہ سرانجام دیا۔ ان میں سے ایک جانثار نے مسیح کا روپ دھار کر اپنے آپ کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ اور باقی حواریوں نے اسے صلیب پر سے اتروا کر (جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے) اسے اپنے ساتھ لیا اور پھر سب وہیں چلے گئے جہاں اس سے پہلے حضرت عیسیٰؑ تشریف لے جا چکے تھے۔ اس خیال کی تائید کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے، سورہ مائدہ کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات گناتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ تم ہمارے اس انعام کو بھی یاد کرو: **وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ عَنْكَ (۱۱۱)** ”جب ہم نے تمہیں یہودیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا“ یعنی تم ان کے ہاتھ ہی نہ لگے۔

قرآن کریم نے اس باب میں اتنا ہی کہا ہے۔ لیکن اب خود مغربی محققین اس امر کی تحقیق کر رہے ہیں کہ واقعہ تصلیب کی حقیقت کیا تھی اور وہ کون تھا جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ اس باب میں وہاں طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور آئے دن اس موضوع پر کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہوتی رہتی ہے۔ چند برس ادھر اس موضوع پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس نے دنیائے عیسائیت میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب کا نام ہے **(THE PASSOVER PLOT)** اور

خود عیسائیوں کی تحقیق

مصنف کا نام ہے **(DR. HUGH J. SCHONFIELD)** ہم تو اس سے متفق

نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہیں؛ لیکن اس مصنف کی تحقیق کی ساری عمارت اس مفروضہ پر اتوار ہوتی ہے کہ یہ ایک سوچا سمجھا ڈرامہ تھا جو یہود شلم میں یہودیوں کے سالانہ جشن کے موقع پر کھیلایا گیا تھا۔ اسی جہت سے اس نے اسے **(PLOT)** کہہ کر پکارا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہودیوں کو ایک مسیحا کا انتظار تھا جس کی آمد کا ذکر اور متعلقہ علامات ان کی سابقہ کتابوں میں مذکور تھیں (حضرت عیسیٰؑ کے دل میں (دانستہ یا نادانستہ) یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ آنیوالا مسیح میں ہی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے وہ علامات ان پر پوری اتریں جو یہودیوں کی الہامی کتابوں

۱۔ **(PASSOVER)** ایک سالانہ جشن تھا جسے یہودی بڑے جوش و خروش سے منایا کرتے تھے (شاید اب بھی سالتے ہوں)۔ واقعہ

تصلیب انہی دنوں ظہور میں آیا تھا جب یہود شلم میں جشن منایا جا رہا تھا۔ لفظ **(PLOT)** کی تشریح اوپر متن میں ملے گی۔

میں مذکور تھیں۔ ان علامات میں آخری علامات یہ بھی تھی کہ اس مسیح کو صلیب دیا جائے گا اور اس کے بعد وہ آسمان پر چلا جائے گا اس مصنف کے کہنے کے مطابق (حضرت) مسیح نے نہایت احتیاط سے اس پلان کی جزئیات مرتب کیں جن کی رو سے وہ صلیب پر تو چڑھائے جائیں لیکن انہیں چند گھنٹوں کے بعد وہاں سے اتار دیا جائے۔ ان کی ٹانگیں بھی نہ توڑی جائیں اور پھر وہ یروشلم سے کہیں باہر نکل جائیں۔ اس پلان میں ان کے حواریوں کے علاوہ، وہاں کا ایک بااثر دولت مند بھی شریک تھا جس کا نام یوسف تھا۔ یہودیوں کے علاوہ رومی گورنر کے ہاں بھی اس کا اثر راسخ تھا اور دوسری طرف وہ حضرت عیسیٰ کا عقیدہ مند بھی تھا۔ اس نے اس پلان کو کامیاب بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ہم اس سے تو کسی صورت بھی متفق نہیں ہو سکتے کہ حضرت عیسیٰ (معاذ اللہ) قریب خورد یا قریب کار مدعی مسیحیت تھے لیکن اس سے اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوا تھا اس میں آپ کے حواری برابر کے شریک تھے۔

ہم نے اس سے پہلے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام ہے (THE LIFE OF JESUS) اور جس کے مصنف ہیں (MARCELLO CRAVERI)۔ اس مصنف نے متعدد حوالوں کی مدد کے ساتھ لکھا ہے کہ

جب رومی سپاہی (حضرت) عیسیٰ کو کشاں کشاں سوئے دار لے جا رہے تھے تو صنعت اور کمزوری کی وجہ سے آپ سے وہ شہتیر اٹھائے نہیں جاتے تھے جنہیں گاڑ کر صلیب بنانا مقصود تھا۔ راستے میں (SIMON) نامی ایک شخص ملا

جو کھیتوں میں کام کاج کرنے کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ رومی سپاہیوں نے اسے بیگاں میں پکڑا اور کہا کہ وہ ان شہتیروں کو اٹھا کر ساتھ چلے چنانچہ

صلیب کسی اور کو دی گئی تھی

اس نے شہتیر اٹھا لئے تو (حضرت) عیسیٰ نے ایسا کیا کہ خود سائمن کی شکل اختیار کر لی اور سائمن (حضرت) عیسیٰ کا ہم شکل ہو گیا۔ چنانچہ سائمن کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور (حضرت) عیسیٰ سائمن بنے صلیب کے نیچے کھڑے مکتاتے رہے۔ (ص ۳۹۵)

یہ مورخ حقیقت تک تو نہیں لیکن اس کے قریب قریب پہنچ گیا ہے۔ یعنی اس مقام تک کہ جسے صلیب دیا گیا تھا وہ حضرت مسیح نہیں تھے، کوئی اور تھا۔ لیکن اصل حقیقت پر سے پردہ انجیل برہناس میں اٹھایا گیا ہے جو میرے اس قیاس کی تائید کرتی ہے جسے میں نے قرآن کریم کے اشارات کی روشنی میں قائم کیا تھا اور جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ حواریوں کے مشورہ سے حضرت عیسیٰ

۱۔ ہم اس سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک نبی کی عظمتِ کردار کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن (یہودی یا) عیسائی اپنے انبیاء کی طرف اس

قسم کے توہین آمیز افسانے منسوب کرنے میں کوئی بھجک محسوس نہیں کرتے۔

پہلے ہی دہاں سے ہجرت کر گئے تھے اور ان ہی میں سے ایک جاں نثار نے حضرت مسیح کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو درمیں سپاہیوں کے حوالے کیا تھا۔ اور اسی جانباز کو صلیب پر چڑھایا گیا اور (جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے) زندہ اتار لیا گیا۔

انجیل برنباس کا مختصر سا تذکرہ اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ برنباس حضرت مسیحؑ کے حواریوں میں سے تھے۔ عیسائی ان کا شمار

انجیل برنباس | ”بھی رسولوں“ میں کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک انجیل مرتب کی تھی لیکن عیسائیوں نے صرف یہ کہ اس کا شمار ان اناجیل میں نہ کیا جنہیں انہوں نے مستند قرار دے کر قبول کر لیا تھا بلکہ اسے دنیا کی نظروں

سے اوجھل کر دیا اس لئے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے عیسائیوں کے معتقدات اور دیگر اناجیل میں بیان کردہ دو کوائف کی تردید ہوتی تھی۔ اس نام عرصے میں اس کا ذکر تو آتا رہا لیکن اس کا وجود کہیں نظر نہ آتا تھا۔ قریب تین سو سال اُدھر کا ذکر ہے کہ پوپ کی

لائبریری سے اس کا نسخہ چوری کر کے باہر لایا گیا۔ اس کے بعد من جملہ دیگر زبانوں کے عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا اور عربی سے اس کا ترجمہ اردو میں ہوا جسے مولوی انشا اللہ، مالک اخبار وطن لاہور نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا

ایڈیشن جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں واقعہ تصلیب کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حواریوں کے مشورہ سے ہوا تھا اور جس یہود یا مسخریوطی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

اس نے حضرت عیسیٰؑ کی مخبری کی تھی اور چند سکول کے عوض انہیں گرفتار کرادیا تھا، وہ درحقیقت وہی جاں نثار تھا جس نے اپنے آپ کو اس جانکاہ خطرے میں رخصتا مندانہ ڈال دیا تھا جس زلمے میں یہ انجیل لکھی گئی تھی اُس وقت کی احتیاط کا تقاضا تھا

کہ حقیقت کو اشارات کے پردوں میں لپٹا کر پیش کیا جائے۔ اگر مصنف کی اس احتیاط کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر اصل واقعہ کے سمجھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہود یا مسخریوطی (بظاہر) مخبری کرنے کے لئے رومیوں کے ہاں

گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرانے کے لئے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لایا۔ :-

اور جب سپاہی یہود کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا۔ یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا

مناقب اسی لئے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا اور گیارہوں (شاگرد) سو رہے تھے۔ پس جب کہ اللہ نے اپنے بندہ کو خطرہ میں

دیکھا اپنے سفیروں، جبرائیل، میخائیل، رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو اس دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے

اور یسوع کو دکن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اس کو اٹھائے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں

ان فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا۔ جو کہ اب تک اللہ کی تسبیح کرتے رہیں گے۔ (فصل ۲۱۵ - ص ۲۹۴)

اس کے بعد ہے :-

اور یہود اور کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا جس میں سے یسوع اٹھایا گیا تھا۔ . . . تب اللہ نے ایک عجیب کام

۲۱۵

کہا۔ پس یہود ابولی اور چہرے میں بدل کر یسوع کے مشابہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اعتقاد کیا کہ وہی یسوع ہے۔ (فصل ۲۱۶)

پس سپاہیوں نے یہود کو کپڑا اور اس کو اس سے مذاق کرتے ہوئے باندھ لیا۔ (فصل ۲۱۷ - ص ۲۹۸)۔

اسی یہود کو صلیب پر چڑھایا گیا اور :-

وہ شاگرد جو کہ اللہ سے نہیں ڈرے تو وہ رات کے وقت گئے اور یہود کی لاش چاکر اسے چھپا دیا اور خبر ادا دی کہ

یسوع جی اٹھا ہے (فصل ۲۱۸ - ص ۳۰۳)۔

یہ ہے حضرت مسیحؑ کے ایک حواری کی وہ آنکھوں دیکھی شہادت جو قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے کہ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۱۵۷)۔ باقی رہا اس آئینہ جمیل کا اگلا حصہ کہ ذَرِّئَ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا بَيِّنَاتٍ مِّنْهُ تَوَاسَّسَ فِيْهِمْ يَتَّبِعُونَ

اور یسوع کے چلے جانے کے بعد شاگرد، اسرائیل اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو گئے۔ وہ گناہ حق جو شیطان کو پسند نہ آیا، اس کو

باطل نے دبا لیا جیسا کہ یہ ہمت کا حال ہے پس شریروں کے ایک فرقہ نے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یسوع کے شاگرد ہیں یہ

بشارت دی کہ یسوع مر گیا اور وہ جی نہیں اٹھا اور دوسروں نے یہ تعلیم پھیلائی کہ وہ درحقیقت مر گیا پھر جی اٹھا اور اوردن نے

منادی کی اور برابر منادی کر رہے ہیں کہ یسوع ہی اللہ کا بیٹا ہے اور ان ہی لوگوں کے شمار میں بولنے نے بھی دھوکا دیا۔ اب

رہے ہم تو ہم محض اسی کی منادی کرتے ہیں جو میں نے ان لوگوں کے لئے لکھا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں تاکہ اخیر دن میں جو

اللہ کی عدالت کا دن ہو گا چھٹکا رہا پائیں۔ آمین۔ (فصل ۲۲۲ - ص ۳۸۸)۔

اسی فصل پر انجیل برنبا س ختم ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت مسیحؑ ہجرت کر کے کہاں تشریف لے گئے اور کس مقام

پر ان کی وفات ہوئی اس کے متعلق نہ انا جیکل میں کچھ کہا گیا ہے اور نہ ہی قرآن کریم میں اس کی بابت کچھ آیا ہے۔ اصل یہ ہے

کہ قرآن کریم نے اکثر انبیاء کرامؑ (حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط وغیرہ علیہم السلام) کی ہجرت کی

بعد کی زندگی کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ یہی کیفیت حضرت عیسیٰؑ کی ہجرت کے بعد کی زندگی کی ہے۔

عیسائیوں نے یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی تھی اس لئے وضع کیا کہ ان کے کفارہ کے عقیدہ کا اثبات

ہو جائے۔ جیسا کہ مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۹ زیر آیت (۱۸۰) میں بتایا جا چکا ہے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ

خدا کے بیٹے نے اپنی جان دے کر ہمیں گناہوں سے نجات دلا دی۔ عیسائیت کی ساری تعلیم اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر عیسائی کی موت کے وقت پادری آکر اس سے حضرت مسیحؑ کی وفات اور کفارہ کے عقیدہ کا اقرار لیتا ہے۔

قرآن کریم نے آیات (۱۵۸-۱۵۹) کے تسلسل میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا ہے کہ

وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنُوا بِهٖ قَبْلَ مُوْتَبِئٍ وَيَوْمَ الرَّقِيْمَةِ يَكْفُرُوْنَ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۙ (۵۳)۔

عیسائیوں کا یہ عالم ہے کہ باوجودیکہ حقیقت حال کا انہیں بھی یقینی طور پر علم نہیں۔ وہ مسیح کے جان دینے اور اس طرح ان کے گناہوں کے کفارہ بن جانے پر ایسا محکم یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت کے وقت اس کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن جب یہ لوگ مسیح کے کفارے پر ایمان کی بنا پر اپنی بخشش کے لئے خدا کے حضور جائیں گے تو خود مسیح ان کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ان سے اس قسم کے عقائد رکھنے کا کبھی نہیں کہا تھا۔ یہ سب عقائد ان کے خود ساختہ ہیں (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آیات (۱۱۸-۱۱۹) میں ملے گی)۔

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دی ہی نہیں گئی تھی عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد ہی ختم کر دی۔ اور ہم نے جو پہلے لکھا ہے کہ اب خود عیسائی محقق بھی اسی حقیقت کی طرف جا رہے ہیں کہ جسے صلیب پر چڑھا یا گیا تھا وہ حضرت عیسیٰ نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفارہ کے عقیدہ کی عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے منہدم کر رہے ہیں۔ یوں قرآن نے اپنے دعویٰ کو زور منوایا ہے۔



یہ ہیں حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور وفات کے متعلق وہ حقائق جنہیں میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن مجید سے سمجھ سکا ہوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے ان عقائد نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ ایسی اہمیت کہ انہیں کفر اور ایمان کا معیار قرار دے دیا گیا ہے۔ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ میں جو کچھ لکھا ہے آپ اس سے ضرور اتفاق کریں۔ جو حضرات میری پیش کردہ تصریحات کو صحیح سمجھیں۔ وہ مجھ سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ جو ایسا نہ سمجھیں وہ جو عقائد مجی میں آئے رکھ لیں۔ میں ان سے کسی قسم کی بحث میں نہیں الجھوں گا۔



جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم میں بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس زیر عنوان بنی اسرائیل) میزان خداوندی میں یہودیوں کی آخری تباہی | یہودیوں (بنی اسرائیل) کے جرائم کا پلڑا آہستہ آہستہ جھٹکا چلا جا رہا تھا تاکہ وہ اس جرم عظیم کی وجہ سے (جو انہوں نے حضرت عیسیٰ کے خلاف کیا تھا) اپنی انتہا تک پہنچ گیا اور ان کی آخری تباہی کا وقت آگیا۔ اس کے متعلق حضرت عیسیٰ نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی۔ انجیل متی میں ہے اور یسوع مہیکل سے نکل کر جا رہا تھا کہ اس کے شاگرد اس کے پاس آئے تاکہ اسے مہیکل کی عمارتیں دکھائیں۔ اس نے جواب میں ان سے کہا کیا تم ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا

جو گریبا نہ جائے گا (متی ۲۳/۱۳)۔

ان کی یہ آخری تباہی اسی رومی حکومت کے جرنیل (TITUS) کے ہاتھوں ظہور میں آئی جس حکومت سے ساز باز کرنے کے بعد انہوں نے (بڑے غم خویش) حضرت مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ یہ تباہی کس قدر عبرت انگیز تھی اس کی بابت انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔

سُءٌ — اب پینے کی دسویں تاریخ کو خوف دہرا اس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی سقوطِ یروشلم

عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ وہ الساعت (انقلابِ عظیم) تھا جس کی آمد کی علامت حضرت عیسیٰ تھے۔ قرآن کے الفاظ میں: وَ اِنَّكَ لَعَلَّمْتَ السَّاعَةَ (۲۳)۔ ہمارے عام طور پر "الساعت" سے مراد مرنے کے بعد آنے والی قیامت لی جاتی ہے لیکن قرآن مجید میں یہ اصطلاح ان انقلابات کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے جن کی رو سے قوموں کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں (تفصیل میری لغات القرآن میں دیکھیے)۔ یہی وہ الساعت تھی جس کے متعلق کہا گیا کہ یہودی جو اپنی سرکشی اور حدودِ فراموشی سے باز نہیں آتے تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَ هُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۲۳)۔ کہ یہ اس انقلاب کے انتظار میں ہیں جو اس طرح دفعتاً آجائے گا کہ وہ ان کے دہم دگمان میں بھی نہیں ہوگا۔ اور یہی تھا دنیا میں وہ عذابِ شدید جس کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت (۵۴) میں کیا گیا ہے۔ آیت (۵۴) تک ہم پہلے آچکے ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ کلام یوں آگے چلتا ہے۔

آیت (۵۴) کا انا حصہ پہلے آچکا ہے۔ اِذْ قَالَ... كُفِّرُوا۔ اور اس کی تشریح بھی وہاں کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد آیت کا بقایا حصہ آیات (۵۵-۵۶) کے ساتھ ملانے سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَعِدْ بِهِمُ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ ۝ وَاَمَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ جُزْءَهُمْ ۝ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ (۵۵-۵۶)

جن لوگوں نے حقیقت اور صداقت سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کی ہے، انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت عذاب دیا جائے گا اور اس عذاب (تباہی) سے انہیں کو بچا نہیں سکتا۔

ان کے برعکس جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں (اور یقین رکھیں گے) اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت

بخش پر وگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں (اور ہوں گے) ان کی محنت کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی کی محنت کے بدلہ میں کبھی کر کے ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں، اللہ انہیں پسند نہیں کرتا۔

یہ آیات حضرت عیسیٰ کی داستانِ حیات کے تسلسل میں آئی ہیں، اس لئے ان میں کفر اور سرکش برتنے والوں سے مراد یہودی ہیں۔ ان پر اس دنیا میں تباہی کس طرح آئی تھی، اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان کے برعکس حق و صداقت پر یقین رکھنے والے، اُس دور کے عیسائی تھے، اور اُن کے بعد اہل اسلام۔ اُن عیسائیوں کے متعلق آیت (۳۷) میں کہا گیا ہے۔

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فُتًى الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۳۷)

(اے عیسیٰ) اس وقت تیری جماعت کے افراد نہایت کمزور اور ناتواں دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس کے بعد (دنیا دیکھ لے گی) کمزور اُن اور ناتواںوں کی یہی جماعت کس طرح ان یہودیوں پر غالب آجاتی ہے جو اس وقت (اس قدر تشدد و برت رہے ہیں۔ ان کا یہ غلبہ عرصہ دراز تک قائم رہے گا۔ باقی رہے اُن کے باہمی اختلافات، سو اُن کا فیصلہ ہمارے ہاں سے ہوگا) (اس دنیا میں اس وقت جب قرآن نازل ہوگا اور اس کے بعد آخرت میں)۔

یہودیوں پر حضرت عیسیٰ کے متبعین کے غلبہ کی بشارت اس وقت دی گئی جب ان متبعین کو کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ لوگ کس طرح یہودیوں پر غالب آ گئے، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ (یہ تاریخ، ظہور اسلام کے بعد جماعتِ مؤمنین کے

یہودیوں پر عیسائیوں کا غلبہ

صحن میں دہرائی گئی)۔ (ضمناً) اوپر کہا گیا ہے کہ متبعین حضرت عیسیٰ کا یہ غلبہ ”الیوم القیامت“ (قیامت کے دن تک) رہے گا۔ ”قیامت کے دن تک“ ایک محاورہ ہے جس کے معنی ”مباہرہ“ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ (مثلاً) کہا جاتا ہے ”تم قیامت تک یہ کام نہیں کر سکو گے“

اس طرح حضرت عیسیٰ کے کوالف حیات بیان کرنے کے بعد کہا :-

ذٰلِكَ نَشَاؤُكَ عَلَيْهِ مِنْ الْآيَاتِ وَالَّذِينَ الْخٰكِيْمُ ۝ (۳۸)

یہ ہیں وہ پُر از حکمت تاریخی حقائق جن کا علم تجھے (اے رسول!) بذریعہ وحی دیا جا رہا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ کے سلسلے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ اکثر و بیشتر ان کہانیوں سے مختلف ہیں جو اس زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں عام تھیں۔ وہ لوگ قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات کو جھٹلاتے تھے (کیونکہ یہ اُن کے ہاں کے مروجہ واقعات سے مختلف تھے اور ان سے اُن کے عقائد پر سخت زد پڑتی تھی)۔ لیکن علمِ انسانی کی وسعت اور تاریخی تحقیق کی مدد سے جوں جوں حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جاتے ہیں، قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات کی صداقت کی شہادت ملتی جا رہی ہے جتنی کہ

خود یہودی اور عیسائی بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات مبنی بر حقیقت ہیں اور ان کے ہاں کے مروجہ واقعات غلط ہیں۔

اکثر متشرعین اعتراض کیا کرتے ہیں حضور نبی اکرمؐ نے یہودی اور عیسائی علماء سے سابقہ انبیاء کرام کے قصے سن لئے تھے۔ اپنی کو انہوں نے ”وحی خداوندی“ کہہ کر قرآن میں بیان کر دیا! جو کچھ اُدھر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ان کے اس قسم کے اعتراضات کا جواب خود انہی کے ہاں سے ملتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح حقیقت اپنے آپ کو منوالیتی ہے!

۵۸ اس کے بعد کی آیت میں کہا گیا ہے کہ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ (۳۸) یہ آیت اور اس کی

تشریح (حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں) پہلے گزر چکی ہے۔ اس کے بعد یہ دُہرایا کہ

۳ اَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا شَكَّ مِنَ الْمُبْتَرِّينَ ۝ (۵۹)

یہ ہے اس سلسلہ میں اصلی اور حقیقی بات جو تیرے رب نے بیان کر دی ہے اس کے بعد ان لوگوں کے

لئے، دلائل دہرائیں گی جو سے بحث کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

کہا یہ کہ دلائل و براہین کی رو سے بحث کرنے کی تو ان لوگوں کے پاس گنجائش نہیں، لیکن اگر یہ اس کے بعد محض ہٹ دھرمی، ضد، تعصب اور دھاندلی سے اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو اس کا اس کے سوا کیا علاج ہے کہ ان سے کہہ دیا جائے کہ ہم تم سے مزید بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ تم اگر حقیقت اور صداقت کو نہیں ماننا چاہتے تو تم جانو تمہارا کام۔ ہم تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔

ضد اور تعصب کی بنا پر ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والوں سے بالآخر ایسا کہنا ہی پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کو متعدد مقامات پر ایسا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مثلاً سورہ الزمر میں ہے: وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا ۝ (۳۹)۔ اے رسول! جو کچھ یہ لوگ تیرے خلاف کہتے اور کرتے ہیں تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو۔ تم نے انتہائی کوشش کر لی کہ یہ زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ اگر اس کے باوجود یہ لوگ راہِ راست پر آنے کے لئے تیار نہیں اور اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہیں تو ان کے ساتھ بحث و تھمیس میں مزید وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا وقت بڑا قیمتی ہے اور تمہارے پیش نظر عظیم پروگرام ہے جسے تم نے تکمیل تک پہنچانا ہے۔ یہی وقت اور توانائی اُس کے لئے صرف کرو۔ ان لوگوں سے الگ ہو جاؤ، ان سے قطع تعلق کر لو۔ لیکن یہ قطع تعلق بھی حسن کا رانہ انداز سے کرو۔ اس کا

حَسَنَ كَارَانَهُ اَنْدَازَ سَے قَطْعِ تَعْلُقِ

الصَّفْحَ الْجَبِيلِ ۝ (۴۰)۔ یہاں بھی حسن کا رانہ انداز سے قطع تعلق کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سورہ زمر میں، اس حسن کا رانہ انداز

میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کہا ہے: فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ (۳۹)۔ ان سے قطع علائق کر لو۔ لیکن ایسا کرتے وقت اُن سے کہہ دو کہ اگرچہ میں تمہاری صدا اور سہٹ دھڑکی کی وجہ سے تم سے الگ ہو رہا ہوں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہاری نباہی کا خواہاں ہوں۔ نہیں! میں اب بھی تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں اور اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ تمہیں خیر باد کہتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میں جو کچھ تم سے کہتا تھا، وہ تمہاری بھلائی کے لئے تھا، سو اس کے متعلق تمہیں غمگین نہ ہو جائے گا۔

یہ کس طرح سے معلوم ہو گا، اس کے متعلق دیگر مقامات میں وضاحت کر دی گئی۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے پہلے (ایک بار پھر) یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ مذہب میں جن اقدار کو ”نیک“ کہہ کر پکارا جاتا ہے ان کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے نہیں آتا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان کا نتیجہ آخرت میں جا کر سامنے آئے گا۔ اس لئے اس امر کے پرکھنے کا ذریعہ کوئی نہیں ہونا کہ جن کاموں کو ہم نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ فی الواقعہ نیک ہیں یا نہیں۔ اس کے برعکس دین اس عملی پروگرام کا نام ہے جس کے نتائج اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ نبی اکرمؐ دین کے پروگرام کو پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے مطابق عمل کرنے سے (آخرت کی فلاح اور کامرانی تو اپنی جگہ رہی) اس دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی نصیب ہو جائے گی۔ آپ کے مخالفین کہتے تھے کہ آپ کا یہ دعویٰ غلط ہے، کامیابی اور کامرانی ہمارے پروگرام پر چلنے سے حاصل ہوگی۔ اس باب میں پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اُن لوگوں کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھایا جانا کہ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ ان کے پروگرام کا نتیجہ نباہی اور بربادی ہو گا۔ کامرانی اس پروگرام کا نتیجہ ہوں گی جسے ہم پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دلائل و براہین کو سُنتے نہ تھے کہ لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ لہذا، اس کے بعد ہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ اُن سے کہا جاتا کہ بہت اچھا۔ تم اپنے پروگرام پر عمل کرو، مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو، نہ میں تمہارے پروگرام میں داخل انداز ہوتا ہوں، نہ تم میرے پروگرام میں ملو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ حق پر مبنی تھا۔ نتائج کی رو سے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت پیش کرنا وہ طریق تھا جس کے سامنے اب ساری دنیا نے علم و بصیرت سر جھکا دی ہے۔ یہ وہ طریق کار تھا جسے آخر الامر حضورؐ نے اختیار فرمایا۔

اِرْشَادِ خداوندی تھا: قُلْ يَتَّقُوا اللَّهَ اَعْلَمُوْا اَعْلٰی مَكَانَتِكُمْ ۝ اِنِّیْ عَامِلٌ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَنْ لَّكُنْ لَهُ عَاقِبَةُ
الْبَدَاۗئِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ ۝ (۶۰)

”ان سے کہہ دو کہ (اس باب میں کسی بحث و تمحیص یا جھگڑے جھیلنے کی ضرورت نہیں، تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے چل جاؤ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے۔ اور بہت جلد بتا دیں گے۔ کہ آخر الامر

دنیا میں کامیابی کسے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے اس کی کھیتی کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔“

حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور ان کے کوائف حیات کے سلسلہ میں یہودی اور نصرانی اس مقام تک آپہنچے تھے جہاں وہ دلیل و برہان کی رو سے کچھ سننے اور علم و بصیرت کی بنا پر کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی ضد پر برابر اڑے بیٹھے تھے، اس مقام پر کہا گیا۔

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَكُمُ
وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ تَبْتَهِلُ فَنَجْعَلُ
لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ه (۳۰)

اگر اس علم و حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ یونہی تھکڑتے چلے جائیں تو ان سے کہہ دو کہ میں اس معاملہ میں تم سے تھکڑتا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں ہماری روش یہ ہوتی ہے کہ ہم کنارہ کشی اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ لہذا ہم اپنے آپ کو اپنے مردوں اور عورتوں سمیت الگ کر لیتے ہیں (یعنی تنہا میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ میری جماعت کے افراد بھی)۔ تم اسی طرح اپنے لوگوں کو لے کر الگ ہو جاؤ۔ نہ تم ہمارے معاملات میں دخل دو۔ نہ ہم تمہارے معاملات میں مغل ہوں گے۔ ہمارا پروگرام عملی ہے۔ اس کے نتائج خود بتادیں گے کہ ہم میں سے کون تھوڑا ہے اور کون سچا۔ تھوڑا، زندگی کی ان خوشگوار یوں سے محروم رہ جائے گا جو حق و صداقت کی ماہ پر چلنے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

اس آیت میں لفظ ”تَبْتَهِلُ“ پہلی بار آیا ہے۔ جس کا مادہ (ب - ہ - ل) ہے۔ لَعْنَتُ کی رو سے اس کے معنی ہیں کسی کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا۔ اَبْهَلَکَ کے معنی ہیں اُسے اس کی رائے اور ارادے میں آزاد چھوڑ دیا۔ اَبْهَلَ النَّاظِرَ کے معنی ہیں اُوٹنی کو بغیر ہمارے چھوڑ دیا کہ وہ جہاں جی چاہے چرتی پھرے۔ اَسْبَهَلَ الْوَالِي الرَّعِيَّةَ کے معنی ہیں حاکم نے رعایا کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد قطع تعلق کر لینا ہے۔ یہ وہی روش یا فیصلہ ہے جس کے لئے ’ہجر جمیل‘ اور صفحہ جمیل کے الفاظ آئے ہیں اور جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

دوسرا لفظ ہے ”لَعْنَتُ“۔ اس کے معانی مطالب الفرقان جلد دوم ص ۳۷۴ زیر آیت (۳۸) اور جلد سوئم ص ۱۲۶ زیر آیت

(۱۵۹) بیان کئے جا چکے ہیں۔ یعنی زندگی کی خوشگوار یوں سے محرومی اور نامرادی۔

یہ ہیں تَبْتَهِلُ اور لَعْنَتُ کے معنی۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے جو معنی لئے جاتے ہیں وہ عجیب ہیں۔ روایات کی رو سے کہا جاتا

ہے کہ بحران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ سے ملنے کے لئے آیا جسٹور نے انہیں حضرت عیسیٰ کے متعلق صحیح عقائد

مباہلہ

اور دلائل بتائے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو اس پر ارشاد خداوندی ہوا کہ تم انہیں ’مباہلہ‘ کی دعوت

دو۔ یعنی اُن سے کہ وہ کہ میں اپنے بال بچوں کو لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہوں۔ تم اپنے بال بچوں کو لے کر مقابلہ میں بیٹھ جاؤ۔ پھر تم بھی کہو کہ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ ہم بھی یہی کہیں گے۔ پتہ چل جائے گا کہ خدا کی لعنت کس پر برستی ہے۔ وہ اس چیلنج سے اس قدر مخالفت ہوئے کہ مقابلہ سے دست بردار ہو گئے۔ اسے ”مباہلہ“ یا ملاعنہ (ایک دوسرے پر لعنتیں برسانا) کہا جاتا ہے۔

مباہلہ یا ملاعنہ کے الفاظ ہمارے ہاں فراموش ہو چکے تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ان کی تجدید کر دی۔ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں مرزا صاحب کا آخری حربہ یہی ہوتا تھا۔ یعنی وہ اُن سے کہتے تھے کہ آؤ مباہلہ کر لو۔ یعنی تم ہم پر لعنتیں برساؤ۔ ہم تم پر لعنتیں برساتے ہیں۔ پتہ چل جائے گا کہ جھوٹا کون ہے۔

مرزا غلام احمد کے مباہلہ کو تو چھوڑئیے۔ یہ دیکھئے کہ جس روایت کا ادب پر حوالہ دیا گیا ہے وہ کس طرح بھی حضور نبی اکرم کے شایان شان قرار پا سکتی ہے؟ حضور اپنی دعوت کو علم و بصیرت کی رو سے پیش فرماتے تھے۔ آپ کا اعلان تھا: اَدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ عَلٰیٰ حُجُبٍ رَّحِمَةٍ اَنَا دَمِنَ اتَّبِعْنِیْ (۱۳۸) ”میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علم و بصیرت کی بنا پر ایسا کرتا ہوں۔ میری روش بھی یہی ہے اور یہی روش میرے متبعین کی بھی ہوگی“ یعنی ہم اپنی دعوت علم و بصیرت کی بنا پر پیش کریں گے حضور ایسا کچھ اپنے متعلق فرماتے تھے اور اپنے مخالفین سے کہتے تھے کہ حَآتُوا جُرْهَاتِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۱۳۹) ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو اس کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کرو“۔ یعنی وہاں ساری بحث دلائل و براہین کی بنا پر ہوتی تھی۔

تو کیا آپ اسے یاد کر سکتے کہ جس رسول کی دعوت کا انداز یہ ہو، وہ فریقِ مخالفت سے یہ کہے گا کہ آؤ مباہلہ کرو۔ یعنی تم اپنے بال بچوں سمیت آجاؤ، میں اپنے بال بچوں کو لے آتا ہوں۔ اور پھر ہم اور تم دونوں کہیں کہ جھوٹے پر خدا کی لعنت! اور لعنتیں برسانے کی اس روش کو (معاذ اللہ) منسوب کیا جاتا ہے اُس ذاتِ گرامی کی طرف جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت (رحمت اللعالمین) بنا کر بھیجا تھا۔ کیا حضور خدا سے رحمت کی دعائیں مانگیں گے یا (معاذ اللہ) لعنت کی؟ اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضور سے ارشادِ خداوندی تھا کہ ان لوگوں سے قطعِ علائق بھی کرو تو نہایت حسن کارانہ (حسین و جمیل) انداز سے۔

اُن سے تھمت ہو تو کہو کہ میں اس کے بعد بھی تمہارے لئے سلامتی کی دعائیں مانگوں گا۔ وہ ایسے سراپا غمگسار و بدگداز تھے کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا: فَهَلْکَ بَلَخِجْ نَفْسَکَ اَلَا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۲۶) ”ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ راست اختیار کیوں نہیں کرتے؟ ایسا تجسمِ شفقت و محبت کسی کے لئے بھی لعنت کی دعائیں مانگے گا۔ یہ ہے مباہلہ کی حقیقت۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جو اس قسم کے الفاظ آتے ہیں (مثلاً) فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی الْکٰفِرِیْنَ (۱۶۱) یا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی الظّٰلِمِیْنَ (۱۶۲) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کفر اور ظلم کا فطری نتیجہ انعاماتِ خداوندی سے محرومی ہے، یہ نہیں

کہ خدا ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ سے کہا :-

إِنَّ هَذَا هُوَ الْقُصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمُ الْمُسْدِ يَنْ ۝ (۳-۶۱)

یہ واقعہ حقیقتاً وہی ہے جو تجھے سے بیان کیا گیا ہے، لہذا تم اسے پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے رہو۔ ان کے اس قسم کے عقائد کہ عیسائی خدائی اختیارات میں شریک تھا، اور اسے مقامِ اُلُوہیت حاصل تھا یکسر باطل ہیں۔ کائنات میں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار (إِلَٰه) نہیں۔ سارا غلبہ و اختیار جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی ہے، اُسی کو حاصل ہے۔ یہ کہہ کر ان سے الگ ہو جاؤ۔ اگر یہ لوگ علیحدگی کے اس معاہدہ سے پھر جائیں تمہارے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگیں اور اس طرح خواہ مخواہ فساد پر اُتر آئیں تو خدا یہ بھی جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیے۔

اس کے بعد فرمایا :-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ
وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ
تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (۳-۶۳)

تم ان اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہو کہ تم ان جُزئی باتوں کو چھوڑو اور اس اصل الاصول کی طرف آؤ جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اور جس کے ماننے کے (بظاہر) تم بھی مدعی ہو۔ یعنی یہ کہ (۱) اللہ کے سوا کسی اور کے قوانین کی محکومی اختیار نہ کی جائے۔

(۲) اُسی کے اس اختیار و اقتدار میں نہ کائنات کی کسی شے کو شریک سمجھا جائے اور نہ ہی ان باتوں میں کسی کو خدائی اختیارات کا حامل قرار دیا جائے۔

اگر یہ لوگ توحید کے اس بنیادی نقطہ پر جمع ہو جائیں تو ہر المراء۔ لیکن اگر اس سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ تم جس طرف جانا چاہتے ہو جاؤ۔ ہم صرف ایک خدا کی محکومی اختیار رکھے ہوئے ہیں۔ اور اس کے تم بھی شاہد ہو۔

اہل کتاب کو یہ دعوت درحقیقت قرآن کریم اور رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانے کی دعوت تھی۔ اس لئے کہ جن قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کرنے کی انہیں دعوت دی گئی تھی وہ قرآن کے سوا کہیں موجود نہیں تھے (نہ ہی موجود ہیں) قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب سے بھی جماعتِ مؤمنین کی طرح ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا تھا (حوالوں کے لئے سابقہ اہل کس دیکھئے) اس آیت میں خطاب تو اہل کتاب سے ہے۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھئے تو اس کے مخاطب خود ہم (مسلمان) ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم اُس

ہماری حالت

مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر زمانہ نزولِ قرآن میں اہل کتاب تھے۔ اس لئے جو کچھ قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ہم پر کم و بیش اسی طرح ہوتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب مذہب کی جُزیّت اور دعوات میں اُلجھے رہتے ہیں لیکن دین کی اصل و اساس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دین کی اصل و اساس تھی (اور ہے) لَا نُعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ۔ خدا کے سوا کسی کی حکمرانی تسلیم نہ کی جائے۔ اس کے سوا کسی کے قوانین و احکام کی اطاعت نہ کی جائے۔ اہل کتاب کو دین کی اصل کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ اس کے بعد آپ اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ صدرِ اقل کے بعد جب ہماری گاڑی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر دوسری پٹری پر جا پڑی تو ہم اسی قسم کی جزیّات اور فروعیات میں الجھ گئے اور آج تک اُلجھے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارا سارا وقت، دولت اور توانائیاں اس قسم کے مباحث کی نذر ہو رہی ہیں کہ

ابنِ مریمؑ مرگیا یا زندہ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجد جس میں ہوں فرزندِ مریم کی صفات
ہیں کلامِ اللہ کے الفاظِ حادث یا قدیم اُمتِ مرحوم کی ہے کس غنیدے میں نجات

ہمارے ہاں "اسلام" کے مہماتِ مسائل اس قسم کے ہیں کہ رسول اللہ بشر تھے یا فوراً، خدا عرش پر بیٹھا ہے یا آسمانِ اول پر آجاتا ہے۔ حوضِ کوثر کی لمبائی اور چوڑائی کس قدر ہے۔ یا اسی قسم کی فروعیات کہ نماز میں لاٹھ کہاں باندھے جائیں۔ آمین جلی کہتی چاہئے یا خفی۔ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں یا بیس وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے سب فرقتے اسی قسم کے نظری عقائد اور فروعی مسائل کی بحثوں کو دین کی اہم خدمت قرار دیتے ہیں اور اس کی اصل و اساس (لا الہ الا اللہ) کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ حالانکہ یہی وہ قدر مشترک ہے (یعنی صرف کتاب اللہ کی حکمرانی) جو ہمیں ایک اُمت بناتی ہے۔ اسی کا نام توحید تھا جسے ترک کر کے ہم بھی رابل کتاب کی طرح) مختلف اقسام کے شرک میں مبتلا ہیں۔ (شرک کے متعلق سابقہ جلدوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔ سابقہ اندکس سے حوالہ دیکھئے)۔ ہم نے بھی، انہی کی طرح اپنے اجداد و رہبان (علماء و مشائخ) کو خدا بنا رکھا ہے۔ ہم زبان سے تو "إِنَّا لَنَعْبُدُكَ" کہتے ہیں (یعنی یہ کہ ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں) لیکن عملاً اطاعت انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامی شریعت نام ہی فقہی قوانین کا ہے نہ کہ قرآنی قوانین کا۔ یہی کیفیت اہل کتاب کی تھی اور یہی حالت ہماری ہے۔ نبی اکرمؐ نے انہیں اس قدر مشترک کی طرف آلے کی دعوت دی تھی جس کے وہ بظاہر مدعی تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے منہ پھیر کر چل دیتے، بلکہ اس کی مخالفت پر اُتر آئے۔ یہی حالت آج ہماری ہے۔ اگر آج کوئی شخص ہم سے کہتا ہے کہ تم جب زبان سے کہتے ہو کہ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور اس کی کتاب کو مکمل ضابطہ ہدایت کہہ کر پکارتے ہو — اور تم سب (تمام فرتے) اس (زبانی) دعوے میں متفق ہو تو عملاً بھی اس پر متفق ہو جاؤ، تو نہ صرف یہ کہ یہ اس دعوت کی طرف

سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں بلکہ دعوت دینے والے پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں اور اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس سے زیادہ کیا کیا جاسکتا ہے جو خدا نے فرمایا تھا: **فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ** (۶۶) ”اگر تم صحیح راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ہر کیفیت خدا کی اطاعت کریں گے۔ اسے تم خود دیکھ لو گے“ اس کے بعد ان (اہل کتاب) سے کہا کہ تم حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورث علی تسلیم کرتے ہو لیکن مذہب کے معاملہ میں اپنے ہاں کی مروجہ تورات یا انجیل کو سند کے طور پر پیش کرتے ہو، حالانکہ یہ کتابیں (محرّف ہونے کے علاوہ) حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی ہیں۔ تم حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہو تو یہ دیکھو کہ حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم کیا تھی؟ وہ جسے تم پیش کرتے ہو یا وہ جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں؟

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَخَاجُونِ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتْ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۚ هَآؤُنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُخَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۶۶-۶۷)

ان سے کہو کہ تم (کم از کم) ابراہیمؑ کے بارے میں (جسے تم اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہو) یہ جھگڑے تو نہ نکالو کہ وہ یہودی تھا یا نصرانی۔ وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتا ہے جب کہ تورات اور انجیل اس کے (سب سے) بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیا تم ایسی بدیہی بات سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے؟

تم نے اُن امور کے متعلق جھگڑا کر کے دیکھ لیا جن کی بابت تمہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ علم تھا (اور اُن میں بھی منہ کی کھاٹی)۔ اس کے بعد سوچو کہ تم اُن معاملات میں کیا جھگڑا سکو گے جن کے متعلق تمہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں۔ (بتناؤ کہ مسلک ابراہیمؑ کے متعلق تمہیں کیا علم ہے؟)۔ تمہیں اس کی بابت کچھ علم نہیں، اور جھگڑاتے ہو تم اس خدا کے ساتھ جسے اس کا پورا پورا علم ہے۔

یاد رکھو! ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھا نہ نصرانی۔ یہ تمہاری خود ساختہ نسبتیں ہیں۔ وہ خالص مسلم تھا۔ وہ دین میں گردہ بندیاں پیدا کرنے والے مشرکین میں سے نہیں تھا (۳۱-۳۲) یہ کچھ تم ہی کرتے ہو۔

یہاں ہم پھر اس حقیقت کو دہرا دینا چاہتے ہیں کہ بات تو یہ ظہور اسلام کے زمانے کے یہود و نصاریٰ کے متعلق ہو رہی ہے لیکن اس کا اطلاق صرف محرف ہم پر ہونا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے اور نصاریٰ

کہتے ہیں کہ وہ نصرانی تھے۔ ایسا کہتے وقت یہ اتنا نہیں سوچتے کہ حضرت ابراہیمؑ تو یہود اور نصاریٰ دونوں سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں، لہذا، وہ یہودی یا نصرانی کس طرح ہو سکتے ہیں؟

ہم میں دو بنیادی فرقے، شیعہ اور سُنی ہیں۔ شیعوں کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ کا وہی مذہب تھا جس کے پیرو وہ ہیں۔
— یعنی (بقول اُن کے) رسول اللہ شیعہ تھے۔ ان کے برعکس سنی دعویٰ سنیوں کا ہے — یعنی (بقول اُن کے) رسول اللہ سُنی تھے۔ پھر سنیوں میں اہل حدیث، اور اہل فقہ ہیں۔ اہل فقہ میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی ہیں۔ حنفیوں میں دیوبندی اور

رسول اللہ کا تعلق کون سے فرقہ سے تھا؟

بریلوی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ وہ رسول اللہ کے مُتبع ہیں۔ سُنّت رسول اللہ کے پیرو ہیں۔ یعنی (بقول اُن کے) رسول اللہ اہل حدیث تھے، حنفی تھے، شافعی تھے، مالکی تھے، حنبلی تھے۔ دیوبندی تھے۔ بریلوی تھے۔ اور ان کے اس دعویٰ کا قرآنی جواب یہ ہے کہ رسول اللہ تو ان سب سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اس لئے وہ ان فرقوں میں سے کیسے ہو سکتے ہیں؟ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا "وہ خالص مسلم تھے" اسی طرح رسول اللہ نے فرمایا تھا: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (۱۴۱) "میں سب سے پہلا مسلم ہوں" اور یہ نام خود خدا کا مقرر کردہ ہے: هُوَ سَمُّكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۝ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا — (۱۴۲) "خود خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا" — قرآن سے پہلے بھی اور اس میں بھی۔ لہذا، اس نام کے سوا اپنے آپ کو کسی اور نام سے پکارنا ارشاد خداوندی اور سُنّت رسول اللہ کے خلاف ہے۔ لیکن ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ تم کون ہو، اور آپ جواب میں کہہ دیں کہ "مسلمان" تو اس سے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ پوچھتا ہے کہ کون سا مسلمان؟ یعنی خدا کے مقرر کردہ اور

تم کون سے مسلمان ہو؟

رسول اللہ کے ارشاد فرمودہ نام سے تسلی نہیں ہوتی۔ تسلی ہوتی ہے ان ناموں سے جو بعد کے وضع کردہ ہیں۔ اور تماشا یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کا مدّعی ہے اور سُنّت رسول اللہ کے متبع ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور ہر فرقہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔ یہی کیفیت یہود و نصاریٰ کی تھی: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَا تُنْتَبِزُ عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصْرَى كَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ (۱۴۳)۔ "یہودی، نصاریٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا مذہب باطل ہے اور نصاریٰ، یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں۔ اور (ستم ظریفی یہ کہ) دونوں اس کے مدّعی ہیں کہ وہ کتاب اللہ (عہد نامہ عتیق اور جدید) کے پیروکار ہیں۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہم میں سے ہر فرقے کا دعویٰ ہے کہ وہ سُنّت رسول اللہ کا مُتبع ہے۔ سُنّت رسول اللہ کا تین حصوں کی احادیث کی رو سے کیا جاتا ہے اور احادیث ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔ شیعہ اور سنیوں کے تو احادیث کے مجموعے

ہی الگ الگ ہیں۔ سُنّیوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے فرقوں کی احادیث کے مجموعے الگ الگ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ ان کی قابلِ اعتماد احادیث بھی الگ الگ ہیں۔ اور یہی الگ الگ حدیثیں ہمارے ہاں کے الگ الگ فرقوں کی بنیاد ہیں اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ پر غور فرمائیے مشکوٰۃ المصابیح، احادیث کا قابلِ اعتماد مجموعہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں (سُنّیوں کے معتبر ترین) مجموعہ کی منتخب احادیث درج ہیں۔ کچھ عرصہ اُدھر کی بات ہے کہ احادیث کا ایک مجموعہ (زجاجۃ المصابیح) کے نام سے شائع ہوا تو اس پر (مولانا) عبدالماجد دریا بادی (مدیر صدق لکھنؤ) نے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے۔

خطیب تبریزی کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبویؐ کا یہ مستند کار آمد اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آ رہا ہے اور عوام خواص سب

کے لئے شیعہ نہایت کام دے رہا ہے۔ لیکن صاحب مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالتِ القدر کے بہر حال حنفی المذہب نہ تھے، شافعی تھے۔ اس لئے شافعی مذہب کی رعایت کا

حنفی مجموعہ احادیث

ان کی کتاب میں جایا آ جانا قدرتی تھا اور اس لئے علماء حنفیہ ایک اس قسم کے دوسرے مجموعہ احادیث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت ان کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عمل پورا کرنے کی سعادت اس حیدر آبادی فاضل کے ہتھ میں آئی ہے۔

(صدق لکھنؤ، ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء بحوالہ مقام حدیث)

یعنی مشکوٰۃ المصابیح اس مقصد کے لئے مرتب کی گئی تھی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ شافعی مذہب مطابق سنت رسول اللہ ہے۔ یہ بات حنفیوں کو بڑی کھلتی تھی۔ اس لئے یہ نیا مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے کہ حنفی مذہب مطابق سنت رسول اللہ ہے۔ بالفاظ دیگر، مشکوٰۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کی گئی تھی کہ رسول اللہ شافعی المذہب تھے اور زجاجۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کی گئی کہ رسول اللہ حنفی المسلک تھے۔

شافعی اور حنفی تو اہل فقہ کے دو فرقے ہیں۔ اہل حدیث اور اہل فقہ میں کس قدر بُعد اور تنازعہ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ (مولانا مفتی محمد حسین (مرحوم)، (مولانا) اشرف علی تھانوی (مرحوم) کے خلیفہ۔ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ دلاہور) کے بانی تھے۔ (مولانا) جمیل احمد صاحب نے ان کا حسب ذیل واقعہ ہفتہ وار اخبار ”خداۃ الدین“ (دلاہور) کی ۱۴ جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے (اپنے قیام امرتسر کے دوران) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نور اللہ مرقدہ) سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ

حدیث کسی حنفی سے پڑھو

چونکہ ہم نے احادیث مبارکہ اہل حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں۔ جوڑا پیدا نہیں ہوگا۔ لہذا، آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں، پھر درخواست بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔

یہاں تک بات احادیث کی ہو رہی تھی چند لمحات کے لئے کتاب اللہ کی طرف آجائیے۔ چند سال اُدھر کی بات ہے کہ تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو اس کے لغات میں، دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز مدرس (مولانا) سید النظر شاہ صاحب نے تحریر فرمایا:-

صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصیت کا تختہ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب

علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بُری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو خوش آئند ہے جس جماعت

کی طرف سے ہو، قابلِ پذیرائی ہے مگر افسوس علم جیسے لازوال ابدیت 'شان' سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو، ہر عصیت

سے پاک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان

تفسیر و حدیث کی طول طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہر حال جو کچھ ہوا ہو چکا ہے۔ اس کا تدارک

حنفی تفسیر قرآن

اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطہ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔ (پارہ اول۔ جزو اول ص ۷)

یعنی قرآن مجید کی شافعی تفسیر کے نقصان کے ازالہ کے لئے حنفی تفسیر! (بالعجب)۔

اسی قسم کی ایک اور مثال۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی (مرحوم) نے قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر

شائع کی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، دہلی کے ماہنامہ "برہان" نے اپنی مئی ۱۹۵۸ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں لکھا:-

انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں

لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت تھی جس کو اہل سنت والجماعت کے ماسخ العقیدہ مسلمانوں

کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی

سنی ترجمہ قرآن

روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔ بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی

ہے۔ (بحوالہ طبع اسلام بابت جولائی ۱۹۵۸ء)

آپ سوچئے کہ اپنے عقائد اور نظریات کے تابع قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر اگر کھلا ہوا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر اس پر بھی غور

ایجئے کہ کیا اس قسم کے تراجم اور تفاسیر سے خالص کتاب خداوندی کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے؟ قرآن مجید نے اہل کتاب سے کہا تھا

کہ حضرت ابراہیمؑ، یسوعیؑ یا نصرانیؑ کس طرح ہو سکتے تھے کیونکہ وہ تو ان فرقوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہو گئے تھے۔

اس سے مجھے ایک بات یاد آگئی جو ہے تو (بظاہر) لطیفہ سی، لیکن ہمارے ہاں کی عام مذہبی ذہنیت کی بڑی جامعیت سے

کیا رسول اللہ غیر مقلد تھے؟ غمازی ہوتی ہے۔ ایک حنفی مولوی صاحب وعظ میں فرما رہے تھے کہ نجات صرف امام اعظم (بوحنفیہ) کی تقلید سے حاصل ہو سکتی ہے جو ان کا مقلد نہیں اس کی نجات نہیں ہو سکے گی۔ اس کے بعد ایک دن وہی مولوی صاحب سیرت نبوی پر وعظ فرما رہے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ حضور کی وفات ساتھ میں ہوئی تھی جس شخص نے پہلا وعظ سنا تھا اس نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب! امام بوحنفیہ کا زمانہ کون سا تھا؟ ان نے کہا کہ ان کی پیدائش شہ میں اور وفات شہ میں ہوئی تھی۔ اس پر اس مستنصر کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ کپکپا اٹھا۔ اور سمجھتے ہوئے مولوی صاحب سے کہا کہ کیا رسول اللہ غیر مقلد ہی وفات پا گئے؟ (اس سے آگے آپ خود سمجھ لیجئے!)۔

یہ ہوتی ہے فرقہ دارانہ ذہنیت۔ یا اس قسم کی عصبیت پیدا کرنے کا نتیجہ! (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ)۔ یہی تھی وہ ذہنیت یا عصبیت جس کی تردید کے لئے، اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے کہا تھا کہ (حضرت) ابراہیم کو تمہاری گروہ بندیاں سے کیا نعلق۔ تمہاری یہ گروہ بندیاں ان کے بعد وجود میں آئی تھیں۔ وہ تو صرف مسلم تھے۔



قرآن کریم نے یہود اور نصاریٰ سے یہ بھی کہا تھا کہ یہودیت اور عیسائیت نے فرقہ بندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور فرقہ بندی شرک ہے (۳۱-۳۲)۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ یہودی یا نصرانی کیسے کہلا سکتے ہیں کیونکہ وہ مشرک نہیں تھے (وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ - ۳۳)۔ وہ صرف مسلم تھے۔ یعنی وہ اسلام کے پیرو تھے اور اسلام میں فرقہ بندی ہو نہیں سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو بھی اپنی نسبت کسی فرقہ کی طرف کرتا ہے وہ نہ مسلم ہو سکتا ہے نہ سنت رسول اللہ کا متبع۔ قرآن کا متبع ہی مسلم ہے اور وہی متبع سنت رسول اللہ کیونکہ حضور خود قرآن مجید کا اتباع کرتے تھے حضور سے کہا گیا تھا: اَتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۳۴) ”جو شخص تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے تو اسی کا اتباع کر“ یہی حکم مسلمانوں کو بھی تھا: اَتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۳۵) ”جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اسی کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی بڑے (سازگار و سرپرست) کا اتباع نہ کرو“ یہی مسلک ابراہیمؑ تھا: فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (۳۶)۔ اور اس سے انسان مشرک سے مجتنب رہ سکتا ہے: وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۷)۔ اسی لئے فرمایا:-

إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ
آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (۳۸)

(گروہ بندانہ نسبتیں رکھنے والوں کا ابراہیمؑ کے ساتھ کیا نعلق)۔ اس کے ساتھ ہی اور قریبی وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کی

ملت کا اتباع کیا (۳۶) اور اب اس کا قرین یہ نہیں ہے اور جماعتِ مومنین جو اس مسلکِ توحید کے علمبردار ہیں جس کی طرف ابراہیم دعوت دیتا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا کی رفاقت اور سرپرستی حاصل ہے۔

فرقہ دارانہ عصبیت سے انسان کی کیفیت عجیب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے فرقہ کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہتا، چاہتا یہ ہے کہ دوسرے بھی اس کا فرقہ اختیار کر لیں۔ یہی اکرمؑ نے یہود و نصاریٰ پر واضح کیا کہ ان کی گروہ بندیاں دینِ خداوندی اور ملتِ ابراہیمی کے خلاف ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان حقائق پر غور کر کے اپنے مسلک میں تبدیلی کرتے، ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح حضورؐ اپنے مسلک میں کچھ تبدیلی پیدا کر لیں۔

وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ

۳
۶۸

وَمَا يَشْعُرُونَ (۳۷)

”ان اہل کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تم تھوڑی سی مداخلت اختیار کر لو (۳۷) اور قرآن میں ان کے مطلب کے مطابق

کچھ تبدیلی کر دو (۳۸) تو یہ تم سے مصالحت کر لیں۔ لیکن یاد رکھو: حق اپنے مقام پر ہوتا ہے اور وہ اس سے نیچے اتر کر کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے، ان لوگوں کی یہ خواہش، درحقیقت تمہیں حق سے روگرداں کر دینے کی کوشش ہے۔ لیکن اس قسم کی ناکام کوششوں سے یہ خود اپنے آپ کو حق سے روگرداں کرتے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔“

اس پر ارشادِ خداوندی ہوا:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (۳۹)

۳
۶۹

”اے اہل کتاب! تم کہو کہ تم قوانینِ خداوندی سے کیوں انکار کرتے ہو، حالانکہ ان کے سچے ہونے کی اس قدر

نشانیوں تمہارے سامنے موجود ہیں۔“

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ان اہل کتاب کی حالت یہ تھی کہ یہ حق اور باطل میں تلبیس بھی کرتے تھے اور حق کو چھپاتے بھی تھے۔ سورہ بقرہ کی آیت (۲۶) میں انہیں اس جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھئے مطالب القرآن، جلد دوم صفحہ ۱۹۵۔ زیر آیت ۲۶)۔ یہی الزام ان پر اس مقام پر بھی عائد کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۰)

۳
۷۰

”یہ (اہل کتاب) صرف حق سے انکار ہی نہیں کرتے۔ ان کا، اس سے بھی سنگین جرم یہ ہے کہ یہ حق اور باطل کو

خلط ملط کر دیتے ہیں، جس سے حق مُشَبَّہ ہو جاتا ہے۔ اور حق کو چھپاتے بھی ہیں۔ اور یہ کچھ دید و دانستہ کرتے ہیں۔“

ان سے پوچھو کہ اس سے بالآخر ان کا مقصد کیا ہے ؟ (۲۲)۔“

ہمارے ہاں التباسِ حق و باطل کی کئی قسمیں ہیں۔ ان کی مثالیں آپ کو کتبِ احادیث اور تفاسیرِ تاریخ میں ملیں گی۔ کتبِ احادیث میں آپ کو ایک حدیث ایسی نظر آئے گی جو زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہی ہوگی کہ یہ واقعی ارشادِ نبویؐ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی روایت ملے گی جس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کسی حال میں بھی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن مقتدینِ احادیث کا اصرار ہے کہ آپ کو ان دونوں کو اتحادِ رسول اللہ ماننا ہوگا۔ (اہل حدیث کا عقیدہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی مسلمان کو دائرۃ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث “از مولانا محمد اسماعیل درحوم”)۔ یہی حال ہماری کتبِ تفاسیر اور تاریخ کا ہے۔ ان میں بھی حق اور باطل، غلط اور صحیح گڑبڑ شکل میں ملیں گے۔ اس تمام ذخیرہ سے حق کو باطل سے الگ کرنے کا ایک ہی طریق ہے کہ قرآن مجید کو معیار قرار دے کر ان کا از سر نو جائزہ لیا جائے جو اس معیار پر پورا اترے، اسے حق تسلیم کیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دے کر مسترد کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا تو ایک طرف، ہمارا مذہب پرست طبقہ اس قسم کی بات تک سننے کے لئے بھی تیار نہیں !

التباسِ حق و باطل کی طرح، کتمانِ حق کی بھی کئی قسمیں ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ سنگین شکل وہ ہے جو اہل معرفت (تصوف) کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کے معانی سے حقیقت سامنے نہیں آتی۔ حقیقت ان الفاظ کے بطن میں پوشیدہ ہے۔ یعنی ان الفاظ کے باطنی معانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے مقررین کو بذریعہ کشف و الہام بتاتا ہے۔ وہی معانی حقیقی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اصل حقیقت کو قرآن کے الفاظ کے بطن میں چھپا رکھا ہے اور وہ ان پردوں کو اپنے مقررین کے لئے اٹھاتا ہے۔

باطنی معانی | اس طرح اصلی قرآن ان مقررین کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے۔ ان کے سوا دوسرے مسلمانوں پر جو قرآن کریم کے الفاظ کے معانی کی رُو سے اسے سمجھنا چاہتے ہیں، حق مستور اور مکشوف رہتا ہے۔ سو چئے کہ اس سے خود ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ (کشف اور الہام اور تصوف کے متعلق، تفصیلی بحث مطالب الفرقان کے سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ حوالے سابقہ انڈکس کی مدد سے دیکھئے)



ان محاذوں پر شکست کھانے کے بعد ان اہل کتاب نے تخریبِ کاری کا ایک ایسا طریق اختیار کیا، جس سے وہ اس زبان میں تو کامیاب نہ ہو سکے، لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس سے مسلمانوں کی گاڑی دین کی پٹری

پر جا پڑی۔ اور وہ آج تک اسی پٹری پر چلی جا رہی ہے۔ وہ سارنٹ کیا تھی، اسے قرآن مجید کے الفاظ میں سنئے :-

وَقَالَتْ طَآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلٰی الدِّیْنِ اٰمِنُوْا
وَجِهَ النَّهَارِ وَالْقُرْۡاٰنِ اٰخِذُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَذٰجِعُوْنَ ۙ (۳۱)

اُسے جماعت مؤمنین! آؤ، تمہیں بنائیں کہ ان لوگوں کی سازشیں کیا ہے (یہ اپنے لوگوں سے کہتے ہیں کہ جاؤ! صبح کے وقت، مسلمانوں کے دین میں (مناقصہ طور پر) شامل ہو جاؤ (اور اس طرح، ان میں گھل مل کر، دین کی طرف سے ان کے دل میں شبہات پیدا کرتے رہو) اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ، اس دین کو ترک کر کے تمہارے ساتھ واپس آجائیں۔

انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ مسلمانوں سے الگ رہ کر ہم ان کے دین میں بگاڑ پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ مسلمان بن کر ان کی جماعت کے اندر چلے جاؤ۔ وہاں چپکے چپکے اپنے خیالات پھیلاؤ۔ انہیں ان کے دین سے برگشتہ کرو۔ نہایت مخفی اور ہمدرد بن کر، سرگوشیوں سے کام لو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ متذبذب افراد تمہارے ساتھ اس جماعت سے نکل کر باہر آجائیں۔ اگر اس کا فوری اثر نہ بھی ہو تو بھی جو خیالات تم وہاں چھوڑ آؤ گے وہ اہمیت آہستہ آہستہ متاثر کرتے جائیں گے۔ یوں ان کی جماعت کے اندر یہ سست رفتار زہر (SLOW POISON) اپنا کام کر جائے گا۔

سرگوشیاں یا دوسوہ انگیزیاں کس قدر خطرناک ہوتی ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے

تین پاروں اور (۱۱۴) سورتوں میں اپنے پیغام کو مکمل کرنے کے بعد آخری (۳۱) سورت میں مسلمانوں کو ایک وارننگ دی، اور اس وارننگ پر قرآن کو ختم کر دیا۔

دوسوہ انگیزی کا زہر خاموش

وہ وارننگ یہ تھی کہ تمہیں خاص طور پر محتاط رہنا ہو گا۔

مِّنْ مَّشْرِائِیْۤ اَوْ سَوَاسِیْ ۙ الَّذِیْ یُؤَسُّوْۤسُ فِیْ صُۤلُوۡدِ النَّاسِ ۙ مِّنَ الْجَنَّةِ ۙ وَالنَّاسِ ۙ (۳۱)

ان لوگوں کی دوسوہ انگیزوں سے جو دے پاؤں آتے ہیں اور چپکے ہی چپکے کانوں میں کچھ بھونک کر پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔

ایسا کچھ جانے پہچانے لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی طرف سے بھی جو اجنبی اور بیگانے ہوتے ہیں۔

ہماری (صدر اول کے بعد کی) ساری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلام کو غیر مسلموں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان

ان لوگوں نے پہنچایا جو مسلمان بن کر اس اُمت کے اندر شامل ہوئے، انہوں نے اس طرح اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ

دیا کہ ہمیں احساس تک بھی نہ ہوا، اور ہم دین خداوندی سے یکسر بیگانہ ہو گئے۔ اور اس سے بیگانہ ہی نہیں ہوئے بلکہ

تمام غیر اسلامی نظریات، خیالات، تصورات، مقدمات کو اس طرح عین اسلام سمجھ کر اپنایا کہ اب اگر کوئی ہم سے کہتا ہے کہ

یہ اسلام نہیں تو ہم اس کی جان تک کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

بہ افرونگی بتاں دل باختتم من زتاب دیریاں بگدا ختم من

چناں ازخویشتن بیگانہ بودم چو دیدم خویش را نشنا ختم من

اس سازش کی تفصیل کا یہ مقام نہیں؛ کیونکہ یہ بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ آپ اسے جانتا چاہیں تو میری کتاب "شاہکار رسالت" کا آخری باب دیکھئے جو بڑا مفصل اور مبسوط ہے۔



بات اہل کتاب کی سازش کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ تم مسلمانوں کے اندر جا کر ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرو۔ انہوں نے یہ اسکیم تو وضع کی، لیکن اس سے انہیں ایک خطرہ بھی لاحق ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام دلائل و براہین پر مبنی دین ہے۔ انہیں خدشہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کو ہم مسلمانوں کے اندر بھیج رہے ہیں، کہیں وہ خود ہی اسلام سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان سے تاکید کیا کہ

وَلَا تَوَلُّوْا اِلَّا بِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ اَنْ
تُوَلِّيَ اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِيْتُمْ اَوْ يَحْلَجُوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ
الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۳
يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۴ (۳۳-۳۴)

اور (یہ) اپنے لوگوں سے اس کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ سوائے اُن لوگوں کے، جو تمہارے مسلک کا اتباع کریں، اور کسی کی بات پر اعتماد نہ کرو۔ نیز اُن سے کہتے ہیں کہ (اس کا تو تصور تک بھی دل میں نہ لاؤ کہ) جو دین تمہیں دیا گیا تھا، اس جیسا دین کسی اور کو بھی مل سکتا ہے یا خدا کے حضور تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہے۔ (یہ اپنے لوگوں کو اس طرح پکا کرتے رہتے ہیں)۔
ان سے کہہ دو کہ

۱۔ جہاں تک کسی کی بات ماننے کا تعلق ہے، اس میں ہماری بات، یا تمہاری بات کا سوال ہی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح راستہ وہی ہو سکتا ہے جو اللہ نے بتایا ہو۔ تم بتاؤ کہ وہ رہنمائی تمہارے پاس موجود ہے ؟

۲۔ اب رہا یہ کہ جس قسم کا دین تمہیں ملا تھا، ویسا دین کسی اور کو نہیں مل سکتا، سو اس بات کا اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق، جسے چاہتا ہے، وحی سے نوازتا ہے۔ خدا کی نگاہ انتخاب

تمہاری گروہ بندیوں میں گھر کر نہیں رہ سکتی۔ وہ بڑی وسعتوں کا مالک ہے اور ملائحد و دعلم رکھتا ہے۔ اس وسعت علم کی بنا پر وہ خوب جاننا ہے کہ وحی کی امانت سونپنے کے لئے کون سا قلب سب سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ صاحب فضل عظیم ہے۔ تمہارے جیسا تنگ نظر نہیں۔“

ان آیات میں ایک بات تو وہ ہے جو اہل کتاب ان لوگوں سے کہتے تھے جنہیں وہ منافقانہ طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بھیجتے تھے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ وہاں جاتے ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ ان کی کوئی بات تم پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ یاد رکھو! جو دین ہمیں دیا گیا ہے اس کی مثل کسی اور کو نہیں دیا گیا۔ اگر تم نے اتنا سا بھی مان لیا کہ ان (مسلمانوں) کے ہاں بھی کچھ سچی باتیں پائی جاتی ہیں تو انہیں تمہارے خلاف جھگڑنے کے لئے، گنجائش نکل آئے گی۔ لہذا، وہاں جاؤ تو اس طرح جیسے بطح پانی میں جاتی ہیں جاتی ہے کہ اس کا ایک پر بھی بھگنے نہیں پاتا۔ تم جیسے جاؤ، ویسے ہی

مسلمان بن کر ان کے اندر جاؤ | میں جاتی ہے کہ اس کا ایک پر بھی بھگنے نہیں پاتا۔ تم جیسے جاؤ، ویسے ہی وہاں سے نکل آؤ۔

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جو قومیں اس طرح منافقانہ مسلمانوں میں مل کر شامل ہوئیں، انہوں نے مسلمانوں کو تو پیچ رنگ میں رنگ لیا لیکن اسلام کا ایک چھینٹا تک بھی اپنے معقولات و نظریات پر نہ پڑنے دیا۔ مذہبی دنیا سے ہٹ کر اس کی ایک حالیہ مثال سیاسی دنیا میں ملتی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران، ہندو راہنماؤں (جن کے سرخیل مسٹر — یا ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق دہاتما گاندھی تھے) کا آپریشن (وعظ) یہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ! سیاست کی بات میاں سطح پر کرو۔ مذہب کو درمیان میں مت لاؤ۔ وہ مسلمانوں سے یہ کہتے اور خود اپنی قوم کو تاکید کرتے کہ تم ہندو دھرم کے احیاء کے لئے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

چنانچہ نیشنلسٹ مسلمان (بالخصوص علماء کا طبقہ) ان کی اس سازش کا شکار ہو گیا، اور انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو نماز، روزہ، نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی حاصل رہے اور

نیشنلسٹ مسلمان | امور مملکت جمہوری (سیکولر) طریق پر سرانجام پاتے ہیں تو اس سے اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے کسی جداگانہ مملکت کی ضرورت نہیں۔ ہندو کی یہی سازش تھی جسے بے نقاب کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نمی گوید بکس اسرار خود را
بدوشن خود بُرد ز ناز خود را (ارمغانِ حجاز)

نگہ دارد بر من کار خود را
من گوید کہ از تسبیح بگذر



اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ ہدایتِ خداوندی صرف ان کے پاس ہے۔ نہ یہ کسی اور کے پاس ہے، نہ کسی اور کو مل سکتی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی اصولی بات کہی کہ اگر اسے معیار تسلیم کر لیا جائے تو، دیگر اہل مذہب تو ایک طرف خود مسلمانوں کے باہمی فرقہ وارانہ جھگڑے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ سوال اس کا نہیں کہ حق و صداقت کی راہ تمہاری راہ ہے یا تمہارے فریق مخالفت کی۔ حق و صداقت کی راہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے۔ (رَبِّكَ هَدَىٰ لِلدِّينِ ۚ إِنَّ الدِّينَ هُوَ

الْهُدَىٰ - ۲۳)۔ اَلْهُدَىٰ (THE RIGHT PATH) صرف وہ ہے جسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ تم ثابت

کر دو کہ جس راہ ہدایت کے تم مدعی ہو وہ خالصتہً خدا کی عطا فرمودہ ہے۔

اس میں انسانی آمیزش کا کوئی دخل نہیں۔ تم اسے ثابت ہی نہیں کر سکتے۔ ایسا ثابت کرنا تو ایک طرف تمہاری مبینہ آسمانی کُتب خود اس کی زندہ شہادت ہیں کہ وہ محرف ہیں۔ اس لئے تمہارا یہ دعویٰ کس طرح سچا ہو سکتا ہے کہ خالص اور غیر محرف ہدایتِ خداوندی تمہارے پاس ہے۔

یہاں جو جواب اہل کتاب کو دیا گیا ہے، وہی جواب ہمارے ہاں کے مذہبی فرقوں کو دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ حقیقی اسلام اس کے پاس ہے، دوسرے فرقے کے ہاں نہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایک روایت تروج ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت میں (۷۳) فرقے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا، باقی سب اہل جہنم۔ اس روایت کی رو سے ہمارے ہاں کا ہر فرقہ اس کا مدعی ہے کہ ناجی فرقہ وہی ہے اور کوئی نہیں۔ قرآن کریم اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ سوال تمہارے دعاوی کا نہیں۔ اصل سوال ان دعاوی کے ثبوت کا ہے۔ ثبوت کے لئے ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ ان ہدیٰ اللہ ہو اَلْهُدَىٰ: حق و صداقت کی راہ (ہدایت) وہی ہے جسے خدا نے نازل فرمایا ہے۔ یعنی جو قرآن مجید کے اندر ہے۔ تم میں سے جس کا دعویٰ اس معیار پر پورا اترے گا (یعنی وہ قرآن کے مطابق ہوگا) وہ سچا ہوگا۔ جو اس کے خلاف ہوگا وہ ہدایتِ خداوندی نہیں ہوگا۔

اگر ہمارے فرقے اس معیار کو تسلیم کر لیں تو فرقہ واری آج ختم ہو جائے۔ لیکن اس معیار کو نہ اہل کتاب نے تسلیم کیا تھا، نہ ہمارے فرقے تسلیم کریں گے۔

یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ نبوت کو بنی اسرائیل کے اندر محدود رہنا تھا۔ یہ (ان سے باہر) بنی اسماعیل میں کس طرح چلی گئی؟ (بنی اکرم نسلی اعتبار سے بنی اسماعیل میں سے تھے)۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ نبوت نہ کسی نسل کے ساتھ منحصر ہے، نہ کسی خاص قبیلہ یا خاندان کے ساتھ۔ اس اختصاص کا فیصلہ مشیتِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے اسی لئے اس میں بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کی کوئی قید نہیں۔ (نبوت -

نبوت نسلی نہیں

رسالت۔ وحی وغیرہ کے متعلق مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔



اس کے بعد قرآن کریم ایک ایسے ایسی نظریہ کو سامنے لایا ہے جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس نظریہ کی ”جہنمیت“ کا صحیح اندازہ اس سے پہلے لگ چکا ہو یا نہ، لیکن ہمارے زمانے میں یہ نکھر اور ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّيكَ إِلَىٰ وَجْهِكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّيكَ إِلَّا وَجْهًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْأَلْبَابِ أُولَٰئِكَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۴)

ان اہل کتاب کے ہاں جو کہ دین اجتماعی نظام کی شکل میں نہیں، محض انفرادی، ضابطہ اخلاق کی صورت میں ہے، اس لئے ان میں انفرادی طور پر ایسے لوگ مل جائیں گے کہ اگر ان کے پاس چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دو، تو وہ، جوں کانوں، والہں کر دیں۔ اور ایسے بھی کہ اگر ان پر ایک روپے کا بھی بھروسہ کر دو، تو وہ اُسے کبھی واپس نہ کریں بجز اس کے کہ تم ان کے سر پہ (ڈنڈا لے کر) سوار رہو۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ سرگردہ بندی میں ہوتا ہے) ان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا ہے کہ تم غیر اہل کتاب کے ساتھ جو جی میں آئے کرو، اس سے تم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوگا۔ اور تماث یہ کہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس بات کی اجازت خود خدا نے دے رکھی ہے۔ حالانکہ یہ اللہ کے خلاف صریح کذب و افتراء ہے۔ اور (ان کے مذہبی پیشوا جو عوام سے ایسا کہتے ہیں) خوب جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔

اس ایسی نظریہ کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ پہلے قرآن مجید کی کشادہ نگہی ملاحظہ کیجئے کہ اہل کتاب نے اسلام اور مسلمانوں کی انتہائی مخالفت کی۔ اس کی تخریب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں

قرآن کی کشادہ نگہی

اعتراف کے لئے جس وسعت ظرف کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن اس کا آئینہ دار ہے۔

اب آگے بڑھیں۔ عصر حاضر کی میکینا دلی سیاست کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اُس نے کرہ ارض پر لکیریں کھینچ کر نوب انسان کو مختلف قوموں میں تقسیم کر رکھا ہے جس سے (اقبال؟ کے الفاظ میں) ”انسان نوب انسان کا شکاری“ ہو گیا ہے۔ انسانوں کی اس تقسیم نے، ضابطہ اخلاق کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی ذاتی اخلاق (PRIVATE MORALITY) اور سیاسی اخلاق (PUBLIC MORALITY) پر دو قیصر جوڑ کے الفاظ میں :-

(عصرِ حاضر کی سیاست کی رو سے) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔

پرائیویٹ اور پبلک ضوابط اخلاق | اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار ،
رحمدل اور قابلِ اعتماد ہیں ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں
اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا
”کارِ ثواب“ ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے ۔

(GUIDE TO MORALS, ETC. P-13)

اسی بنا پر لارڈ کرے نے کہا تھا :-

سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پاسکتے

(IDEALS AND ILLUSIONS, BY SUSAN STEBBING. P-13)

اور وال پول نے لکھا تھا :-

نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات

ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک نہیں جاسکتے

(- 00 - P-14)

(CAVOUR) جسے اٹلی کا سمار کہا جاتا ہے، کہا کرتا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطانی بن جائیں گے۔

(FOREIGN AFFAIRS, JULY, 1952)

اس قسم کا ”اخلاقی نظریہ“ نیشنلزم کا پسیدہ اگر وہ ہے جس میں سب سے بڑا محبِ وطن (PATRIOT) وہ ہوتا ہے جس کا
ایمان یہ ہو کہ (MY COUNTRY RIGHT OR WRONG) ”مجھے اپنے ملک کا مفاد مطلوب ہے، خواہ وہ حق پر ہو
یا باطل پر۔“

مذہب کی دنیا میں اسی قسم کی بدترین قومیت پرستی کی بنیاد یہودیوں (بنی اسرائیل) نے رکھی تھی۔ اُن کی قومیت کا مدار نسل
پر تھا۔ وہ غیر بنی اسرائیل کو اس دنیا میں تو ایک طرف، آخرت میں بھی، جنت میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اُن
کا عقیدہ تھا :-

لے اس قسم کے ضابطہ اخلاق۔ میکیناؤلی سیاست۔ اور نیشنلزم کی سیاہ کاریوں کے لئے میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا“۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوَ ذَا اَذْنُنْزِي ه (۲۷)

یہود و نصاریٰ کے سوا جنت میں کوئی نہیں داخل ہو سکے گا۔ یہ (ہود و نصاریٰ) دونوں بنی اسرائیل تھے۔ ان کی اس نسل پرستی پر مبنی قومیت نے ”دو اخلاقی نظریہ“ کی نعمت کی تخلیق کی۔ وہ عربوں کے غیر اسرائیلیوں کو اُمیتین کہہ کر پکارتے تھے۔ اور ان کا نظریہ اخلاق یہ تھا کہ ان کے خلاف سب کچھ کرنا جائز ہے۔ (لیس علیہما فی الامیین سبیل)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے جن دیانت داروں کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، ان کی دیانت داری بنی اسرائیل تک محدود تھی۔ غیر بنی اسرائیل کے ضمن میں ان کا سلسلہ بھی قومی تھا۔

ہمارے ہاں جو لوگ مغربی ممالک سے ہوا آتے ہیں، وہ وہاں کے باشندوں (بالخصوص انگریزوں) کی خوش معاملگی اور حسن سلوک سے بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ خوش معاملگی اور حسن سلوک قابل تعریف محسن ہیں۔ لیکن وہی مغربی باشندے جب قومی سطح پر آتے ہیں تو اخلاق و دیانت کے ہر اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، اور اپنی قوم کے مفاد کی خاطر وہ کچھ کرتے ہیں جو باعث ننگ انسانیت ہوتا ہے۔ اس آئیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے اسی نظریہ اخلاق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قرآن کریم نوع ان کو اُمت واحدہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ ضابطہ اخلاق کے سلسلہ میں اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اُس کا قرآنی ضابطہ اخلاق تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے۔ قرآن کریم عظیم اصول پیش کرتا ہے کہ تم نے صداقت شکاری اور دیانت داری کا عہد کسی خاص شخص یا قوم سے نہیں کیا۔ تم نے یہ عہد اپنے خدا سے کیا ہے۔ اس لئے اس عہد کا پورا کرنا فریضہ خداوندی ہے جسے تمہیں ہر حالت میں ادا کرنا ہوگا۔ خواہ فریقِ مقابل کوئی بھی ہو:

بَلٰی مَنْ اٰذَنِيْ بِعَهْدِيْ ۙ وَ اَتَّقِيْ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانون اس باب میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کا قانون یہ

۳
۷۵

۱۔ ہمیں افسوس ہے کہ میکاؤلی یا ست سے متاثر ذہنیتوں نے یہاں بھی اسی قسم کے ضابطہ اخلاق کی تعلقین کی اور قیامت

بالائے قیامت کہ اسے اسلامی ضابطہ اخلاق کہہ کر پیش کیا۔ فرمایا:

راست بازی و صداقت شکاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین

جُرّائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس

کے وجوب تک فتویٰ دیا گیا ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مرحوم۔ بحوالہ ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء ص ۵۷)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جھوٹ کی ضرورت ”اپنے سے باہر“ کے لوگوں کے سلسلہ میں ہی پیش آسکتی ہے۔

ہے کہ جس شخص نے بھی اپنے عہد پورا کیا، اور اس طرح قوانین خداوندی کی نگہداشت کی، تو سب لوگ ہیں جو خدا کی نگاہ میں پسندیدہ ہیں۔
اس کے برعکس :-

۳
۷۶

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي
الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُذَكِّرُهُمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۷۶)

اس کے برعکس، جو لوگ اپنے عہد معاہدہ، اور قول اقرار کو، جن کی پابندی کی تاکید قانون خداوندی اس شدت سے کرتا ہے،
دنیاوی مفاد کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں، تو انہیں مفاد عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن مستقبل کی خوشگوار یوں میں ان کا
کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس دنیا کا فائدہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں اس
کی کچھ قیمت نہیں ہو سکتی۔ مستقبل کی خوشگوار یوں کے سلسلہ میں قانون خداوندی ایسے لوگوں سے بات تک نہیں کرے
گا۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا نہیں دیکھے گا۔ ان خوشگوار یوں میں حصہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی صلاحیتیں رب کریم جانیں
گی۔ ان کی ذات کی نشوونما نہیں ہوگی۔ اور اس طرح، یہ درد انگیز عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

غور کیجئے۔ یہاں اس عہد معاہدہ کو جسے ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتا ہے عہدُ اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اس
سے قرآن کا پیش کردہ نظام اخلاقی باقی دنیا سے متمیز اور بلند ہو جاتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص (یا کوئی گروہ
کسی دوسرے گروہ) سے معاملہ کرتے وقت یہ نہیں کہتا کہ میں اس وقت تو نہیں اپنی صداقت، دیانت اور پابندی عہد کی یقین
دلانی کر رہا ہوں، لیکن بعد میں، میں ہر قسم کی بددیانتی اور بدعہدی کروں گا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کہے گا۔ وہ اپنے عہد معاہدہ کی پابندی
کا یقین دلاتا رہے گا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ عہد معاہدہ تم نے اس شخص کے ساتھ نہیں کیا تھا، خدا کے ساتھ کیا تھا،
اس لئے اس کے لئے تم سے خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا: **وَأَذِفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا** (۷۶)۔ اپنے عہد کو پورا
کر۔ اس کی بابت تم سے خدا کے ہاں باز پرس ہوگی۔

زیر نظر آیت میں قرآن کریم نے کہا ہے: **أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ**۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ
بددیانتی اور بدعہدی کرنے والوں کو پیش پا افتادہ مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن آخر الامر (IN THE LONG RUN)

کفار کے اچھے کاموں کا صلہ اسی دنیا میں |
بعد کی زندگی لی جائے تو اس سے ایک اور اہم سولہ کا جواب
مل جاتا ہے اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ غیر مسلم (کفار) اکثر نیک کام بھی کرتے ہیں۔ کیا ان کے نیک کاموں کا انہیں کوئی اجر

نہیں ملے گا؟ قرآن مجید میں ہے کہ یہ لوگ جب قیامت میں خدا سے یہی سوال کریں گے، تو ان سے کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طِبْلَكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا دَأْسْتُمُغْتُمْ بِهَا؟ (۳۰) ”تم نے دنیا میں اچھے کام کئے تو ان اچھے کاموں کا بدلہ بھی دیں مل گیا۔ تم نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کا حساب تم نے دیں چکا لیا۔ اب ان کا بدلہ کیا مانگتے ہو؟ یہی مطلب ہے یہاں ان الفاظ سے کہ اُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔“ دنیا اور آخرت کی نجات و سعادت کے سلسلہ میں یہ نکتہ بڑا اہم ہے لیکن اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اسے ہم مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں مکافاتِ عمل اور نجات وغیرہ کے موضوعات کے تحت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ (انڈکس کی مدد سے حوالے تلاش کئے جاسکتے ہیں)۔

اس کے بعد قرآن کریم ایک اور اہم حقیقت سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام کے دلوں میں دیانت، امانت، صداقت وغیرہ کی اہمیت کا احساس موجود ہوتا ہے، اس لئے وہ اُن کی خلاف ورزی کی جرأت از خود بہت کم کرتے ہیں۔ یہ اُن کے مذہبی پیشوا ہیں جو انہیں ”منزعی جیلوں“ سے باور کراتے رہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی مصداقہ نہیں۔ بلکہ حبساکہ ص ۵۹ کے فطوٹ میں لکھا جا چکا ہے وہ ان سے کہتے ہیں کہ ایسا کرنا تم پر واجب ہے۔“

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوَنَ أَلْسِنَتَهُمُ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ
مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ
عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (۳۱)

ان میں (مذہبی پیشواؤں کا) گروہ ایسا ہے جو اپنی طرف سے باتیں وضع کرتے ہیں اور پھر انہیں وحیِ خداوندی کے ساتھ اس طرح بٹ دیتے ہیں کہ وہ دونوں مل کر ایک ہی نظر آئیں اور یوں انسانوں کی باتیں خدا کی شریعت بن جائیں۔ جب ان سے پوچھو تو پوری دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ باتیں بھی خدا ہی کی ہیں، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ لوگ دیدہ دانستہ خدا کے خلاف جھوٹ بولتے اور آخرت پر دازی کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ لوگوں سے اپنی باتیں منوائیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔

یہاں ذکرِ تو اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کا ہے، لیکن مذہبی پیشوائیت جہاں اور جس قوم میں بھی ہوگی، وہاں یہی کچھ ہوگا۔ خود

آپ کو شاید علم نہ ہو کہ فقہی قوانین کی کتابوں میں ایک باب الجمل بھی ہوتا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ وہ کون سے جیلے ہیں جن سے ان قوانین کو توڑا بھی جاسکتا ہے اور گناہ بھی نہیں ہوتا۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۳۱) کا مفہوم اور بھی ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں جو کچھ شریعت کے نام پر کیا اور کرایا جاتا ہے اس سے کون واقف نہیں اور مذہبی فتوے جس طرح لکھے جاتے ہیں اس کا کسے علم نہیں جب مذہب پیشہ (ذریعہ معاش) بن جائے تو یہ سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ کچھ اسی صورت میں کرایا جاسکتا ہے جب عوام کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا جائے کہ یہ لوگ (مذہبی پیشوا) خدا کے نمائندے ہیں اس لئے انہیں اختیارات خداوندی حاصل ہیں جب تک عوام میں یہ عقیدہ پیدا نہ کیا جائے انہیں کوئی بھی اپنے سامنے نہیں ٹھکا سکتا ہے۔ خواہ وہ حکمران طبقہ ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت۔ انسان دوسروں کا غلام بنتا ہی عقیدت کی بنا پر ہے اور قرآن کریم اسی عقیدت کو انسانوں کے دل سے ختم کرنے کے لئے آیا تھا تاکہ دنیا میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے کا محتاج ہو اور نہ محکوم۔ وہ ساری دنیا سے بر ملا کہتا ہے کہ

کسی در این جا سائل و محکوم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نے اس انقلابِ عظیم کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے کہ :

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ شُمْ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا
عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳۸)

حرف انسانیت کا تقاضا اور دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت خدا کے قلموں کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ اس باب میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے اس کے مغز تک پہنچتے ہو رہائی (یعنی اس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔

میں جب پہلے پہل اس آیتِ جلیلہ کے مفہوم کی گہرائیوں میں اترا اور اس منشور کے عملی نتائج کو سامنے لایا تو میرے دل سے بے ساختہ یہ خیال ابھر کر اگر سارا قرآن میرے سامنے نہ بھی ہوتا، اس کی یہی ایک آیت سامنے آتی تو میں بلا تامل پکارا ٹھٹھا کہ لاریب! یہ خدا

سے خدا کی طرف سے عطا شدہ ضابطہ قوانین (کتاب) میں رسول اور اس کے متبعین دونوں شامل ہوتے ہیں کیونکہ وہ کتاب رسول کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو بھی ملتی ہے۔ اسی طرح حکومت بھی۔ لیکن نبوت میں نبی کے سوا کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے کتاب حکومت اور نبوت کہے سے نبی اور غیر نبی سب آگئے۔ دیکھئے (۲۵)۔ نبی کی اُمت کو وارث کتاب بھی کہا گیا ہے : (۲۵)۔

کا کلام ہے، کسی انسان کا نہیں۔ انسان (فرد ہو یا قوم) کی انتہائی خواہش کیا ہے؟ آزادی — لیکن آزادی کے لئے اس کی اس قدر شدید خواہش کے باوجود اس کا حاصل ہونا تو ایک طرف، وہ آج تک اس کی صحیح اور جامع تعریف (DEFINITION) بھی نہیں کر سکا۔ آزادی کی ضد غلامی یا محکومی ہے۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ غلامی یا محکومی کی شکلیں کچھ بھی ہیں دو ہی قوتیں ہیں جو دوسرے انسانوں کو اپنا غلام یا محکوم بناتی ہیں۔ حکمرانی کا اقتدار اور مائندگان خدا (مذہبی پیشواؤں) کا جلال۔ حکومت (یا حکمرانی) کا اقتدار محسوس شکل میں سامنے آتا ہے اور اس کی زنجیریں انسانوں کے جسم کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ لیکن خدا کے خود ساختہ نمائندوں کا الوہیاتی اقتدار غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے اور وہ انسانوں کے قلب و دماغ کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے، انسان لاکھ کوششوں کے باوجود ان (بہر دو) قوتوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکا۔ ان قوتوں کی گرفت کی شکل و صورت بدلتی رہی ہے لیکن ان کی حکمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

قرآن کریم نے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم مطلق اور

انسانی آزادی کا عظیم منشور

فرمان تدبیر بنائے۔ اس سلسلہ میں اس نے ان دونوں قوتوں کی تصریح کر دی جن کی محکومی کی زنجیروں میں انسان جکڑے چلا آ رہا تھا۔ یعنی — عام اصطلاح میں — مادی (TEMPORAL) اور روحانی (SPIRITUAL) قوتیں۔ ”روحانی“ یا مذہبی قوتوں میں بلند ترین مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں تو مذہبی پیشواؤں کو اس کا حق کیسے حاصل ہو سکے گا؟ اس نے ایک ہی جھٹکے سے مذہبی اقتدار کی تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اب یہی وہ مادی یا دنیوی حکومت، تو اس میں قدیم زمانوں میں بادشاہوں کے احکام کی اطاعت ہوتی تھی جس نے ہمارے زمانے میں ڈکٹیٹر شپ کا پیکر اختیار کیا۔ سیاسی مفکرین نے افراد کے احکام کی اطاعت کو محکومی اور غلامی قرار دے کر یہ کہا کہ حکومت قوانین کی ہونی چاہیے۔ لیکن اُس نے قوانین سازی کا اختیار انسانوں کو دے دیا۔ (اسے مغرب کا سیکولر جمہوری نظام کہا جاتا ہے)۔ قرآن کریم نے کہا کہ ایک انسان دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے یا انہوں کا کوئی گروہ اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت دوسرے انسانوں سے کرائے، یہ بہر حال انسانوں کی غلامی یا محکومی ہے۔ اسے آزادی نہیں کہا جاسکتا — عہد قدیم کی حکومت بھی باطل، عصر حاضر کی حکومت بھی باطل!

آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے نبوت (مذہبی اقتدار) حکم (ملوکیت یا آمریت) کا اقتدار جس میں ایک فرد کے احکام کی اطاعت کرائی جاتی ہے، اور کتاب (قوانین سازی کے اقتدار) کی نفی کر کے کس طرح ان تمام زنجیروں کو توڑ دیا جس میں نوع انسانی کسی نہ کسی شکل میں جکڑی چلی آرہی تھی۔

لیکن جیب انسانوں پر کوئی اقتدار بھی نہ رہے تو اس سے انار کی (ملاقا نویت) پھیل جائے گی۔ اس کے لئے اُس نے کہا کہ انہوں پر دوسرے انسانوں کا اقتدار نہیں رہے گا۔ ان پر خدا کا اقتدار ہوگا۔

اس پر مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ خدا اپنی حکمرانی کے لئے خود دنیا میں نہیں آتا، ہم اُس کے نمائندے ہیں۔ اس لئے ہماری اطاعت، خدا کی اطاعت ہے۔

قرآن نے کہا کہ یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے۔ خدا کا کوئی نمائندہ نہیں۔ اس نے ایک ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے۔ اس ضابطہ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی۔

آپ غور کیجئے کہ اس سے انسانوں نے دوسرے انسانوں کی محکومی سے کس طرح دستگیری حاصل کر لی۔ اسی کا نام صحیح آزادی ہے۔ انسانوں کی محکومی میں انسانی صلاحیتیں کچلی جاتی ہیں اور انسان شرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کتاب خداوندی کی اطاعت سے۔ انسانی صلاحیتیں نشوونما پا کر پروان چڑھتی ہیں اور انسان "حسنِ تعویم" کے بند و بالا مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی اس دنیا میں انسانی زندگی کا منتہا ہے۔

سوچئے کہ اس قسم کا منشور آزادی کوئی انسان بھی وضع کر سکتا تھا؟ ایسا انقلاب آفرین منشور خدا ہی دے سکتا تھا۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ (ان امور کی تفصیل مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں حکومت، نبوت، عیلت کے عنوانات کے تحت ملے گی)۔

جب ذہن انسانی اپنے عہدِ طغولیت میں تھا تو وہ مظاہرِ فطرت کو اپنا معبود بنا لیتا تھا۔ — اصنامیات یونان یا ہندوؤں کے دیوی دیوتا سب اسی ذہنیت کے تراشیدہ بُت ہیں۔ (سابقہ جلدوں میں ملائکہ کا عنوان دیکھئے)۔ یہ آگے بڑھا تو اُس نے رسولوں کو خدا کا درجہ دے دیا۔ قرآن کریم نے اس کی بھی تصریح کر دی کہ خدا کی سچی تعلیم کو پیش کرنے والا کبھی اس قسم کی توہم پرستانہ تعلیم نہیں دے گا۔

وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۚ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۚ (۲۹)

۳
۷۹

وہ یہ بھی نہیں کہے گا کہ تم مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا بنا کر اُن کی پرستش شروع کر دو، یا تم اپنے انبیاء کو خدا بنا لو۔ کیا

ایسا ہو سکتا ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا عہد کر دو اور وہ تمہیں اس قسم کی کافرانہ تعلیم دے؟

اس آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ ان میں کفر و اسلام میں واضح طور پر خط امتیاز کھینچ دیا گیا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ کسی انسان کی اطاعت نہ کی جائے — اس میں انبیاء۔ مذہبی پیشوا۔ حکام۔ مجالسِ قوانین ساز سب شامل ہیں۔ اطاعت صرف کتابِ خداوندی

کی کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ
 وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ — فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ
 — فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵۴-۵۵)

جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں — ظالم ہیں — فاسق ہیں۔
 یہی الدین ہے، اور دین خداوندی کوئی نئی چیز نہیں جسے پہلی بار قرآن مجید میں دیا گیا ہو۔ ہر نئی کو یہی دین دیا جاتا تھا۔
 (مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں دین کے عنوان کے تحت دیکھئے) لیکن ہوتا یہ کہ نبی کے چلے جانے کے بعد اس کے نام پر
 اس کی طرف نازل شدہ دین میں تحریف کر دیتے۔ اس کے بعد ایک اور نبی آتا جو اس محرف شدہ دین سے ان کی آمیزشوں کو الگ
 کر کے دین خداوندی کو پھر سے اس کی حقیقی اور منترہ شکل میں پیش کر دیتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَّا أُنْيَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ شَمَّ
 جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّمَّنْ دَلَّكُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ أَصْرُ حُجَّتٍ فَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَشْهَدُ وَإِنَّا مَعَكُمْ
 مِنَ الشَّاهِدِينَ ه (۵۶)

یہ سلسلہ ہدایت کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ ایک ہی پیغام ہے جو شروع سے اخیر تک مسلسل چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ
 انبیاء کے ذریعے ان کی امتوں سے عہد لیا کرتا تھا کہ تمہیں یہ کتاب و حکمت دی گئی ہے، لیکن اس کے بعد جب ہم (عند الضرر)
 کوئی دوسرا رسول بھیجیں جو اس تعلیم کو سچا کر دکھائے جو تمہیں دی گئی تھی، تو تم گروہ بنانا نہ تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت
 نہ مشروع کر دینا، بلکہ اس کی صداقت پر ایمان لانا، اور اس کی مدد کرنا۔

یہ اس قدر اہم اصول تھا کہ اللہ ان سے بنا کہ یہ پوچھتا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور مجھ سے اس کا عہد کرتے ہو کہ ایسا ہی
 کرو گے؟ وہ کہتے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں (یعنی یہ چیزیں ان کا جود ایمان ہوتی تھیں)۔ اس پر اللہ ان سے کہتا کہ اب تم اپنے
 اس عہد و اقرار کی نگرانی کرنا۔ اور میں بھی اس کی نگرانی کروں گا (کہ تم اسے نباہتے ہو یا نہیں)۔ یہ اقرار اہم سابقہ سے لیا جاتا
 تھا۔ (ایک اقرار خود انبیاء سے بھی لیا جاتا تھا جس کا ذکر (۳۶) میں آئے گا)

اس پر وگرام کے مطابق سلسلہ انبیاء کرام کی آخری کڑی — حضور نبی اکرم — تشریف لائے اور دین خداوندی، اس کی منترہ
 اور مکمل شکل میں دنیا کو دے دیا۔ چونکہ منترہ اور خالص دین خدا کی کتاب میں تکمیل تک
 پہنچ چکا تھا اور اس کی (قرآن مجید کی) حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تھا، اس لئے

سلسلہ رشد و ہدایت

اب سلسلہ انبیاء کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (اس کو ختم نبوت کہا جاتا ہے)۔ خدا کے اس آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت اہل کتاب اور دوسرے انسانوں (سب) کو دی گئی۔ اہل کتاب کے ہاں تو حضورؐ کی آمد کی پیشگوئیاں بھی موجود تھیں۔ اس لئے رسالت محمدیہ سے روگردانی اُن کے لئے بھی جائز نہیں تھی۔ اس لئے فرمایا :-

فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَٰسِقُونَ ۝ (۸۱)

۳
۸۱

اسی سلسلہ رشتہ دہایت کے مطابق، اب یہ خدا کا آخری نبی آیا ہے۔ اس کی آمد کا اقرار بھی ان (یہود و نصاریٰ) سے لیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس عہد و اقرار سے روگردانی کرتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ جو بھی اس قسم کے عہد و پیمان سے روگردانی کرے گا، وہ یقیناً سیدھی ماہ سے منحرف ہو گا۔



بات ہو رہی تھی الدین کی۔ اور الدین نام ہے قوانین خداوندی کی اطاعت کا سابقہ صفحات میں بنایا جا چکا ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ چونکہ اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا ہے اس لئے انہیں قوانین خداوندی سے یارائے سرکشی نہیں۔ مجال انکار نہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے کہا ہے کہ کائنات میں دین خداوندی جاری و ساری ہے۔ یہی دین (یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت) انسانوں کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا :-

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَٰئِذَا اسْتَلِمَ مِنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

۳
۸۲

اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۸۲)

کیا یہ لوگ "دین اللہ" کے بجائے کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ کائنات کی ہر شے "طوعاً و کرہاً" قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس محور کے گرد گردش کرنے پر مجبور۔

آپ دیکھئے کہ اس آیت میں اسلام کی اصل و حقیقت کو کس وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے! لیکن اس میں ایک دو نکات غور طلب ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلَٰئِذَا اسْتَلِمَ مِنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (کائنات میں جو کچھ ہے

طوعاً و کرہاً قوانین خداوندی کے سامنے تسلیم فہم کئے ہوئے ہے)۔ اگرچہ یہ

خارجی کائنات میں اسلام

قاعدہ کلیہ نہیں، لیکن عربی زبان میں 'ما' عام طور پر غیر جاندار اشیاء کے لئے

آتا ہے اور مَنْ بالعموم جانداروں کے لئے، اگرچہ اس میں بعض اوقات غیر جاندار بھی شامل ہوتے ہیں۔ اشیائے کائنات میں

(انسان کو چھوڑ کر) جاندار (حیوانات پرندے وغیرہ) بھی شامل ہیں جو قوانین فطرت کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح

غیر جاندار اشیاء ان قوانین کی اطاعت ان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ ایسا جلی طور پر (INTRINSICALLY) کرتے ہیں

پر غالب آجائے۔

اقوام مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے انسانوں کے وضع کردہ ادیان (نظاموں) کا تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ ان کے کام نہایت ہونے پر اب وہ رفتہ رفتہ اسی نظام کی طرف آرہے ہیں جو خدا نے متعین فرمایا تھا۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں اسلام، نظام اور دین کے عنوانات کے تحت دیکھئے)۔ یُزَجَّوْنَ پر غور کیجئے۔ یعنی یہ اس نظام کی طرف خود نہیں آئیں گے، یہ اُس کی طرف لائے جائیں گے۔ زمانے کے تھپیڑے انہیں مارا کر اس کی طرف لائیں گے۔ جس نظام کو انہوں نے طوعاً اختیار نہیں کیا تھا، اسے یہ کہنا اختیار کریں گے۔ اس کے سوا نوع انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔ کوئی کشادگی راہ نہیں۔ جو حقیقت کو از خود نہیں مانتا، حقیقت اس سے اپنے آپ کو خود منوالیتی ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ دین کوئی نیا دین نہیں۔ تمام انبیاء کرام کو یہی دین دیا گیا تھا۔ اسی لئے اسلام قبول کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ انبیاء سابقہ کو خدا کی طرف سے ہی دین ملا تھا۔ اس لئے فرمایا :-

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ سَبَقِهِمْ لَا نَفَرَّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۸۳)

ان سے کہہ دو کہ ہم اس دین (نظام زندگی) کو طوعاً (بطیب خاطر) اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے ہم، خدا کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ وحی، جواب ہماری طرف نازل ہوئی ہے اساساً اور بنیاداً وہی ہے جو اس سے پہلے ابراہیم و اسمعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد (میں سے انبیاء) پر نازل ہوئی تھی۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دیگر انبیاء کو دی گئی تھی (۸۳، ۸۴، ۸۵)۔ ہم ان تمام انبیاء کو دین خداوندی کا پیامبر سمجھتے ہیں اور اس اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں کرتے یہ ہے وہ طریق جس سے ہم قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں۔ اس نظام کا نام ہے اسلام۔ لہذا :

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يَّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۸۴)

اس نظام کا نام ہے الاسلام۔ اور یہی نظام، خدا کی طرف سے، تمام عالم انسانیت کے لئے تجویز ہوا ہے۔ سو جو فرد یا قوم اس نظام کے سوا، زندگی کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہے تو میزبان خداوندی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اس سے اُس قوم کو مفاد عاجلہ تو حاصل ہو سکتے

ہیں۔ لیکن مستقبل میں وہ سخت نقصان میں رہے گی۔

ہم انسان کی نامرادیوں، حرام نصیبیوں اور ناکام تجارب سے نقصان اٹھا کر آخر الامر صحیح راستے کی تلاش میں نکلنے کی داستان بڑی دلچسپی سے سن رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کفار کی سرگزشت بیان ہو رہی ہے۔ لیکن اس جذب و اہماک سے کچھ وقت کے لئے الگ ہٹ کر سوچئے تو نظر آجائے گا کہ

ارے دل ! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے !

اپنی داستان ! لیکن بہت بڑے فرق کے ساتھ۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان اقوام نے دین الحق کو کبھی اختیار ہی نہیں کیا تھا اور وہ عقل کے تجرباتی دین سے صحیح راستے کی تلاش کر رہے ہیں، لیکن ہم (امت محمدیہ) نے اس نظام کو اپنایا۔ قائم کیا۔ اس کے درختندہ نتائج کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اور اس کے بعد اسے چھوڑ کر غیر خداوندی راستے اختیار کر لئے۔ ذرا غور کیجئے کہ مندرجہ ذیل ارشاد خداوندی میں ہمارا ہی ذکر تو نہیں !

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعُدَ إِيْمَانُهُمْ وَشَهِدُوا أَنَّ اللَّهَ سَوَّلَ حَقُّ وَجَّأَهُمْ ابْتِغَاءُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (۳۵)

اب رہے وہ (بد نصیب) جو ایمان لانے کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لیں یعنی صحیح اسلامی نظام قائم ہو جانے کے بعد، پھر غیر اسلامی نظام کی طرف لوٹ جائیں، درآنحالیہ (اس نظام کے درختندہ نتائج نے) یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کے رسول نے جو کچھ کہا تھا وہ کس قدر حقیقت پر مبنی تھا !

سو ظاہر ہے کہ جو قوم، صداقت کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے کے بعد بھی اس نظام سے سرکشی اختیار کر جائے

تو اس پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کس طرح کھل سکتی ہے ؟

اس ایمان کے بعد کفر کا جو نتیجہ ہوا، اس کے تصور سے بھی روح پرکپکی طاری ہو جاتی ہے اس لئے جی نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے سامنے آئے۔ لیکن وہ نتیجہ تو ایسا ہے جس کی شہادت خود ہماری حالت دے رہی ہے۔ اس لئے اسے چھپایا کس طرح جاسکتا ہے ؟ اس کو طوعاً و کرہاً سامنے لانا ہی ہوگا۔ جب اسے سامنے لانا ہی ہے تو پھر

اس کا نتیجہ

اسے خدا کے الفاظ ہی میں کیوں سامنے لایا جائے۔ وہ الفاظ یہ ہیں :-

أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۞هُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۞ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۞ (۸۷-۸۸)

يُنظَرُونَ ۞ (۸۷-۸۸)

یاد رکھو ! ان لوگوں کی روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ نظام خداوندی کے خوشگوار ثمرات سے بھی محروم

رہیں کائنات کی قوتوں کی برکات بھی ان کے حصے میں نہ آئیں۔ اور اقوام عالم بھی انہیں ذلیل و خوار سمجھ کر اپنے سے دور دور رکھیں اور یوں ان پر ہر طرف سے محرومی و نادرادی کی پھٹکار پڑے۔

یہ ذلت و خواری ان پر مسلط رہے گی، اور (خدا و رسول کا زبانی اقرار) ان کی منراہیں ذرا سی تخفیف نہیں کر سکے گا، اور نہ ہی ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور میں تاخیر کی جائے گی۔ وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائیں گے۔

اُف! کس قدر الم انگیز ہے یہ انجام اور کیسا عبرت آموز ہے یہ حال۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ عذاب ابدی اور یہ سزا ہمیشہ مسلط رہنے والا ہے یا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ خدائے رحیم و رحمن سے یہ بعید تھا کہ وہ اپنے بندوں پر نجات و سعادت کی تمام راہیں بند کر دیتا۔ اُس نے کہا کہ

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۸۸) ۳
۸۸

اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ جس دو ماہے پر اُن کے قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گئے تھے، وہ پلٹ کر وہیں جائیں، وہاں سے وہی سیدھا راستہ اختیار کریں اور خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اس طرح وہ تباہی سے محفوظ بھی رہ جائیں گے اور انہیں سامانِ نشو و نما بھی میسر آجائے گا۔

دیگر اقوام کے ہاں چونکہ قرآن موجود نہیں اس لئے انہیں زمانے کے تقاضے مار مار کر اس طرف لائیں گے (إِلَيْهِ يُلَاجِعُونَ) ہمارے پاس چونکہ خدا کی کتاب موجود ہے، اس لئے ہمیں (خود پلٹ کر اس کی طرف آنا ہوگا)۔ (إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا)۔ لیکن ہم ہوں یا وہ، فلاح و سعادت کی راہ قرآن کریم کے سوا کہیں سے نہیں ملے گی۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لیکن :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ اِزْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تَقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الصَّاكُوتُونَ ۝ (۸۹) ۳
۸۹

لیکن اگر یہ ایسا نہ کریں اور زبان سے توبہ تو بہ کہتے، لیکن عملاً اسی غلط راستے پر چلتے رہیں اور اس میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں، تو ظاہر ہے کہ غلط راستے پر چلنے والا، صحیح منزل پر کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

اور اس کے بعد :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُمْسِلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ ۚ وَالْأَرْضُ ذُتُّهَا وَكُفُّوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُمْسِلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ ۚ وَالْأَرْضُ ذُتُّهَا وَكُفُّوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُمْسِلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ ۚ ۳
۹۰

مِنْ نَصْرَيْنِ ۝ (٣٠)

پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس باز آفرینی کا امکان اسی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد اگر یہ چاہیں کہ زندگی کی سرفرازیوں نصیب ہو جائیں تو ایسا ہونا ناممکن ہو گا خواہ یہ، اس کے بدلے میں دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ دے دینا چاہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب کی زندگی ہو گی اور کوئی ایسا نہیں ہو گا جو اس حالت میں ان کی کوئی مدد کر سکے۔

شروع چوتھا پارہ

آیت (۱۲) میں کہا گیا تھا کہ اگر تم دین الحق کی خوشگوار یوں سے فیض یاب ہونا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم اپنے موجودہ غیر فرآئی نظام زندگی کو چھوڑ کر، اُس نظام کی طرف پیڑ جسے قرآن نے متعین کیا ہے۔ لیکن اتنا سمجھ لو کہ یہ مرحلہ بڑا محنت طلب ہوگا اس میں بنیادی اصول یہ ہوگا کہ جب کبھی اقدارِ خداوندی اور تمہارے ذاتی مفاد یا خواہشات میں ٹکراؤ ہو، تو تمہیں اقدارِ خداوندی کو اپنے مفاد اور خواہشات پر ترجیح دینی ہوگی۔ اسی سے تم پر کشادگی راہیں داہوں گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ (٣١)

4
91

بِهِ عَلَيْهِ (91/3)

اس کے بعد سہل یہ سامنے آتا ہے کہ جو لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہیں وہ کیا کریں؟ بات سیدھی ہے۔ تم زندگی کی اور اپنی ذات کی کنشاد چاہتے ہو۔ اس کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ (مال و دولت میں سے) جو چیزیں تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہوں انہیں صرف اپنے لئے سمیٹ کر نہ رکھو، بلکہ (نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے) کھلا رکھو۔ جو کچھ تم اس طرح ربوبیت عام کے لئے صرف کرو گے، خدا کو اس کا علم ہوگا، اس لئے تمہارا کوئی عمل نظر انداز نہیں ہونے پائے گا۔

انفاق | انفاق کی بحث سابقہ جلدوں میں تفصیل سے آچکی ہے۔ (ان جلدوں کے انڈکس اور فہرست مضامین سے حوالے مل جائیں گے)۔ اس مقام پر انفاق کا اعلان مال و دولت تک محدود سمجھا جائے گا۔ لیکن قرآن کریم نے احب کا دائرہ بڑا وسیع بنایا ہے۔ ارشاد ہے :

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِئْوَاجُكُمْ وَأَشْرَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ مُتَمَثِّلَةٌ بِأَنْفُسِكُمْ وَبِعِزَّتِكَ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَلَائِكُكُمْ تُدْرِكُونَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَفِي سَبِيلِهِ

فَتَوَلَّيْتُمْوَاَحْتٰى يٰۤاَيُّهَا اللّٰهُ يٰۤاَمْسِرْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؕ (۹۳)

(اے رسول!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہل خاندان اور مال و دولت جو تم کھاتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسول (نظام خداوندی) اور اس کے قیام و بقا کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ عزیز ہے، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تاکہ قانون خداوندی کی رو سے اس کے ظہور نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر، ادھر ادھر نکل جائے۔ اور وہ مقام تو آپ کو یاد ہی ہو گا کہ جہاں کہا گیا ہے کہ کشادگی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ یہ ہے کہ (اگر یاد نہ ہو تو مطالب الفرقان جلد سوم میں ص ۱۵۷ پر آیت (۹۳) دیکھئے۔ زندگی کی وسعتیں حاصل کرنے کا طریق آپ کے سامنے آجائے گا)۔



بات چلی آرہی تھی اصل کتاب اور ملتِ ابراہیمی کے اتباع کی۔ اب ہم پھر اُسی موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ تم کہتے ہو کہ دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ تم ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا خود بھی دعوے کرتے ہو اور ہمیں بھی اُسی کے اتباع کی دعوت دیتے ہو۔ اگر بات یہی ہے تو یہ (مسئلہ) بتاؤ کہ پھر ایسا کیوں ہے کہ بعض چیزیں ہمارے ہاں حرام ہیں اور تم انہیں حلال قرار دیتے ہو؟ ان سے کہا کہ

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلٰلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرٰٓءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرٰٓءِیْلُ عَلٰی
نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰتُ ۚ قُلْ فَاَلَا بِالتَّوْرٰتِ اَمَّا فَاَتْلُوْهَا
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنْ اِفْتَرٰی عَلٰی اللّٰهِ الْكِذْبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۹۳-۹۲)

ان سے کہہ دو کہ تم ابراہیم کو اپنا مورث علیٰ مانتے ہو۔ جو چیزیں اس کی ملت میں حرام تھیں، انہی کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے (۹۳)۔ باقی چیزوں کے متعلق ہوا یہ تھا کہ، نزدیکی تو رات سے پہلے، یعقوب (اسرائیل) نے بعض چیزوں کو اپنے لئے منوع قرار دے لیا تھا۔ سو یہ چیزیں خدا کی طرف سے ابدی طور پر حرام قرار نہیں دی جاسکتیں۔ نیز بعض چیزوں کو یہودیوں پر، بطور سزا حرام قرار دیا گیا تھا (۹۲)۔ تم تو رات لاؤ اور اس میں یہ دکھاؤ کہ کون سی چیزیں تھیں جو ملتِ ابراہیمی میں ابدًا حرام قرار دی گئی تھیں۔ اور انہیں اب حلال قرار دیا گیا ہے؟ یہ سب باتیں تم نے خود وضع کی ہیں۔ اور انہیں منسوب

کرتے ہو خدا کی طرف! یاد رکھو! جو اس طرح حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی خدا پر بہتان باندھے، تو ایسے لوگ عدالت خداوندی میں مجرمین کی صف میں کھڑے ہوں گے۔

حرام اور حلال کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۲۰ زیر آیت (۱۲۱) آچکی ہے۔ لیکن یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا تھا، ان میں سے بعض چیزیں حضرت یعقوب (اسرائیل) کے مزاج کے موافق نہیں تھیں، یا مرغوب خاطر نہیں تھیں۔ اس

حضرت یعقوب بعض چیزیں نہیں کھاتے تھے

لئے وہ ان سے پرہیز کرتے تھے۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں

قرآن کریم نے حلال کے ساتھ طیب کا اضافہ بھی اسی مقصد کے لئے کیا ہے کہ حلال اشیاء میں سے جو چیزیں تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں یا تمہیں پسند نہ ہوں، انہیں بیشک نہ کھاؤ۔ البتہ انہیں حرام مت قرار دو۔ یہی کہو کہ وہ ہمیں پسند نہیں۔ حضرت یعقوب نے ایسا ہی کیا تھا، لیکن چونکہ وہ خدا کے رسول تھے، ان کی امت (بنی اسرائیل) نے خیال کر دیا کہ وہ چیزیں بھی حرام کی فہرست میں داخل ہیں کیونکہ حضرت یعقوب نے ان کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ اس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ حضرات انبیاء و کرام کو اپنی زندگی کے معمولات میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ ہو سکتا تھا کہ ایک چیز وہ بعض عادت کرتے ہوں اور ان کی امت انہیں دین کا تقاضا سمجھ لے۔ اسی قسم کا واقعہ نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں بھی پیش آیا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر حضورؐ کی توجہ مبذول کرائی۔ سورہ التحریم میں ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتِ اللَّهِ وَارْجِعْ إِلَى اللَّهِ مَغْفُورًا دَعِيمًا ﴿۱۰۱﴾

”اے نبی! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا تھا، تو نے اسے اپنے لئے ممنوع کیوں قرار دے لیا؟ تم نے تو اسے ایک

معمولی بات سمجھ کر اپنی بیویوں کی رضا جوئی کی خاطر ایسا کیا (اور ایسا کرنا نہ جرم تھا نہ معصیت)

رسول اللہؐ بھی

لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے جس بات کو یہ بعض عادتاً کرے ہو سکتا ہے کہ اس کی امت بعد میں اسے دین کا تقاضا سمجھ لے۔ تم اس خود عائد کردہ پابندی کو ختم کرو (۱۰۱)۔ اس سے خدا

کے ہاں مواخذہ نہیں ہوتا۔“

دین کو خالص رکھنے کے لئے اس انتباہ کی بڑی ضرورت تھی۔ ہمارے ہاں سنت رسول اللہ (حضورؐ کے معمولات زندگی) کو بھی غیر متبدل دین قرار دے کر اس کی اطاعت کو فرض ٹھہرا گیا تو اس سے قسم قسم کی بحثیں وجود میں آ گئیں۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت کہتے کسے ہیں؟ قدامت پسند طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ نبی اکرمؐ نے کیا، یا کہا۔ یا جس کام کو دیکھ کر آپ خاموش رہے (یعنی حضورؐ کے اقوال، اعمال اور تقریریں)

سنت کی بحث

یہ سب احادیث ہیں، اور حدیث اور سنت ایک ہی چیز ہے۔ یعنی ہر حدیث سنت ہے۔

اب ظاہر ہے کہ چونکہ ہر فرقہ کی حدیثیں الگ الگ ہیں، اس لئے ہر فرقہ کی سنت رسول اللہ بھی الگ الگ ہو گئی۔ اور چونکہ سنت رسول اللہ کو غیر متبدل دین قرار دے دیا گیا۔ اس لئے ہر فرقہ کا (گویا) دین الگ ہو گیا۔ آپ جس قدر فرقہ دار بحثیں دیکھتے ہیں وہ سب اس اصل کی پیدا کردہ ہیں۔ اس کے خلاف سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ یہ صحیح نہیں کہ ہر حدیث، سنت رسول اللہ ہے۔ ان کے نزدیک !

سنت اس طریقہ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکمانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔

اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان مودودی مرحوم کا نظریہ

ہونے کے۔ یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز نہ کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو... تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام۔ اور تمام لوگوں کے لئے سنت بتادینا مقصود نہ تھا۔ (مسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۱۱ : ۳۱۱)

اس کتاب میں وہ ص ۳۱۲ پر لکھتے ہیں :-

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرز خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور شرائع الہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

سنت بنادیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحی شرع میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا من جملہ اُن بدعات کے لئے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل صاحب کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت رسول اللہ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی (مرحوم) کے نزدیک صحیح حدیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزیں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں :-

جو امور آپؐ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنادینا اور تمام دنیا کے ان لوگوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (مت ۳)

اس سے یہ دشواری سامنے آئی کہ احادیث کے مجموعہ میں کسی جگہ اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ حضورؐ نے فلاں کام رسول کی حیثیت سے کیا تھا یا اپنی بشری حیثیت سے اور اب ایسا متعین کرنے کا کوئی طریقہ یا ذریعہ بھی نہیں۔ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ اس کا فیصلہ ”مزاج شناس رسول“ کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔ ان کے الفاظ میں :-

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور مہارت سے

انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا

ہے۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جویری کی بصیرت

مزاج شناس رسول

کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ استاد کا زیادہ

محتاج نہیں رہتا۔ وہ استاد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک

غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے

کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معطل، غیر شاذ، مستقل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض

کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ نرین میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اول - ص ۳۰۲ تا ص ۳۱۲)

اس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے کہا :-

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کرے۔ پھر اسے اختیار دے کہ اصولی محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مطلق مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی جھلوں سے بچانے کی

کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۶۱)

یہ ہی وجہ تھیں جو حدیث و سنت کے سلسلے میں ہمارے ہاں جاری اور اُمت میں وجہ پریشانی و انتشار بن رہی ہیں جب تک اسلام ایک مذہب کی حیثیت اختیار کئے رہا۔ یہ بحثیں مناظروں اور مباحثوں یا فتویٰ بازوں تک محدود رہیں۔ لیکن پاکستان میں انہوں نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں مطالبہ یہ کیا گیا کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ حضراتِ علماء کرام کی طرف سے یہ مطالبہ متفق طور پر پیش کیا گیا۔ لیکن میں نے ان حضرات کی خدمت میں گزارش کیا کہ کتاب (یعنی قرآن مجید) تو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر خدا کی کتاب ہے لیکن سنت کی یہ پوزیشن نہیں۔ اول تو سنت کی تعریف (DEFINITION) ہی متفق علیہ نہیں۔ اور اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو سنت کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں۔ ان حالات میں یہاں کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ آپ حضرات پہلے سنت کا ایسا مجموعہ مرتب کر لیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں اس کے بعد کتاب و سنت کی رو سے متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب ہو سکے گا۔ اس کا جواب کفر کے فتوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا!

میں اپنا نام درمیان میں لانے کے لئے معذرت خواہ ہوں، لیکن ایسا کرنا ناگزیر ہے کیونکہ یہ سوال میری ہی طرف سے اٹھایا گیا تھا

اور مجھے اسی بناء پر منکر حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا۔

بیس برس تک یہ (ناممکن العمل) مطالبہ پیش ہوتا رہا اور ہر حکومت کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ یہ لوگ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کے بعد ان حضرات کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ

کتابِ سنت کی رو سے ناممکن ہے | کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) بحوالہ ایشیا - ۲۳، اگست ۱۹۷۷ء)

اس کا اعتراف بھی کر لیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ مطالبہ اپنی جگہ قائم رہا کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف وضع اور نافذ نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ اب (اواخر ۱۹۷۹ء میں) ملک کی ہائی کورٹوں پر مشتمل، شریعت پنچپس قائم کی گئی ہیں جن کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ مروجہ قوانین کے متعلق فیصلہ کریں کہ ان میں سے کون کونسا قانون ”کتاب و سنت“ کے خلاف ہے۔ انہوں نے یہ اہم فیصلہ کرنے ہیں ان حالات میں کہ نہ ”سنت“ کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) ان کے سامنے ہے اور نہ ہی سنت کا کوئی ایسا مجموعہ جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔

اس سعیِ لاحاصل کا جو نتیجہ برآمد ہوگا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پھر دہراؤں کہ دین کتاب اللہ کے اندر ہے جھنور بنی اگر تم نے اسے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ایک عملی نظام کی شکل میں قائم فرمایا تھا۔ ہم اسے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متشکل کریں گے۔ کتاب اللہ میں محفوظ دین ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ اس کے قائم، رائج اور نافذ کرنے کے طریق ہر دور میں بدلتے رہیں گے۔

یہ مقصد تھا قرآن کریم کا اس واقعہ کے بیان کرنے کا کہ خدا کے ایک رسول (حضرت یعقوبؑ) نے بعض حلال چیزوں کے استعمال کو ترک کر دیا جو انہیں ذاتی طور پر ناپسند اور ناخوش آئند تھیں، تو یہودیوں نے ان کے اس عمل کو ابدی دین قرار دے دیا۔ ایسا تم نہ کرنا۔ یہودیوں سے کہا :-

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۲۶)

ان سے کہو کہ سچی بات وہی ہے جسے خدا نے بتا دیا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ، اپنی کٹ جتنی چھوڑ کر ملتِ ابراہیمی

۳
۹۴

لے اب (جون ۱۹۷۸ء میں) ان بچوں کو توڑ کر مرکز میں ایک فیڈرل نیچ قائم کیا گیا ہے۔ لیکن نتیجہ اس کا بھی وہی نکلا گا۔ خرابی ان بچوں میں نہیں۔ اصل خرابی یہ ہے کہ ان کے سپرد ایک ایسے اصول کے مطابق فیصلہ کرنے کا کام کیا گیا ہے جو ناممکن العمل ہے۔

کی پیروی کر دے۔ (ہماری دعوت بھی وہی ہے) ابراہیمؑ نے ہر طرف سے منہ موڑ کر، خالص خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار

کیا تھا۔ وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ کہ خدا کے قانون کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی ملا لیتا)۔

یہودیوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس (یروشلم) تھا۔ مسلمانوں نے اپنا قبلہ علیحدہ کر لیا۔ کیا یہ الٹی دوا آیات (۹۴-۹۵) میں اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ قبلہ کعبہ، مکہ، حج۔ ابراہیمؑ کے سلسلے میں تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ ان میں زیر نظر دو آیات (۹۴-۹۵) بھی درج ہیں (جلد سوم صفحہ زیر آیت (۱۲۵)۔ اس لئے ان کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں۔ بجز اس کے کہ یہودیوں نے جس طرح نبوت کو اپنی نسل (بنی اسرائیل) میں محدود کر رکھا تھا اس طرح ان کا قبلہ (بیت المقدس) بھی قومی تھا۔ اس کے برعکس اسلام عالمگیر دین (نظام حیات) تھا اس لئے اس نظام کا مرکز (قبلہ) بھی نسلی، قومی، جغرافیائی حدود و قیود سے ماوراء عالمگیر ہونا چاہئے تھا۔ یہ وجہ تھی کہ جو بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ (مرکز) مقرر کیا گیا۔

مستقلہ آیات اور ان کا مفہوم درج ذیل ہے :-

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۚ
فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۚ وَلِلَّهِ عَلَى
النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ ۚ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ
الْعَالَمِينَ ۝ (۹۴-۹۵)

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ، قرآن نے، بیت المقدس کی بجائے، کعبہ کو کیوں مرکز قرار دیا ہے؟ (۱۲۵)۔ ان سے کہو، دنیا میں سب سے پہلے جس مقام کو نوع انسان کا مرکز تجویز کیا گیا تھا، وہ مکہ تھا۔ اسی مرکز سے اقوام عالم کو ثبات و استحکام اور نشوونما کا سامان ملنا تھا، اور اسی کو وہ روشنی کا مینار بننا تھا جس سے عالمگیر انسانیت کے سامنے زندگی کا صحیح راستہ آئے۔

یہ رہنمائی بڑی تین اور واضح ہے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں سے ابراہیمؑ کو اقوام عالم کی امامت کا مقام بلند حاصل ہوا تھا (۱۲۵-۱۲۷)۔ اس کی خصوصیت کبرئی یہ ہے کہ جو شخص بھی اس مرکز میں داخل ہو جائے، اسے ہر طرف سے امن و سلامتی حاصل ہوگی۔ اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں (۱۲۷)۔ جو جو لوگ بھی اس تک پہنچنے کی راہ پائیں، وہ یہاں جمع ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس نظام کا یہ مرکز ہے وہ نوع انسان کے لئے کس قدر منفعیت بخش ہے (۱۲۸)۔ بشرطیکہ ان کا اس طرح جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، اگر وہ بے اندازہ مصلحتوں کے پیش نظر نہ ہو۔

یہ ہیں اس مرکز نظام خداوندی کی خصوصیات۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے مرکز سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے۔ یہودی جس طرح نبوت کے عالمگیر ہونے کے تصور کے خلاف تھے اسی طرح وہ ایک عالمگیر مرکز کے ہونے کے بھی خلاف تھے۔ اسی بنا پر ان سے کہا گیا :-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ۝ (۹۷)

ان اہل کتاب سے کہو کہ تم (اس قسم کے منفعت بخش) قوانینِ خداوندی سے کیوں انکار کرتے ہو؟ یاد رکھو!

جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کا قانونِ مکافات اس کی پوری پوری نگہبانی کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آکر رہے گا۔ یہودی اگر اس دین کو ناپسند کرتے تھے تو انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ اسے قبول نہ کریں، لیکن وہ ان لوگوں کے راستے میں بھی رکاوٹیں پیدا کرتے تھے جو اسے بطیب خاطر اختیار کر چکے تھے۔ یا اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی انہیں اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ جب اسلام دوسروں کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتا تو وہ انہیں اس کی اجازت کیسے دے سکتا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کریں۔ لَا أَكْرَهُ أَتَى الَّذِينَ (۹۷) کا مفہوم یہی ہے۔ اس لئے ان سے کہا گیا :-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنۢ تَبْغُوا نَهَايَ عَوَجًا ۖ وَ أَنْتُمْ شُهَدَاءُ ۖ وَمَا اللَّهُ بِعَاقِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۹۸)

ان سے کہو کہ تم، اس نظام میں داخل ہونا نہیں چاہتے تو نہ ہو، لیکن جو شخص اس کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے،

اسے اس کی طرف آنے سے یوں روکتے ہو؟ نیز تم یہ بھی چاہتے ہو کہ، خدا کی

طرف سے جانے والی، اس سیدھی راہ میں الجھاؤ پیدا کر دنا کہ لوگ، اس کے پیچھے

میں کھو کر رہ جائیں اور منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکیں، حالانکہ تم حقیقتِ حال سے اچھی طرح باخبر ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی تم

کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

یہاں پر ایک ثانیہ کے لئے رکٹے اور دو باتوں پر غور کیجئے۔ ایک یہ کہ عربی زبان میں محض زیر اور زیر کے فرق سے معانی میں کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں کس قدر گہری حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے: تَبْغُوا نَهَايَ عَوَجًا یعنی یہ لوگ، اسلام میں عَوَجًا پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ مادہ (ع۔و۔ج) کے معنی ہوتے ہیں ٹیڑھ پن۔ کجی۔ پیچیدگی۔ اس مادہ سے لفظ عَوَجًا (ع کے زیر کے ساتھ) کے معنی ہوتے ہیں ایسا ٹیڑھا پن جو آنکھ سے صاف نظر آجائے۔ اور عَوَجًا (ع کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن

دین میں غیر محسوس ٹیڑھ پن | کو کہتے ہیں جو محسوس طور پر نظر نہ آئے بلکہ جسے عقل و بصیرت سے پہچانا جاسکے۔ اس آیت میں عَوَجًا آیا ہے۔ یعنی ایسا ٹیڑھ پن جو محسوس طور پر دیکھا نہ جاسکے بلکہ عقل و بصیرت کی رُو سے پہچانا جاسکے۔

دین کو مذہب میں بدلنے کی سازش کرنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے کہ وہ دین کو اس طرح بدل دیں کہ صاف نظر آجائے کہ یہ کوئی نیا دین ہے۔ وہ دین کے شعائر و ارکان کی شکل و صورت تو ایسی ہی رہنے دیتے ہیں لیکن اس کی غرض و غایت کو بدل دیتے ہیں۔ یہ ایسا ٹیڑھ پن ہے جو محسوس طور پر نظر نہیں آسکتا۔ علم و بصیرت کی رُو سے گہرائی میں جا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ یہودیت اور عیسائیت کو چھوڑیے اور خود اپنے ہاں غور کیجئے کہ دین اسلام کو مذہب میں بدلنے کی سازش کرنے والوں نے اس کے ظواہر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے مقصد اور غایت کو بدل کر رکھ دیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :

نماز و روز و قمر بانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے
یہ الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور
یعنی رہ گئی رسم اذان روحِ بلالی نہ رہی

(مثال کے طور پر) نماز میں ”منظر قبلے شریف کے“ بنیادی شرط ہے تعمیرِ مساجد کے وقت قبلہ کے تعین کے لئے اس قدر کوششیں کی جاتی ہیں کہ اس کی سمت میں بال برابر بھی فرق نہ رہے۔ اگر کسی نمازی کا رخ جانبِ قبلہ سے ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو دھائی میادی جاتی ہے کہ ”تیری نماز نہیں ہوئی“ اس پر تو اس قدر زور دیا جاتا ہے لیکن قبلہ کے مقصد اور اس کی جانب رخ کرنے کی غایت یکسر فراموش ہو چکی ہے۔ قبلہ امت کا مرکز محسوس تھا اور اس کی جانب رخ کرنے کا مقصد امت کی وحدت قائم رکھنے کے لئے یک نگیں۔ اب صورت یہ ہے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر فرقہ کی مسجد قبلہ کا مقصد | الگ الگ ہے۔ ایک فرقہ کا مقلد دوسرے فرقے والوں کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھتا لیکن ان تمام (الگ الگ) مساجد کے رخ کو جانبِ قبلہ رکھنے کے لئے انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں اور ہر مسجد کے نمازی کے قبلہ رُو ہونے کو نماز کی بنیادی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ معنوی طور پر دیکھئے تو ہر فرقہ کا ”قبلہ“ (مرکزِ توجہ) الگ الگ ہوتا ہے لیکن محسوس طور پر سب کا قبلہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ ہے عَوَجًا اور عَوَجًا کا فرق۔ اگر ہر فرقہ (یا کوئی فرقہ) اپنا قبلہ محسوس طور پر الگ بنالیتا تو اسے دائرۃ اسلام سے خارج کر دیا جاتا۔ دین کو مذہب میں تبدیل کرنے والوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے عَوَجًا نہیں بلکہ عَوَجًا کی ٹیکنیک اختیار کی۔ قبلہ کی محسوس شکل وہی رہنے دی۔ اس کی غایت بدل دی۔ محسوس نگاہوں سے

دیکھئے تو تمام مسلمانوں (ساری امت) کا قبلہ ایک ہے چٹم بصیرت سے غور کیجئے تو امت کے بیسیوں قبلہ الگ الگ ہیں۔
غور فرمایا آپ نے کہ دین کو مذہب سے بدل دینے کی یہ ترکیب کس قدر نگاہِ قریب اور دامِ مہرنگ زمین کے مراد ہے۔
اس کے بعد آپ سوچئے کہ قرآنِ کریم نے عَوَجَّا کے بجائے عَوَجَّا کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے! لادیب! یہ خدا کا کلام ہے!



بہر حال، قرآنِ کریم یہ کہہ رہا تھا کہ اہل کتاب کی کوششیں یہ ہیں کہ اس دینِ خداوندی کی طرف آنے والوں کے راستے میں کاٹیں پیدا کر دیں اور اگر وہ اس کے باوجود اس دین کو اختیار کر لیں تو اس میں ایسا ٹیڑھ پن پیدا کر دیا جائے کہ وہ محسوس طور پر تو نظر نہ آئے لیکن اس کا مقصد اور غایت یکسر بدل جائے۔ قرآنِ کریم نے اُدھر اہل کتاب کے متعلق تو یہ کہا اور اُدھر جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمُ
بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ۝ (۹۹)

جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لا چکے، اور اسے، اپنی زندگی کا نصب العین بنا چکے ہیں، انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر وہ ان اہل کتاب کے کسی ایک گروہ کی باتوں میں بھی آکر ان کے پیچھے لگ گئے، تو وہ انہیں، ان کے ایمان کے بعد، پھر حالتِ کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

انہیں صرف تنبیہ ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی وجہ بھی بتائی — اور یہ قرآنِ کریم کا مخصوص انداز ہے کہ وہ جہاں ایک حکم دیتا ہے وہاں اس حکم کی علت غائی، وجہ اور سبب بھی بتا دیتا ہے اسے کتاب و حکمت کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قانون اور اس کی علت اور مصلحت (ITS RATIONALE) جماعتِ مومنین کو جو تنبیہ اوپر کی گئی ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے ۵۶ اور اس کی تشریح) دین کی صداقت کے ثبوت کے لئے دو بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے — دین کا ضابطہ اور اس کے مطابق قائم کردہ نظامِ معاشرہ جس کے حیات بخش نتائج دین کے دعاوی کے ثبوت بنتے ہیں۔ کہا کہ جب یہ دونوں چیزیں تمہارے سامنے موجود ہیں تو دین سے انحراف اور ارتداد کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمُ آيَاتُ اللَّهِ وَرَفِيقُكُمْ سَاسُوهُ، وَمَنْ
يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۱۰۰)

اے جماعتِ مومنین! تم حالتِ کفر کی طرف کس طرح لوٹ سکتے ہو؟ اس لئے کہ ایمان کے راستے پر قائم رہنے کے لئے، دو بنیادی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ قوانینِ خداوندی (اپنی اصلی شکل میں) انسان کے سامنے ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ، اُن قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے، ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے ہاں موجود ہیں —

خدا کی کتاب اور اس کا رسول !

یاد رکھو؛ جس نے اس کتاب اور نظامِ خداوندی کے مرکز کو، حکمِ طور پر بختم کیا، اور اسے اپنی حفاظت کا ذریعہ بنالیا، تو اسے یقیناً، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف رہنمائی مل گئی۔ (جب تک تم میں قرآن اور قرآن پر چلنے والا نظام باقی رہے گا، تم گمراہ نہیں ہو گے)۔

اس آیت میں ”وَفِيكُمْ رَسُولُهُ“ کے الفاظ وضاحت طلب ہیں۔ سطحی طور پر یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ہے کہ جب تک تم میں رسول موجود ہے، تم ہدایت پر رہو گے۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب تم میں رسول نہیں رہے گا تو پھر تم ہدایت سے بھر جاؤ گے۔ یہ منطقی نتیجہ، نظری یا امکانی ہی نہیں بلکہ اس نے عملی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی۔ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد صرف پانچ حضرات مومن رہ گئے تھے۔ باقی سب (معاذ اللہ) اسلام سے پھر گئے تھے۔ اس عقیدہ کے اثرات نے سنیوں کی کتابوں تک میں بادپالیا۔ چنانچہ ان کی حدیث کی معتبر ترین کتاب بخاری (جسے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے) کی وہ روایت پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت میں ملائکہ ایک گروہ کو روزِخ کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔ رسول اللہ انہیں دیکھ کر فرمائیں گے کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا کہ جب تک آپ ان میں موجود تھے، یہ اسلام پر رہے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ اس سے منحرف ہو گئے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک وضعی روایت سے، ایک تیسرے کتنے شکار مار لئے گئے۔ صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) مرتد ثابت کر دیا گیا۔ رسول اللہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق یہ خیال اجاگر کر دیا کہ اس کا اثر عارضی سا ہوتا تھا۔ دیر پا نہیں تھا۔ اسلام کے متعلق یہ تاثر پیدا کر دیا کہ وہ زندہ شخصیتوں کے سہارے ہی اپنے نتائج پیدا کر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر زمانے میں ایک زندہ شخصیت موجود رہے۔

یہ نظریات، قرآن کریم میں پیش کردہ اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہیں۔ اگر اسلام اپنے نتائج پیدا کرنے کے لئے شخصیتوں کا محتاج ہوتا تو نبوت کو کیوں ختم کیا جاتا۔ جس طرح اس سے پہلے انبیاء کرام شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رکھا جاتا۔ ختم نبوت اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ (مشیتِ خداوندی کی رُو سے) شخصیتوں کا دور ختم کر دیا گیا ہے۔ اسلام ایسا نظام ہے جو

قرآن کریم میں عطا فرمودہ اقدار و اصول کے مطابق قائم کیا جاتا ہے اور یہ نظام اپنے اندر اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ یہ اپنے حیات اور نتائج پیدا کرنا چلا جائے: اُكْلُهَا دَآئِمًا وَظِلُّهَا (۱۳) "اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کی آسائشیں پائیدار۔ تُوْتِيْ اُكْلَهَا كُلَّ حَبِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴) "وہ قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے پھل ہر موسم (زمانے) میں دیتا جائے گا۔" قرآن کریم کو اسی مقصد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ لہذا، جو قوم بھی (اور جب بھی) اس کے مطابق اپنا نظام قائم کرے گی وہ اس کے زندگی بخش نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا کہ اسلام نبی اکرمؐ کی ذات سے وابستہ نہیں نہ حضورؐ کی زندگی تک محدود۔ یہ آپؐ کے بعد بھی زندہ ہوگا۔ اسی سورہ (آل عمران) میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہے:-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُۙ اَفَاَمِنَ مَّا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِۦ ۚ اَلْقَلْبُۤیْمُ عَلٰی اَعْقَابِكُمْۙ وَمَنْ یُّثْقَلْ عَلٰی عَقْبِیْهِۦ فَلَنْ یُّصْرَّۤ اِلَیْهِۦ شَیْْءًا ۚ وَیَسْجُزِیْ اللّٰهُ الشُّكْرِیْنَ ۝ (۲۳)

(تم) اسلام کو شخصیتوں کے ساتھ دالبتہ وسمہت چھوٹی موٹی شخصیتیں تو ایک طرف اس باب میں تو محمدؐ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح کے بہت سے پیغام رساں (رسولؐ) آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہذا، اگر یہ پیغام رساں بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد تم اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو شخص ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدر شناس کرے گا، تو اسے اس کی کوششوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

لہذا، وَفِیْكُمْ رَسُوْلٌۙ (۱۳) سے مراد یہ نہیں کہ جب تک رسولؐ زندہ موجود رہے گا، تم صراطِ مستقیم پر رہو گے۔ اس کے لئے اعتصام بکتاب اللہ کی شرط ہے: وَمَنْ یُّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ۔ (۱۳) اور اعتصام بکتاب اللہ، قرآنی نظام کی رو سے ہوگا۔ رسولؐ کے بعد یہ فریضہ اُس کی امت کو ادا کرنا ہوگا۔ اسوٰل اللہ کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا (۱۴) یہی فریضہ اب اُمت سرانجام دے گی (۱۵) اس کے لئے تمکن فی الارض (یعنی نظامِ مملکت) ضروری ہوگا (۱۶) یوں پھر اسلام حضورؐ کے بعد بھی زندہ و تابندہ رہے گا۔ "رسول" کا یہ قرآنی مفہوم سمجھ لینے سے وہ بے شمار گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں جن میں امت صدیوں سے الجھے چلی آرہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پانے کا نام نبوت ہے، اور اس وحی کو آگے پہنچانے اور اس کے مطابق دین کے نظام

کو قائم کرنے کا نام ”رسالت“۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ پر نبوت کو ختم کر دیا۔ (حضور کو خاتم النبیین کہا گیا۔ ۲۳) لیکن رسالت (یعنی نظامِ خداوندی کو قائم رکھنے) کے سلسلہ کو حضور کی ذاتِ اسلامی نظام کے اصول و اساسات تک محدود نہیں رکھا۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا تھا۔

۲۔ رسول اللہ کی وفات پر جب امت میں کُہرام مچ گیا تو خلیفۃ الرسول ابو بکر صدیقؓ نے برسرِ منبر اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو اپنا ”الہ“ سمجھتا تھا وہ سمجھ لے کہ اس کا الہ فوت ہو گیا ہے، لیکن جو خدا کو اپنا ”الہ“ سمجھتا ہے اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا ”الہ“ جی و قیوم (زندہ و پائندہ) ہے۔ اس لئے رسول اللہ کی وفات سے دین میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوگی۔ یہ فرمایا اور اس کے بعد سورہ آل عمران کی وہ آیت (۳۱) تلاوت فرمائی جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے، اس سے امت کو اطمینان ہو گیا کہ اسلام اس نظام کو قائم رکھنے کا نام ہے جسے رسول اللہؐ نے وحی کی روشنی میں قائم فرمایا تھا۔ اب اس دین کو رسول اللہ کے جانشین (خلفاء) قائم رکھیں گے۔ اسی جہت سے اس نظام کو خلافتِ علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے اور حضور کے بعد اس نظام کو قائم رکھنے والوں کو خلفاء راشدین کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔

۳۔ رسالت کے اس مفہوم کو سامنے رکھیے تو ”اللہ اور رسول کی اطاعت“ کا عملی مفہوم، اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہو گا جسے وحیِ خداوندی کی روشنی میں پہلے حضورؐ نے قائم فرمایا اور جسے حضور کے بعد آپ کے خلفاء (جانشین) (SUCCESSORS) قائم رکھیں گے۔

۴۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، نہ تو ”رسالت“ کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی وقت پیش آئی، اور نہ ہی اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے ارشادِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ رہا اور خلافتِ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو ”رسالت“ کا صحیح مفہوم ذہنوں سے اوجھل ہو گیا اور اس قسم کے سوالات ابھرنے شروع ہو گئے کہ ”اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول“ کی تعمیل کس طرح کی جائے؟ کہا یہ گیا کہ اطیعوا اللہ کی تعمیل تو قرآن مجید کی اطاعت سے ہو جائے گی، لیکن رسول اب ہم میں موجود نہیں۔ ان کی اطاعت کی کیا صورت ہوگی؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسول اللہ کی اطاعت آپ کی احادیث کی رو سے کی جائے، اس سے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ واضح رہے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں رسول اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُس وقت ”اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول“ کا قرآنی مفہوم ان کے سامنے تھا۔ یعنی نظامِ خداوندی قائم تھا جس میں اس نظام کی اطاعتِ خدا و رسول کے قائم مقام تھی۔ یعنی قرآنِ کریم کی اطاعت نظامِ اسلامی کی رو سے۔

۵۔ احادیث کا یہ عالم کہ ان کے مختلف مجموعوں میں تو ایک طرف، کسی ایک مجموعہ میں بھی بکثرت احادیث ایک دوسرے

سے مختلف اور متضاد ہیں۔ اس سے امت میں فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

۶۔ اب ہمارے ہاں ”اسلامی نظام“ کے قیام کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان میں خدا اور رسول کا مفہوم ”قرآن اور احادیث“ لیا جاتا ہے۔ یعنی **فَیْکُمْ دَسُوْلُهُ** سے مراد ”فَیْکُمْ احادیث رسول اللہ“ لیا جاتا ہے۔ اس سے جس قدر اختلافات پیدا ہو رہے ہیں، ظاہر ہے۔ ایسے اختلافات جن کی روشنی میں یہ حضرات اس اعلان پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ جب حقیقت یہ ہو تو سوچئے کہ اس سے اسلامی نظام قائم کیسے ہو سکتا ہے؟

۷۔ یاد رکھئے، جب تک ”فَیْکُمْ دَسُوْلُهُ“ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں لایا جائے گا، نہ مسلمانوں کے اختلافات مٹ جائیں گے، نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکے گی۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اس کتاب عظیم کی بنیادوں پر نظام مملکت قائم کر دیا جائے تو دین کی وہی شکل پھر سے سامنے آجائے گی جو عہد رسالت مآبؐ اور دور خلافت راشدہ میں تھی۔ دین کی یہی وہ اصل بنیاد ہے جسے اگلی آیات میں بیان کیا گیا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۱۰۱)

۱۰۱۔ لہذا، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اس ضابطہ خداوندی کی نگہداشت کرو، جیسا کہ نگہداشت کرنے کا حق

ہے۔ اور یہ نگہداشت، محض مہنگامی اور وقتی طور پر نہ کرو، بلکہ اپنی ساری زندگی اسی ہیچ پر گزار دو۔ اور جب تمہیں موت

آئے تو وہ بھی اس عالم میں کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے جھکے ہوئے ہو۔

اس طرح اس نظام کے قیام و دوام کا سلسلہ، نسلاً بعد نسل، آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے لئے دو شرط لازم ہیں۔

(۱) اعتصام بحبل اللہ۔ کتاب اللہ کے ساتھ وابستگی یعنی جملہ امور حیات کے فیصلے اس کے مطابق۔ اگر ایسا نہ کیا گیا

تو یہ اسلام نہیں، کفر ہو گا۔ اور اگر اس کے ساتھ، انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو بھی یہی حیثیت دے دی گئی تو یہ شرک ہو گا۔

(۲) امت واحدہ بن کر رہنا۔ اگر امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی تو یہ توحید نہیں، شرک ہو گا جیسا کہ (۳۱-۳۲) میں

واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے۔

مزید سنایا :-

وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ

وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ه (۳)

یاد رکھو! دین نہ انفرادی مسلک کا نام ہے، نہ گروہ بندیوں کے طریقے کا۔ لہذا، تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، سب کے سب بلا استثناء، اجتماعی طور پر، کتاب اللہ کے ساتھ، محکم طور پر، وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت
آنے دو کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۲-۳۱) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (۶۵/۶۷)۔

دین کا اصل الاصول

ایسا کرنے والوں کے ساتھ رسول اکرمؐ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، (۱۶۰/۱۶۱)۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو، جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے، فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا نظام زندگی عطا کیا جس سے (تم میں صرف ظاہر اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح، ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر، ایک برادری بن جانا، کتنا بڑا انعام خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے، ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے، کہ اس (نظام خداوندی) نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا، (۲۹/۳۰)۔ اللہ اس طرح اپنے قوانین و ضوابط اور ان کے نتائج و ثمرات، واضح طور پر بیان کرتا ہے، تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔ اس کے بعد آیت (۳۰/۳۱) میں بتایا گیا ہے کہ امت کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ه (۳۱)

اس نظام کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ تم ایسی جماعت بن کر رہو (۲۹/۳۰) جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ تمام نوع انسان کو قرآن کی طرف دعوت دے (۲۸/۲۹)۔ ان امور کو عملاً نافذ کرے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرے اور ان سے روکے جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ [یہی فریضہ اس وقت یہ رسول ادا کر رہا ہے اور ایسا ہی تمہیں بھی کرنا ہوگا (۲۹/۳۰)۔] اس کے لئے تمکن فی الارض — اپنی آزاد مملکت کا وجود — ناگزیر ہے (۲۲/۲۱)۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں اور جو نہایت کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں (۲۳)۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ
جیسا کہ ذرا آگے چل کر (آیت ۳۴) میں وضاحت کر دی گئی ہے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری امت

مسلمہ کا فریضہ ہے، نہ کہ امت میں سے کسی مخصوص گروہ کا۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان کی تیسری جلد ص ۹۲ زیر آیت (۱۳۳/۲) تشریح کی جا چکی ہے، وہاں دیکھ لیجئے۔ لیکن ایک نکتہ کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ میں نے اُس مقام پر کہا ہے کہ ”لغوی تفصیل میں اُلجھے بغیر انا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس آیت میں ”مِنْ“ کا حرف تبعیض کے لئے نہیں آیا، تبئین کے لئے آیا ہے۔“ اس پر قارئین کی طرف سے جو استفسارات موصول ہوئے ہیں ان کے پیش نظر مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس نکتہ کی عام فہم الفاظ میں وضاحت کر دی جائے۔ آیہ زیر نظر (۱۳۳/۲) میں کہا گیا ہے، ذَلَّتْکُمْ مِّنْکُمْ اُمَّةٌ.....

منکم کا مفہوم

اور مِّنْکُمْ کے معنی کئے جاتے ہیں ”تم میں سے“ عربی زبان میں حرف ”مِنْ“ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں ”تم میں سے کچھ“۔ اسے تبعیض کہتے ہیں۔ یعنی سب کے سب نہیں بلکہ تم میں سے بعض یا کچھ۔ دوسرے ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ ”تم سب کے سب“۔ یعنی اس امر کی وضاحت کے لئے کہ یہ فریضہ تم سب کا ہے۔ اسے تبئین کہتے ہیں۔ عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرف ”مِنْ“ کو تبعیض کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہئے جہاں اس کی جگہ لفظ ”بعض“ بلا تکلف رکھا جاسکے۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنی تبئین کے لئے جائیں۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے التالقان - سیوطی)۔

حسب ذیل دو آیات اس فرق کو واضح کر دیں گی۔ سورہ التغابن میں ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّ مِّنْکُمْ مُّؤْمِنٌ (۲۴۱)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن۔ ظاہر ہے کہ یہاں ”مِنْ“ کے معنی تبعیض ہی کے لئے جاسکتے ہیں۔ دوسری طرف سورہ فاطر میں ہے: قَالَ الَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْکَ مِّنَ الْکِتَابِ هُوَ الْحَقُّ (۲۴۱)۔ اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے۔ اگر یہاں ”مِنْ“ کے معنی ”بعض“ کئے جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ پر کتاب کا صرف کچھ (بعض) حصہ نازل کیا۔ پوری کتاب نازل نہیں کی۔ ان معانی کی رو سے اسلام کی اصل و اساس پر پانی پھر جاتا ہے۔ لہذا، اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف پوری کی پوری (سب کی سب) کتاب نازل کی۔ اور یہی کتاب حق پر مبنی ہے۔ لہذا، یہاں پر ”مِنْ“ کے معنی تبئین کے لئے جائیں گے، تبعیض کے نہیں۔

”مِنْ“ کے یہی معنی آیت (۱۳۳/۲) میں لئے جائیں گے۔ یعنی یہ کہ تم (پوری کی پوری امت) وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے گی۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد سوم ص ۹۳-۹۴ پر بتایا گیا ہے، قرآن کی رو سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ساری کی ساری امت کا ہے، نہ کہ امت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ ہماری مذہبی پیشواہیت نے محض اپنے الگ مخصوص گروہ کے جواز کے لئے ”مِّنْکُمْ“ کا ترجمہ ”تم میں سے ایک گروہ“ کر کے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم

کو مسخ کر دیا۔ اس کے بعد آیات (۱۰۶-۱۰۳) میں اُمت میں تفرقہ کو باعثِ عذابِ عظیم کہا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کیا جا چکا ہے تفرقہ اور فرقہ بندی کے متعلق مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (انڈکس سے حوالے دیکھ لیجئے)۔ اس لئے یہاں ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ صرف آیت اور ان کے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۚ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَدُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ (۱۰۶-۱۰۳)

یاد رکھو! ہم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح قوانینِ خداوندی آجانے کے بعد، فرقوں میں بٹ گئے (۱۰۶-۱۰۳) اور باہمِ دگر اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ اس لئے اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے اس سے قومیں ذلیل و خوار و تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

یہ دونوں گروہ ہمارے سامنے ہیں — ایک وہ جو نظامِ خداوندی کے رشتے میں مسلک ہو کر، اُمتِ واحدہ کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ دوسرے وہ جو فرقوں میں بٹ کر کفر و شرک کے مسلک پر چل نکلیں — پہلا گروہ وہ ہے جن کے چہرے کامیابیوں اور کامرانیوں سے چمک رہے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ذلت اور رسوائیوں کی وجہ سے رُوسیاہ ہے۔ یہ رُوسیاہ وہ ہیں جو ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی حالت کی طرف لوٹ گئے۔ یعنی فرقوں میں بٹ گئے۔ اُن کا اس کافرانہ مسلک کی وجہ سے اُن پر ذلت اور تباہی کا عبرت انگیز عذاب چھا گیا۔ جن کے چہرے روشن ہیں وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں ہیں (۱۱۹-۱۱۸) جب تک یہ وحدت اور اخوت کی زندگی بسر کریں گے، خدا کی رحمتوں کے بادل ان پر سایہ فگن رہیں گے۔

ان نصیحتات کے بعد فرمایا :-

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِيلُهَا عَلَيْكَ يَا حَقِيقٌ ۖ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ۚ (۱۰۷)

یہ ہیں قوموں کی موت و حیات کے متعلق وہ قوانین و ضوابط جنہیں خدا، ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو بڑا ظلم ہوتا کہ جن اصولوں کے تابع چلنے سے انسانی زندگی نے کامیاب ہونا تھا، وہ اصول ان کو نہ بتائے جاتے۔

اس کے بعد کہا :-

ذَلِيلُهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۱۰۸)

خدا نے یہ انداز کچھ تمہارے ہی لئے اختیار نہیں کیا۔ خارجی کائنات میں بھی اسی قسم کے قوانین و ضوابط کا فرما

ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔

اور ہر تہذیب کا قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ کائنات کی ہر سکیم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

خارجی کائنات میں کس طرح قوانین خداوندی کا فرما ہیں، اس کے لئے اندکس میں کائنات اور قوانین کے عنوانات دیکھئے۔

نیز اسی جلد میں آیت (۱۰۹) کی تشریح۔ باقی رہی انسانی دنیا، سو اس میں یہ قوانین اس امت کی وساطت سے کار فرما ہوں گے

جسے وارث کتاب بنا لیا گیا ہے (۱۰۹)۔ انہیں مخاطب کر کے کہا گیا :-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ كُنَّا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَكُنَّا خَيْرًا لَهُمْ

مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ أَكْثَرُهُمْ الْفَاسِقُونَ ۝ (۱۰۹)

فرق یہ ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود کار فرما ہیں، اور ان فی دنیا میں انہیں نافذ کرنے کے لئے،

انسانوں کی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم نے، اے جماعتِ مؤمنین، تمہیں اٹھا کھڑا

کیا ہے تاکہ تم ایسا نظام قائم کرو جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رسا ہو۔ اس کے لئے ضروری

ہے کہ تم ان باتوں کا حکم دو جسے قرآن بھیج تسلیم کرتا ہے، اور ان سے روکو جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ

ہیں۔ لیکن تم دوسروں سے یہ کچھ اسی صورت میں کہہ سکتے ہو جب تم خود ان قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو۔

اگر یہ اہل کتاب بھی، اس نظام کی صداقت پر ایمان لاکر، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، تو یہ ان کے لئے

بہتر ہوگا۔ یہ بھی اس خیرِ امت، کا جزو بن جائیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو اس پر ایمان لائے

ہیں، لیکن اکثریت ان کی ہے جو غلط راستوں پر چل رہے ہیں۔ (اور اس نظام کی سخت مخالفت کرتے ہیں)۔

ہم نے آیت (۱۰۹) کی تشریح کرتے ہوئے جو کہا تھا کہ اس سے سراو ساری کی ساری امت ہے، ذکرِ امت کا کوئی خاص گروہ

تو اس کی تائید زیرِ نظر آیت سے ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ فریضہ پوری کی پوری امت کا بتایا گیا ہے۔ سورہ توبہ کی آیت (۱۱۱)

میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کر دی :-

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ وَسَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۱۰)

(دوسرا گروہ) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ہے۔ یہ سب نصب العین کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ لُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطہ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے رد کرتے ہیں جنہیں وہ (ضابطہ خداوندی) ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظام صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسول (نظام خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامان نشوونما سے فیض یاب ہوں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا قانون کس طرح قوت و حکمت پر مبنی ہے۔

(صمناً) اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف مومن مردوں کا فریضہ نہیں اس میں مومن عورتیں بھی برابر کی شامل ہیں۔ اس سے اس اہم سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے **عورتیں امور مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں** کہ اسلام میں عورتیں امور مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ (۳۱) اور جب (آیت ۱۱ کی رو سے) عورتیں بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں شامل ہیں تو وہ بھی امور مملکت میں حصہ لے سکتی ہیں۔ (نیز دیکھیے ۱۱۳)

آیت (۱۱) میں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ (بالخصوص یہود سے مراد ہے) اس کتاب پر ایمان لے آئیں تو اس سے اپنی کا فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ ایسا نہ کریں اور اپنی مخالفت سے باز نہ آئیں، حتیٰ کہ نوبت جنگ تک کی بھی آجائے، تو اس سے اپنی کا نقصان ہوگا۔

لَنْ يَنْصُرَكُمْ إِلَّا أَذَىٰ ۚ وَإِنْ يَغَاتِكُمْ يُؤْتِكُمْ آلَٰذِبًا ۖ تُمْ لَا يَنْصُرُونَ ۝ (۱۲)

لیکن یہ لوگ، اس مخالفت سے تمہیں، بجز ذرا سی تکلیف اور پریشانی کے، اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

اگر یہ میدان جنگ میں تمہارے متر مقابل آئیں گے تو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، اور ان کا کوئی یار و مددگار اور پشت

پناہ نہیں ہوگا۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں داستان بنی اسرائیل بڑی شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے جرائم پیہم کی پاداش میں ذلت و سستی کے الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (مطالب الفرقان جلد دوم ص ۲۹۵ زیر آیت ۱۲)۔

وہی الفاظ یہاں دھڑے گئے ہیں۔ جب کہا :-

صَبَرْتُمْ عَلَيْهِمُ الدَّلَّةُ أَيُّنَ مَا تَقْفُوا إِلَّا يَحْبِلُ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٌ مِّنَ
النَّاسِ وَبَاءَ وَبَغَضِبٍ مِّنَ اللَّهِ وَصَبَرْتُمْ عَلَيْهِمُ الْمُسْكَنَةُ ذَلِكِ بَأْسُهُمْ
كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكِ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا
يَعْتَدُونَ ۝ (۱۱۳)

تم دیکھتے نہیں کہ یہ کس قدر ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ دنیا میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں آسمانی کتاب کے حامل سمجھ کر پناہ دی۔ یا کسی قوم سے انہوں نے عہد و پیمان کر لیا اور اس کی وجہ سے انہوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ ورنہ، ان کی عام حالت یہی ہے کہ، خدا کا عذاب ان کے پیچھے لگا ہوا ہے اور یہ سخت محتاجی اور بد حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ، انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی۔ اس حد تک سرکشی کہ بیویوں تک کو ناحق قتل کر دیا۔ (۱۱۲)

سوچو کہ جو قوم، اس درجہ سرکش اور بے باک ہو جائے، وہ دنیا میں ذلیل و خوار نہیں ہوگی، تو اور کیا ہوگا؟ ہمارے ہاں اکثر یہ مسئلہ زیر بحث رہتا ہے کہ کیا (قرآن کی رو سے) یہودیوں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے؟ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۶۸ زیر آیت ۲۴ تشریح کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہودیوں میں کوئی بھی ایسے نہیں رہے جو صحیح راستہ اختیار کر کے اس عذاب سے بچ جائیں۔ (دیکھئے ۱۱۲)۔ ذیل کی آیات میں انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

لَيَسُوْا سَوَآءٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ اَنۡعَا
الَّذِيْنَ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ
بِالْعَمَلِ الصَّالِحِ وَبِالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ ۝ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصَّٰلِحِيْنَ
وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوْكَ ۝ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (۱۱۳-۱۱۲)

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ان کی ساری نسل میں صبیح و شام کی طرف آنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ ان میں ہنوز صلاحیت موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ، ان میں سے جو لوگ اسلام لے آئے ہیں (۱۱۲) ان میں مومنانہ صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ حق پر قائم رہتے ہیں۔ انوں کو اٹھ کر قوانین خداوندی کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ان کی پوری

پوری اطاعت کرتے ہیں۔

یہ بنی ان میں سے وہ لوگ جو صحیح معنوں میں اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن باتوں سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ صالحین (مومنین) کے زمرے میں شامل ہو چکے ہیں۔

خدا کا قانونِ مکافات، ان کے خُسنِ عمل کو اس لئے نہیں ٹھکرا دے گا کہ یہ بنی اسرائیل کے گھروں میں پیدا ہو گئے تھے۔ اسلام کا دروازہ ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ اس لئے جو اس کے دائرے میں آجائے، اُسے اُس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے، اس میں شرف و سعادت کا معیار صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کون کرتا ہے، اور کس حد تک کرتا ہے (۱۱۵)۔

اگرچہ ان آیات کے مفہوم سے مطلب واضح ہو جاتا ہے، لیکن اتنا دُھرا ضروری ہے کہ یہ خیال کر بیہودی یا نصاریٰ بے شک اپنے مذہب پر رہیں قرآنِ کریم اُن کے ایمان اور اعمال کو اسلام کے مطابق سمجھتا ہے، صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم اہل کتاب کے لئے بھی اسی طرح قرآنِ کریم (رسالۃ محمدیہ) پر ایمان لانے کو ضروری سمجھتا ہے جس طرح غیر اہل کتاب کے لئے۔ تفصیل مطالبہ فرماتا کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (ایڈکس میں عنوان کتاب اہل کتاب) ملاحظہ کیجئے۔ خود اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر، ان کے قرآنِ کریم (مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ...) پر ایمان لانے کا ذکر کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان تصریحات کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ یہودیوں کے ہاں دینِ قومی تھا۔ یعنی کسی غیر اسرائیلی کے لئے دین کے دروازے کھلے ہی نہیں تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ (اور تو اور خود) یہودی بھی قرآن پر ایمان لا کر انہی انعاماتِ خداوندی کے مستحق ہو سکتے ہیں جن کے مستحق باقی اہل اسلام ہیں۔ یہ تو تھے وہ اہل کتاب جو قرآنِ مجید پر ایمان لا کر اُمتِ مسلمہ کے دائرے کے اندر آ گئے۔

ان کے برعکس :-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِمَّا
 اللَّهُ شَاقِبُ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ مَثَلُ مَا
 يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ سَرِجٍ فِيهِمَا صِوْرٌ ۖ أَصَابَتْ حَرًّا قَدْ ضَلُّوا
 أَنْفُسَهُمْ ۖ فَأَهْلِكَتْهُ ۖ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ ۖ وَلَٰكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ (۱۱۵-۱۱۴)

جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کر کے دوسری روش اختیار کرتے ہیں، اُن کے پیش نظر صرف ذاتی مفاد کا خیال ہوتا

ہے، لیکن ان کی یہ مفاد پرستی — خواہ کثرتِ اولاد کی صورت میں ہو یا مال و دولت کی شکل میں — نظامِ خداوندی کے مقابلے میں ان کے کسی کام آنے سکے گی۔ ان کی غلط دشمنی، انہیں اس طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی کہ وہ پھر اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔

ان کے پیش نظر صرف طبعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک چا پہنچے جنہوں نے، قوانینِ خداوندی کے مطابق، اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا۔ تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

یاد رکھو: ان کی یہ تباہی، خدا کی طرف سے زیادتی نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کو غصب کر کے، خود اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔

آیت (۱۶) میں بتایا گیا ہے کہ ان اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا ذلتی کردار اچھا ہے۔ اس سلسلہ میں پرائیویٹ اخلاق اور پبلک اخلاق کی تفریق کے متعلق بھی تشریح کی گئی ہے، اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے مفاد کے لئے تو بڑا اہتمام کریں گے لیکن اپنی قوم سے باہر کے انسانوں میں ہر طرح کا سلب و نہب جائز رکھیں گے۔ یہودیوں کی تاریخ اس شہویت کی زندہ مثال ہے۔ اور اسرائیلی مملکت اس کی موجودہ شہادت۔ اس مملکت کے قیام اور استحکام کے لئے دنیا بھر کے یہودی بے پایاں دولت خرچ کر رہے ہیں لیکن اس کا مقصد کیا ہے؟ سب سے پہلے فلسطین کے مسلمانوں کی آزادی چھیننا اور انہیں ان کے گھر بار سے نکال باہر کرنا۔ اس کے بعد ان کے عزائم کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ہے وہ اتفاق جس سے ظلم کا بیج بویا جاتا ہے، اور جس کا آخری نام نتیجہ خود ظالم قوم کی تباہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک اتفاق ”فی سبیل اللہ“ ہے، جس کا مقصد عالمگیر انسانیت کی رلوبیت ہوتا ہے۔ اس کا بویا ہوا بیج شاخِ طیبہ کی طرح بڑھتا اور سدرۃ المنتہی تک پہنچتا ہے۔ (اس اتفاق کے متعلق مطالبہ الفرقان جلد اول ص ۱۵۰ جلد سوم صفحات ۴۱۶، ۴۲۱، ۴۲۲ ملاحظہ فرمائیے۔



اس کے بعد جماعتِ مؤمنین کو ایک بہت بڑے خطرے کی طرف سے متنبہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس انتباہ سے پہلے، ایک تنہیدی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ انہیں ووٹنگ کا حق ہو گا یا نہیں؟ وہ پارلیمنٹ کے ممبر بن سکیں گے یا نہیں؟ انہیں حکومت کے کلیدی مناصب

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت

دیئے جاسکیں گے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اسلامی مملکت کہتے کسے ہیں اور اس کے خواص و لزومات کیا ہیں۔ قرآن کریم کی رُود سے اسلامی مملکت :

۱۔ ایمان اور عمل صالح کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ ظلم و استبداد اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ (۲۴)

۲۔ یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ یہ دین کے ممکن کا ذریعہ ہوتی ہے (۲۵)۔

۳۔ اس کا قریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہوتا ہے (۲۶)۔

۴۔ اس میں تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ (قرآن کریم) کی رُود سے ہوتے ہیں (۲۷)۔

آپ سوچئے کہ جس مملکت کی اساس و بنیاد یہ ہو جس کی غرض و غایت یہ ہو جس کے مقاصد یہ ہوں۔ کیا اس مملکت کے کاروبار میں وہ لوگ شریک کئے جاسکتے ہیں (یا شریک ہو سکتے ہیں) جو اس کی اصل و اساس اور اس کے ان اغراض و مقاصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں؟ ایمان نہ رکھنا تو ایک طرف، جو انہیں صحیح نہ سمجھتے ہوں جو ان کے مخالف ہوں؟ جواب ظاہر ہے کہ انہیں اس مملکت کے کاروبار میں شریک کیا ہی نہیں جاسکتا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مملکت کی آبادی کے ایک حصہ کو کاروبار مملکت سے باہر رکھنا، مغربی جمہوریت کے خلاف ہے، وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت دنیا کی دیگر تمام مملکتوں سے کیسے منفرد اور متمیز ہوتی ہے، اس لئے دنیا کے کسی نظام کو بھی اس مملکت کے لئے معیار قرار دینا بنیادی غلطی ہے۔ اس مملکت کا اپنا منفرد نظام ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر یہ نہ دیکھئے کہ دیگر نظام ہائے مملکت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کا نظام دنیا کے عام نظاموں جیسا ہی ہے تو پھر اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی ترک کر دیجئے۔ ”منکرے بودن دہرنگستان زلستین“ کی روش اسلام میں نہیں چل سکتی۔ اسلام میں تو — یا سراپا نالہ بن جا، یا تو پیدا نہ کر — کا اصول کار فرما ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم کو تمام انسانی حقوق دیئے جائیں۔ لیکن انہیں شریک حکومت نہیں کیا جاسکے گا۔ کوئی حکومت بھی جو کسی آئیڈیالوجی (نظریہ یا عقیدہ) پر مبنی ہو، ان لوگوں کو شریک حکومت نہیں کر سکتی جو اس نظریہ یا عقیدہ کو نہ مانتے ہوں۔

قرآن کریم نے اس باب میں ایک اصولی اور بنیادی بات کہہ دی ہے اور وہ یہ ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُكُمْ بِمَا لَا يَؤْتِيكُمْ خَبْرًا لَّا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تَخْفَى صَدْرُهُمْ أَلْكَرُوا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ

الْآيَةَ إِن كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۲۸)

قرآن کی رُود سے انسانوں کی تقسیم خون۔ رنگ۔ زبان۔ وطن۔ قومیت کے بجائے آئیڈیالوجی (ایمان) کی بنا پر ہوگی۔ جو لوگ دہی کی رُود عطا شدہ مستقل اقدار پر ایمان رکھیں اور نظام خداوندی کے قیام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں، وہ ایک جماعت۔ ان کے برعکس

جو لوگ ان اقدار سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور نظام تجویز کریں وہ دوسری جماعت کے افراد — چونکہ وعدت اور نیکانگت کے

لئے، نصیب العین کا اشتراک بنیادی شرط ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ان دو متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں میں قطبی تعلقات کبھی قائم

نہیں ہو سکتے۔ لہذا، اے جماعتِ مؤمنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا کسی کو اپنا لڑا

نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ

ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان

کی زبان پر بے اختیار آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں بچھا رہتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے

واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم غفل و مہوش سے کام لے کر ان کی طرف سے محتاط رہو۔ ($\frac{3}{4}$: $\frac{9}{22}$: $\frac{59}{22}$: $\frac{6}{7}$)

اب ظاہر ہے کہ جنہیں ”رازدان“ نہیں بنایا جاسکتا، انہیں شریکِ حکومت کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد کہا:۔

هَآنَظُنُّمُ اَوْلَاۤءُ عَجَبُوۡنَهُمْ وَلَا يُجَبُّوۡنَکُمْ وَاَلَا یُحِبُّوۡنَکُمْ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ وَاِذَا الْقُوۡدُکُمۡ قَالُوۡا اٰمَنَّاۤ ؕ وَاِذَا

خَلَقُوۡا عَصُوۡا عَلَیْکُمْ اِلَّا نَاصِلٌ مِّنَ الْقِیۡظِ طُلُۡمٌ مُّوۡنُوۡاۤ اِیۡضًا یَّظُنُّکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلَیۡہِمْ یَذٰلِکَ

دیکھو! ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انہیں اپنا دوست بنالو۔ اگر تم ایسا کر دگے بھی تو وہ تمہیں کبھی اپنا دوست نہیں بنائیں گے حالانکہ تم ان تمام کتابوں پر

ایمان رکھتے ہو جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ان (تمہارے مخالفین) کے انبیاء کی طرف سے نازل

ہوئی تھیں۔ تم یہ کچھ غلو میں قدب سے کرتے ہو۔ لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور

جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو شدتِ عداوت سے تمہارے خلاف غصہ میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ! اپنے غصے میں

مرؤہ! اللہ جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے ہو اور تمہارے سینے میں کیا چھپا ہوا ہے۔ تمہاری نفسیاتی کشمکش اور دورخی زندگی خود تمہارے

لئے سمانِ ہلاکت بن جائے گی۔

صدرِ اول کے اہل کتاب کی اس قسم کی متناقضہ روش کے متعلق آیت (۱۶) میں گفتگو ہو چکی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس ”لات و منات“

نے ایک اور شکل اختیار کر رکھی ہے۔ عیسائی سلطنتیں صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کرتی چلی آرہی ہیں، تاریخ کے اوراق اس

پر شاہد ہیں۔ ان طاقتوں نے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے تک کی مذموم کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کیونکہ ان کے انقلاب

کے بعد انہیں روس کی طرف سے جو خطر محسوس ہوا تو اس کی مدافعت کے لئے انہیں مسلمان

سلطنتوں کی تائید کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس پر انہوں نے نعرہ بلند کیا کہ

دورِ حاضر کے لات و منات

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER

یعنی انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم بھی خدا کے ماننے والے ہو، ہم بھی خدا کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے آؤ! اس دھڑیت پر مبنی نظام (کیونرم) کے مقابلہ کے لئے ہم اور آپ مل کر متحدہ محاذ قائم کریں۔ روس کا مقابلہ کرنے کے لئے تو مسلمانوں کو اس طرح دعوت اتحاد دی، اور مسلمان سلطنتوں کے خلاف اپنی ریشہ دوانیاں بدستور جاری رکھیں۔

روس کی دھڑیت بھویا اقوام مغرب کی خدا پرستی، قرآن کی رو سے دونوں کفر پر مبنی ہیں۔ وہ منکرین خدا اور اہل کتاب سبک اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے، تو ان کا دوست نہ کوئی منکر خدا ہو سکتا ہے نہ (بزم خویش) خدا پرست۔ سب ان کے خلاف دانت پیستے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ

۳
۱۱۹
[ان تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةً تَسُوهُمْ ۖ اِنْ تَصِيبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرُوا بِهَا ۖ وَ اِنْ تَصِيبُوا وَ تَنْتَقُوا
لَا يَصْرُكُمْ كَيْلُ هُمْ شَيْئًا ۖ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَبِما يَعْمَلُونَ مُجِيطٌ ؕ] (۳۰)

ان کے خُجبتِ باطن کا یہ حال ہے کہ، اگر کوئی اچھی بات تمہیں چھو بھی جائے تو انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے، تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن تم ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اگر تم اپنے پروگرام میں ثابت قدم رہے، اور قوانین خداوندی کی پوری پوری نگرہداشت کرتے رہے، تو ان کی تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اللہ کا قانونِ مکافات انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس لئے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوں گے، نہ کہ ان کی خواہشات کے مطابق۔

کفار (غیر مسلموں) کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۵۰۔ زیر آیت (پ)۔ آچکی ہے۔ اس کی تفصیل نیز مندرجہ بالا آیات (۱۱۹-۱۲۰) سے دو قومی نظریہ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ غور کیجئے کہ جب قرآن کریم غیر مسلموں کے خیالات، نظریات اور مسلمانوں کے خلاف ان کے جذباتِ نفرت و عداوت کی اس طرح وضاحت کرتا ہو، اور مسلمانوں سے ناکیداً کہتا ہو کہ اُن پر کبھی اعتماد نہ کرنا، تو کیا وہ اور مسلمان (امت مسلمہ) مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں اندکس میں قوم اور قومیت پرستی کے عنوانات ملاحظہ کیجئے۔

غیر مسلموں کے بعض اور عناد کی پیدہ کشائی کرنے کے بعد قرآن کریم کفر اور اسلام کے تضادات کا ذکر کرتا ہے جو صدرِ اول میں دوما ہوئے تھے۔ ان کی تفصیل آئندہ باب میں سامنے آئے گی۔



۱۵۰ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۵۰۔ زیر آیت (پ)۔

تیسرا باب

چراغِ مصطفویٰ اور شرارِ بوہی کی ستیزہ کاری

(آیات ۱۲۰ تا ۱۹۹)

- ۱ — قریش کی مسلسل مخالفت
- ۲ — نوحۃ الوجدیل
- ۳ — جنگِ اُحد
- ۴ — جنگ کا جذبہ محرکہ - اعلیٰ حکم اللہ -
- ۵ — مشاورت کا نظام
- ۶ — مومن اور منافق چھٹ کر الگ الگ ہو گئے
- ۷ — کاظمین الغیظ
- ۸ — جرم کی سزا کے لئے دو شرائط
- ۹ — مجرم عادی ہو اور قانون کو سمجھ سکے
- ۱۰ — شخصیتوں کے بجائے قانون اور نظام کا دور
- ۱۱ — ہم نے پھر شخصیت پرستی شروع کر دی -
- ۱۲ — کیا موت کا وقت مقرر ہے ؟
- ۱۳ — توکل کسے کہتے ہیں ؟
- ۱۴ — ثواب کا کیا مفہوم ہے ؟
- ۱۵ — شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے -
- ۱۶ — شرک کسے کہتے ہیں ؟
- ۱۷ — بخل سے قوموں کی تباہی
- ۱۸ — کائنات کے نظم و نسق پر غور و تدبر
- ۱۹ — کائنات کا باطل سمجھنا کفر ہے
- ۲۰ — قبولیت دعا، اعمال کے اجر ملنے کا نام ہے
- ۲۱ — ذکر کا مفہوم
- ۲۲ — مومنین کی اجتماعی خصوصیات
- ۲۳ — صبر و اصابہ - صابر و رابط - واقف و

تیسرا باب

شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاریاں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

حضور نبی اکرمؐ، مکہ میں تیرہ سال تک انتہائی مصائب و نوائب کی زندگی گزارنے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ قریش مکہ کو اگر حضورؐ اور جماعتِ مؤمنین کے خلاف یہی شکایت تھی کہ وہ ان کی بُت پرستی کی مخالفت اور ان کی مذموم عادات و خصائل پر تنقید کرتے تھے تو انہیں خوش ہونا چاہئے تھا کہ یہ کائنات نکل گیا۔ اب انہیں کسی قسم کی تنقید و تشبیہ کا خدشہ نہیں رہا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے ان کا تعاقب کیا اور ہجرت کے دوسرے ہی سال ایک لشکرِ حجاز کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ بدر کے مقام پر ان کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکہ کی تفصیل سورہ انفال میں آئی ہے۔ جسے اس مقام پر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قریش نے مسلمانوں کا تعاقب کیوں کیا تھا۔ اور وہ سات سال تک ان کے خلاف نبرد آزما کیوں رہے تھے۔ انہیں کس بات کا خطرہ تھا جسکی وجہ سے انہوں نے اس طرح سردھڑکی بازی لگا دی تھی۔

بات واضح تھی۔ اگر اسلام بھی یہودیت، عیسائیت یا مجوسیت کی طرح ایک مذہب ہوتا تو انہیں (کم از کم ہجرت کے بعد) اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ نظامِ حیات ہے۔ اگر یہ نظام کسی جگہ بھی قائم ہو گیا تو قریش کی کوئی حیثیت

باقی نہیں رہے گی۔ اُن کے نسلی اور نسبی تفوق کا یہ عالم تھا کہ وہ غیر عرب تو ایک طرف، عربوں کے بھی کسی دوسرے قبیلہ کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے، دنیاوی وجاہت کے علاوہ، کعبہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے انہیں ایسا مذہبی تقدس حاصل تھا جس میں ان کا کوئی شریک دہیم نہ تھا۔ وہ در دراز ملکوں سے تجارت کرتے تھے اور اس مذہبی تقدس کی وجہ سے ان کے قافلے ہر مقام پر محفوظ رہتے تھے جبکہ عرب میں قافلوں کی لوٹ مار کا سلسلہ عام تھا۔ سینکڑوں غلام اور لونڈیاں اُن کے دروازوں پر بلا زنجیر بندھے رہتے تھے۔ وہ دن رات محنت اور مشقت کرتے اور یہ ان کی کمائی پر عیش اڑاتے تھے۔ ان کی یہ عیش سامانیاں اس وجہ سے بھی قائم و دائم تھیں کہ اُن کے دایئیں یائیں، ایلانی اور یازیطینی حکومتوں میں رعایا کی حالت ان غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ انقلاب جس کی دعوت حضور نبی اکرمؐ دیتے تھے، کسی جگہ بھی ظہور میں آگیا تو اُس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر اُن کے ہاں کا زیر دست طبقہ سرکش ہو جائے گا جس کے بعد ان کی نہ وجاہت باقی رہے گی نہ ثروت۔ نہ تقدس باقی رہے گا نہ تفوق۔ یہ تھا وہ خطرہ جس کی وجہ سے وہ اسلامی نظام کے قیام میں (خواہ اس کا آغاز مدینہ میں ہی کیوں نہ ہو) اپنی موت دیکھتے تھے اور انتہائی کوشش کرتے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے ان خطرات کا نقشہ، نوحہ البوجہل کے عنوان سے جاوید نامہ میں بڑے بیخ انداز میں کھینچا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ البوجہل نے غلاب کعبہ کو تھا ما اور انتہائی گریہ ناری سے اپنے خداؤں سے فریاد کی کہ

نوحہ البوجہل

سینہ ما از محمد داغ داغ از دم اُکعبہ را گل شد چراغ
ساحرو، اندر کلامش ساحری است این دو حرف لا الا خود کا قری است
تاباط دین آبا در نورد باحث داودان ما کرو، آنچه کرد

وہ چلاتا تھا کہ

مذہب او قاطع ملک و نسب از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست با غلام خویش بر یک خواں نشست

اس کے نزدیک یہ حادثہ قیامت سے کم نہ تھا۔

قدر احبار عرب نشناخت با کفتان جنس در ساختہ
احمران با سوداں آمیختند آبروئے دو دمانے ریختند !

وہ اس نظام کی معاشی مساوات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا کہ

اِس لئے وہ کبھی حجرِ اسود کو پکار کر کہتا کہ
اِس مساوات، اِس مواخات اچھی است خوب سے داتم کہ سلمانؓ مزدکی است

بازگو، اے سنگِ اسود بازگوے انچہ دیدیم از محمد بازگوے
اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے ”خدا“ سے فریاد کرتا کہ

اے سہیل! اے بندہ را پوزش پذیر خانہ خود را زبے کیشاں بگیہ
گلہ، شاں را بگرگاں کن سبیل تلخ کن خرمائے شاں را برنخیل!

یہ تھے وہ خطرات جن کا احساس قریش کو ایک ثانیہ کے لئے بھی چین کی نیند سونے نہیں دیتا تھا۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے سترہ میں بدر کے میدان میں نبرد آزمائی کی۔ وہاں بُری طرح شکست کھانے کے بعد اگلے سال (شوال ۳۱ھ) مطابق مارچ ۶۲۵ء) پہلے سے بھی زیادہ لاؤ لشکر کے ساتھ، پھر مدینہ کی طرف اُمتدائے مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر کوہِ احد کے قریب جماعتِ مجاہدین کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا۔ قریش کی جمعیت، قریب تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ حضورؐ کی معیت میں کل ایک ہزار مجاہد تھے۔ اس زمانے میں ہنوز مدینہ میں منافقین بکثرت موجود تھے۔ ان کی کوئی تین سو کی جماعت (ریش المنافقین عبداللہ بن ابی کی زیر قیادت) مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئی۔ یہ ہے وہ جنگ جس کا تذکرہ زیر نظر آیات میں سامنے آیا ہے۔ آیت (۱۱۹) میں کہا تھا: **وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضْرِبْكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۖ** اگر تم نے استقامت اختیار کی اور تو انہیں خداوندی کی نگہداشت کی، تو منافقین کی سازشیں تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔ اس وعدے کی صداقت کے طور پر جنگِ احد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۖ وَاللَّهُ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۱۲۰)

۳
۱۲۰

(اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کہ صبر و تقویٰ کا پھل کیا ہوتا ہے اور استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کا نتیجہ کیا،

تم اس جنگ — احد — کا واقعہ سامنے لاؤ) جب تو (اے رسول!) صبح سویرے اپنے گھر سے نکلا تھا تاکہ

جماعتِ مؤمنین کو لڑائی کے مرکزی مقامات پر متعین کر دے — اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا تھا۔

۱۔ مزدکیت، فارس کی کمیونزم۔ (حضرت سلمانؓ فارسی نژاد تھے)

۲۔ اسلام اور جنگ کے موضوع پر سابلہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اندکس کی مدد سے ”جنگ“ کا عنوان دیکھئے۔

اس میں حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جنگ کے روز آپ صبح سویرے گھر سے نکلے تاکہ اپنے سپاہیوں کی پوزیشنیں متعین کر دیں۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک رسولؐ کے فرائض زندگی کیا ہوتے تھے؟ رسولؐ کے فرائض

رسولؐ کے فرائض | محض نمازیں پڑھانا اور وعظ کہنا نہیں تھے۔ وہ اپنی فوجوں کا ”کمانڈر۔ ان چیف“ بھی ہوتا تھا۔ اور میدان جنگ میں بنفس نفیس شریک ہو کر، فوجوں کی کمان کرتا تھا۔ ہم اپنی مذہبی پیشوائیت سے اتباع سنت رسول اللہؐ کے چرچے روز سنتے ہیں اور اس پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ تارک سنت کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ سنت رسول اللہؐ (کہ جسے قرآن کریم نے حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے تعبیر کیا ہے) کی اہمیت بجا اور درست، لیکن اتباع سنت رسول اللہؐ کے ان دعویداروں سے پوچھئے کہ جنگ میں فوجوں کی کمان کرنا تو ایک طرف! انہوں نے کبھی میدان جنگ کی شکل بھی دیکھی ہے؟ ان کا، سنت کا تصور، کُتے پانچاڑے کی تراش خراش، یا ”عقیقہ اور ولیمہ“ کی دھو توں تک محدود ہوتا ہے۔ سچ ہے سہ

ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور !

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے اس منکر میں منافقین کی جماعت بھی شامل ہو گئی تھی جو قرابت میں سوا فرد پر مشتمل تھی۔ تاریخ میں ہے کہ وہ راستے ہی میں ساتھ چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس طرح قریش کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں مجاہدین کی تعداد صرف سات سو رہ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ایسے اعراب (بدو) بھی شامل ہوں جن کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے کہ وہ مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر تھا۔ (۲۹)

اس قسم کے وہ سپاہی تھے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے :-

إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتٌ مِّنْكُمْ أَن تَفْشَلُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُونَ (۳۱)

۳۱
۱۲۱

(اس دن مقابلہ ایسا سخت تھا کہ تم میں سے دو گروہوں کے دل میں ہمت ہار دینے کا خیال پیدا ہو گیا حالانکہ انہیں قوانین خداوندی کی تائید اور سرپرستی حاصل تھی۔ (یہ وہی تھے جن کا ایمان ہنوز پختگی حاصل نہیں کر سکا تھا، ورنہ وہوں کی تو خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں قوانین خداوندی کی حکمیت پر پورا پورا بھروسہ اور خدا کے وعدوں پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔

یہاں توکل، کالفظ پہلی مرتبہ آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قرآنی مفہوم قدرے وضاحت سے سامنے لایا جائے، بالخصوص اس لئے کہ ہماری تباہیوں میں (قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات کی طرح) اس اصطلاح کے غلط مفہوم کو بھی بڑا

توکل کا مفہوم

دخل ہے۔ ہمارے ہمارے ہاں توکل کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بے دست دیا بیٹھا رہے۔ کسی کام کے لئے نہ کوشش کرے، نہ محنت اور دل میں سمجھتا رہے کہ اس کی روزی اور دوسرے مقاصد کی کامیابی کے لئے خدا خود بخود غیب سے سامان پیدا کر دے گا۔ ”توکل“ کے اس مفہوم میں ہمارے ہاں کے تصوف کو بڑا بہت دخل ہے۔ ”مقربین بارگاہ خداوندی۔ یعنی اولیاء اللہ“ ہر قسم کے مادی اسباب اور سہارا دل کو خدا پر ایمان کے مُنافی قرار دے کر ”توکل بخدا“ بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے عقیدت مند اس خوش فہمی میں مُبتلا رہتے ہیں کہ ”حضرت صاحب کچھ نہیں کرتے“ اس کے باوجود اُن کے سب کام بروقت ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ پر توکل رکھتے ہیں۔ حالانکہ ”حضرت صاحب“ کے توکل کا راز اس میں ہوتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں (مُریدوں) کا ایک جم غفیر محنت کرتا ہے اور ان کی محنت کی کھائی پر حضرت صاحب کا کاروبار چلتا ہے۔ یہ عقیدت مند نذرانے پیش کرنا بند کر دیں تو حضرت صاحب کے توکل علی اللہ کی قلعی کھل جائے!

توکل (مادہ : و۔ ل۔ ل) کے معنی اعتماد اور بھروسہ (CONFIDENCE) یا (TRUST) کے ہیں۔ اس کا مفہوم ایک دو مثالوں سے سمجھ میں آجائے گا۔ آپ نے ہوائی جہازوں سے پیراشوٹوں کو کودتے دیکھا ہوگا۔ وہ دس دس ہزار فٹ کی بلندی سے کس بے باکی اور بے تکلفی سے فضا میں کود جاتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت انہیں کسی خطرے کا احساس تو ایک طرف، ذرا سا تذبذب یا تاامل بھی نہیں ہوتا۔ وہ ایسا کس طرح کر جاتے ہیں؟ ان کے پاس ایک چھتری ہوتی ہے جو انہیں زمین پر گرنے سے بچاتی ہے۔ انہیں اس چھتری کی محکمیت پر اس قدر بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ بلا خوف خطر فضا میں کود جاتے ہیں۔ اس قسم کے اعتماد اور بھروسہ کو توکل کہتے جاتا ہے۔

یا مثلاً آپ ایک سوئی پانی میں پھینکیں تو وہ ڈوب جاتی ہے لیکن تہاروں ٹن وزن کا لوہے کا جہاز اُسی پانی میں بسط کی طرح تیرتا پھرتا ہے۔ اس میں ہزاروں من سامان بھی لاداجاتا ہے اور مسافر بھی۔ ہم جہاز میں بلا تکلف سوار ہو جاتے ہیں اور اس کے ڈوب جانے کا خیال تک بھی ہمارے سہرا نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ جہاز (پانی کا ہویا ہوائی وجہاز) قوانین فطرت کے مطابق تیار ہوتے ہیں اور فطرت کے قوانین ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ وہ نہ کبھی ناکام رہتے ہیں اور نہ ہی دغا دیتے۔ اسی لئے اُن کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کیا جاتا ہے۔ ان زندگی کا تمام کاروبار قوانین فطرت کی اسی ہمہ گیری اور محکمیت کے سہارے چلتا ہے۔ اسے ”توکل“ کہا جاتا ہے۔

یا مثلاً آپ کسی جگہ جانا چاہتے ہیں اور راستے میں چوراہا آجاتا ہے جہاں سے آپ کو علم نہیں ہوتا کہ کس طرف کو مڑا جائے۔ کون سا راستہ اختیار کیا جائے جو آپ کو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اس چوراہے پر ایک سائٹ پوسٹ

نصب ہونا ہے جو مختلف راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ اس کے مطابق راستہ اختیار کرتے ہیں اور بلا تذبذب و تامل اس پر گامزن رہتے ہیں تاکہ آپ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ راستے کی اس نشاندہی (راہ نمائی) پر آپ کا اعتماد ہے جو آپ پورے حتم و یقین کے ساتھ وہ راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے اُس راہ نمائی پر ”توکل“ سے تعبیر کیا جائے گا۔

لہذا، توکل علی اللہ سے مراد یہ ہے کہ آپ کو پورا پورا یقین ہو کہ قوانینِ خداوندی محکم اور اٹل ہیں۔ خدا نے جو وعدے کر رکھے ہیں، وہ پورے ہو کر رہتے ہیں۔ (درحقیقت قوانینِ خداوندی ہی کو خدا کے وعدے کہا جاتا ہے) اور جو رہنمائی خدا نے عطا کی ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک یقیناً پہنچا دے گی۔ اسی کو بالفاظِ دیگر ایمان کہتے ہیں۔ ایمان کے معنی ہیں کسی کی بات پر ایسا یقین اور اعتماد جس سے آپ کو پورا پورا امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم نے کفر اور ایمان میں یہی فرق بتایا ہے جہاں کہا ہے کہ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲۵۶) جو قوم، ہر غیر خداوندی قانون اور نظام سے منہ موڑ کر، نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائے گی، تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اسے توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ سفرِ زندگی میں صحیح راستے کا میسر آ جانا، منزل مقصود تک پہنچنے کا یقین عطا کر دیتا ہے۔ سورہ ابراہیم میں مومنین کا قول درج ہے کہ وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا (۲۱۲)۔ ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ کریں کہ اس نے ہماری رہنمائی صحیح راستوں کی طرف کر دی ہے؟ یہ صحیح راستے کون سے ہیں؟ رسول اللہ سے ارشادِ خداوندی ہے: وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ..... جو کچھ تیری طرف من جانب اللہ وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ اور اسی وحیِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد کرو۔ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا (۲۱۳)۔ اور اس حقیقت پر یقین کامل رکھو کہ قوانینِ خداوندی پر بھروسہ کرنے کے بعد کسی اور سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سہارا، نہ تو ناکافی ہوگا، نہ ہی ناقابلِ اعتماد۔ سورہ فرقان میں، اس سلسلہ میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ اعتماد اور بھروسہ عارضی اور ہنگامی نہیں۔ یہ ابدی اور دائمی ہے۔ فرمایا:۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ..... (۲۵۶)۔ اس خدا پر بھروسہ کرو۔

خدا کے زندہ و پائیدہ ہونیکا عملی مفہوم | جو زندہ ہے اور کبھی مرے گا نہیں۔ خدا کا زندہ و پائیدہ ہونا ہمارے لئے کیا معنی رکھتا ہے، اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا تعلق اس کی کتاب کی روش سے ہے۔ رہا مخصوص دیکھئے، مطالب الفرقان۔ جلد سوم ص ۲۲۳ آیت ۲۸۶)۔ اس کتاب کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی (۲۸۶)۔ اور قیامت تک کے لئے محفوظ بھی (۱۵)۔ لہذا، ہمارے لئے خدا کے زندہ و پائیدہ ہونے کا عملی مفہوم، اس کی کتاب کا زندہ و پائیدہ ہونا ہے۔ اور اس کتاب کے قوانین و قواعد پر یقین محکم، خدا پر توکل۔ وہ خدا۔ اَللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ جس کے سوا اور کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اطاعت و محکومیت صرف اُسی کے قوانین کی کی جاسکتی ہے اور کسی کے قوانین کی نہیں۔ وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۲۸۶)۔ اور یہی ہے خدا پر توکل کا عملی ثبوت۔

بات جنگ اُحد کے سلسلہ میں یہ ہو رہی تھی کہ جن متذہبین کے دلوں میں بے بہتی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، انہیں خدا کے قوانین اور اُس کے وعدوں پر بھروسہ نہیں۔ وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۲۸۶)۔ مومنین کی کبھی یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ انہیں خدا کے وعدوں کی صداقت پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اور اس کا مظاہرہ تم اس سے پہلے جنگ بدر میں کر چکے ہو :

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ۔ (۲۸۶)

۳
۱۲۲

تم اُس وقت دشمن کے مقابلہ میں تعداد میں بھی کم تھے اور اسلحہ اور سامان کے اعتبار سے کمزور بھی۔ اس کے باوجود

خدا نے تمہاری مدد کی (۲۸۶)۔ اور وہ نتیجہ تھا تمہاری تقویٰ شجاری کا۔ یعنی قوانین خداوندی پر نگہداشت رکھنے کا۔

اگر تم اب بھی ان قوانین کی نگہداشت کرو گے تو تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں گی۔

جنگ بدر میں ملائکہ کے ذریعے نصرت خداوندی کا ظہور ہوا تھا۔ ملائکہ کس طرح تائید و تقویت کا موجب بنتے ہیں اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۶۹) پر بار دیگر نگاہ ڈالئے۔ یہاں بھی، دو آیات آگے جا کر اس کی مزید تشریح کر دی گئی ہے۔ سرِ دست اتنا سمجھ لیجئے کہ جنگ بدر میں دشمن کے ایک ہزار سپاہی تھے، اس لئے وہاں ایک ہزار ملائکہ کا ذکر ہوا۔ جنگ اُحد میں دشمنوں کی فوج تین ہزار افراد پر مشتمل تھی، اس لئے وہاں تین ہزار ملائکہ بھیجے گئے۔ اور جنگ احزاب میں اُن کی تعداد پانچ ہزار تھی، تو وہاں پانچ ہزار ملائکہ کا ذکر آئے گا۔ ذیل کی آیات میں ملائکہ کی اسی تائید و نصرت کا ذکر ہے :-

ملائکہ کی تائید و نصرت

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ تُبَدِّلُوا بَعْضَ بَعْضٍ

۳
۱۲۳

مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزِلِينَ (۲۸۷)

(جَبَّ اُحدیں) جب تو (اے رسولؐ!) اپنی جماعت سے کچھ رہا تھا کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ اللہ ان تین ہزار ملائکہ سے تمہاری مدد کرے جو تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر، تمہارے لئے ثبات و طمانیت کا موجب بنیں۔ (۳۵/۱۳)؛ $\frac{9}{11} : \frac{4}{11} : \frac{4}{11}$ } (تین ہزار ملائکہ اس لئے کہ دشمن کی تعداد بھی اسی قدر تھی۔ {

میں جاتے تھے۔ اپنے خون کی قیمت ادا کر کے فتح حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں جنگ کے دستور کے مطابق، دشمنوں سے ہاتھ آنے والا مال غنیمت فاتح فوج کے سپاہیوں کی ملکیت ہوتا تھا۔ اور جنگ کے قیدی غلاموں کی طرح اور ان کی عورتیں لونڈیوں کی طرح ان (سپاہیوں) میں تقسیم ہوتے تھے۔ لیکن قرآن نے آکر اس تمام نقشے کو بدل دیا۔ مال غنیمت کے متعلق کہا کہ یہ سپاہیوں کی ملکیت نہیں۔ یہ سب مملکت کی تحویل میں جائے گا جو اسے نوع انسان کی منفعت عامہ کے لئے صرف میں لائے گی (۱۱۶)۔ جہاں تک جنگ کے قیدیوں کا تعلق ہے انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا: **فَمَا مَّا مَتًّا بَعْدُ وَ اِمَّا جِدَ اَعَزَّ** (۱۱۷)۔ عربوں میں لڑائی کے ہی محرکات تھے۔ انہیں ختم کر دینے کے بعد جذبہ محرک صرف ایک رہ گیا۔ یعنی نظام خداوندی کا غلبہ اور نظام باطل کی نگوں ساری۔ (۱۱۸) شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

اس لئے حضور سے ارشاد ہوا کہ

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَانْتُمُ ظَالِمُونَ ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ ۝ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۱۲۷-۱۲۸)

ان مخالفین میں سے کون کون اپنی سرکشی کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا، اور کسے (سزائش کے بعد) معاف کر دیا جائے گا، اس کا فیصلہ (اے رسول!) تیرے (یا کسی اور انسان کے ذاتی طور پر) کرنے کا نہیں۔ یہ فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

یعنی خدا کے اس قانون کے مطابق جس کی رو سے ساری کائنات اُس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں مصروف عمل ہے۔ اسی کے مطابق قوموں کو تباہیوں اور بربادیوں سے حفاظت کا سامان ملتا ہے، اور اپنی کے مطابق ان کی گرفت اور ہلاکت ہوتی ہے (۱۲۷)۔ جو قوم اپنے آپ کو جس سلوک کا مستحق بنائے اس سے دیا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اُس

ایسا نظر آتا ہے کہ غنیمت کے متعلق یہ تبدیلی ذرا بعد میں جا کر ہوئی تھی۔ ابتدائی جنگوں میں غالباً سابقہ انداز جاری رہا تھا۔

عربوں میں غلامی کا یہی ذریعہ تھا۔ قرآن کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دے کر ہمیشہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا قرآن کریم میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر ہے وہ وہ ہیں جو اس سے پہلے عربی معاشرہ میں موجود تھے۔ اس حکم خداوندی کے بعد کسی کو غلام بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کے قانون میں (گرفت اور سزا کے ساتھ) حفاظت اور پرورش کا سامان بھی موجود ہے۔ (لہذا، اُس میں کسی کے ذاتی انتقام کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا)۔

جنگِ اُحد کے متعلق اس مقام پر یہی آیات ہیں۔ اس کا باقی تذکرہ آگے چل کر آتا ہے لیکن موضوع کے تسلسل کے لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان آیات کو بھی اسی جگہ پیش کر دیا جائے۔ اس جنگ کی (STRATEGY) یہ تھی کہ حضورؐ نے اپنی فوج کو اُس مقام پر صاف آرا کیا تھا جس کی پشت پر کوہِ اُحد تھا۔ اس پہاڑ میں ایک درہ تھا جس میں سے دشمن یورش کر سکتا تھا۔ آپؐ نے ماہر تیراندازوں کا ایک دستہ اس درہ میں متعین کر دیا۔ جنگ شروع ہوئی تو بہت جلد دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس کا لشکر شکست کھا کر بھاگ اٹھا اور بہت سا ساز و بیدار میدان میں چھوڑ گیا۔ مجاہدین کے لئے، اسلام لانے کے بعد، یہ دوسری جنگ تھی اور ایسا نظر آتا ہے کہ ابھی یہ احکام نافذ نہیں ہوئے تھے کہ مالِ غنیمت، انفرادی طور پر سپاہیوں کی ملکیت میں نہیں جائے گا بلکہ اجتماعی مفاد کی خاطر مرکز میں جمع ہوگا۔ اس لئے یہ مجاہدین، اپنی سابقہ روش کے مطابق، مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں تک تو خطرہ کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن جو تیرانداز درہ میں متعین تھے وہ ابھی اس مال کی کشش (TEMPTATION) پر ضبط نہ کر سکے اور اس خیال سے کہ دشمن بھاگ گیا ہے، اپنے مقام کو چھوڑ کر، مالِ غنیمت کی طرف لپک کر آ گئے۔ دشمن ابھی قریب ہی تھا۔ اُس نے درہ کو خالی دیکھا تو واپس مڑ کر اس پر قبضہ کر لیا اور جھکڑ کی طرح تیر بھڑانے شروع کر دیئے۔ اس میدانِ جنگ میں افراتفری مچ گئی اور ایسا نظر آنے لگا کہ سمانوں کی فتح مبدل بہ شکست ہو جائے گی۔ قرآن کریم نے اس حادثہ فاجعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدًا إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِآيَةٍ هِيَ أَقْبَلُ إِلَيْكُمْ إِذْ أَفْشَلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ مَا أَمَّاكُمْ مَا تَحِبُّونَ مِّنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۵۱)

میدانِ جنگ میں قانونِ خداوندی کے مطابق (تم دشمن کو تیر تیغ کر رہے تھے) تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا، اور اس طرح خدا کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا۔ لیکن، عین اس وقت تمہارے پاؤں میں بفرش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیشِ نظر میں تم نے باہمی تنازعہ شروع کر دیا۔ اور تمہارے کمانڈر نے جو حکم تمہیں دے رکھا تھا، تم نے اس کی خلاف ورزی کی، حالانکہ فتح و کامرانی، جو تمہارا محبوب مقصد تھا، تمہاری آنکھوں

کے سامنے تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ قریبی مفاد پر ٹوٹ پڑے، اور کچھ ایسے رہ گئے جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ لیکن تمہارا رخ دشمن سے ہٹ کر، دوسری سمت کو پھر گیا، (تمہیں شکست ہو گئی اور) اس طرح تم پر اپنی غلط نگہی کا نتیجہ و اشکات ہو گیا۔

بہر حال، اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کیا۔ پھر اپنے مقام پر واپس آ گئے۔ تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی (اور یوں) تمہاری لغزش کے اثرات مٹ گئے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ایک بار کی لغزش سے انسان ہمیشہ کے لئے کامرانہوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آجائے، خدا کی نوازشات سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں دو نکات وضاحت طلب ہیں: ایک یہ کہ اس میں کہا گیا ہے کہ مِّنْكُمْ مَّن يُتَرِّدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَرِّدُ الْآخِرَةَ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ گروہ حیاتِ آخرت کا منکر ہو گیا تھا اور اُس نے محض دُنیاوی مفاد کو اپنا مقصودِ حیات قرار دے لیا تھا۔ قطعاً نہیں۔ اس طرح تو انسان مسلمان ہی نہیں رہتا۔ آخرت کے انکار سے ایمان اور اسلام ختم ہو جاتا ہے۔ دُنیا اور آخرت کا مفہوم سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (انڈکس کے حوالہ سے اُن مقامات پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے) وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دُنیا کے معنی ہوتے ہیں پیش پا افتادہ یا عاجلہ مفاد اور آخرت کے معنی ہوتے ہیں مستقبل کی خوشگواریاں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ تیرا انداز کا یہ دستہ پیش پا افتادہ مفاد (مالِ غنیمت) پر لپک پڑا، اور انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ان کے اس طرح درہ کو چھوڑ دینے سے مستقبل کا کس قدر نقصان ہوگا۔ یہ ہے زیرِ نظر آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح مفہوم، ورنہ قرآن کی رو سے جماعتِ مؤمنین کا تو دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی، دونوں کی خوشگوار یوں میں حصہ ہوتا ہے۔ (پہلے)

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اسی گروہ نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس سے انہوں نے نقصان اٹھایا۔ قرآنِ کریم مؤمنین کو اس قسم کا معصوم قرار نہیں دینا کہ ان سے کوئی چھوٹی موٹی لغزش بھی سرزد نہ ہو۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّغَمَ (۵۳)۔ وہ سنگین جرائم اور بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ یاں

یہ ممکن ہے کہ اُن سے چھوٹی موٹی لغزشیں سرزد ہو جائیں۔ یہ وہ لغزشیں ہیں جن کے داغ اُن کے اشکِ ندامت دھو ڈالتے ہیں۔ ویسے بھی، اجتماعی زندگی میں افراد کی چھوٹی موٹی لغزشوں سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی جماعت کے اجتماعی حُسنِ کردار سے ہو جاتی ہے: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهِبْنَ الشَّيْئَاتِ (۲۴)۔ میزانِ خداوندی کا

بنیادی اصول ہے، یعنی اگر حسنات کا پلڑا بھاری ہے تو اس سے سیات کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ آیت (۱۵۶) میں اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بہم پہنچا دی ہے۔

اس کے بعد پھر ایک عظیم حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسولؐ کا منصب وعظ و نصیحت کرنا ہی نہیں تھا۔ وہ اسلامی مملکت کا سربراہ اور اپنی فوجوں کا کمانڈر۔ ان چھت بھی ہوتا تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں اُس کی عظمت کر دار کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اگلی آیت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا :-

اِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلَوْنَ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنَ الرَّسُولِ يَدُ عُوْكُمْ فِي أَخْرِكُمْ
فَأَنَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَّكِيْلًا تَخْزَنُوْنَ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (۱۵۷)

اس شکست میں، بدحواسی سے تمہاری حالت یہ ہو رہی تھی کہ تم مزہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے تھے اور کوئی، ایک دوسرے کی طرف، مڑ کر نہیں دیکھتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے، حالانکہ تمہارا رسولؐ، تمہیں پیچھے سے آوازیں دے رہا تھا۔ یوں تمہیں نقصان پر نقصان ہوا، اس سے مقصد یہ تھا کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو کہ اپنے مقام سے اذخود، کبھی نہیں ہلنا چاہیے۔ اگر تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی چیز تمہارے ہاتھوں سے نکلے جا رہی ہے تو تم، اس خیال سے کہ اگر میں ٹیوٹی پر کھڑا ہوں تو یہ چیز جاتی رہے گی، اپنی جگہ کو چھوڑ کر، اُس کے پیچھے نہ لپک پڑو۔ یا اگر کوئی سخت مصیبت آرہی ہے تو اس سے گھبرا کر اپنا مقام نہ چھوڑ دو۔ تم اپنی جگہ پر جمے رہو، خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔

یعنی اس محشرستان میں افسرِ تقری اور نفسا نفسی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر شخص بدحواسی کے عالم میں بھاگے چلا جا رہا تھا، لیکن ایک شخصیت ایسی تھی جو اس تلاطمِ انگیزی میں روشنی کے مینار کی طرح نہ صرف اپنے مقام پر کھڑی تھی بلکہ

اُسوۃ رسول اللہ

کی — یہ ہوتی ہیں قائم کی خصوصیات! جنگِ احزاب میں ایک مقام پر، اس سے بھی زیادہ ہولناک اور قیامت خیز حادثہ پیش آگیا تھا۔ اور اس میں بھی حضورؐ نے استقامت، شجاعت، غیر ہمت اور حوصلہ مندی کا عظیم النظیر مظاہرہ فرمایا تھا۔ وہی مقام تھا جہاں اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مؤمنین سے کہا تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳)۔ "تہد" قائم (رسول اللہ) نے اُس وقت جس عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس میں تمہارے لئے بہترین نمونہ (ماڈل) تھا۔ یہ ہیں حضورؐ کی وہ "سُنَن" جنہیں خدا نے بہترین ماڈل قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ہے :-

ثُمَّ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنٌ نَافِئٌ غَمًّا طَائِفَةٌ مِّنْكُمْ لَا
 وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ
 يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّهِ يُخَفُّونَ فِي أَنفُسِهِمْ
 مَا لَا يَبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ
 فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا
 فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۳۵۳)

رسول کی اس آواز میں مضمر عزم و ثبات نے میدان جنگ کا نقشہ بدل دیا، اور اس طرح، شکست کے غم و حزن کے بعد تم پر اطمینان و سکون کی نصیحت جاری ہو گئی (۳۵۳)۔ لیکن اطمینان و سکون کی یہ کیفیت صرف اپنی پہچانی ہوئی۔ جن کے ایمان پختہ تھے، اور ان سے محض یہ عارضی نفرت ہو گئی تھی۔ ان کے دوسرے وہ منافقین کا تھا جنہیں اب بھی اپنی جان کے لئے پشیمان ہوئے تھے، اور ان کا دل خدا کے متعلق، برہنہ جہالت، عجیب قسم کے خیالات کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ ایسے خیالات جو زمانہ جہالت میں تو عام تھے لیکن اسلام نے دور کر دیا تھا۔ کبھی وہ کہتے کہ جنگ کے معاملہ میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہونا چاہیے تھا۔ یعنی اس بات کا فیصلہ کہ جنگ کرنا چاہیے یا نہیں، اور اگر کرنا چاہیے تو اس کا پرہ و گرام کیا ہونا چاہیے۔ یہودی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس قسم کے فیصلے کسی فرد یا گروہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا کرتے۔ یہ معاملات، نظام خداوندی کے طے کرنے کے ہوتے ہیں اور اسی کو اس کا کلی اختیار ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی باتیں محض دکھانے کے لئے کہہ رہے ہیں، جو کچھ ان کے دل میں ہے اسے ظاہر نہیں کرتے۔ (ان کے دل میں دین ہی کی طرف سے شک ہے)۔ یہ کہتے کہ اگر اس باب میں ہمیں کچھ اختیار دیا جاتا تو ہم اس مقام (پر آکر) کبھی قتل نہ ہوتے۔ (ہم اپنے گھروں میں رہتے)۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں رہتے کا فیصلہ بھی کر لیتے، تو جماعت مؤمنین تمہاری تعمید نہ کرتی۔ جب ان پر جنگ لازم قرار دی جاتی تو بے خود بخود میدان جنگ کی طرف آ جاتے۔

اس شکست سے ہوا یہ کہ جو کچھ کسی کے دل میں تھا، ابھر کر سامنے آ گیا۔ منافقین کی منافقت ظاہر ہو گئی اور پختہ ایمان والے، مصائب کی اس بھٹی سے گندن بن کر نکلے۔ اس لئے کہ اللہ تو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں کثیر تعداد میں منافقین بھی موجود تھے اور وہ اسلامی لشکروں میں بھی

منافقین شامل ہو جایا کرتے تھے۔ مقصد اُن کا یہ ہوتا تھا کہ مختلف قسم کی وسوسہ انگیزی سے جماعتِ مؤمنین کے حوصلوں کو پست کر دیا جائے اور اُن میں یا ہی پھوٹ ڈال دی جائے۔ (منافقین) کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس قسم کی سازشیں حالتِ امن میں بھی کچھ کم فتنہ انگیز نہیں ہوتیں لیکن جنگ کی حالت میں ان کی ہلاکت آفرینیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ یہ تھے وہ حالات جن سے اقامتِ نظامِ خداوندی کی خاطر جماعتِ مؤمنین (امتِ مسلمہ) کو گزرنا پڑا تھا، اس سفر میں جس میں :

صد منزل است و منزل اول قیامت است

اذاں بعد اللہ تعالیٰ نے تیر اندازوں کی اسی جماعت کی بریت کا اعلان کر دیا جن سے بغض ہو گئی تھی۔ فرمایا :-

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ
بِبَعْضٍ مَّا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۱۵۴)

جب (اُس دن) دونوں لشکر آمنے سامنے آئے ہیں تو تم میں سے جن لوگوں نے گدیز کی ماہ اختیار کر لی تھی تو، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے ایمان میں فرق آ گیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کی بعض کمزوریوں کے باعث پیش پا افتادہ مفاد کی کشش نے اُن کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اس قسم کی ہنگامی بغزشوں سے خدا کا قانون درگزر کر لیتا ہے اور ملت کا اجتماعی حُسنِ عمل، افراد کی ایسی بغزشوں کے مُضمر اثرات کی روک تھام کر دیتا ہے۔ خدا کا قانون ذرا داسی باتوں پر بھروسہ نہیں اٹھتا۔ وہ بڑا بیماری بھر کم، نفع اور بُہ دیار ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے کفر اور ایمان میں ایک ایسا خط امتیاز کھینچا ہے کہ ہر جوں بگہ بصیرت اس کی گہرائیوں میں

کفر اور ایمان میں عجیب خط امتیاز اترتی ہے موت اور حیات کی مشہور حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ قرآن کریم وہ ذہنیتیں سامنے لاتا ہے۔ ایک

ذہنیت وہ ہے جسے سعدی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

بدریا در منافع بے شمار است مگر خواہی سلامت بر کفار است

یعنی اس میں شبہ نہیں کہ سمندر میں غوطہ زن ہونے سے بہت سے منافع حاصل ہوتے ہیں لیکن اگر آپ امنِ سلامتی

چاہتے ہیں تو وہ ساحل پر رہنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خیریت اور عافیت اس میں ہے کہ انسان کسی قسم کا خطرہ

مول نہ لے اور ایسی زندگی بسر کرے جس کے متعلق غلبت نے کہا ہے کہ

نہ تیر کماں میں ہے نہ میاد کیں میں گوشے میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے

ایک ذہنیت یہ ہے۔ اس کے برعکس دوسری ذہنیت وہ ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

میاں بہ زم بہ ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجبش درآویز حیات جاوداں اندر ستیز است

ساحل پر زندگانی بسر کرنا، زندگی نہیں۔ زندگی یہ ہے کہ انسان دریا میں کود کر موجوں کی طغیانوں سے نبرد آزما ہو۔ اس نبرد آزمائی میں اگر وہ جان دے دے گا تو اسے حیات جاوداں حاصل ہو جائے گی۔ اس لئے

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی

جو قومیں خطرات سے جی چڑھتی ہیں، وہ زندہ نہیں مرنے ہوتی ہیں۔ تسخیر ارض و سماء اپنی قوموں کا حصہ ہے جو خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔

اب دیکھیے قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اَوَّلُ الذِّكْرِ ذَهْنِيَّتٌ (یعنی خطرات سے منہ چلانے والی ذہنیت) کفر ہے۔ اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان رزمگاہ حیات میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہے۔ فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا الْإِغْوَاءُ مِنْهُمْ إِذَا صُرُّوا
فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غَزًى تَوَكَّلُوا عِندَ نَا مَا تَلَّوْا وَمَا تَنَلَّوْا لِيَجْعَلَ اللَّهُ

ذَلِكَ حَسْرَةً لِّفِي تَلَّوْا بِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۵۵)

اے جماعتِ مؤمنین! دیکھنا تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی۔ یعنی یہ ذہنیت پیدا کر لی کہ اگر ان کے بھائی بند باہر سفر میں گئے ہوں، یا جنگ میں مصروف ہوں، تو وہ کہتے ہیں کہ، اگر وہ ہماری طرح گھروں میں رہتے، تو لاہے کو مرتے یا قتل ہوتے؛ یہ اندازِ فکر، ان کے سامنے یہ حکمِ مولاؐ آنے ہی نہیں دیتا کہ زندگی، خطرات میں جینے کا نام ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی زندگی، جو مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور ان کی اس زندگی کے قابلِ رشک نتائج، ایسے لوگوں کے دل میں داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں جو چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ زندگی محض سانس لینے اور موت، سلسلہ تنفس کے منقطع ہو جانے کا نام نہیں حقیقی موت اور حیات کا تصور اس سے مختلف ہے اور وہ خدا کے قانون سے وابستہ ہے جو انسان کے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس قانون کی رو سے حیات، مرگ، ہاشرف کو کہتے ہیں اور موت، حیات بے شرف کا نام ہے۔ زندگی، مجاہدانہ لگ و تاز سے عیادت ہے اور بے عملی کا دوسرا نام موت ہے۔

یہاں ایک نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ فرمایا کہ **وَاللّٰهُ يُخَيِّئُ ذَوِيْمِيَّتٍ**۔ سطح بین نگاہوں سے اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ موت اور حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے انسان اس باب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ موت نے جب آنا ہے اور جہاں آنا ہے وہ بہر حال آکر رہے گی۔ اس کی مدت مقرر ہے۔ نہ اس میں ایک ثانیہ کا تقدم ہو سکتا ہے نہ تاخیر۔ (مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اندکس کی مدد سے متعلقہ مقامات پر ایک نظر بار دیگر ڈال لیجئے)۔ اس آیت میں اس دقیق مسئلہ کو ایک لفظ میں حل کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کہا کہ **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ**۔

موت اور حیات کا تقابل | موت اور حیات کا فیصلہ تمہارے اعمال (کاموں) کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ زندگی سانس لینے کا نام نہیں۔ سانس تو دو خنقوں کے پتے بھی لیتے ہیں اور ہم بلا شعور بلا ارادہ ہر وقت سانس لئے چلے جاتے ہیں۔ لہذا، سانس لینا عمل نہیں۔ پس زندگی کا مدار سانس لینے پر نہیں، حسن عمل پر ہے، **خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** (۶۷)۔ جو موت سے ڈر کر بھاگتا ہے، موت اسے جھپٹ لیتی ہے۔ جو موت کو پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کرتا ہے، موت اس سے ڈر کر بھاگ اٹھتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کس قدر حسین انداز میں بیان کیا۔ بے جب کہا کہ

از مرگ ترسی، لے زندہ جاوید؟ مرگ است صیدے، تو در کیمنی!

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بپرد از بے یقینی! (زبور نجم ص ۱۱)

لیکن خطرات سے بے غوفی کے یہ معنی نہیں کہ انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے۔ قرآن کریم نے اسے سختی سے روکا ہے، جب کہا ہے کہ **وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ**۔ (۱۹۵)۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو، اس میں اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی ہلاکت سے محترز رہنے کی تاکید ہے۔ مرگ باشرط زندگی کے بلند مقاصد (اقدارِ خداوندی) کی حفاظت کے لئے خطرات کا سامنا کرنے اور عند الضرورت جان تک دے دینے کا نام ہے۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس کی وضاحت کر دی۔

وَلَيَنْ قَتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةً خَيْرٌ

۳
۱۵۶

مِمَّا يَجْمَعُونَ (۱۵۶)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے ذاتی مفاد اور نفس پروری کی خاطر خطرات مول لے اور اس طرح جاں دے دینے کو "مرگ باشرط" قرار دے لے۔ "مرگ باشرط" اُسی کی ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام اور بقاء کے لئے جس کا مقصد نفعِ انسان کی عالمگیر جوبیت ہے، خطرات کا مقابلہ کریں اور عند الضرورت اپنی جان تک دے دیں۔ ایسا کرنے

والے اگر اس کوشش میں مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں (۲۶) تو ان کی چھوٹی موتی کوٹا ہیوں کے مضر اثرات سے ان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ اور انہیں ان کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مل جاتا ہے۔ یہ چیز اس تمام سرمایہ سے بہتر ہے جسے انسان ذاتی مفاد کے لئے جمع کرتا ہے۔

(مقتولین فی سبیل اللہ کی تشریح کے لئے سابقہ جلدوں میں عنوانات شہداء اور مقتولین دیکھئے) لیکن ایسا وہی کر سکتے ہیں جو حیات بالآخرت پر ایمان رکھیں۔

وَلِیِّنْ مِّتِّمٌ اَوْ قَتِلْتُمْ لَا اِلٰی اللّٰهِ تَحْشَرُوْنَ ۝ (۲۷)

۳
۱۵۷

اس لئے کہ طبعی موت یا قتل ہو جانے سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی، گروہ درگروہ کاڑاں درکارواں، اس منزل کی طرف بڑھے جا رہی ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ اس طرح، رفتہ رفتہ سب اس نقطہ کے گرد جمع ہونے والے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ اقوامِ مسلمہ کے ”کمانڈر۔ ان۔ چیف“ بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ کمانڈر کو اپنے سپاہیوں سے قواعد و ضوابط کی پابندی کرانے کے لئے بعض اوقات سختی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ فوجی ضروریات کے علاوہ امورِ مملکت میں بھی احکام و قوانین کی پابندی کے لئے افراد اور جماعت پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ڈسپلن اور نظام قائم کرنے اور رکھنے کے لئے سختی کے معنی سخت گیری اور دُرستی نہیں۔ قرآن کریم نے جنگ کے تذکرہ کے درمیان اس حقیقت کی بھی وضاحت ضروری سمجھی کہ اپنے رفقاء (صحابہؓ) کے ساتھ آپؐ کا سلوک انتہائی شفقت اور محبت، رافت اور رحمت، نرم دلی اور جان سوزی کا ہونا تھا۔ حضورؐ طبعاً رفیق القلب حضورؐ کی شفقت اور رافت

وجہ سے صحابہؓ پر دانوں کی طرح آپؐ کے جانشان واقع ہوئے تھے۔ اس لئے فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۚ اے رسولؐ! اگر تم تندخو اور

۳
۱۵۸

سنگدل ہوتے اور انسانی کمزوریوں کی رعایت کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا، تو تمہاری جماعت کے افراد تمہیں چھوڑ کر تتر بتر ہو چکے ہوتے۔ تمہاری بیجمیت ہی باقی نہ رہتی۔ اس لئے فَاَعْفُ عَنْهُمْ ۚ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۲۸)۔ ”جس حد تک قانونِ خداوندی اجازت دے، تم ان کے سبہ و خطا سے درگزر کیا کرو اور ان کی حفاظت کے لئے سپرین جابیا کرو۔“ سربراہِ مملکت اور قائدِ وسائدِ جماعت کی یہی خصوصیت ہے جو اس کی جمیعت کی شیرازہ بندی کی ضامن اور اس کے اشارہ پر جان تک دے دینے کی محرک ہوتی ہے۔ تندخو اور سنگدل حاکم سے ہر شخص نفرت کرتا اور مخالفت کے موقع

کی تلاش میں رہتا ہے ۔

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جان پرست
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے (اقبال)
جس دل میں احترامِ انسانیت کے لئے سوز و گداز نہیں، وہ میرِ کارواں تو ایک طرف، انسان تک کہلانے کا مستحق نہیں۔
اس کے بعد قرآنِ کریم نے، حضور نبی اکرمؐ (سربراہِ مملکت) اور آپ کے رفقاء (افرادِ مملکت) کے ایک ایسے تعلق کا ذکر کیا ہے جس پر غور و فکر سے ہماری سینکڑوں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

یہ حقیقت متعدد بار پیش کی جا چکی ہے کہ اسلام کا مقصد، حکومتِ خداوندی کا قیام ہے۔ اور حکومتِ خداوندی سے مراد کتاب اللہ کی حکمرانی ہے (اس کے لئے دیکھئے بالخصوص مطالب الفرقان جلد سوم ص ۹۔ زیرِ آیت ۲۱۷)۔ لیکن کتاب اللہ (قرآن مجید) کی صورت یہ ہے کہ اس میں (چند ایک تفصیلی احکام کے سوا) دین کے اصول و اقدار دیئے گئے ہیں اور اس کو مملکتِ اسلامیہ پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق طریقے وضع کر لے۔ انہیں آپ جزئی یا فرعی قوانین (BYE-LAWS) کہہ لیجئے۔ قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی، لیکن ان حدود (BOUNDARY LINES) کے اندر وضع کردہ جزئی احکام، زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلتے جائیں گے۔ ثبات و تغیر کے اس امتزاج سے نظامِ اسلام (یا حکومتِ خداوندی) ہمیشہ کے لئے آگے بڑھتا رہے گا۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ جزئی احکام، امت کے مشورہ سے وضع کئے جائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ نظام مشاورتی کہلائے گا۔ ہماری غلط فہمی یہ ہے کہ ہم اسے مغرب کے جمہوری نظام کے مترادف سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں کھراور اسلام کا فرق ہے۔ مغربی جمہوریت میں قوانین سازی کے کُلی اختیارات، بلا حدود و قیود مجلسِ واضعینِ قوانین (پارلیمنٹ) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اسلامی نظامِ مشاورت میں یہ فریضہ قرآن کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا اس میں حکمرانی، خدا کی کتاب کی ہوتی ہے مجلسِ واضعینِ قوانین (پارلیمنٹ وغیرہ) اس حکمرانی کے عملی نفاذ کے طور طریقے متعین کرتی ہے۔ یہ امت کے باہمی مشورہ سے ہوتا ہے۔ (اس سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں حکومتِ جمہوریت۔ نظامِ اسلامی یا اسلامی نظام کے عنوانات دیکھئے)۔

مشاورتی نظام اور مغربی جمہوریت

یہ نظام مملکت سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور آپ ہی اس کے سربراہ تھے۔ اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ

وَسَّادِسْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج (۳/۱۵۸)

اپنے رفقاء سے معاملات حکومت میں مشورہ کیا کرو۔

یہ (آیہ شوری) اسلامی نظام کی بنیادی حقیقتوں میں سے ہے اور اُن بے شمار پیچیدگیوں کو دور کر دیتی ہے جن میں ہم (اپنی غلط نگہی سے) صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ رسول اللہ کے متعلق عقیدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ

قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا فرض

رسول اللہ کی حیثیت

اور قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا... جسکے آپ کے نبی اور خاندانی اور شہری زندگی کے تمام معاملات بھی اسی حیثیت کے تابع آ گئے تھے... قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسان اور حیثیت امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت "جس حالت میں" جو کچھ بھی کرتے تھے، رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم - تفہیمات حصہ اول ص ۴۳-۲۴۱)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضورؐ کے ہر عمل، ہر قول، ہر فیصلہ کے لئے خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی اور آپ اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ (مولانا) محمد اسماعیل (مرحوم) سابق صد جمعیت اہل حدیث کے الفاظ میں :
جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

لہذا،

تحقیق و تنقید کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا، اور جو احادیث قواعد احادیث کے متعلق عقیدہ

صحیح اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۲۷-۲۸)

ہوگا اور ملت کے خوارج کے مراد۔

قرآن مجید غیر متبدل اور ابدی ہے۔ اسی طرح احادیث رسول اللہ بھی وحی منزل من اللہ۔ ابدی اور غیر متبدل قرار پاتی ہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن اور مشلہ معہ — قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل

عطا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ، معاً احادیث ہیں اور قرآن ہی کی طرح مبنی بروحی خداوندی۔ اس اعتبار سے یہ حضرات وحی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وحی متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے، یعنی قرآن) اور دوسری وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، یعنی احادیث)۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں وحی کے عنوان میں ملے گی۔ اس عقیدہ کی رو سے اسلام، قرآن اور حدیث دونوں کو یکجا کرنے سے مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں غیر متبدل اور ابدی ہیں یعنی (قرآن کی طرح) احادیث میں بھی نہ تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے نہ حکم و اضافہ (کمی بیشی)۔ یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اسلامی مملکت میں کوئی قانون ”کتاب و سنت“ کے خلاف نافذ نہیں ہو سکتا، تو اس سے یہی مراد لی جاتی ہے۔

عقیدہ کے طور پر تو یہ مان لیا گیا کہ اسلامی مملکت میں ضابطہ قوانین ”کتاب و سنت“ (یعنی قرآن اور حدیث) کے مطابق ہوگا، لیکن جب عملی حیثیت سامنے آئی تو اس میں ایسی مشکلات پیش آئیں کہ ان کا کوئی حل ہی نہیں ملتا۔ قرآن ایک جامع کتاب ہے جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن

قانون سازی میں مشکلات

سنت (یعنی احادیث) کی یہ کیفیت نہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے ہاں احادیث کے اپنے اپنے مجموعے ہیں۔ شیعوں کے مجموعے الگ، سنیوں کے الگ۔ پھر سنیوں میں بھی اہل حدیث اور اہل فقہ میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فرقوں کی تسلیم شدہ صحیح احادیث الگ الگ۔ ان حالات میں کتاب و سنت (یعنی قرآن اور احادیث) کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کو ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) سے الگ رکھا جائے۔ شخصی قوانین کے متعلق ہر فرد کو اجازت دے دی جائے کہ وہ انہیں اپنے اپنے مجموعہ ہائے احادیث کی رو سے مرتب کرے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ پبلک لاز کا کیا کیا جائے۔ وہ تو ہر فرقے کے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ پاکستان میں سالہا سال تک یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ یہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں۔ یعنی ایک ناممکن العمل مطالبہ۔ اور برسوں کی کشمکش اور چپقلش کے بعد بالآخر انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

کتاب و سنت کی کوئی ایسی بغیر ممکن نہیں ہے، جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(بیان مودودی مرحوم۔ مہفتہ دارالینبیاء۔ مؤرخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۱ء)

یہی نہیں کہ مودودی (مرحوم) کو قانون سازی کے سلسلہ میں یہ موقف اختیار کرنا پڑا، انہیں خود سنت کے متعلق، اپنے سابقہ

۱۔ ہمارے ہاں دو قسم کا یہ عقیدہ یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ وہ بھی تو ذات کو وحی متلو اور روایت کو وحی غیر متلو سے تعبیر کرتے تھے۔

عقیدہ میں تبدیلی کرنی پڑی۔ سنت کے متعلق ان کا سابقہ عقیدہ آپ صفحہ ۲۱۶ پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں:-

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں، کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں۔ اور ایسی صورت میں یہ فرق امتیاز کرنا، کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (رسائل و مسائل جلد اول صفحہ ۳۱۱-۳۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی کسی کتاب میں بھی یہ مذکور نہیں کہ حضورؐ نے فلاں کام رسولؐ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا اور فلاں کام ان ہونے کی حیثیت سے۔ مودودی (مروجہ) کا ارشاد ہے کہ سنت انہی کاموں کو کہا جائے گا جو حضورؐ نے بحیثیت رسولؐ کئے تھے اور اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی مزاج شناس رسولؐ کی نگاہ بصیرت، اور صحیح احادیث میں سے سنت کا تعین بھی اُسی کے فیصلے پر منحصر (یا للعجب) رسولؐ اللہ کے طریق عمل کے اس امتیاز کے متعلق وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریع لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے۔ اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنادینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل جلد اول صفحہ ۳۱۰)

اس کی وضاحت میں دوسرے مقام پر لکھتے !

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قوی طرز معاشرت اور آپ کے عہد تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا تو مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس

طرز خاص کا لباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے اور نہ شرائع الہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن، یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے ابدیہیت ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔

سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات ہآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں، اُن کو خواہ مخواہ سنت قرار دینا، من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

(رسائل و مسائل جہتہ اقل ص ۳۱۲)

پھر لکھتے ہیں :-

جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔

(در مسائل و مسائل جہتہ اقل ص ۳۱۲)

تحریف اور خطرناک تحریف کہتے ہیں :-

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر اُن کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین۔ جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، اور آئندہ

بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً ص ۳۱۲)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خود مودودی (مرحوم) کے فیصلہ کے مطابق جو امور سنت ہیں، کیا وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گے یا اُن میں بھی تغیر و تبدل کیا جاسکے گا۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں :-

یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات میں اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جبرئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں عرب اور دُنیا کے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا، احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں اُن کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و منکرات کے لحاظ سے اُن کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو مروج اسلامی سے کوئی

علاقہ نہیں جزئیات میں دلالت النقص اور اثارة النقص، تو درکنار، مراحۃ النقص کی پیروی بھی فقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور فقہ کا اقتضار یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور اپنی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تفسیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو۔ (تفہیمات حصہ دوم - اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن - صفحہ ۳۲۸-۳۲۷)

آپ دیکھتے ہیں کہ سنت کے متعلق ان کے یہ خیالات، ان کے سابقہ عقیدہ کے تصور کے کس قدر خلاف ہیں۔ لیکن ان کے معاملہ میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ وہ ان کی تحریروں میں اس قسم کے متضاد خیالات اور عقائد موجود رہتے تھے اور وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ان کا سابقہ عقیدہ خلاف حقیقت تھا جس سے انہوں نے بعد میں رجوع کر لیا تھا، یعنی اسے چھوڑ کر دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔



بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ دین کے معاملہ میں ہمارے ہاں اکثر و بیشتر الجھنیں اس غلط عقیدہ کی پیدا کردہ ہیں کہ احادیث رسول اللہؐ بھی، قرآن کی طرح، وحی منزل من اللہ ہیں۔ اور ابدی اور غیر متبدل۔ آیہ شوریٰ نے اس عقیدہ کی واضح طور پر تردید کر دی۔ سوال یہ ہے کہ اگر رسول اللہؐ کا ہر قول - ہر عمل - ہر فیصلہ وحی کی رو سے ہوتا تھا تو آپ کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ مشورہ تو ایسے امور میں کیا جاتا ہے جن کا حل انسانی فکر اور آراء کی رو سے دریافت کیا جاتا ہو۔ اور جو کچھ مشورہ سے طے کیا گیا ہو، وہ دوسرے وقت میں (عند الضرورت) مشورہ سے بدل بھی جاسکتا ہے۔ اس ایک آیت سے واضح ہے کہ قرآنی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لئے حضورؐ اپنے رفقاء کے ساتھ مشاورت سے جو طریق وضع فرماتے، جو احکام و ضوابط نافذ کرتے، وہ نابدی تھے نہ غیر متبدل۔ چونکہ اسلامی نظام امت کو حضورؐ کے بعد بھی بدستور قائم رہنا اور آگے چلنا تھا، اس لئے امت کے لئے بھی یہی ارشاد ہوا کہ **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (۲۶)۔ اُن کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اس سے اس حقیقت کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ امور مملکت کے متعلق حضورؐ کے زمانے میں جو فیصلے باہمی مشاورت سے طے ہوتے تھے، انہیں (حضورؐ کے زمانے میں یا) حضورؐ کے بعد اسلامی مملکت امت کے مشورہ سے تبدیل بھی کر سکتی تھی اور ان میں حک و اضافہ بھی۔ امت کے متفقین میں امام ابوحنیفہ (امام اعظمؒ) کا مقام بہت بلند ہے جس حقیقت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اسے **امام اعظم کا مسلک**۔ خوب سمجھے تھے۔ تدوین فقہ کے سلسلے میں وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہؐ کا طریق یہ تھا

کہ تعبیریں جزئیات میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی تھی اُسے اختیار فرما لینے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے تھے کہ اگر میں بھی رسول اللہ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا، اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے۔ چنانچہ

عمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں رسول اللہ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابواسحق کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہ کے سامنے اکثر نبی صلعم کی حدیثیں آئیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔

(تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۳ ص ۲۸۷)

اس کی تائید میں وہ فرماتے تھے :-

۱ — دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے (ایضاً ۳۹۰)

یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں سترہ حدیثوں سے زیادہ سے استفادہ نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ وہ احادیث کو ابدی اور غیر متبدل نہیں سمجھتے تھے۔



آپ نے دیکھا کہ آیہ شوریٰ نے اس (بظاہر) لائیکل مسئلہ کو کس خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔

۲ — آیہ شوریٰ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اسلامی میں شخصی حکومت (ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ) نہیں۔ اس میں نظام حکومت شورائی ہو گا۔ یعنی امور مملکت امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔

۳ — یہیں سے آج کل ایک اور غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے۔ اور جمہوریت سے مراد مغربی جمہوریت لیا جاتا ہے، حالانکہ اسلامی نظام شوائیت اور مغرب کے نظام جمہوریت میں کفر اور اسلام کا فرق ہے، اس فرق کو پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، لیکن چونکہ یہ اہم بنیادی نکتہ ہے اسے ہم دُعا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں قانون سازی کلی اختیار، بلا حدود و قیود، انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس میں اقتدار مطلق انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی مملکت کو قانون سازی کے اختیارات، قرآن کریم کی غیر متبدل اور ابدی حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت درحقیقت قوانین و اقتدار خداوندی کے نافذ کر نیکا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس کی قانون سازی سے مراد ان طور طریقوں کا مرتب کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے قرآنی قوانین نافذ کئے جائیں۔ اس میں اقتدار مطلق خدا (یعنی خدا کی کتاب) کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہے فرق مغرب کی جمہوریت اور اسلام

کے نظامِ شوریٰ اور یہ فرق جزئی نہیں بلکہ بنیادی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مشاورت کا اصول جو دیا ہے اس کے طریق اور شکل و ہیئت خود متعین نہیں کئے۔ انہیں ہر دور کی اسلامی مملکت خود متعین کرے گی۔ (جمہوریت کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ دیکھئے اندکس)

۴۔۔۔ اور اس آیہ کریمہ سے نبی اکرمؐ کے رفقاء (صحابہ کبار) کی عظمتِ فکر بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جن حضرات سے خود رسول اللہؐ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ (اجازت نہیں بلکہ حکم دیا گیا تھا) ان کی بلند فکری اور پاکیزگی سیر کے لئے کسی اور سند کی ضرورت نہیں رہتی۔ کس قدر مناسب تھی ان کی رائے اور کس قدر قابلِ اعتماد تھی ان کی سیرت۔ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) (صحابہ کی عظمتِ کردار کے متعلق سابقہ جلدوں میں صحابہ کا عنوان دیکھئے)

اب آگے بڑھیے حضورؐ کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ رقیق القلب اور نرم مزاج تھے۔ لیکن اس نرمی اور رقیق القلبی کے معنی یہ نہیں کہ آپ ذرا ذرا سی بات سے متاثر ہو کر گھڑی گھڑی اپنے فیصلے اور ارادے بدل دیا کرتے تھے۔ رقیق القلب اور متلون مزاج ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی بنا پر آیہ شوریٰ کے ساتھ فرمایا کہ ”تم اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرو۔“

مشاورت اور عزیمت فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (۳۱)

آپ اس مشاورت کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں، تو پھر قانونِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے اس فیصلہ کو عمل میں لانا شروع کر دیں۔ یہی تمہارا شیوہ ہونا چاہیے اور یہی شیوہ تمہارے متبعین کا جنہیں اس قسم کی مشاورت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت، لینت اور عزیمت کا حسین امتزاج ہے۔

ہو حلقہ یاران تو بریشم کی طرح نرم نرم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ - رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۳۱)
خدا رسول اللہ اور ان کے رفقاء کار کی کیفیت یہ ہے کہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں
لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد۔

سابقہ آیات میں قرآن کریم نے فتح و کامرانی کے بنیادی اصول بتا دیے ہیں۔ یعنی :-

۱۔ جہدِ معاملات کو یا بھی مشاورت سے طے کرنا۔

برسگی، لیکن اس سے فصل صرف اس زمین سے پیدا ہوگی جسے اس مقصد کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ ایسی زمین پر جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو، بارش کا برسنہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ ہی اس زمین سے جس میں زرعی صلاحیت تو ہو، لیکن اسے بارش سیراب نہ کرے، کچھ پیدا ہو سکتا ہے۔ فلاح و کامرانی کے لئے ایمان اور عمل کی ہم آہنگی کی اس طرح ضرورت ہے۔

ماحصل اس مثال کا یہ ہے کہ جو شخص اپنی سعی و عمل کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے گا، اس کی کوشش بار آور ہوں گی۔ اس عمل میں جو حصہ قانون خداوندی کا ہوتا ہے، اسے نصرت الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں جو کردار انسانی کوشش ادا کرتی ہے، اسے بھی نصرت ہی کہہ کر لپکا را گیا ہے۔ فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن مَنصُورُ اللَّهِ يَنْصُورُكُمْ** (عج۱)۔ اس کے عام معنی ہیں ”اے جماعتِ مؤمنین! اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے خدا کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی کوششوں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ رکھا، تو اس کا اجر جنت تمہاری کھیتوں کو سرسبز و نشاداب کر دے گا۔ خدا کی نصرت کرنی کیا ہے؟ فرمایا: **وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ** (عج۲)۔ ”وہ تمہارے پاؤں جہاد کے گا۔“ تم میں ثبات اور استقلال پیدا کر دے گا۔ پاؤں تمہارے ہوں گے ان میں ثبات قانون خداوندی کے مطابق پیدا ہوگا۔

نصرت کے اس مفہوم سے آیت زیر نظر (عج۳) کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر تمہاری کوششیں قانون خداوندی کے مطابق ہوں گی تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔

واضح ہے کہ قوانین خداوندی کی ہم آہنگی (اطاعت اور پابندی) سے انسان کی سیرت و کردار میں اس قسم کی تبدیلی آجاتی ہے جس سے وہ بڑی ہمت اور مردانگی سے ہر قسم کے خطرات، حتیٰ کہ موت تک کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی سیرت اس قسم کی نہ ہو، تو پھر کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ آیہ زیر نظر میں آیا ہے **وَإِنَّ تَحْصُنَ لَكُمْ**.... ”خَدَل“ کے معنی ہوتے ہیں کسی جانور کا اپنے گلے سے بچھ کر پیچھے تنہا رہ جانا۔ اور اس طرح ہر خطرہ کا بدف بن جانا۔ اس ایک لفظ میں فرد اور جماعت کا تعلق اور عمل کا رشتہ سمٹ کر آ جاتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی سعی و عمل کو قانون سے ہم آہنگ وہی رکھ سکتا ہے جس کا اس قانون کی حکمیت اور نتیجہ خیزی پر پورا پورا اعتماد ہو۔ اس کو ”توکل“ کہتے ہیں۔

لیکن قانون پر اس قسم کا بھروسہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قانون کی صداقت پر کامل یقین ہو۔ قوانین خداوندی انسانوں تک اُس وحی کے ذریعے پہنچتے تھے جو اُن کے رسول پر نازل ہوتی تھی۔ وحی کا ذریعہ اس قدر غیر محسوس

ہوتا تھا کہ کوئی شخص کسی طریق سے معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ جس بات کو رسول وحی خداوندی کہہ کر پیش کرتا ہے وہ فی الواقع منزل من اللہ ہے۔ اس کا ایک ہی طریق تھا۔ اور وہ یہ کہ رسول کے متعلق یقین ہو کہ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ اس میں کذب و افتراء کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم کی رو سے ایمان کے معنی ہیں قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد حقیقت مطلقہ کا یقین کرنا۔ قلب و دماغ کے اس اطمینان کے لئے ضروری ہے کہ ان غور و فکر اور علم و بصیرت سے کام لے (۲۵) لیکن رسول کے دعویٰ (یعنی اس کی پیش کردہ وحی) پر غور و

فکر پر ہی آمادہ ہو گا جو یہ سمجھے کہ اس دعویٰ کا پیش کرنے والا جھوٹا اور مکار نہیں۔ سچا اور راست باز ہے۔ یہ وجہ ہے جو حضور نے اپنے دعویٰ نبوت کے ثبوت کے لئے اپنی قبل از نبوت زندگی کو بطور دلیل پیش کیا تھا (۱۶)۔ اس طرح غور و فکر کے بعد ان اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ جو کچھ یہ نبی پیش کرتا ہے وہ اس کی اپنی یا کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے (اور ہمارے زمانے میں اس کا امکان زیادہ ہو گیا ہے) کہ کوئی دانشور براہ راست قرآن کریم پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ یہ کتاب الہی ذہن کی تخلیق نہیں۔ اور اس طرح حضور کی صداقت پر ایمان لے آئے۔

دونوں صورتوں میں نبوت کے مدعی کی صداقت پر ایمان ضروری ہے۔ یعنی اس بات پر ایمان کہ اس کا یہ دعویٰ کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے حقیقت پر مبنی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو کچھ اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے، یہ اس میں کس قسم کی تحریف۔ آمیزش اور خیانت نہیں کرتا۔ اسے سن و سون دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ نبی کی اس خصوصیت کے اظہار کے لئے فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلُّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۱۶)

نبی کے لئے ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی وحی میں کسی قسم کی خیانت کرے۔ (انبیاء سابقہ میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے متبعین نے بعد میں ان کی وحی میں خیانت کر دی)۔ اب جب کہ خدا کی وحی پھر اپنی اصلی شکل میں آگئی ہے تو جن لوگوں نے انبیاء سابقہ کی وحی میں خیانت کی تھی، ان کی تلخی کھل جائے گی۔ اور خیانت کے ان مجرمین کو ان کے جرائم کی منازل مل جائے گی۔ (یہاں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی) لیکن ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

حضور نبی اکرم نے وحی خداوندی (قرآن مجید) کا ایک ایک لفظ انسانوں تک پہنچا دیا۔ اسے مرتب، منضبط اور تحریری شکل میں جامع طور پر اُمت کو دیا، اور سینکڑوں ہزاروں حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، خدا نے قرآن مجید کی حفاظت

کا ذمہ لیا تھا۔ نبی کریم نے اسے اس طرح محفوظ شکل میں اُمت کو عطا کر دیا اور اس طرح اس دعوائے خداوندی کا ثبوت ہم پہنچا دیا کہ نبی اپنی وحی میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ (تفصیل انڈکس میں قرآن کے عنوان کے تحت ملے گی)۔

حضورؐ نے تو وحی کی حفاظت کے لئے اس قدر اہتمام فرمایا، لیکن حضورؐ کے بعد ہم نے اس وحی کے ساتھ وہی کچھ کیا جو کچھ انبیاء سابقہ کی امتوں نے، اُن انبیاء کی وحی کے ساتھ کیا تھا۔۔۔ ہم نے :-

۱۔ اختلافِ قرأت کا عقیدہ وضع کیا۔ اختلافِ قرأت کے یہ معنی ہیں کہ مروجہ قرآنی نسخوں میں جس انداز سے آیات موجود ہیں، اُن میں سے بکثرت آیات، اُن سے مختلف الفاظ میں نازل ہوئی تھیں اور اکابرین صحابہؓ کے پاس ایسے مصاحف (قرآن کے تختے) تھے جن میں وہ آیات اس طرح درج تھیں جس طرح (بقول اُن کے) وہ درحقیقت نازل ہوئی تھیں۔ (یہ تمام تفصیل ادارہ طبع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" میں ملے گی) چنانچہ آپ قرآن مجید کے تراجم اور تفسیر میں اکثر ایسا لکھا دیکھیں گے کہ یہ آیت "اس قرآن" میں تویوں ہے۔ لیکن قرأتِ حضرت ابن عباسؓ (وطیرہ) میں یہ اس طرح آئی ہے۔ سوچئے کہ اس سے اس وحی پر کچھ بھی یقین اور اعتماد باقی رہ جاتا ہے جو حضورؐ پر نازل ہوئی تھی؟ (نیز دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۱۲)۔

۲۔ پھر یہ عقیدہ وضع کیا کہ وحی ساری کی ساری قرآن کریم میں مندرج نہیں۔ اس کے علاوہ مشلہ، معہ، قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل، اور وحی بھی نازل ہوئی تھی جو احادیث میں مندرج ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے "قرآنی وحی" کی حفاظت کا تو اُن قدر اہتمام اور انتظام کیا لیکن (وحی کے دوسرے حصے) احادیث کو نہ لکھایا۔ نہ صحابہؓ کو یاد کرایا۔ نہ ان کا کوئی مصدقہ مجموعہ اُمت کو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُمت میں ہزاروں ایسی حدیثیں پھیلی ہوئی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح مانا جائے کہ ہر ہاکی تعداد میں یہ حدیثیں وحی خداوندی تھیں، تو فرمائے حضورؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آئے گا جو وحی خداوندی کو ایسی حالت میں چھوڑ گئے؟ اسی طرح ناسخ و منسوخ کا عقیدہ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۵)۔

۳۔ یہاں تک تو اربابِ شریعت گئے تھے۔ اہلِ طریقت ایک قدم اور آگے بڑھے انہوں نے ایک حدیث وضع کی جس کی دوسے حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ نبی اکرمؐ نے مجھے علم کے دو بندہ بت دیئے تھے۔

قرآن کے باطنی معانی | ایک بہترین کو تو میں نے کھول کر اُمت کو دے دیا۔ اگر دوسرا بہترین کھولتا تو میرا کلاٹ لٹا جاتا۔

(بخاری باب العلم)۔ ارباب طریقت کا کہنا ہے کہ اس دوسرے برتن میں قرآن کے باطنی (یعنی حقیقی) معانی اور تصوف کے رموز و اسرار بند تھے۔ یہ علم صوفیاء میں سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے اور ”مغز دین“ ہے۔

۴۔ ان کے علاوہ ہم نے دجی خداوندی میں کس کس طریق سے خیانت کی (اسے کس کس طریق سے چھپا کر اور اس سے خارج کو وحی بنا کر اُس کا اتباع شروع کر دیا) اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم ص ۱۲۵ زیر آیت (۱۶۱)۔ اور انڈ کس میں تصوف کا عنوان ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے ہمارا جو حشر ہوا (اور ہو رہا ہے) اس کے متعلق اگلی آیت میں فرمایا :-

۳
۱۶۱
اَفَمِنْ اَتْبَعَ رِضْوَانِ اللّٰهِ كَمَنْ بَاَءَ بِسَخَطِ مِّنَ اللّٰهِ وَمَا وُصِّلَتْ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۶۱)

یاد رکھو! جو شخص دجی خداوندی سے پورا پورا ہم آہنگ ہو جائے، اُس کی کامل اطاعت کرے، اس کی حالت کبھی اس شخص جیسی نہیں ہو سکتی جو اس کے خلاف چلے، اور یوں عذاب خداوندی کا مستوجب بن جائے (جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کا فطری نتیجہ ہے)۔ ایسے شخص کا مقام جہنم ہے۔ کیسی بُری ہے یہ منزل جہاں انسان کی بے راہ روی اسے پہنچا دیتی ہے!

رضوان اللہ کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم ص ۲۵۸ زیر آیت (۱۶۱) دیکھئے۔ اور سَخَطُ (غضب) کے لئے جلد اول ص ۵۴ زیر آیت (۱۶۱)۔ سَخَطُ کے قرآنی استعمال کے لئے دیگر آیات (۵۸، ۲۸-۲۶) دیکھئے۔ مقصد ہے قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کا تباہ کن نتیجہ۔ اس کے برعکس، ارباب رضوان اللہ کے متعلق فرمایا :-

۳
۱۶۲
هُمْ دَسَخَتْ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۱۶۲)

اس کے برعکس قوانین خداوندی کے مطابق چلنے والوں کے ”دجات“ اُن کی سعی و عمل کی نسبت سے، متعین ہوتے ہیں (۱۶۲)۔ وہ شرفِ انسانیت کے ارتقاء کی سیڑھیاں چڑھتے، بلند سے بلند تر مقامات پر پہنچتے جاتے ہیں (۱۶۲)۔ خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے کسی کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہتا۔

واضح رہے کہ انسان ہونے کی جہت سے تو ہر انسان واجب التکریم ہے (۱۶۲) لیکن اس کے بعد مختلف انسانوں کے مدارج، اُن کے اعمال (اخلاق و کردار) کے مطابق متعین ہوتے ہیں

اسلامی معاشرہ میں بھی اور بارگاہِ خداوندی میں بھی

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے خدا نے اپنا رسول بھیجا :

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۳/۱۶۳)

جب کامیابی اور ناکامی، صحیح اور غلط روش، کا دار و مدار قانونِ خداوندی پر ٹھہرا جو وحی کے ذریعے ملتا ہے، تو نوعِ انسان کے پاس، اس قانون کا، اپنی حقیقی شکل میں رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے انہی میں سے، ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا۔ یہ ایمان والوں پر، خدا کا احسان ہے (۳/۱۶۳)۔ اس لئے کہ وحی کسب و مہر سے نہیں مل سکتی۔ خدا کی طرف سے وہی طور پر ہی مل سکتی تھی۔ وہ رسول، ان کے سامنے، قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جاتی ہے (۳/۱۶۳) (۹/۱۱) ذ (۹۲/۱۸)۔ انہیں قانون اور اس کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اندھا دھند نہیں کراتا۔ ہر بات کو اچھی طرح، ذہن نشین کر کر کے، علیٰ وجہ البصیرت اطاعت کراتا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتظام نہ ہوتا تو لوگ اسی طرح، حیران و سرگرداں، راہ گم کردہ، کھوٹے ہوئے پھرتے، جس طرح اس سے پہلے پھرتے تھے۔ رسولؐ نے اس نظامِ خداوندی کو عملاً مشکل کر کے دکھا دیا، اور خدا نے اس کے ضابطہ (قرآن) کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا (۱۶/۱۰۱)۔

رسول کے جن فرائض یا مناصب کا یہاں بیان ہوا ہے، ان کا ذکر دیگر مقامات میں بھی انہی الفاظ میں آیا ہے، یعنی فرائض رسالت

۱۔ آیاتِ خداوندی (وحی الہی) کا دوسروں کے سامنے پیش کرنا۔ اسے تبلیغِ رسالت کہا جاتا ہے۔
۲۔ آیاتِ خداوندی کو پیش ہی نہیں کرنا، بلکہ انہیں سمجھانا بھی کہ قوانینِ خداوندی کیا ہیں اور ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ اسے تعلیمِ کتاب و حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ اور پھر ایسا عملی نظام قائم کرنا جس میں افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ان کی ذات کا ارتقاء ہوتا جائے۔ اسے تزکیہ ذات کہا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم ص ۲۵ آیت ۱۶۳)۔

تعبیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے دعا کی تھی کہ ذریتِ اسماعیلی میں اس قسم کا رسول مبعوث ہو۔ مطالب الفرقان جلد سوم ص ۶۲۔ آیت (۱۶۴)۔ اور آیت (۱۶۵) (ص ۶۳) میں اس رسول کی بعثت کا ذکر ہے۔ ان فرائض و رسالت کی اہمیت کے پیش نظر، انہیں آیت زیرِ نظر میں بھی دھرایا گیا ہے، نیز آیت (۱۶۶) میں۔

زیرِ نظر آیت میں رسولؐ کی بعثت (یا نزولِ وحی) کو خدا کا احسان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ کس طرح خدا کا احسان ہے اس

کے متعلق اندکس میں وحی کا عنوان دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کا عطا ہونا احسانِ خداوندی تھا

قوانینِ رسولوں کو بلا مزد و معاوضہ عطا کئے (حتیٰ کہ ان میں ان کی سعی و کوشش کا بھی کوئی دخل نہیں تھا جن پر ان کا نزول ہوا تھا)۔ اور اُس کے رسول انہیں بلا مزد و معاوضہ دوسروں تک پہنچاتے اور ان کی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ (سورہ ہود کی ابتدائی آیت میں دیکھئے) ہر رسولؐ اپنی دعوت کو پیش کرنے کے ساتھ ہی اس کا اعلان بھی کرتا تھا: اِقُومُوا لَآ اَسْأَلُكُمْ عَنْہِمْ اَحَبًا (۱۰) اور دیگر آیات) ”اے میری قوم میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا“ یہی اعلان خود حضور نبی اکرمؐ نے بھی کیا (۳/۳۲)۔

آپ سوچئے کہ بھولے ہوئے راہیوں کو، بلا مزد و معاوضہ صبح راستے کا پتہ نشان بنا دینا، ان پر کتنا بڑا احسان ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے برعکس، انسانی رد عمل کو بڑے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی بھولے مسافر کو، بلا مزد و معاوضہ صبح راستہ بتائے اور وہ مسافر، اس رہنما سے کہے کہ چونکہ میں نے تمہارا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا تھا، اس لئے تم میرا احسان مانو، تو اس کا یہ مطالبہ کس قدر مضحکہ انگیز ہو گا۔ اس قسم کی ذہنیت کو واشگاف کرنے کے لئے اُس نے اعراب (بدوؤں) کی مثال پیش کی اور کہا:-

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمْنُوْا عَلٰیٓ اِسْلَامِكُمْۙ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ

اَنْ هٰذَا كُمْۙ بِالْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۳/۶۹)

پھر یہ لوگ (اے رسولؐ!) تجھ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ دھرد۔ بلکہ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کی راہ دکھا دی ہے۔ لہذا، اگر تم واقعی اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے ممنون احسان ہو۔ نہ یہ کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان دھرد۔

ہم نے آیات (۳۸-۱۳۷) تک جنگِ اُحد کا ذکر کرنے کے بعد درمیانی آیت چھوڑ دی تھیں، اور آیت ۱۵۱ سے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا تھا۔ اب پھر اپنی تصادمات کا ذکر ہے۔ جنگِ بدر میں مخالفین کو شکست ہوئی تھی۔ جنگِ اُحد میں بھی وہ پہلے شکست کھا کر بھاگ اٹھے تھے، لیکن بعد میں دوبارہ لوٹ کر آگئے تھے، اس سے مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر میدانِ اپنی کے ہاتھ میں رہا تھا۔ اس کی یاد دلاتے ہوئے کہا:-

۳
۱۶۴
اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِثْلَهَا قُلْتُمْ اِنَّا هَذَا
قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۶۴)۔

مخالفین کے ساتھ مقابلہ میں کامیابی اور ناکامی کا مدار اس پر ہے کہ تم کس حد تک قوانین خداوندی اطاعت کرتے ہو
جنگِ بدر میں تم نے کامل اطاعت کی تو تعداد کی کمی اور سامانِ حرب کی قلت کے باوجود تمہیں کامیابی ہوئی اور دشمن
کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگِ احد میں تم سے لغزش ہو گئی تو تمہیں فتح کے بعد شکست ہو گئی اور تمہیں نقصان
اٹھانا پڑا۔ ہر چند یہ یہ نقصان اس نقصان سے کم تھا جو جنگِ بدر میں دشمن کو تمہارے ہاتھوں اٹھانا پڑا، لیکن بایں ہمہ
تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ نقصان کیوں ہوا! اس کی وجہ کیا ہوئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

قبل اس کے کہ ہم آیت کے باقی حصہ کا مفہوم پیش کریں، ایک اہم سوال کا سامنے لانا ضروری ہے۔ آج ہم پر کوئی مصیبت
آئے۔ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اور اس کے متعلق سوال ہو کہ ایسا کیوں
مصیبت کیوں آتی ہے؟

ہوا؟ تو ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکلے گا کہ اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی۔ سب
کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہ سادہ سے الفاظ تو عوام کی زبان پر تو آئیں گے۔ ”مقربین بارگاہِ خداوندی“ اس سے بھی
آگے بڑھیں گے اور کہیں گے ”مرضی مولا، برہمہ ادلی“ کوئی مصیبت آئے، کسی ہی تکلیف ہو۔ کتنا ہی نقصان ہو۔
زبان پر حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف کبیدگی پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ خدا کے فیصلہ
کے خلاف چیلنج ہو گا۔ مرضی مولا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں تو کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ
مرضی یار کے خلاف نہ ہو۔ لوگ میرے لئے دعا نہ کریں۔

لیکن معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب کیا دیا تھا؟

سوال یہ تھا کہ اِنَّا هَذَا — یہ مصیبت کیوں آئی۔ یہ نقصان کیوں اٹھانا پڑا۔ اس کا
ہماری اپنی وجہ سے

ذمہ دار کون ہے؟ جواب ملا — قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔ اے رسول!

ان سے کہہ دو کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ دار خود تم ہو۔

ذرا غور کیجئے۔ کہنے والا خود خدا۔ جس کی وساطت سے یہ کہا گیا وہ رسول جن سے یہ کہا گیا وہ صحابہ کی جماعت۔ اس سے

بڑھ کر ”لقرب بارگاہِ خداوندی“ کا مقام کون سا ہو گا؟ لیکن اس کے جواب میں ”مرضی مولا“ کا شائبہ نک نہیں آیا۔ صاف

الفاظ میں کہہ دیا، هَذَا مِنْ اَنْفُسِكُمْ۔

اس کے بعد ہے — اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ — اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، ”اللہ ہر چیز پر قائل ہے۔“

غور کیجئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے بات کیا سامنے آتی ہے ؟

اے رسول ! یہ پوچھتے ہیں کہ یہ مصیبت کیوں آئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے ؟ ان سے کہہ دو کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ اور اس کے بعد — اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

کہئے کہ اس ٹکڑے کا سابقہ ٹکڑوں سے کوئی ربط ہے ؟ اس سے سابقہ جواب کا مفہوم باقی رہتا ہے ؟ کیا اس سے (CONFUSION) پیدا نہیں ہو جاتی کہ خدا کہنا کیا چاہتا ہے ؟ وہ ایک طرف کہتا ہے کہ اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اور دوسری طرف کہتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے مروجہ تراجم سے کس قدر الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کے معنی ہیں : اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اگر گناہات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ جنگ بدر میں تم نے ان قوانین کی اطاعت کی، تمہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ — جنگ احد میں تم نے ان (قوانین) سے سرتابی بھرتی، نقصان اٹھایا۔ بات صاف ہے۔ جو شخص سنگھیا بھاٹک لیتا ہے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی موت جوتی ہے خدا کے اس قانون کے مطابق کہ سنگھیا بھاٹک ہے۔ (یا سنگھیا کی اس قدر مقدار بھاٹک۔ اسی کو پیمانہ کہتے ہیں)۔ لیکن اس کی موت کی ذمہ داری تو خود اس شخص پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی موت خریدتا ہے۔ اسی لئے اسے خودکشی کہتے ہیں : هُوَ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَا كَانَ يَفْعَلُ

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کا یہ مفہوم ہے۔

اس کے بعد ہے :-

﴿ ۳ ﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ (۳/۱۶۵)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے — جو تکلیف تمہیں اس جنگ میں پہنچی وہ خدا کے حکم سے تھی، ”یہاں اِذْن کا ترجمہ حکم کر دینے سے وہی الجھن پیدا ہو گئی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اگر یہ کچھ خدا کے حکم سے ہوا تھا، تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا تھا کہ هُوَ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَا كَانَ يَفْعَلُ : یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت تھی ؟ ”اِذْن“ کے معنی بھی قانون ہیں۔ اسی لئے اس بات کو پھر دہرایا گیا جو پہلے کہی گئی تھی کہ یہ کچھ ہوا ہے خدا کے قانون کے مطابق

اِذْن کے معنی

لیکن اس کے ذمہ دار خود تم ہو۔ چونکہ تقدیر اور اِذْن کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس مقام پر اسی پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ (اِذْن کس میں تقدیر اور اِذْن کا عنوان دیکھئے)۔ اس کے بعد کہا کہ اس شکست سے نقصان تو تمہارا ضرور ہوا، لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ اور وہ یہ کہ وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُؤْمِنِينَ

وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ خَافُوا (۱۶۵-۱۶۴) اس سے مومن اور منافق الگ الگ ہو گئے۔ (منافقین کے متعلق سابقہ جلدوں میں اندکس کی مدد سے دیکھئے)۔ منافقین کی یہ حالت ہے۔

۳
۱۶۶
وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَا اتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكَفَرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ
بِأَفْوَهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْنُيُونَ (۱۶۶)

جب ان (منافقین) سے کہا گیا کہ چلو! نظام خداوندی کے قیام کے لئے دشمن سے جنگ کرو، یا (حسب موقعہ) مدافعت کرو، تو یہ بہانے بنا کر ادھر ادھر کھسک گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ تمہیں کامیابی ہوئی ہے (نواب کہتے ہیں کہ ہمیں اس کا یقین نہیں تھا کہ وہاں جنگ ہوگی۔ اگر ہمیں اس کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ہم تمہیں اکیلا چھوڑ دیتے ان کا یہ انداز ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب ہے۔ یہ لوگ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔ اور اللہ پر خوب روشن ہے کہ یہ ظاہر کیا کرتے ہیں اور چھپاتے کیا ہیں۔

منافقت کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے: يَقُولُونَ بِأَفْوَهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ۔ وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر قلب اور زبان میں ہم آہنگی کا نہ ہونا منافقت ہے جس سے اور جہاں بھی اس طرز عمل کا مظاہرہ ہو، وہ منافق ہے۔ منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک خصلت کا نام ہے ایسی ہی جیسے جھوٹ بولنے والوں کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ جھوٹ ایک خصلت کا نام ہے۔ جہاں اور جس سے بھی اس کا مظاہرہ ہو، وہ جھوٹا ہے۔ منافقت کی خصلت کے متعلق کہا کہ لِلْكَفَرِ أَقْرَبُ لِلْإِيمَانِ۔ ”یہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔“ اس سے اس جرم کی شدت کا اندازہ لگا لیجئے (منافقین کی مزید تفصیلات کے لئے اندکس دیکھئے)۔ جنگ کے سلسلے میں جن منافقین کا ذکر آیا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ

۳
۱۶۷
الَّذِينَ قَالُوا إِخْوَانُهُمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قَاتَلُوا قُلُوبًا فَادْسَرُوا عَنِ
أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۱۶۷)

ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ لوگ خود بھی میدان جنگ میں نہ گئے، اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور جو لوگ جنگ میں شریک ہوئے، ان کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے ناحق جان گنوائی۔ اگر وہ ہماری بات مانتے تو کبھی قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ جو جنگ میں نہ جلتے وہ موت سے محفوظ رہتا ہے، تو تم ذرا ایسا کر کے دکھاؤ کہ جب تمہارے سامنے موت آکھڑی ہو، تو اسے نکال باہر کرو، اور اس طرح ہمیشہ زندہ رہو۔

اس کے بعد بتایا کہ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کے مراتب مدارج کیا ہوتے ہیں۔ فرمایا :-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُدْفِنُونَ ۝

ان کو تاہ اندیشوں کو کیا خبر کہ موت اور زندگی کسے کہتے ہیں؟ ان سے کہو کہ جو لوگ نظام خداوندی کی راہ میں قتل

ہو جائیں، اُن کے متعلق یہ گمان تک بھی ذکر و ذکر وہ مر گئے (۱۵۵)۔ اس کی موت، حیات، با شرف ہے (۱۵۵)۔ انہیں

ان کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے زندگی اور ارتقاء کے تمام سامان میسر ہیں (زندگی، موت کے ساتھ ختم

نہیں ہو جاتی) ۱۶۸

ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ

يَكُنْ لَهُمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

وہ اپنے بلند مقامات کو دیکھ کر، جو انہیں عنایات خداوندی سے ملتے ہیں بہت خوش ہوتے ہیں اور اس احساس سے

کہ، اُن کی اس قربانی سے اُن لوگوں کے لئے جو ابھی دنیا میں موجود ہیں، ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں وہ ہر

طرح کے خوف و خزن سے مامون ہوں گئے ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

وہ ان آسائشوں اور راحتوں سے جو فوار شابت خداوندی سے انہیں حاصل ہوتی ہیں بے حد خوش ہوتے ہیں نیز

اس حقیقت سے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کسی ایمان والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اس کا پورا

لے طبعی موت، ہر ذی حیات کے لئے ہے (۱۸۴)۔ اس میں کسی کی استثناء نہیں (۳۹) اسی طرح مرنے کے بعد

زندگی بھی ہر انسان کے لئے ہے (۲۸)۔ یہاں مقتولین فی سبیل اللہ کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین نے کہا تھا

کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو مارے نہ جاتے۔ ویسے بھی اہل جنت کی زندگی اور جہنمیوں کی زندگی میں زمین آسمان کا

فرق ہے۔ جہنم والے نہ زندہ ہوتے ہیں نہ مردہ (۲۴)۔ انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں

(۱۲) اہل جنت کی زندگی بٹ رتوں کی زندگی ہے (۳۰) یہ خصوصیت بھی صرف انہی کے لئے نہیں جو میدان جنگ میں قتل ہو جائیں

جو اس جدوجہد میں قتل ہو جائے یا ویسے ہی مر جائے، اس میں سب شامل ہیں (۱۵۶) ۲/۴ ذ (۱۱۱-۱۱۲)۔ یہ بھی واضح

رہے کہ جو اس دنیا سے چلا جائے، اس کا اس دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا (۳۵) ۳/۴ ذ (۱۱۳-۱۱۴) ۵/۴

پورا بدلہ دیتا ہے۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس کے دھرانے کی یہاں ضرورت نہیں (انڈکس میں مقتولین فی سبیل اللہ اور شہداء کے عنوانات دیکھئے)۔ نیز اسی جلد میں زیر آیات (۱۵۵-۱۵۷)

اس کے بعد ان مجاہدین (شہداء اور غازیوں) کی خصوصیات کا تذکرہ جمیلہ ان الفاظ میں کیا :-

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ثُمَّ الَّذِينَ
اَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (۱۶۱)

ان مؤمنین کے اعمال کا بدلہ جو مصائب و مشکلات کے زخم خوردہ ہونے کے باوجود، اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی)

کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سرفروشانہ باہر نکل آتے ہیں (اسی سے وہ حقیقی زندگی کے مستحق قرار پاتے ہیں)۔

یہ ہے قانونِ خداوندی کی نگہداشت کا وہ حسن کارانہ شعائرِ زندگی جس کا ایسا عظیم اجر ملتا ہے۔

سوئے انفال میں اللہ اور رسول کی دعوت کے متعلق کہا کہ وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلا رہے ہیں جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی (۱۶۱)۔ یہ دعوت ان لوگوں کو دی جا رہی تھی جو طبعی طور پر (PHYSICALLY) زندہ تھے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ

قرآن کریم کے نزدیک "زندگی" طبعی طور پر سانس لینے کا نام نہیں۔ یہ تو محض حیوانی
موت و حیات کا مفہوم سطح کی زندگی ہے۔ اصل حیات اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے جینا اور بوقت

ضرورت اس کی خاطر جان دے دینے کا نام ہے۔

یہ وہ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ہیں کہ

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَلَّهُمْ
اِيْمَانُنَّ ۖ وَقَالُوْا احْسِبْنَا اللّٰهَ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (۱۶۲)

یہ ہے قانونِ خداوندی کی نگہداشت کا وہ حسن کارانہ شعائرِ زندگی جس کا ایسا عظیم اجر ملتا ہے۔ یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین

ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جوار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے

ڈرنا چاہیئے، تو اس سے ان کا ایمان اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے، اوروہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ،

دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کہے ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت شامل ہے۔ اور یہ وہ قوت

ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ان کے اس ایمان و اعتماد و عزم و استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ

قَاتِلُوا بِعِمَّةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضِّلْ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَلَا تَتَّبِعُوا
رِضْوَانَ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ (۳۱)

۳
۱۷۳

اس عزم و یقین اور جوش و خروش کے ساتھ جماعتِ مؤمنین دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے، نکلی لیکن دشمن جنگ کے بغیر بھاگ اٹھا، اوریوں یہ مجاہد کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر، خدا کی عطا کردہ آسودگیوں اور خوش حالیوں سے بھریاں بھر بھر کر واپس لوٹ آئے۔ یہ سب اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کیا تھا۔ اور قانونِ خداوندی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا پُر اثر اور بار آور واقع ہوا ہے۔

اس کے بعد قرآن نے دشمنوں کی ایک سازش سے متنبہ کیا ہے۔ کہا :-

إِنَّمَا ذَاكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ لَا فَلَ تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ (۳۲)

۳
۱۷۴

یاد رکھو! ان سرکش قوتوں کی (جو تم سے برسرِ پیکار ہیں) چال یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی — پارٹی کی طرف سے دوسروں کے دل میں ڈر اور خوف پیدا کرتے رہتے ہیں (۳۲) لیکن تم جب مومن ہو تو تمہارے لئے ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈرنا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے چاہیے۔ (خدا کے دستوں کو خوف کیسا؟ (۶۴-۶۲) — خوف تو شیطان کے دستوں کو چونا چاہیے)۔

یہ تھے وہ صبر آزاں بہت شکن، جاں گسل مراحل جن سے اسلام اپنے ابتدائی دور سے گزر رہا تھا۔ مدینہ میں جماعتِ مؤمنین کی پناہ گزینوں کی سی زندگی، قریش کی مخالفت کا یہ عالم کہ وہ ہر شکست کے بعد تازہ جوش و خروش اور بکثرت سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ حمد آور ہوتے تھے۔ (عرب اور دیگر منافقین) کی یہ حالت کہ جماعتِ مؤمنین کی فتوحات کو دیکھ کر جنگی بہمت میں ان کے ساتھ تو ہو لیتے تھے لیکن وقت پر دھوکہ دے جاتے تھے۔ ان حالات سے قلبِ نبویؐ کا متاثر ہو جانا قطعاً تعجب انگیز نہ تھا — اپنی خاطر نہیں بلکہ اس احساس سے کہ یہ ٹٹھی بھر جماعت جو ابھی اپنی سابقہ (ہر طرح سے کامیاب) زندگی چھوڑ کر، اس نظامِ نو میں داخل ہوئی ہے اس گمراہی مدام سے کہیں گھبرا نہ جائے۔ اس تاثر کو نازل کرنے کے لئے ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :-

وَلَا يَحْزَنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنُ يُعْصِرُوا وَاللَّهُ شَهِيدٌ
مِّمَّنْ لَّهُمُ حَقٌّ فِي الْأَخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳۳)

۳
۱۷۵

اے رسول! اپنے رفقاء سے کہہ دیجئے کہ جو لوگ کفر کی راہ میں اس تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں، تمہارے لئے ان کی وجہ سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنے اس انکار و سرکشی سے اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

اس سے ان کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ (وہ کچھ قریبی مفاد حاصل کر لیں تو اور بات ہے لیکن مستقبل کی خوشگوار یوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کے لئے گھل گھل کر مرجانا اور تباہ ہو جانا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ جس انجام و عواقب کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کا تعلق نہ انہی لوگوں سے ہے نہ موجودہ مہنگامی حالات سے۔ یہ حق و باطل کے معرکہ اور خیر و شر کی ستیزہ کاری کا ابدی اصول ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوتا ہے اور خیر انجام کار غالب آتا ہے۔ (حق و باطل کی کشمکش کے لئے اندکس میں عنوانِ حق دیکھئے)۔ فرمایا :-

۳
۱۷۶
اِنَّ الَّذِیْنَ اَشْتَرُوا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یُضُرَّوْا اللّٰهَ شَیْئًا ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۳۱)

یہ چیز کچھ (نبی) سے مخصوص نہیں۔ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیتے ہیں تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کا انجام بڑا الم ناک اور درد انگیز ہوتا ہے۔

حق و باطل کی کشمکش میں جس بات سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے — اور وہ مغالطہ بعض اوقات حق کے غالب آنے کے یقین میں بھی تذبذب پیدا کر دیتا ہے — وہ یہ ہے کہ ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو ہستی باطل کی قوتیں سر اٹھائیں غیبی طاقتیں ان کا دیں سر کچل دیں۔ چونکہ دنیا میں ایسا ہوتا نہیں اسی لئے ہمارے دل میں حق کے غلبہ کے بارے میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس باب میں قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے عمل اور اس کی نتیجہ خیزی میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اسے مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب ہونا ہوتا ہے لیکن مہلت کے وقفہ کے بعد۔ اس سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں ”مکافاتِ عمل“ اور ”مہلت کا قانون“ کے عنوانات دیکھئے۔ اسی قانونِ مہلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

۳
۱۷۷
وَلَا یَحْسِبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنْهُمْ اُنْمِلُوْا لَهُمْ خَیْرٌ ۚ لَا نَفْسٌ مِّمُّهُمْ اِنَّمَا تُنْمِلُ
لَهُمْ لِیَزِدَّ اُذُوْا اِشْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (۳۲)

ان لوگوں کو جو قریبی مفاد حاصل ہو جاتے تو یہی چیز انہیں مغالطہ میں ڈال دیتی ہے۔ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات کوئی شے نہیں۔ اس کی یونہی دھکی دی جاتی ہے۔ یہ ان کی غلط نگہی ہے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ فوراً سامنے نہیں آ جاتا۔ ایک وقت کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ (جس طرح بیج کو پھل بننے کے لئے ایک

مدت درکار ہوتی ہے)۔

یہ قانون دہلت، اُن لوگوں کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو آخری تباہی سے پہلے اپنی روش میں اصلاح کریں۔ لیکن جو لوگ اپنی کفر کی روش میں آگے بڑھتے جائیں، اُن کے لئے یہ دہلت کا دقیقہ، نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ اُن کے جرائم کا وزن بڑھتا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اُن کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں تاکہ وہ دلت و خواری کے جہنم میں جا گرتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جماعتِ مؤمنین کو کفار (یعنی کھلے دشمنوں) کے مقابلہ میں منافقین کے ہاتھوں زیادہ تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں یہ مسئلہ بڑا اذیت رساں اور توجہ طلب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں حضور کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ کفار کی مخالفتِ آخرالامر دم توڑ دے گی اور کامیابی تمہارے ہی حصہ میں آئے گی، وہاں منافقین کے متعلق بھی فرمایا کہ ان کا مسئلہ بھی مستقل نہیں۔ یہ چھٹ کر الگ ہو جائیں گے اور آخرالامر تمہاری جماعت

منافقین

خاص مؤمنین پر مشتمل ہوگی۔ اس میں کوئی منافق نہیں ہوگا۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ
مِنَ الطَّيِّبِ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ
شَيْءٍ سُلَيْمٍ مَنْ يَشَاءُ ۖ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ
أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۸)

اس کا بھی یقین رکھو کہ خدا کا قانون ایسا نہیں کہ وہ تمہارے معاشرے کو اس حالت میں رہنے دے جس میں وہ اب ہے۔ کوئی تحریک بھی ہو، اس میں ابتداء ہر قسم کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مصائب اور مشکلات کی بھٹیاں آہستہ آہستہ کھرے اور کھوٹے کو، الگ کرتی جاتی ہیں۔ یہ بات شروع ہی میں از خود نہیں بتا دی جاتی کہ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔ آدمائوں سے اُن کی چھانٹ ہوتی جاتی ہے۔ اور (اس طرح) کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا کہ مجھے محض بدگمانی کی بناء پر اپنے اندر شامل نہیں ہونے دیا گیا، یا الگ کر دیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں غیب سے یہ بات نہیں بتا دی (کہ فلاں منافق ہے اور فلاں مؤمن) اس میں شبہ نہیں کہ ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بعض امورِ غیب کا علم دیتے ہیں۔ (۲۶-۲۷) (۳-۳) (۵۰-۶) (۱۸۸) لیکن اس بات کا علم رسول کو بھی نہیں دیا گیا۔ وہ بھی منافقین کو اُن کے انداز ہی سے پہچان سکتا ہے (۳۰-۳۱)۔ اندر میں ملتا تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم خدا کے قانون اور اُس کے لانے والے کی صداقت پر یقین محکم رکھو (اور یہ نہ خیال کرو کہ اگر یہ سلسلہ خدا کی طرف سے ہے تو اُس نے شروع ہی میں کیوں نہ بتا دیا کہ منافق کون کون ہے)۔ اگر تم نے

اس یقین کو محکم کر لیا اور ان قوانین کی نگہداشت کی تو تمہارے لئے اس کا اجر بہت بڑا ہے۔

اس آیت جلیلہ میں بڑے اہم بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں۔ ان نکات کے متعلق مطالب الفرقان کی جلد اول میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اس میں تو ایک پورا باب منافقین سے متعلق ہے۔ (ص ۲)۔ زیر نظر نکات اس جلد کے صفحات نمبر ۲۲۲-۲۲۴ پر دیکھئے۔ اور علم غیب کے لئے غیب کا عنوان (انڈکس میں)۔ خبیث و طیب منافقین و غلبہ کی یہ علیحدگی رسول اللہ کی زندگی میں ہو چکی تھی اور جنہیں رسول اللہ کے سامنے (صحابہؓ) کہہ کر پکارا گیا ہے وہ سب ایمان میں مخلص اور مومن حقا تھے اور جنت کے مستحق (۸/۴۷) (۹/۱۰۰) (۹۲-۹۴) (۹۸/۲۹) (۵۴/۱۰)۔



ہم نے جنگ کے سلسلہ میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے آیات (۳۸-۱۲۷) کے بعد آیت (۱۵۱/۳) سے سلسلہ کلام شروع کر دیا تھا، اور آیات (۱۵۰-۱۳۹) کو چھوڑ دیا تھا۔ آیت (۱۳۸/۳) کے بعد اتفاق کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق بھی بالواسطہ جنگ ہی سے ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ پہلے آیات (۱۵۰-۱۳۹) کو دیکھ لیا جائے اور اس کے بعد آیت (۱۳۹/۳) سے مسلسل آگے بڑھا جائے۔ آپ سابقہ صفحات میں آیات (۳۸-۱۲۷) پر نگہ باز گشت ڈال لیجئے تاکہ سلسلہ مضامین مستحضر ہو جائے۔ وہاں بات سہو رہی تھی مخالفین کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ اس سلسلہ میں فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَاْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ مَصَافًا مَّضَعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَاتَّقُوا النَّاسَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۱۳۹-۱۳۸/۳)

لیکن تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میدان جنگ میں فتح حاصل ہو گئی تو دین کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہاں کی فتح سے صرف اُن تحریبی قوتوں کی مدافعت ہوتی ہے جو تمہارے نظام کی راہ میں حائل ہوں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ

صحیح خطوط پر متشکل ہو۔ (۲۱۹-۲۱۷/۲)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۲۴۹-۲۷۵/۲) 'معاشرتی تباہی میں سب سے بڑا حصہ ربا کا ہے (یعنی محض سرمایہ سے نفع کمانا)۔ سمجھایا جاتا ہے کہ اس سے دولت بڑھتی ہے۔ انفرادی طور پر تو ایسا ہی نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت اس سے (قومی دولت میں) کمی اور کمزوری واقع ہوتی ہے۔ لہذا، اسے جماعتِ مؤمنین! تم ربا کے (سرمایہ دارانہ) نظام کو اختیار نہ کر لینا۔ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی کامیابی کی صحیح راہ ہے۔ اگر تم نے محنت سے دولت پیدا کرنے کے بجائے، سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرنی شروع کر دی (۳۰-۳۸/۳) تو، ہر اس قوم کی طرح، جو نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتی ہے، تمہارا معاشرہ

بھی جہنمی معاشرہ بن جائے گا۔

ربو کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان، جلد سوم ص ۴۷ زیر آیت ۲۷ میں آچکی ہے۔ وہ بحث اس قدر جامع ہے کہ اس پر کسی اضافہ یا مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زیر نظر آیت بھی وہاں آچکی ہے۔ البتہ ایک نکتہ کی طرف بار دیگر توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ یہاں خطاب ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ یعنی مومنین سے ہے۔ اور کہا یہ گیا ہے کہ تم اس جہنم کے عذاب سے محتاط رہو: ”أَعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ“ جو کہ کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ جلد سوم میں بتایا جا چکا ہے کہ ربو ایک معاشی نظام کا نام ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی ضد ہے، اور وہاں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم ربو کے نظام کو ترک نہ کر دو گے تو اسلامی نظام تمہارے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔ اور یہاں کہا گیا ہے کہ اس صورت میں تم اس عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے۔ جو کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر مومنین (یعنی موجودہ اصطلاح میں مسلمان) اپنے ہاں خلاف قرآن معاشی نظام رائج کر لیں تو ان کا شمار مومنین کے زمرے میں نہیں رہے گا۔ وہ ”خدا اور رسول“ کے دشمن ہو جائیں گے۔ اور کفار کے ساتھ عذابِ جحیم میں ماخوذ۔

اس عذاب سے محفوظ رہنے کی صورت یہ کہ ”وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالسَّوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ“ (۳۱) اسلامی نظام خداوندی کی اطاعت کر دو۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نظام کی اطاعت کر دو۔

دَسَارِعُوهَا إِلَى مَعْفَرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ
وَالْأَرْضُ ۚ لَا أَعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۳۲)

اور (اس طرح) اپنے نشوونما دینے والے کے سایہ حفاظت میں جلدی سے پہنچ جاؤ اور ربوبیتِ خداوندی کی اس جنت کو حاصل کرو جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے (۳۲)۔ یہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار رکھی ہے جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

جنت کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (دیکھئے انگس)۔ وہیں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اُخروی جنت (اور جہنم) پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے جنت (اور جہنم) کا سلسلہ اسی دُنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں جنت کے متعلق کہا گیا کہ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ ۚ۔ اس کی دوستیں ارض و سموات (جملہ کائنات) کو محیط ہیں۔ وہ ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ارضی جنت خود بخود آ جاتی ہے۔ یہ جنت ہے متقیوں کے لئے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ
عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (س۱۳۳)

۳
۱۳۳

یعنی، اُن لوگوں کے لئے جو (دوسروں کی کمائی پر نگاہ رکھنے کے بجائے) زندگی کی ہر حالت — غم و مسرت اور تنگی اور آسودگی — میں، اپنی محنت کی کمائی کو فروعِ ان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ جو اپنی زائد آمد ضرورتِ دولت ہی کو نہیں، قوت اور حرارت کو بھی (خواہ مخواہ مشتعل ہو کر تباہ و برباد کر دینے کے بجائے) تعمیری کاموں کی طرف منتقل (SUBLIMATE) کر دیتے ہیں اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ دوسروں کی طرف سے اُن کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہوتا ہے۔ اُن کا مقصد اپنی ذات اور معاشرہ میں حُسن پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ روش نظامِ خداوندی کے نزدیک بڑی پسندیدہ ہے۔

اس آیت میں ایک بڑا عمیق نفسیاتی نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ مومنین کی صفات میں کہا گیا ہے، وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظِ — ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — غصہ کو دبانے والے — عصرِ حاضر کی سائیکالوجی (علمِ نفس) کی تحقیق یہ ہے کہ غصہ (یا کسی اور جذبہ) کے دبائے (SUPPRESSION OF REPRESSION) سے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں (COMPLEXES) اور اعصابی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسی اعصابی بیماریاں جن کا کوئی طبی (یا طبیعی) سبب معلوم نہ ہو سکے، ان کا علاج نفسیاتی طور پر کیا جاتا ہے۔ یعنی ماہرِ علمِ نفس کرید کرید کر معلوم یہ کرنا ہے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جسے دبا دیا گیا اور وہ اب مرلہن کے تحت الشعور سے اُس کا ذہنی اور اعصابی توازن بگاڑ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غصہ کو دبا دینا قرآنی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

کاظمین الغیظ

سائیکالوجی کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی جذبہ میں کسی دھبہ سے شدت پیدا ہو جائے (شدت کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات کا توازن برقرار رکھنے کے لئے جس قدر جذبہ، توانائی، حرارت وغیرہ کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ ہو جائے) تو ایسی صورت میں اس ”زائد از ضرورت“ جذبہ (یا توانائی) کا رخ کسی دوسری سمت کو موڑ دینا چاہیئے جہاں اسے تعمیری کاموں میں صرف کیا جاسکے۔ اسے ان کی اصطلاح میں (SUBLIMATION) کہتے ہیں۔ یعنی انسانی جذبات یا توانائی کو پست سطح سے اٹھا کر بلند سطح کی طرف لے جانا۔

سائیکالوجی (PSYCHOLOGY) کی ان تحقیقات کو سامنے رکھتے ہوئے اب اس آیت کی طرف آئیے۔ عربوں کے ہاں پانی کی بڑی کمی تھی۔ اُن کے ہاں تو آج بھی یہ حالت ہے کہ اُن کے دشت و صحرا مگھلا ہوا سونا (OIL) اگل رہے ہیں۔ جس سے دنیا بھر کی دولت اُن کی طرف سیلاب کی طرح اُمنڈے چلی آتی ہے لیکن وہ اپنے پینے کا پانی (بند ہرنوں میں)

دوسرے ملکوں کے درآمد کرتے ہیں۔ انہیں ”سونا“ دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ ان سے پانی لیتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ صحرائین عربوں کے لئے پانی کا مسئلہ کس قدر شدید تھا۔

انہی صحراؤں میں کہیں کہیں پانی ہوتا تھا۔ ایسے مقام پر وہ کرتے یہ تھے کہ پاس پاس مہیت سے کنوئیں کھود لیتے تھے، اور انہیں آپس میں زمین دوز ٹالپوں (SUBTERRANEAN CHANNELS) کے ذریعے ملا دیتے تھے تاکہ جب کبھی کسی ایک کنوئیں کا پانی نیچے اتر جائے تو دوسرے کنوئیں کا پانی خود بخود اس طرف آجائے (کیونکہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے)۔ اس طرح ایک کنوئیں کے زائد پانی کو دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل کرنے کے عمل کو وہ ”کفایت“ کہتے تھے۔ غور کیجئے کہ اس کا صحیح مفہوم (SUBLIMATION) نہیں تو اور کیا؟ ”الکاظمین الغیظ“ کے معنی یہ ہیں ان مؤمنین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے ان کے غصہ میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اسے (وحشیوں کی طرح) تخریبی امور میں صرف کریں، اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیتے ہیں تاکہ اس زائد قوت کو تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس طرح (انفرادی طور پر) اس فرد کی ذات کا توازن بھی برقرار رہتا ہے اور (اجتماعی طور پر) معاشرہ کا توازن بھی۔ اسی لئے ان ”الکاظمین الغیظ“ پر عمل کرنے والوں کو محسن کہہ کر پکارا۔ یعنی جن کا توازن برقرار رہتا ہے۔ جن کی ذات اور معاشرہ کا حسن نہیں بگڑتا۔ (تفصیل انڈکس میں حسن کے زیر عنوان ملے گی۔ نیز نفس کے عنوان کے تحت)۔

مومنین کی اگلی خصوصیت یہ بتائی ”وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ“۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں“۔ ”معاف کر دینے“ سے حقیقت نکھر کر سامنے نہیں آتی۔ ”العفو“ کی قرآنی اصطلاح کے متعلق دوسری اور تیسری جلد میں تفصیل آچکی ہے (دیکھئے انڈکس) یہاں عفو سے مراد وہ سلوک اور برتاؤ ہے جو معاشرہ میں دوسرے افراد سے کیا جائے گا۔ عفو کے معنی ہوتے ہیں کسی ناپسندیدہ بات کو زیادہ اہمیت نہ دینا اور ایسے لوگوں سے الجھے بغیر آگے بڑھ جانا۔ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو کمینہ خصلت اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ وہ باہمی معاملات میں سب سے سطح پر اتر آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنے کے بجائے، اپنا دامن بچا کر، شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاؤ اور اس طرح اپنی گراں قیمت صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔ دوسری جگہ ہے: ”وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعَصِّمُونَ“ (۲۱) ”یہ لوگ ہر قسم کی لغویت سے اعراض برتتے ہیں“۔ سورہ لغویت سے اعراض | ”لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنَ مَقْصُورَاتِ الْيَمِينِ“ (۲۵) ”اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی

لغویت ان کی راہ میں آجائے تو وہ اس سے کریمانہ انداز سے گزر کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ ہے عَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کا مفہوم۔ یعنی وہ چھوٹی چھوٹی، ناقابل اعتنا باتوں میں الجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے، بلکہ حُسن کار انداز سے اُن سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مؤمنین کی صفات کے سلسلہ میں کہا :-

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاجِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا
لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ يَصِدُّوا عَلَى
مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (۳۳)

اگر اُن سے کبھی (غلطی سے) کوئی مصیبت حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں تو اُس پر اصرار نہیں کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں (۳۳)۔ اور اُس کے مطابق اپنی اصلاح کر کے اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غلط اقدامات کے مضر اثرات سے قانونِ خداوندی کے سوا کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟ {اس قانون کو (۳۳) میں بیان کر دیا گیا ہے، یعنی تعمیری کاموں سے تخریبی امور کے نقصان کے اثرات کا ازالہ}۔

فَاجِشَةً | غشَاء کے معنی مطالب الفرقان جلد سوم ص ۱۳۶ زیارت (۱۶۸) واضح کئے جا چکے ہیں۔ فَاجِشَةً سے مُراد ہر مصیبت اور قابل مذمت بات ہے۔ اس میں بے حیائی کی باتیں بھی آجاتی ہیں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں : فَعَلُوا فَاجِشَةً اور اَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ۔ فَعَلُوا فَاجِشَةً سے تو کسی مصیبت یا کاسرزد ہو جانا مراد ہے۔ لیکن ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ اس سے الگ ہے۔ آپ سابقہ جلدوں میں نفس کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس پر مرتب ہو جاتا ہے، جو کام اس کے نفس (یا ذات) کی نشو و نما کے راستے میں مخل ہوتے ہیں انہیں اس کے نفس پر ظلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی اپنے آپ پر زیادتی۔ اس زیادتی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان سے کوئی جرم سرزد ہو جائے۔ اس جرم کا ایک اثر معاشرے پر پڑتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا اثر خود اس شخص کی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ یعنی اس کا جرم معاشرہ پر بھی ظلم ہوتا ہے اور اس کی ذات پر بھی ظلم۔

اب دوسری قسم کو لیجئے۔ ایک شخص آپ کو فریب دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس لئے اُس سے معاشرہ پر ظلم سرزد نہیں ہوا۔ لیکن فریب دہی کے ارادے سے اس کے نفس پر تخریبی اثر تو مرتب ہو گیا۔ یعنی اُس نے اس سے اپنے آپ پر ظلم کر لیا۔ (تفصیل مکافاتِ عمل کے عنوان میں ملے

گی۔ دیکھئے انڈکس)

اپنے آپ پر ظلم کی دونوں قسمیں آپ کے سامنے آگئی ہیں جو جرم معاشرہ کے خلاف کیا جائے اور معاشرتی قانون عدل کی رُو سے اس کی سزا بھی مل جائے، اس سے دنیاوی مکافات کا تقاضا تو پورا ہو گیا۔ لیکن اس کا جو اثر اُس شخص کی ذات پر ہوا تھا اُس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ نیشے نے اس لطیف سے فرق کو بڑے طبع انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے، اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اُس سے

جو جرم تم نے اپنے آپ پر کیا ہے اسے کون معاف کر سکے گا؟

اسے معاف کرنے (یعنی اس کا جو اثر انسان کے اپنے نفس پر پڑا ہے، اُس کا اثر بٹانے) کے لئے انسان کو خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اسے توبہ اور استغفار کہا جاتا ہے۔ ان قرآنی اصطلاحات کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بشرح و بسط سے بیان کیا جا چکا ہے (انڈکس میں دیکھئے)۔

یہاں ایک نکتہ ایسا ہے جس کا اثر قانون عدل پر بھی پڑتا ہے۔ ہماری ہاں عام طور پر کسی مجرم کے جرم اور اس جرم کے تکرار و اصرار میں فرق نہیں کیا جاتا۔

سابقہ جلدوں میں جزا اور سزا کے فلسفہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے سامنے لائیے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ قرآن کریم کا مقصود اصلاح ہے، انتقام نہیں۔ انتقام کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے زندگی میں پہلی بار بھی کوئی لغزش سرزد ہو گئی ہے تو اُس کی بھی کھال اُدھیر دی جائے۔ لیکن اصلاح کا تقاضا ہے کہ ملزم اگر اپنے کئے پر نادم ہے تو اسے اپنی اصلاح کا موقع دیا جائے۔ قرآن کریم نے اس مقام پر جو کہا ہے: **وَلَمْ يُصْرِفُوا** **عَلٰی مَا فَعَلُوْا** تو اس نے پہلی بار کے جرم اور اس کے بار بار کے ارتکاب میں فرق کیا ہے۔ ندامت اور توبہ کی رُو سے اصلاح کی صورت میں سزا کی ضرورت نہیں۔ سزا اس مجرم کے لئے ہوگی جو بار بار اس جرم کا اعادہ کرے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ **وَهُمْ يَعْلَمُونَ** — مجرم کو علم ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ خلاف قانون ہے، اگر اسے اس کا علم ہی نہیں، یا وہ دماغی طور پر اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تو پھر بھی اس جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ جو مؤمنین ان خصوصیات اور صفات کے حامل ہوں گے، اُن کے متعلق کہا :-

اُولٰٓئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّتْ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا
اَلَا تُهْرُجُ لِدِينٍ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۵)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی اصلاح کا صلہ یہ ملتا ہے کہ خدا کا قانون ربوبیت اُن کی سابقہ غلطی کے مُضر اثرات سے ان کی حفاظت کر دیتا ہے اور انہیں زندگی کی سدا بہار خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اس دُنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

کام کرنے والوں کا یہ معاوضہ کس قدر حسین و خوشگوار ہے !

یہاں ”نَعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ“ کہہ کر واضح کر دیا کہ یہ صلہ اُن کے اپنے کاموں کا ہے۔ جنت نہ مُنت میں ملتی ہے، نہ سفارش سے۔ یہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

عمل سے زندگی نبتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ حاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ تاری ہے (اقبال) یا اس سے بھی مختصر الفاظ میں : جنت تری پہاں ہے ترے خونِ جگر میں



بات چلی آرہی تھی میدانِ کارزار میں حق و باطل میں تضاد کی۔ اس کے بعد جماعتِ مؤمنین (مجاہدین) کی صفات کا ذکر آگیا۔ انزال بعد پھر اسی سررشتہ معنی کو آگے بڑھایا اور کہا :-

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ (۳۶)

اس ضمن بیان کے بعد پھر اُسی موضوع کی طرف آؤ جو مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اصول یہ بیان کیا جا رہا تھا کہ حق و باطل کے ٹکڑوں میں باطل کی قومیں شکست کھا کر خاسر و نامراد رہ جاتی ہیں۔ یہ کوئی نیا اصول نہیں جو پہلی بار وضع کیا گیا ہو۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے جو شروع سے اسی طرح چلا آ رہا ہے (چنانچہ تم سے پہلے بہت سے نظام اور بہت سی اقوام گزر چکی ہیں۔ ختم تاریخ کے اس ورق پر غور کرو، اور ان برباد شدہ قوموں کی اُبڑی ہوئی بستیوں کو دیکھو۔ تمہیں نظر آجائے گا کہ قوانینِ خداوندی کو ٹھٹھلا نے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

اور اس کے بعد کہا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کی سرگزشت اور اُن کے مآل و عواقب پر نگاہ تو ڈالو، تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم تم سے تاریخی داستانیں بیان کرنا چاہتے ہیں :-

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ (۳۷)

یہ اندازِ تذکیر (یعنی تاریخی شہادتوں سے نتائج اخذ کرنے کا طریق) اس لئے بنایا گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے حقیقت اُبھر کر آجائے، اور ان میں سے جو غلط روش کی تباہیوں سے بچنے کے آرزو مند ہوں انہیں

منزل مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ اور اخلاقی اقدار کے نشانات مل جائیں۔

یہ تعلیم و تذکیر بیان ہے، یعنی تمام نوع انسان کے لئے ضابطہ راہ نمائی۔ ان میں سے مومنین نے ان ابدی صداقتوں کو بنیادی طور پر تسلیم کر لیا ہے اس لئے ان کا نصاب تعلیم دوسرے لوگوں سے مختص ہو گا۔ (یہ اگلی کلاس میں پہنچ چکے ہیں، اس لئے ان کا نصاب مبتدیوں سے آگے ہو گا) تو اس لئے کہا :-

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۳۸)

(خدا کے اس ابدی قانون کے مطابق) اگر تم بھی غلبہ و تسلط کی زندگی چاہتے ہو، تو اس کے لئے ایک اصول یاد رکھو۔ اوردہ یہ کہ جب فتح و کامرانی سے سابقہ زلیست کی فراوانی حاصل ہو، تو اس سے تنہا سے اندر سستی اور کسمندی نہ پیدا ہو جائے (۱۱-۱۳) اور اگر کسی وقت حالات ناسازگار ہو جائیں، تو اس سے تم پر افسردگی نہ چھا جائے۔ اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب تمہیں قرآن میں خداوندی کی صداقت پر پورا پورا یقین ہو۔

جب تم مومن ہو تو غمگینی اور افسردگی کے کیا معنی؟ جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے تم پر کوئی بھی غالب نہیں آ سکے گا (۱۴)۔

جماعت مومنین (اُمت مسلمہ) کا مقام یا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ تمام اقوام عالم پر غالب ہوتی ہے کسی قوم کا ان سے آگے بڑھ جانا تو درکنار کوئی قوم ان کے ہم دوش بھی نہیں ہو سکتی۔ اَعْلَوْنَ کا لفظ اس کی شہادت دیتا ہے یہ (SUPERLATIVE DEGREE) ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

مومن بالائے ہر بالاترے غیرتِ اُویزنا بدہمسرے

اعْلُوْنَ خداوندی ہے کہ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ الْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَافِلًا (۱۶) یہ کبھی ہونہیں سکے گا یہ ناممکن ہے کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب آجائے دے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین (اُمت مسلمہ) کی یہ علامت بتائی ہے جس سے یہ متعین کرنے میں قطعاً کوئی شوبہ نہیں ہو سکتی کہ ہمارا شمار جماعت مومنین میں ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ہم اَعْلَوْنَ — سب سے بلند و بالا نہیں۔ اگر کفار ہم پر غالب ہیں تو خدا کی فیصلہ کی رو سے ہم مومن نہیں۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے، اسی لئے اس میں کسی کے برا متنازع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے بعض دلوں میں یہ خیال ابھر کر اگر مومن ہونے کی شرط اور علامت یہ ہے تو ہمیں جو جنگِ اُحد میں شکست ہوئی تھی (خواہ وہ فتنی اور ہنگامی تھی) تو ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا :-

۳
۱۳۹

اِنْ يَّمْسَسْكُمُ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ط (۳۱)

گردش دوائی | باہمی ٹکراؤ میں ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ آج ایک فریق کا نقصان ہو گیا۔ کل دوسرے فریق کو شکست ہوگی۔ یہ مستقل غلبہ اور مغلوبیت نہیں ہوتی۔

وَيَلِّكَ الْآيَاتُ مِّنْ دُونِهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳۱) یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جنگ و جدل کی ساری تاریخ اس گردش دوائی کا ریکارڈ ہے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۳۱) اس امر کی ہر وقت جانچ ہوتی رہے (تم اپنے آپ کو (TEST) کر سکو کہ تمہارا ایمان کس قدر محکم ہے اور کون اپنے دعوئے ایمان کی عملی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی گردشوں میں اس کی احتیاط برتنی چاہیے کہ تم کسی حالت میں بھی قوانین خداوندی سے سرتابی نہ برتو۔ فتح ہو یا شکست، قوانین خداوندی کا دامن کسی وقت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

۳
۱۴۰

مخوضیات کا قانون وَلِيَمِجَّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكُفْرَيْنَ (۳۱)

یہی وہ ٹکراؤ ہے جس سے وہ جماعت جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتی ہے، نامساعد

حالات کی کٹھالی میں سے نکل کر، کندن بن جاتی ہے۔ اُسے ثبات و استحکام نصیب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ ان

قوانین سے انکار کرتے ہیں، کمزور ہوتے ہوئے مٹ جاتے ہیں۔

محض اور محقق دونوں کا بنیادی مفہوم ”کی کرنا“ ہوتا ہے۔ محض میں آلائشوں کو کم کر کے خالص اور محکم بنادینے کا مفہوم ہوتا ہے، اور محقق میں، قوتوں کو کم کر کے مٹا دینے کا مفہوم آگ ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ سونے کی آلائشوں کو دور کر کے اسے زبر خالص بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ تصادمات اور ٹکراؤ، احتساب و خویش کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتے ہیں :-

۳
۱۴۱

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَلُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (۱۴۱)

یہ ہے مخوضیات کا وہ محکم اصول جس کے مطابق قومیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں۔ اس کے بعد تم اس خیال خام میں مگن رہو کہ تمہیں جو یہی بیٹھے بٹھائے، کامرانوں اور خوشگوار یوں کی جنتی زندگی مل جائے گی، تو یہ تمہاری کتنی بڑی بھول ہوگی۔ یہ جنت حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے

بہشتے بہرِ پاکِ جسمِ بہشت بہشتے بہرِ اربابِ ہمِ بہشت
بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش! بہشتے فی سبیل اللہ ہمِ بہشت (ارمغانِ حجاز)



یہ کہنے کے بعد جنتِ جان کے عوض ملتی ہے جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم نے اپنی جان اور مالِ خدا کے ہاتھوں فرو کر دیا تھا، جنت کے عوض (۹)۔ وہ خدا کے ساتھ تمہارا معاہدہ تھا۔ اب اس معاہدہ کو پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اٹھو اور جان دے کر جنت خرید لو:-

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْا فَقَدْ سَأَلْتُمُوهُ
أَنْ تُمْ تَنْظُرُونَ ؕ (۱۳۲)

تمہیں یہ حکم اصول بھی بنایا گیا تھا کہ جیتا وہی ہے جو (حق کی راہ میں) مرنے کے لئے تیار رہتا ہے (۳۰ ذ ۲۷۳) اس اصول کے مطابق تم، ہمیشہ مرنے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ اس وقت سنو اس کا موقع نہیں آیا تھا۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔ اب تمہارا باطل کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ جس میں موت تمہارے سامنے کھڑی ہوگی، اور تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو گے۔ اب معلوم ہو جائے گا کہ تم میں سے کس کی تمنا خام تھی اور کس کی پختہ!



اس کے بعد وہ آیتِ جلیلہ سامنے آتی ہے جس نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے اہم مسائل حل کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اسلام سے پہلے شخصیت پرستی کا دور تھا۔ سلطنت تھی تو ایک شخص کی ذات سے وابستہ میدانِ جنگ میں شکست و فتح تھی تو ایک شخص (سپہ سالار) کی ذات کے ساتھ مسلک اس وقت نظامِ اجتماعی شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔ ہاں صورتِ تک انہوں نے سامنے نہیں تھا۔ اگر وہ شخص جو اس اجتماعیت کا نقطہٴ پیکار تھا سر جاتا یا قتل کر دیا جاتا تو قوم کا سارا شیرازہ بکھر جاتا۔ آپ دیکھیں گے کہ زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ انسانیت، شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ وہ تاریخ ہوتی ہی شخصیتوں کی تھی۔ لیکن اسلام نے آکر اس قدیم تصور کو کبیر بدل دیا۔ اُس نے کہا کہ قوموں کی ہیئتِ اجتماعیہ شخصیتوں سے وابستہ نہیں، وہ نظام کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے جس قسم کا نظام اُسی قسم کی اس قوم کی ہیئتِ اجتماعی۔ جب تک اس کا نظام قائم رہے گا، وہ قوم زندہ رہے گی۔ جب وہ نظام مُضمحل یا منتشر ہو جائے گا، اس قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لہذا، اب دورِ نظام کا دور ختم ہو گیا ہے، شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔

رسول اللہ نے ایک اُمت کی تشکیل فرمائی اور ایک مملکت قائم کی۔ عہدِ قدیم کے تصور کی رو سے جماعت کے دل میں خیال پیدا ہونا ہوگا کہ اب تو یہ مملکت اس قدر مستحکم ہے کہ کل کو جب حضور دنیا سے تشریف لے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ اُمت میں اولوالعزم شخصیں موجود تھیں، لیکن وہ رسول اللہ کا بدل تو نہیں ہو سکتی تھیں! صحابہؓ کے اس اندیشہ کے پیش نظر (بالخصوص اس لئے کہ اب رسول اللہ خود لڑائیوں میں بھی شریک ہوتے تھے جہاں موت کسی وقت بھی آ سکتی تھی) ان سے کہا گیا :-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَآفَافٍ مَاتَ
أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ
اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (۳۳)

موت اور مقابلہ کا ذکر آگیا ہے تو اس ضمن میں ایک اہم اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تم اپنی زندگی اور فوت کا راز، اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو۔ اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو۔ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف اس باب میں غور جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی طرح، بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہذا، اگر یہ پیغام رسان (محمدؐ) بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے (۳۱/۱۸۲ : ۳۲/۱۸۲) تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے پورا نظام ختم ہو گیا؟ اور اُس کے بعد اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو! جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا، خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدر شناسی کرے گا، تو اُسے اُس کی کوششوں کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ یعنی اس نظام کو، رسول کی موت کے بعد بھی، علیٰ حالہ قائم رکھنے سے۔ اُس وقت رسولؐ کا جانشین (یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی) وہی فرشتہ سرانجام دے گا جو فرشتہ اس وقت یہ رسولؐ (بحیثیت مرکز نظام خداوندی) سرانجام دیتا ہے۔ اس طرح دین (اسلام) آگے چلے گا۔

اس آیت کی رو سے علاوہ دیگر مہمات اصول، ختم نبوت کا مسئلہ بھی نہایت حُسن و خوبی سے حل ہو گیا۔ اگر رسول اللہ کے بعد کسی اور رسول نے بھی آنا ہوتا تو اس آیت میں کہا یہ جاتا کہ اگر کل کو یہ رسول قتل ہو جائے یا اپنی طبعی موت سے انتقال کر جائے تو اس سے دین کا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ جیسا کہ شروع سے ہونا چلا آیا ہے۔ ایک اور رسول آجائے گا اور دین کو پھر سے اس کی اصلی حالت پر لے آئے گا۔ لیکن یہ نہیں کہا۔ اس لئے کہ حضورؐ کی ذات پر سلسلہ وحی ختم ہو گیا۔ آپ کے بعد کسی رسول نے نہیں آتا تھا۔ دین قرآن کی دفتیں میں مکمل ہو گیا۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ رسول اللہؐ نے قرآنی اصول و اقدار کے مطابق ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا۔ یہ نظام قرآنی بنیادوں پر آگے چلے گا۔

ختم نبوت

لہذا رسول اللہ کی وفات سے اسلام پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

قبل اس کے کہ ہم اس دنگلدار اور عبرت انگیز المیہ کو سامنے لائیں کہ حضورؐ کے بعد ہم (مسلمانوں) نے کیا کیا، ایک نکتہ کی مختصر سی وضاحت ضروری ہے۔ اس آیت (۳۴) میں کہا گیا ہے کہ اگر حضورؐ قتل کر دیئے جائیں یا وفات پا جائیں، قتل انبیاء

حضورؐ کی وفات یا قتل | (اور اس کے امکان) کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم، ص ۳۲ (دیکھ آیت ۲۵) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ جہاں تک حضورؐ کی وفات کا تعلق، قرآن کریم نے یہ کہہ کر اس کی بھی

وضاحت کر دی کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهٗم مَّيِّتُوْنَ۔ (۳۹) ”یہ حقیقت ہے کہ (اے رسولؐ) تم نے بھی مرنا ہے اور ان (تمہارے مخالفین) نے بھی مرنا ہے“ اور دوسرے مقام پر یہ کلیہ بیان کر دیا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذٰلِقَةٌ لِّلْمَوْتِ (۳۶)۔ ”ہر نفس (ذی حیات) نے موت کا مزہ چھکتا ہے۔ موت ہر ایک کو آتی ہے“

آیت (۳۴) میں جو کہا گیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ وَاِنَّکَ عِنْدَ رَبِّکَ لَبَیْطٌ مُّبِیْنٌ (۳۴) اس رسولؐ سے پہلے بھی جتنے رسولؐ آئے، سب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس میں کسی کی بھی استثنا نہیں۔ اس سے وفات حضرت شیخ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

اب آئیے اس المیہ کی طرف جسے ہم نے دل گداز اور عبرت انگیز کہہ کر پکارا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے کہا تھا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد تم زمانہ قبل از اسلام کی روشنی کہن کی طرف نہ پلٹ جانا۔ اسلام نام تھا کتاب اللہ پر مبنی نظام کا جس کا مدار شخصیتوں پر نہیں تھا، اور روشنی کہن سے مراد تھی شخصیت پرستی۔ یہ تھی وہ وارننگ جو اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ بعینہ وہی جس سے خدا نے منع کیا تھا۔

حضورؐ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک تو اسلام کا نظام قائم رہا۔ اس کے بعد ہم شخصیتوں کی طرف پلٹ گئے۔ سب سے پہلے نظام کی جگہ شخصی حکومت نے لی، اور اس کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں شخصیت پرستی درآمدی — نظام کی عدم موجودگی کا لازمی نتیجہ شخصیت پرستی ہوتا ہے۔ نظام میں جملہ امور کے فیصلے مرکز

حضورؐ کی وفات کے بعد | ملت حکومت کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف سے کئے جاتے، اور حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ نظام کے نہ رہنے سے زندگی میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی۔ دنیاوی امور حکومت نے سنبھال لئے اور ”دینی امور“ (یعنی مذہبی امور) علماء کے سپرد کر لئے گئے۔ علماء میں سے ایک گروہ نے ائمہ محدثین (امام بخاری، امام مسلم وغیرہ) کو انتھارٹی بنالیا اور دوسرے گروہ نے ائمہ فقہ (امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام حنبل رحمہم اللہ) کو اپنا مطاع۔ جب مدار شخصیتیں ٹھہریں تو پھر ان کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔ جس نے کسی شخصیت کو پسند کیا، اُسے اپنا

امام تسلیم کر لیا۔ (واضح رہے کہ میں یہاں شیعہ حضرات کے ائمہ کا ذکر نہیں کر رہا۔ وہ اپنے ائمہ کو مامورین اللہ مانتے ہیں، اور انہیں حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں نظام کا تصور ہی نہیں) یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک مسلسل اور متواتر چلا آ رہا ہے۔ اس تمام دوران میں اسلام بحیثیت نظام خداوندی کہیں قائم نہیں ہوا۔ مسلمان اس زمانہ قبل از اسلام کی روش پر گامزن چلے آئے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا۔ شریعت کا کوئی مسئلہ ہو، اس کی سدکشی کسی شخصیت پر جا کر رک جاتی ہے۔ نظام میں اس کی سد کتاب اللہ ہوتی ہے۔ اس کو قرآن کریم نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا ہے: وَمَنْ تَمَّ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۳/۱۱۱) اس کا واضح ارشاد اور حتمی فیصلہ ہے۔ یعنی ”جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے (معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کی رد سے نہیں کرتے) وہی کافر ہیں۔“

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے شخصیت پرستی کے دور کو ابدی طور پر ختم کرنے کے لئے ختم نبوت کا اعلان کیا گیا تھا۔ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ امت کی ہدایت کے لئے اب کوئی مامورین اللہ نہیں آئے گا۔ امت کو اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق اپنے نظام کی رو سے کرنے ہوں گے۔ ہم نے جب شخصیت پرستی کا اجرا (یا احیا) کیا تو مامورین من اللہ کا تصور بھی ہمارے تحت الشعور میں کر دیا۔ اس کے لئے ہم نے

مجدد مہدی ہر صدی پر (مامورین اللہ) مجدّد کا عقیدہ وضع کیا۔ وحی کے قائم مقام، کشف اور الہام کا

نظر پرستعار لیا۔ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول اور امام مہدیؑ کی آمد کا عقیدہ وضع کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے ہاں یہ تمام عقائد بھی مسلم ہیں اور ختم نبوت پر ایمان بھی اپنی جگہ قائم۔ مدعی نبوت کے خلاف مناظرہ کرنے والے وہ علماء ہوتے ہیں جو کشف و الہام، مجدّد، نزول حضرت عیسیٰؑ اور آمد امام مہدیؑ کے قائل ہوتے ہیں۔

یہ تمام خلفشار کس بات کا نتیجہ ہے؟ نظام کے باقی نہ رہے گا! ہمارے زمانے میں اسلامی نظام کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام کے داعی کون لوگ ہیں؟ وہی جو شخصیتوں کو اسلام میں سند اور حجّت تسلیم کرتے ہیں اور اپنے اس عقیدہ میں درسی ترمیم بھی برداشت کر لے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ نتیجہ یہ کہ ان کے تصور کے اسلامی نظام میں شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور پبلک لاز (PUBLIC LAWS) اس فقہ کے مطابق جس کے ماننے والوں کی اکثریت ہوگی۔

یاد رکھیے! اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوگا جب :-

اسلامی نظام

۱۔ سب مسلمان ایک امت کے افراد ہوں۔ ان میں نہ مذہبی فرقے ہوں نہ سیاسی پارٹیاں۔

۲۔ ساری قوم پر ایک ضابطہ قوانین لاگو ہو۔ اس میں نہ شخصی قوانین اور پبلک لاز کی تقریق ہو نہ کسی خاص فقہ کا عملی دخل۔ یہ ضابطہ قوانین خدا کی کتاب پر مبنی ہو، اور ان قوانین پر عمل درآمد کے طریق امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں۔

اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ہم اسلام پر نہیں۔ زمانہ قبل از اسلام کی روش پر گامزن ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس سختی سے منع کیا تھا۔

آیت (۳/۱۳۳) میں نبی اکرمؐ کی وفات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے :-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا (۳/۱۳۴)

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: ”کوئی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے۔ لکھا ہوا ہے ایک وقت مقررہ“ (ترجمہ شیخ البند مولانا محمود الحسن مرحوم)۔ اس ترجمہ کی رو سے یہ عقیدہ عام ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اور خدا کے حکم کے بغیر کسی کو موت نہیں آسکتی۔ اس ترجمہ کی رو سے وہ تمام الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر **کیا موت کا وقت مقرر ہے؟** تقدیر کے موضوع میں کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے اندکس)۔ ایک الجھن تو بڑی

واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جرم قتل کی سزا موت مقرر کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ قتل خدا کے حکم سے ہوا اور اس کے مقرر کئے ہوئے وقت پر تو پھر قاتل کا جرم کیا جس کی اسے سزا دی جا رہی ہے؟ ایک طرف خدا قاتل کو حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کو قتل کر دو، اور دوسری طرف وہ عدالت سے کہتا ہے کہ قاتل کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دو!

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اِذْنِ اللہ کے معنی خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ لہذا، آیت کے اتنے حصے کا ترجمہ یہ ہوا کہ ہر شخص کی موت قانون خداوندی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ ”کِتَابًا مُؤَجَّلًا“۔ اس میں مُؤَجَّلًا کا لفظ وضاحت طلب ہے۔

ہمارے ہاں اجل کے معنی کئے جاتے ہیں۔ ”موت“۔ قتل کی اجل آگئی“ عام استعمال کے الفاظ ہیں۔ لیکن عربی زبان

کی رو سے اجل کے معنی ہوتے ہیں دو حادثات یا واقعات کا درمیانی وقفہ۔ اسے مدت یا ميعاد کہا جاتا ہے۔ انسان کی پیدائش اور اس کی موت کے درمیانی وقفہ کو اجل کہا جائے گا۔ اسے عام الفاظ

میں عمر کہا جاتا ہے۔ کِتَابًا مُؤَجَّلًا کے معنی یہ ہیں کہ یہ وقفہ (جسے عمر کہا جاتا ہے) خدا کے قانون طبعی کے مطابق

مقرر کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص حفظانِ صحت سے متعلق قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ درمیانی وقفہ راجل یا عمر لمبا ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص بڑی بے احتیاطی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ عرصہ کم ہو جاتا ہے۔ اور خودکشی کر نیو لیا تو جس وقت بھی چاہیے تو اسے ختم کر سکتا ہے۔ اسی لئے فرمایا: لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۳۱) ”ہر وقفہ قانونِ خداوندی کے مطابق مقرر ہوتا ہے“ پہلے سے مقرر شدہ نہیں ہوتا۔ اس قانون کے مطابق جس کا جی چاہے اپنی عمر گھٹائے جس کا جی چاہے اسے بڑھالے — وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعْمَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ (۳۲)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانی صحت کے متعلق جس قدر تحقیقات ہو رہی ہیں ان کی رُو سے مختلف قوموں کے افراد کی اوسط عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیت زیرِ نظر پر دوبارہ نگاہ ڈالیے:-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا (۳۳)

ہر شخص کی موت خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق واقعہ ہوتی ہے۔ اس کی عمر کا تعین اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

عمر کے تعین کے بعد زندگی کا مقصد بھی انسان خود متعین کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کے لوگ ملیں گے۔ ایک وہ جو محض اس دنیا کے مفادات کو اپنا مقصود و مُنتہا سمجھیں، اور دوسرے وہ جو دنیاوی مفاد کے ساتھ آخری زندگی کے مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ جو جس قسم کا نصب العین اپنے سامنے رکھے گا، اُسی کے مطابق اس کی کوششیں بار آور ہوں گی: وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَسَنَجْزِي الشَّكِرِينَ ۝ (۳۴)

مذہب کی دنیا میں ثواب کا لفظ جس قدر کثیر الاستعمال ہے اسی قدر بعید المفہوم ہے۔ اس قسم کے الفاظ صبح و شام آپ کے سننے میں آتے ہوں گے۔ ”فلاں نماز کے بعد آٹھ نفل پڑھ لئے جائیں تو اس کا بڑا ثواب ہوتا ہے۔“ فجر کی نماز کے بعد یہ وظیفہ پڑھ لیا جائے تو اس کا بہت ثواب ہوتا ہے۔“ فلاں مسجد میں نماز پڑھنے سے سور کعتوں کا ثواب ملتا ہے۔“ آپ نے یہ لفظ سینکڑوں ہزاروں بار سنا ہوگا، لیکن اگر

آپ ان الفاظ کے دھرانے والوں سے پوچھیں کہ صاحب! یہ ثواب ہونا کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے۔ وہ بھی اتنا ہی کہیں گے کہ ”ثواب ہوتا ہے“ اگر آپ یہ پوچھیں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا تھا اس پر تو میں نے عمل کر دیا، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مجھے اس کا ثواب بھی ملا ہے؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کا حساب خدا کے ہاں ہوتا ہے۔ یعنی ثواب ایک ایسا لفظ ہے جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں۔ اس کا تعلق آپ کے اعتقاد سے ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ فلاں کام کرنے سے مجھے اتنا ثواب ہوگا، تو آپ کو اس سے اطمینان حاصل ہو جائے گا

کہ (مجھے اتنا ثواب ہو گیا)۔ اس کا ثبوت کچھ نہیں کہ آپ کو واقعی ثواب مل گیا ہے؟

جو چیز چلی جائے، اس کے پھر سے واپس مل جانے، کو عربی زبان میں ثواب کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں ”ثواب جسمہ“ ثواباً واثاباً۔ بیماری کے بعد اس کا جسم پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا اور اس طرح اس کی ضائع شدہ صحت اور توانائی پھر عود آئی۔ اگر کسی حوص کی یہ کیفیت ہو کہ اس سے جس قدر پانی نکلے اُننا ہی پیچھے سے آتا جائے تو ایسے ثواب المار کہیں گے۔

آپ کوئی بھی کام کیجئے، اس میں آپ کا وقت توانائی اور ذہنی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا وہ کام بے کا ہے۔ یعنی اس کا کوئی حاصل نہیں۔ تو آپ نے جو کچھ صرف کیا تھا، سب ضائع چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ کام نتیجہ خیز ہے، تو آپ نے جو کچھ صرف کیا تھا، وہ سب واپس مل جاتا ہے۔ اس (RESTORATION) کا نام ثواب ہے۔ کاروباری اصطلاح میں اسے اس سرمایہ کی (RETURN) کہیں گے جو لگایا گیا تھا۔ لہذا، ثواب کے معنی انسانی اعمال کے نتائج ہوں گے۔ جس قسم کے اعمال اسی قسم کے نتائج (ثواب)۔ نتائج کے لئے بھی قرآن میں یہ لفظ آیا ہے۔ سورہ التطفیف میں ہے: هَلْ تُؤْتِي الْكَفَّاسُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲۴) کفار کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ (اس مادہ سے کچھ اور معانی بھی آتے ہیں، ان کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہو گا)۔

سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ قوانین خداوندی کے مطابق کام کرنے کے نتائج اسی دنیا میں بھی مرتب ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی سامنے آئیں گے۔ (انڈکس میں دیکھئے عنوان ”دنیا“) اسی بنا پر آیہ زیر نظر میں ثواب الدنیا اور ثواب الاخرۃ کہا گیا ہے۔ اور میں نے اس کا ترجمہ دنیاوی مفاد اور اخروی مفاد کیا ہے۔ اسے آپ دنیاوی مفاد اور اخروی مفاد کا حصہ کہہ سکتے ہیں۔ مقصد بہر حال اعمال کے نتائج ہی ہے۔ اس ثواب کا مفہوم نظام خداوندی کی رو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں ہیں۔

ثواب کے اس قرآنی مفہوم سے یہ بھی واضح ہے کہ ”ایصالِ ثواب“ کا عقیدہ غیر قرآنی ہے۔ جب ثواب نام ہے ہر شخص کے اپنے عمل کے نتیجہ کا، تو کسی دوسرے کی طرف (اور وہ بھی مُردوں کی طرف) ثواب منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل اس اجمال کی ”مکافاتِ عمل“ کے زیر عنوان ملے گی (دیکھئے انڈکس)



بات کشمکش حق و باطل کی ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں کہا کہ جن تصادمات سے تم دوچار ہو رہے ہو، یہ کوئی بات نہیں۔ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۳
۱۳۵ وَكَاتِبٍ مِّن تَبِيِّ قَتْلٍ مَّعَهُ سَرِيَّةٌ كَثِيرَةٌ ۚ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ (۳۵)

یہ بات کہ، تمہیں اپنے نظام کے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا، کوئی نئی بات نہیں، ہم سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کی معیت میں نظام ربوبیت کے علمبرداروں نے مخالفین سے جنگ کی۔ اس راہ میں انہیں جو تکالیف پیش آئیں ان سے نہ تو ان کے عزائم میں لغزش آئی۔ نہ ان میں کمزوری پیدا ہوئی۔ نہ ہی وہ مسلسل محنت سے ہمت ہار گئے اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔ وہ ان تمام مشکل مراحل میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہے اور اسی لئے خدا کا قانون ان کا ساتھ دیتا رہا۔ اس کے ہاں ثبات اور استقامت بڑی پسندیدہ خصلت ہے (۲/۲۱۴)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ انبیاء کے ساتھ ان کے رفقاء نے بھی اس کشمکش میں برابر کا حصہ لیا۔ حضرات انبیاء کے رفقاء کی اہمیت اور ان کی بلند مقام کے متعلق اندکس میں صحابہ کا عنوان دیکھئے۔ ان کی خصوصیت یہ بتائی کہ

۳
۱۳۶ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا سَرَبْنَا غُفْرَانًا ذُنُوبَنَا وَاسْرَافْنَا فِي
أَمْرِنَا وَتَبَتْ أَفْسَادُ أَمْنَانَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (۳۶)

یہ لوگ اپنے آپ کو عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ان کی زبان پر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے کوئی لغزش یا کوتاہی ہو جائے، یا کسی معاملہ میں ہم حد سے بڑھ جائیں، تو ہمیں ہماری ان غلطیوں کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا۔ ہمیں ثابت قدم رہنے کی توفیق دینا، اور مخالفین پر غلبہ اور کامیابی عطا کرنا۔

غور کیجئے کہ مقام کون سا ہے! میدان جنگ جہاں جذبات کی اس قدر شدت ہوتی ہے کہ لڑنے والا (گویا) نشہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ مؤمنین کا شعاریہ ہے کہ وہ اس حالت میں بھی قوانین خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہاں دو قسم کی لغزشوں سے حفاظت کی آرزو کی گئی ہے۔ ایک ذنب اور دوسرا اسراف۔ ذنب کے معنی سہو یا کوتاہی سمجھئے۔

یعنی جہاں جو کچھ کرنا چاہیے تھا اس میں اگر ذرا سی کوتاہی یا سہو ہو گیا ہو، تو اس سے جو نقصان پہنچ گیا ہو اس کی حفاظت۔ اور اسراف کے معنی ہیں حد سے آگے بڑھ جانا۔ یا کوئی کام اس طرح کرنا کہ اس سے جو مقصد حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو سکے۔

لہذا، ذنب اور اسراف سے بچنے کی آرزو کے معنی یہ ہوئے کہ میدان کارزار میں اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے تھا، اس میں کوتاہی ہو گئی۔ یا ہم دشمن کی مخالفت میں (خدا کی مقرر کردہ) حد سے بڑھ گئے تو اس سے حفاظت کی دعا!

انگریزی زبان میں اسے (OMISSION AND COMMISSION) کہا جائے گا۔ یہ ہے میدان جنگ تک میں مؤمنین کا شعار! اور اس کا نتیجہ؟

فَاتَرَهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِينَ ۝ (۳/۱۳۷)

یہ تھے وہ لوگ جنہیں ہم نے، اُن کے حُسنِ عمل کے بدلے، دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کیں اور آخرت کی زندگی کی نعمتیں بھی حقیقت یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے نزدیک وہی لوگ پسندیدہ قرار پاتے ہیں جو حُسنِ کارا نہ انداز سے، بلند کردار کا ثبوت دیں۔

آیت (۳/۱۳۷) میں ثواب کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس کی محسوس وضاحت سامنے آگئی۔ میدان جنگ میں فتح و کامرانی سے جو "ثواب الدنیا" حاصل ہوتے ہیں اُن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ثواب مبہم یا غیر محسوس نہیں ہوتا۔ وہ "ثواب" ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مؤمنین کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں ثواب الدنیا بھی حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ثواب الآخرة بھی۔ اور ثواب الآخرة، دنیاوی ثواب سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔ مؤمنین کی دنیاوی زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ اسی بنا پر انہیں محسین کہا گیا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ وہ جو تمہیں کہا گیا تھا کہ رسول کی وفات کے بعد اُنْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳/۱۳۷) کی کیفیت پیدا کر لیتا۔ یعنی زمانہ قبل از اسلام کی طرف نہ پلٹ جانا۔ تو اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ ایسا کس طرح ہو کر تا ہے۔ فرمایا:۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَنُنْزِلَنَّ عَلَيْكُمُ الثَّمَرَاتِ ۚ فَمَنْ يَتَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ مَقَالًا فَلَا يَحْمِلْهُ اللَّهُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِهِ ۚ (۳/۱۳۸)

اے جماعتِ مؤمنین! تم اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ نظام، کسی شخص کی موت سے درہم برہم نہیں ہو سکے گا (۳/۱۳۷)۔ اس میں خرابی واقع ہوگی تو اس طرح کہ تم اُن لوگوں کی بات ماننے لگ جاؤ (اور اُن جیسے کام کرنے لگ جاؤ) جو اس نظام کے مخالف ہیں۔ یعنی تم کفار کا شیوہ اختیار کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ لوگ پھر اسی راستے کی طرف بے جا ہوں گے جس پر تم اس سے پہلے چلتے تھے۔ اس سے تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

ہماری ساری تاریخ اسی اجمال کی تفصیل ہے جب ہم نے غیر مسلموں کے عقائد، نظریات، تصورات، حتیٰ کہ مشاربے مسلک اختیار کر لئے۔ تو اسلامی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اور ہم پھر عہدِ جاہلیہ کے دور میں پہنچ گئے۔ بہارِ موجدہ اسلام، اپنی غیر قرآنی تصورات و معتقدات کا مجموعہ ہے اور جسے تبلیغ اسلام، خدمتِ اسلام اور (آج کل کی اصطلاح میں) احیاءِ اسلام کہہ کر پکارا

جاتا ہے وہ درحقیقت اپنی تصورات و معتقدات کو محکم سے محکم تر بنانے کی کوششیں ہیں۔ غلط پٹری پر پڑی ہوئی گاڑی کی رفتار میں جس قدر تیزی پیدا کی جائے، وہ اتنی ہی سرعت سے منزل مقصود سے دُور لے جائے گی۔

اور اسی روش کا نتیجہ : فَتَنَّاكُمُ الْخَاسِرِينَ — تباہی، بربادی، نقصان، خسار !

اس کا علاج — بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ۝ (۱۴۹)۔ خالص خدا کی اطاعت۔ اس لئے

کہ وہی تمہارا مربی و مددگار ہے، اور وہی حامی و ناصر۔ اس سے دُنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آئے گی۔ (۱۴۸)

ان دونوں روشوں کا فرق کیا ہوگا؟ یعنی خدا کی اطاعت اور ان لوگوں کی اطاعت کا فرق؟ فرمایا :-

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا السُّعْتَ بِمَا شَرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطٰنًا ۚ وَمَا لَهُمْ النَّاسُ وَبِئْسَ مَثْوٰى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۵۰)

اگر تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو تمہارے دل بے خوف اور بے باک ہو جائیں گے۔ کیونکہ توحید کا

لازمی نتیجہ بے خوفی ہے (۱۴۸)۔ اس کے برعکس جو لوگ توحید سے انکار کر کے شرک کرنے لگ جاتے ہیں وہ مقام

آدمیت سے گر جاتے ہیں۔ میزانِ زندگی میں اُن کا کوئی وزن نہیں رہتا (۱۴۹)۔ اور اُن کے سینے خوف کے نشین بن

جاتے ہیں۔ شرک، انسان کا خود ساختہ عقیدہ اور اس کے ذہن کی پستی کی علامت ہے۔ خدا کی طرف سے، اس کے

لئے کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔

یاد رکھئے توحید کے معنی ہیں صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنا، جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے (۱۴۵) :

۝ (۱۴۴)۔ اگر کتاب اللہ کے ساتھ ان لوگوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کر لیا جائے تو یہ شرک ہوگا (۱۴۹) : ۱۴۸ : ۱۴۷ : ۱۴۶ : ۱۴۵ :

۱۴۹ : ۱۴۸ : ۱۴۷ : ۱۴۶ : ۱۴۵ : ۱۴۴ : ۱۴۳ : ۱۴۲ : ۱۴۱ : ۱۴۰ : ۱۳۹ : ۱۳۸ : ۱۳۷ : ۱۳۶ : ۱۳۵ : ۱۳۴ : ۱۳۳ : ۱۳۲ : ۱۳۱ : ۱۳۰ : ۱۲۹ : ۱۲۸ : ۱۲۷ : ۱۲۶ : ۱۲۵ : ۱۲۴ : ۱۲۳ : ۱۲۲ : ۱۲۱ : ۱۲۰ : ۱۱۹ : ۱۱۸ : ۱۱۷ : ۱۱۶ : ۱۱۵ : ۱۱۴ : ۱۱۳ : ۱۱۲ : ۱۱۱ : ۱۱۰ : ۱۰۹ : ۱۰۸ : ۱۰۷ : ۱۰۶ : ۱۰۵ : ۱۰۴ : ۱۰۳ : ۱۰۲ : ۱۰۱ : ۱۰۰ : ۹۹ : ۹۸ : ۹۷ : ۹۶ : ۹۵ : ۹۴ : ۹۳ : ۹۲ : ۹۱ : ۹۰ : ۸۹ : ۸۸ : ۸۷ : ۸۶ : ۸۵ : ۸۴ : ۸۳ : ۸۲ : ۸۱ : ۸۰ : ۷۹ : ۷۸ : ۷۷ : ۷۶ : ۷۵ : ۷۴ : ۷۳ : ۷۲ : ۷۱ : ۷۰ : ۶۹ : ۶۸ : ۶۷ : ۶۶ : ۶۵ : ۶۴ : ۶۳ : ۶۲ : ۶۱ : ۶۰ : ۵۹ : ۵۸ : ۵۷ : ۵۶ : ۵۵ : ۵۴ : ۵۳ : ۵۲ : ۵۱ : ۵۰ : ۴۹ : ۴۸ : ۴۷ : ۴۶ : ۴۵ : ۴۴ : ۴۳ : ۴۲ : ۴۱ : ۴۰ : ۳۹ : ۳۸ : ۳۷ : ۳۶ : ۳۵ : ۳۴ : ۳۳ : ۳۲ : ۳۱ : ۳۰ : ۲۹ : ۲۸ : ۲۷ : ۲۶ : ۲۵ : ۲۴ : ۲۳ : ۲۲ : ۲۱ : ۲۰ : ۱۹ : ۱۸ : ۱۷ : ۱۶ : ۱۵ : ۱۴ : ۱۳ : ۱۲ : ۱۱ : ۱۰ : ۹ : ۸ : ۷ : ۶ : ۵ : ۴ : ۳ : ۲ : ۱ :

لایا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں کو اُن کے صحیح مقام سے اُوپر لے جا کر مسندِ الوہیت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں

کو خدا بنا لینا، اور ان کی محکومیت اختیار کر لینا وجہ تذلّیلِ انسانیت ہے۔ اس سے لوگوں کی کیفیت وہ ہو جاتی

ہے جیسا کہ ذکر (۱۴۶ : ۱۴۵) میں کیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شرک کا نتیجہ خوف اور خوف کا نتیجہ وہ جہنم کی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں

(۱۰۴ : ۱۰۳)۔ سو دیکھو کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کریں اُن کا ٹھکانا کس قدر المناک اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔

شرک کیا ہے اور اس کا نتیجہ خوف اور بزدلی کیوں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

انڈکس میں حوالے مل جائیں گے۔

بخیل قوم باقی نہیں رہتی | قسم کی ذہنیت اور اُس کی حامل قوم قرآنی معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ اس لئے اس قابل نہیں کہ وہ باقی رہ سکے۔ سورہ محمد میں ایک نہایت اہم فیصلہ خداوندی

کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

هَآئِنتُمْ هَؤُلَاءِ تَدْعُوْنَ لِنُتَّقِيَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَّبْخُلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنْ نَفْسِهِ ۗ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ ۖ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ۗ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝ (۳۰)

تم میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے، اپنا مال کھلا رکھیں تو وہ بخل کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص اس معاملے میں بخل سے کام لیتا ہے، تو وہ بخل خود اس کی اپنی ذات کے خلاف جاتا ہے۔ اللہ تمہارا محتاج نہیں (کہ تم اسے نہ دو گے تو اُس کی ضرورت رُک رہ جائے گی)۔ تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے نظام کے محتاج ہو۔ اگر تم اس نظام سے روگردانی کر دو گے، اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے، تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہاری جیسی نہیں ہوگی (اس لئے کہ قوموں کی موت و حیات اور استخلاف و استبدال کا قانون یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظامِ زندگی کی حامل ہو، وہ باقی رہتی ہے۔ جو غلط نظام رائج کرے، وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے زندگی کے متعلق اُن کے نظریات اور عملی نظام کی رو سے ہوتے ہیں)۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ میزانِ خداوندی کی رو سے بخل کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ اس نظام کی حامل قوم مصائبِ زندگی میں باقی رہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ ہمارے ہاں ربّ کے متعلق تو اس قدر دیکھیں ہوتی ہیں (اگرچہ وہ بھی سود یا سباج کے معنوں میں) لیکن بخل کے متعلق کبھی کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک معیوبِ عادت خیال کیا جاتا ہے۔ ”وہ بڑا بخیل ہے“ کہہ کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم اسے استبدالِ قومی کا بنیادی سبب قرار دیتا ہے۔ فاضلہ دولت، منفعیتِ عامہ کے لئے کھلی رکھنے کے لئے ہے، نہ سرمایہ داری کے لئے اور نہ ہی روک رکھنے کے لئے۔ اتفاق اور قرض فی سبیل اللہ کی آیات میں سطحی نگاہ سے دیکھنے والے مکنتہ جیسوں کو یہ بات ہاتھ میں آجاتی ہے کہ خدا تم لوگوں سے قرض مانگتا ہے تو کیا وہ محتاج ہے؟ قرضِ حسنہ کے لئے دیکھئے اللہ کس اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ ۚ
سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَتَثْلُحُهُمُ الْآيَاتُ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ وَتَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ

الْحَرِيقِ ۝ (۳۱)

ہمیں ان کا بھی علم ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی کے محتاج نہیں اور خدا یہ جو ان سے مال و دولت طلب کرتا ہے، ان کا محتاج ہے۔ ہم ان کی ان تمام باتوں کو، ایک ایک کر کے، نوٹ کر رہے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ تھے جو، اس زعمِ باطل میں کہ وہ کسی کے محتاج نہیں۔ انہیں کسی کی کیا پرواہ ہے۔ اس نظام کی طرف دعوت دینے والے انبیاء کی تخریب و برباد قتل کے ناحق درپے ہو گئے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کا سرمایہ اور اندوختہ ان کے کسی کام نہیں آئے گا، اور زندگی کی تمام لذتیں ان کے لئے رہبر کا گھونٹ بن جائیں گی۔

سورہ یسین میں کہا گیا ہے کہ اس قسم کی کٹ مچتیاں کرنے والے، اپنے نخل کو تقدیر کے پرے
حُ ا محتاج نہیں | میں چھپانے کی سعی ناکام کرتے ہیں۔ مسرمایا :-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا الَّذَيْنِ كَفَرُوا بِالَّذِينَ آمَنُوا ۚ أَنْطَعِمُ
مَنْ نَوْيَسَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَسْنَمُ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (۳۲)

اور اس ضمن میں عجیب عجیب قسم کے اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو سامانِ زیست تمہیں خدا کے ہاں سے ملا ہے اسے حاجت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو، تو جو لوگ خدا کے نظامِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں، وہ، ان لوگوں سے، جو اس نظام پر ایمان رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر خدا کا یہی منشا تھا کہ رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے، تو اُس نے خود ہی ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا؟ انسانوں سے کیوں کہا کہ تم ایسا معاشرہ قائم کرو، جس میں ہر ایک کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں؟

انہیں کون بتائے کہ ایسا کہنے میں یکس قدر سخت غلطی کرتے ہیں۔ (انسانی معاشرہ میں) خدا اپنے نظام کو انسانی ہاتھوں سے قائم کرایا کرتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کرے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ ورنہ اُس (خدا) کے لئے کیا مشکل تھا کہ جس طرح اُس نے اشیاء کائنات کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، اسی طرح انسانوں کو بھی مجبور پیدا کر دیتا۔ یہ کہہ کر کہ، اگر خدا کو منظور ہوتا تو ایسا کیوں نہ ہو جاتا، انسان اپنے آپ کو اختیار و ارادہ کے شرف سے محروم کرنا اور اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے (۶/۱۴۹) (۱۲/۳۵) (۲۳/۲۱)

غور کیجئے۔ انسان کا اپنی بخلی کو تقدیر کے پردہ میں چھپانے کو کافرانہ شیوہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن نظام سرمایہ داری کو ”دین“ بنانے والے ان باتوں پر کب کان دھر سکتے ہیں؟ انہوں نے تقدیر کا بہانہ بنایا تھا۔ ان سے کہا کہ یہ تباہی تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوگی :-

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ اَيْدِيَكُمْ وَاَنْتَ اللّٰهُ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعٰبِیْدِ (۳۱)

ان کے ساتھ یہ کچھ ظلم اور زیادتی کی بنا پر نہیں ہوگا — خدا کے قانون میں ظلم اور زیادتی کا کیا کام؟

یہ نتیجہ ہوگا ان کے اپنے اعمال کا۔



مدینہ میں سب سے زیادہ مخالفت یہودیوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہب پرست قوم کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ جب ان سے کسی ٹھوس محسوس پر ابہم کے متعلق گفتگو کی جائے جس کا ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہ ہو تو وہ (اس موضوع سے ہٹ کر) قرنی مقابل کو نظری مسائل میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دو۔ میں انہیں کسی دوسری جگہ لے جاؤں گا۔ اُس کے پاس حضرت موسیٰؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے ان کی بات بیچ میں سے کاٹی اور کہا کہ موسیٰؑ! ذرا یہ بتاؤ کہ ہمارے بزرگ جو مر گئے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں — (قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولٰٓئِیْ) — یہ سوال کسی مولوی صاحب سے کیا جاتا، تو وہ ساری رات اس بحث میں ضائع کر دیتا۔ لیکن وہ تو خدا کے رسولؑ تھے، وہ فرعون کے جھانسنے میں کب آنے والے تھے۔ فرمایا: عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ (۲۶)۔ ”ان کا علم میرے رب کی کتابِ آخرت میں ہے۔“ لَا یُضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنۡسِیْ (۲۶) ”وہ نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔“ اس لئے وہ ان سے ٹھیک ٹھیک نیٹ لے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

یہودیوں کے ساتھ بات ہو رہی تھی نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اتفاق کی۔ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جو آپ کی بات نہیں مان رہے تو اس کی وجہ کچھ اور ہے :-

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عِمَدَ الْاِلٰہِیۡنَ اَلَا نُوۡمِنُ بِرَسُوۡلِہٖ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بَقُرۡبٰنٍ

تَاَمُّہُ النَّاسُ ط قُلْ قَدْ جَاۤءَکُمۡ رَّسُوۡلٌ مِّنۡ قَبْلِیۡ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالذِّحٰی

قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوۡہُمۡ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیۡنَ (۳۲)

یہ (یہودی) کہتے ہیں کہ، اللہ نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ تم کسی رسول پر ایمان نہ لانا جب تک وہ تمہارے پاس

سوختنی قربانیوں کا حکم نہ لائے۔ (یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ اللہ نے ان سے کہیں ایسا نہیں کہا تھا) ان سے کہو کہ اگر تمہارا اعتراض یہی ہے تو یہ بتاؤ کہ، مجھ سے پہلے تمہاری طرف بہت سے رسول آئے جو اپنے ساتھ واضح احکام و دلائل لائے۔ (اور بقول تمہارے) انہوں نے سوختنی قربانی کا بھی حکم دیا۔ تو تم، ان پر ایمان لانے کے بجائے ان کی تخریب اور قتل تک کے درپے کیوں ہو گئے؟ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو اس کا جواب دو؟ انہیں تو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا اور نبی کریمؐ سے منسوب کیا :-

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ رَسُولُكَ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوكَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۱۸۳)

سو (اے رسول!) اگر یہ لوگ اس قدر واضح دلائل کے باوجود تمہارے مبنی بر وحی پیغامات کی تکذیب کرتے ہیں (۱۸۳)، تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی چلا آیا ہے۔ تم سے پہلے بھی رسولوں کی، اسی طرح تکذیب ہوتی ہی ہے، جو واضح دلائل اور آسمانی صحیفے، یعنی (انسانی عقل کو) چلا بخشنے والے قوانین لائے تھے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ رسولوں کو بینات۔ والزبر۔ والکتاب المنیر دی گئی تھی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کو خدا کی طرف سے وحی دی جاتی تھی، اور اس وحی کو مختلف ناموں سے اور مختلف صفات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں جو تین الفاظ آئے ہیں (بینات الزبر اور الکتاب) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ تین الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ درحقیقت وحی ہی کے تعارفات ہیں۔ بینات یعنی واضح دلائل، وحی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اور اس کے احکام کو الکتاب کہا گیا ہے۔ جہاں تک زبور کا تعلق ہے تو اس کے معنی جلی حروف میں لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔ ان معانی کی رو سے خدا کی ہر کتاب الزبور ہے۔

سورہ نساء میں ہے: وَاتَّبِعْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ كَانَا زُفُورًا (۱۶۳)۔ (نیز ۱۷۵)۔ عام خیال یہ ہے کہ زبور حضرت داؤد کی کتاب کا نام ہے۔ لیکن یہ بات مزید غور کی متقاضی ہے۔ ان پر دو آیات میں زبور (نکرہ) آیا ہے اور خدا کی کتابوں (التوراة۔ الانجیل۔ القرآن) کو معرف کہا گیا ہے۔ اسی لئے زبور کے معنی ایک کتاب ہیں۔ یعنی (حضرت) داؤد کو (دیگر انبیاء کی طرح) کتاب دی گئی تھی۔ سورہ الانبیاء میں البتہ الزبور آیا ہے :

کہا نہیں جاسکتا کہ یہاں اس سے کوئی خاص کتاب مراد ہے یا ہر کتاب خداوندی! زبور جمع ہے زبور کی۔ یعنی کتابیں۔ یہ صنفی نکتہ تھا۔ اصل موضوع تکذیب رسل سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں تکذیب رسل ہر رسول کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان انبیاء کرامؑ سے کہتے تھے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

تکذیب رسل کے معنی حضرات انبیاء کرامؑ کا اپنے معاشرہ میں بڑا بلند مقام ہونا تھا اور وہ مکارم اخلاق و

پاکیزگی، سیرت کے پکڑ ہوتے تھے۔ اُن کی اس پاکیزگی، سیرت کی شہادت اُن کے دشمن تک بھی دیتے تھے۔ وہ اپنی قوم سے کہتے تھے کہ تم جس روش پر گامزن ہو، اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ اور وہ جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ ہم پر کبھی تباہی نہیں آسکتی۔ یہ تھی تکذیبِ رسل۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ یہ مخالفین ان انبیاء کو جھوٹا نہیں کہتے تھے۔ اُن کی تہذیب (وارنگ) کو جھوٹا کہتے تھے، اس کی شہادت قرآن کریم میں موجود ہے۔ سورہ الانعام میں ہے :-

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَفِّرُونَ بَوْنَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ
بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ه (۱۶۱)

(۱۶۱ رسول!) ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یہ لوگ تمہاری دعوت کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے۔ (جو یہ بات تمہیں اس طرح گرا گزرے) یہ تو قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے)۔ اس لئے، ان کی ان باتوں سے دل پر بُرا اثر لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں وہ مدحیات ہے۔ تو اس سے اس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے نبی کو جھوٹا کہنے اور اس کے پیغام کو جھٹلانے کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے :-

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ سُرُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ فَصَابِرُودَا عَلَىٰ مَا كُنْ بُؤَا وَاُذْذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمُ
نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَاِیِ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۶۲)

پھر یہ بات کوئی نئی بھی نہیں۔ تم سے پہلے بھی رسول آئے اُن کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ اُن کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اس طرح تکذیب ہوتی رہی۔ لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ اور جس قدر تکالیف مخالفین کی طرف سے پہنچتی رہیں انہیں بہت سے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ بالآخر (ہمارے قانون کے مطابق) ہماری طرف سے نصرت آپہنچی۔ پہنچتی کیوں نہ؟ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت اُن انبیاء کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے (اس قرآن میں) تم تک پہنچ چکے ہیں۔

یہ تو تھی کفار کی طرف سے تکذیبِ دین۔ ہم (مسلمان) تکذیبِ دین کس طرح کرتے ہیں اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۳۶ - آیت (۲۹) اور جلد سوم ص ۲۳۳ آیت نمبر ۲۲، ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے بعد کہا کہ اس تکذیب کا فیصلہ اُن کے اعمال کے نتائج کر دیں گے۔ اگر یہ یہاں اس مٹاؤندہ سے بچ بھی گئے تو آخروی زندگی میں مانوڑ ہو جائیں گے جس سے کسی کو بھی مضر نہیں۔

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ الْغُرُورِ ۝ (۱۸۴)

ان سے کہو کہ ہو سکتا ہے کہ تم اس قسم کی کٹ جھتیوں اور فریب کاریوں اور اپنی موجودہ غلط روش سے دنیاوی مفاد حاصل کر لو، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ اور جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہیں آتے ان کا پورا پورا بدلہ، آخروی زندگی میں سامنے آکر رہتا ہے۔ اُس زندگی میں جو شخص تباہ کن عذاب سے دور رکھا گیا، اور جنت کی خوشگوار زندگی کا مالک بنایا گیا، تو وہ درحقیقت کامیاب ہوا (۱۸۴)۔ اس کے برعکس جو شخص صرف دنیاوی زندگی کے مفاد کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے (اور مستقبل کی زندگی کو نظر انداز کر دیتا ہے) اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ کامیاب وہ ہے جسے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور آخروی زندگی کی کامرانیوں بھی! (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰)

(ضمناً) نجات کا قرآنی مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے نجات کے یہ معنی نہیں کہ پہلے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں جھونکا جائے گا، اور پھر وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ قرآنی مفہوم یہ ہے کہ جنت میں جانے کے اہل ہیں انہیں براہِ راست جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ جن میں اس کی صلاحیت نہیں ہوگی، وہ جہنم رسید ہوں گے۔ یہاں اس مفہوم کو یہ کہہ کر دھرا یا گیا ہے کہ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ۔ جسے جہنم سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ کامیاب کامران ہے۔ اس کے بعد جماعتِ مؤمنین سے کہا کہ تمہارا شکراؤ اپنی لوگوں سے ہو گا جن کا نصب العین جنت، اس دنیا کے مفاد کا حصول ہے۔ اس کلمہ میں:

لَتُبْلَوْنَ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيْرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝ (۱۸۵)

تمہارا امتحان بدلتی لوگوں سے رہے گا، اور اس محلاؤ میں تم پر ایسی گودشیں آئیں گی جن میں تمہارے مال اور جان کا نقصان ہوگا (۱۸۵)۔ امدان اہل کتاب اور مشرکین عرب سے بڑی دکھ دینے والی باتیں سننی پڑیں گی۔ سو اگر تم نے ان مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کیا، اور قانونِ خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو یہ تمہارے عزمِ بلند کی دلیل ہوگی، اور بڑی بہت کی بات۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کس طرح بار بار اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ دین کا منتہا (مذہب کی طرح) انفرادی نجات نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے جس میں باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراؤ لایفک ہے۔

اس کے بعد قرآن پھر اہل کتاب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے :-

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكُنُ مِثْلَهُ
قَدَحِينَ وَكَأْوَاعَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبَيَّسَ
مَآيَشَتَرُونَ ۝ (۱۸۶)

(یہ اہل کتاب جواب کہہ رہے ہیں کہ ہم سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا، اور وہ عہد لیا تھا۔ ان سے اس قسم کا کوئی عہد نہیں لیا گیا تھا)۔ ان سے عہد یہ لیا گیا تھا کہ ”جو کچھ تمہیں (وحی کے ذریعہ) دیا گیا ہے اُسے چھپا کر نہ رکھنا، لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا“ لیکن انہوں نے اُسے پس پشت ڈال دیا۔ (اور عمل درآمد اپنی خود ساختہ شریعت پر کرنے لگے کیونکہ) انہیں اس سے دنیاوی مفاد حاصل ہوتے تھے۔ اگر یہ ذرا عقل و فکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ان کا یہ سودا کس قدر خسارے کا ہے (۱/۲)۔ یہ تھا وہ عہد جو ان سے لیا گیا تھا، اور یہ ہے وہ انداز جس سے انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تھا!

”کتمان حق“ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۹۵ (آیت ۲/۲) میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ سابقہ اہل کتاب کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق بعینہ خود ہمارے اُدپر بھی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے) ہم مسلمان اہل کتاب ہی کی سطح پر آچکے ہیں۔ انہوں نے بھی دین کو مذہب میں تبدیل کر لیا تھا اور کتاب اللہ کی بجائے خود اپنے وضع کردہ احکام شریعت کو دین کہہ کر پیش کرتے تھے۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی ”دین“ کو ذریعہ معاش بنا لیا جائے گا، یہی کچھ ہوگا۔ اس کے بعد کہا :-

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَعَاشٍ إِلَّا مِنَ الْعَدَاءِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۱۸۷)

یہ لوگ (اہل کتاب کے مذہبی پیشوا) اپنی اس روش پر بہت خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ جو باتیں لوگوں سے (بطور وعظ و نصیحت) کہتے ہیں، لیکن خود ان پر عمل نہیں کرتے، اُن کی وجہ سے ان کی تعریف کی جائے (حالانکہ تعریف کام کی ہوتی ہے) باتوں کی نہیں)۔

یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ (جس طرح ہم دنیا والوں کو دھوکہ دے لیتے ہیں، اسی طرح خدا کو بھی دھوکہ دے دیں گے)۔ تم ان کے متعلق خیال تک بھی نہ کرو کہ یہ خدا کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ اس کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ اس سے کوئی نہیں چھوٹ سکتا۔ ان لوگوں کی تنہا ہی بڑی دردناک ہوگی۔

قرآن کریم ایمان کے لئے، قلب اور زبان کی ہم آہنگی کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی ایمان، محض زبان سے چند الفاظ دھرنے کا نام نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ جو کچھ تم زبان سے کہو اس کی تصدیق تمہارا دل بھی کرے۔ بقول اقبالؒ:۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

اور مومن ہونے کے لئے وہ ایمان اور عمل میں ہم آہنگی کو لاینفک قرار دیتا ہے۔ جس ایمان (اقرار) کا مظاہرہ اعمال (کاموں) سے نہیں ہوتا، وہ ایمان نہیں محض تصنع ہے۔ فریب ہے۔ جب کوئی قوم عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے، تو اس کے اکابرین کا شیوہ یہ ہو جاتا ہے (خواہ وہ ارباب مذہب ہوں اور خواہ اعیان اقتدار) کہ وہ باتیں بڑی لمبی چوڑی اور دلاویز کرتے ہیں، لیکن ان باتوں کے مطابق کام نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی باتوں کی وجہ سے ان کی شان میں قصیدے پڑھتے رہیں۔ یہ نہ پوچھیں کہ آپ کرتے کیا ہیں۔ جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی تنہا ہی لازمی ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

(وہ ایسے لوگوں سے کہتا ہے کہ) تم اپنے معاشرہ میں تو ایسی صورت پیدا کر سکتے ہو کہ لوگ محض تمہاری باتوں سے (تمہارے منہ پر) تمہاری تعریف کر دیں، لیکن میرا خداوندی میں تو اعمال کا ذوق ہوتا ہے، باتوں کا نہیں۔ سلسلہ کائنات اس اصولِ محکم کی بناء پر کار فرما ہے :-

وَبَلَدٌ مُّلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳/۱۸۸)

اس لئے کہ تمام کائنات میں اقتدار اور اختیار خدا ہی کا کار فرما ہے۔ یہ سلسلہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر ایک کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا ہے (۱۰/۳۷، ۱۱/۳۷، ۱۲/۵۳) ہر شے پر خدا کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس کے بعد وہ عظیم آیات سامنے آتی ہیں جن میں دین کا ملخص بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اکثر مقامات پر واضح کیا گیا ہے دین کا منتہی بے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے صرف کرنا، اس سلسلہ میں سابقہ جملوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے (حوالہ کے لئے دیکھئے انگلہ کس میں عنوانات تسخیر فطرت۔ فطرت اور کائنات) یہاں اسی بلند اصول و منتہی کو ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ فرمایا :-

إِنَّا فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (۳/۱۸۹)

لَا دِلِّيَ إِلَّا الْبَابُ ۝ (۱۸۹)

لیکن یہ بات غور و فکر سے سمجھیں آسکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں، اُن کے لئے کائنات کی پیدائش اور دن اور رات کی گردش میں قوانین خداوندی کی حکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

کارِ گہ کائنات پر غور و فکر | یہاں کائناتی نظم و نسق پر غور و فکر کو اولوالالباب کا خاصہ بتایا گیا۔ یعنی ارباب علم و عقل۔ اصحاب علم و بصیرت۔ اس میں مومن و کافر سب آجاتے ہیں — بلکہ آجکل تو رموز و حقائق کائنات پر غور و فکر میں کفار آسمان کی بلندیوں تک پہنچ رہے ہیں — مومن و کافر کی تفریق اگلی آیات میں کی گئی ہے۔ فرمایا :-

الَّذِينَ يَدْعُونَ اللَّهَ تَبَاً وَقَعُودًا ۖ وَ عَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ ۚ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ سَرَّ بَنَّا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۱۹۰)

اُن صاحبان عقل و بصیرت اور ارباب فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے۔ لیٹے قنوں خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیقی ترکیب (انداز پیدائش) پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور کائنات کے بعد علی وجہ البصیرت پکڑاٹھتے ہیں کہ ”اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارِ گہستی کو نہ تو عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے، اور یہ بات تجھ سے بہت بعید کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت، یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں تو فتن عطا فرما کہ ہم (علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح) تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

ذکر کا مفہوم | اس میں دو تین نکات خاص طور پر غور و طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس میں ”ذکر خداوندی“ کا مفہوم واضح کیا گیا ہے یعنی تخلیق ارض و سموات پر غور و فکر کا نام ذکر خداوندی ہے — بالفاظ دیگر کائنات سے متعلق قوانین خداوندی کو ہر وقت پیش نظر رکھنا۔ ذکر کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر اپنے ہاں کی ”اللہ ہو“ کی مجلسوں پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ وہاں ذکر کا مفہوم کیا لیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جماعت مؤمنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قوانین کائنات اور فرائض فطرت پر غور و فکر اور تحقیق و تفتیش

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے | کے بعد یہ ثابت کریں کہ خدائے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔ ہمارے ہاں تصوف ہو یا شریعت، دونوں میں کائنات

کو باطل قرار دیا جاتا ہے تصوف کا تو (افلاطون کے متبع میں) عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا حقیقی وجود ہی نہیں، یحییٰ ہمارے فریبِ تخیل کا نام ہے۔ غالب کے الفاظ میں

ہستی کے مت فریب میں آجائو اسد عالم تمام حلقہ دایم خیال ہے

تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں سے جب قدرتِ خیال میں ارتقاء پیدا ہو جاتا ہے، تو انسان کے تخیل کی دُنیا میں عجیب غریب قسم کی ”دنیاؤں“ کے نقشے آتے ہیں۔ (ان نکات کی میں نے اپنی زیرِ اشاعت کتاب — تصوف کی حقیقت — میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ تمام تصوّرات (HALLUCINATIONS)

عالمِ خیال میں پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس دُنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ قرآن کے نظریہ کی رُو سے ان کی یہ ”دنیا“ حق نہیں ہوتی۔ باطل ہوتی ہے۔ مثلاً آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس کی سامنے کی دیوار شیشے (آئینے) کی ہو، تو اس میں آپ کا پرے کا پردہ آکر آپ کے سامنے ہو گا۔ حتیٰ کہ کمرے میں ہر نقل و حرکت بھی بعینہ اس میں ”موجود“ ہو گی۔ لیکن یہ درحقیقت اس میں موجود نہیں ہوتی۔ یہ ہماری نگاہ کا فریب ہوتا ہے۔ کشف و الہام کی ہر ”دنیا“ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ کہیں خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ ہمارے عالمِ تخیل میں ہوتی ہے۔

قرآن جو کائنات کو بالحق کہتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فی الحقیقت خارج میں موجود ہے۔ ہمارے تخیلات کی تخلیق نہیں۔ اس کے برعکس، تصوف کی ”کائنات“ کہیں خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ عالمِ تخیل میں موجد ہوتی ہے۔ لہذا، وہ بالحق نہیں کہلا سکتی۔ وہ باطل پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تو رہا باب تصوف کے متعلق۔

اربابِ شریعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اس کے قریب تک بھی نہیں جانا چاہیے۔ ”دنیا ایک لاش ہے اور اس کے چاہنے والے گتے“۔ ”دنیا ایک جیل خانہ ہے جس سے مومن دور بھاگتا ہے“ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تمام عقائد و نظریات باطل ہیں اور قرآنی تصوّر کائنات کی ضد۔

ذلت و خواری کی زندگی | اس کے ساتھ ہی قرآن نے واضح کر دیا کہ جو قوم کائنات کو باطل تصور کرتی ہے، وہ تباہی بربادی کے جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس عذابِ النار کے معنی کیا ہیں — دُنیا

کی زندگی میں ذلت و خواری۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے، اشیائے کائنات کی نفع بخششوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں — اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی بارہمہ گنا نہیں ہوتا۔

کتنی عظیم حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی، وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور جو قوم ذلت و پستی کی زندگی بسر کرے، اُس کا کوئی بارہمہ گنا نہیں ہوتا۔ وہ دوسری قوموں کی محتاج اور گداگر ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گداگروں اور بھک منگوں کو کوئی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

اس کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی رو سے ”کفار اور مومنین“ میں بنیادی فرق کی وضاحت کر دی۔ فرمایا :-

سَبَّأًا اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يَّاتِيًا دِٰى بِالْبَيِّنَاتِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ثُمَّ سَبَّأًا نَّغْفِرْ لَنَا ذُلُوْبَنَا وَكَيْفَ دَعَا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّفْنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (۱۹۲)

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ نوع انسان کی رہبریت عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے (۱۹۳)۔ یہ کچھ دہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر ایمان رکھے۔

لہذا، ان ارباب عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ، اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ۔ ہم نے اس دعوت پر لبیک کہا، اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد، ان صاحبان عقل و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا (۱۹۴)۔ ہماری چھوٹی موٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات سٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت اور معیت میں کرنا، جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی راہیں کھل چکی ہیں۔

کیسی حسین ہیں یہ دعائیں اور کس قدر انسانیت ساز ہیں یہ آرزوئیں۔

سَبَّأًا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلٰی سُرْسُلِكَ وَلَا تَخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تَخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (۱۹۳)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعہ، جن خوشگوار یوں اور سرفرازیوں کا وعدہ

کر رکھ ہے (۲۷/۵۵) اُن سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔

ادھر سے یہ حسین آرزوئیں زبان پر آئیں اور ادھر سے باپ استجاب نے یہ کہہ کر انہیں خوش آمدید کہا کہ

۳
۱۹۴
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلًا غَامِلًا مِّنْكُمْ مِّنْ ذَکَرٍ
اَوْ اُنْثٰیۚ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍۚ فَاَلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ
وِیَارِهِمْ وَاُوْدُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَتَمَلُّوْا وَاَقْتُلُوْا لَا کُفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّئَاتِهِمْ وَلَا
دُخِلَتْهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرٰی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ تَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط
وَاللّٰهُ عِنْدَ کَافٍ لِّلْثَوَابِ ۝ (۱۹۴)

تم میں سے جو بھی ہمارے قانون کے مطابق عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کہ تم ایک ہی نوع کے افراد ہو۔ بلکہ ہر فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مرد اور عورت دونوں کے اجزاء (مادہ تولید) سے مرکب ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یگانگت اور مساوات کی صورت اور کون سی ہو سکتی ہے۔

لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے قوانین کے مطابق نظام کرنے میں تمہیں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہیں اپنی ہر عزیز متاع کو چھوڑنا پڑے۔ تم گھروں سے بے گھر ہو جاؤ۔ بُری طرح سے ستائے جاؤ۔ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جانیں دینی پڑیں۔ سو، جو لوگ اس پروگرام میں پورے اُتریں گے، اُن کے جن عمل کی بدولت، ان کی چھوٹی موٹی نامہواریوں کو مٹا دیا جائے گا، اور انہیں زندگی کی سزا دیا جائے گی جن پر کبھی، افسردگی اور تپہِ مردگی نہیں چھائے گی۔ وہ ہمیشہ تروتازہ رہیں گی۔ یہ خدا کی طرف سے، ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اعمال کا ایسا حسن کارنامہ بدلہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہی مل سکتا ہے۔

یہاں سے یوں ہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ غور سے دیکھئے کہ دعاؤں کی قبولیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلًا غَامِلًا مِّنْكُمْ کہ ہم کسی کام کرنے والے

کے کام کو ضائع نہیں ہو جانے دیتے ہیں۔ اسی کا نام دعاؤں کا قبول ہونا ہے اور وہ اعمال کیا ہیں؟ اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے سرکف میدانِ کارزار میں نکل آنا اور ہر قسم کی تکلیف، مصیبت اور مشقت کو استقامت سے برداشت کرنا۔ لہذا، مومن مفکر ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مجاہد بھی ہوتا ہے اور اس کا اُسے بدلہ ملتا ہے۔ اس کے

بعد (نبی اکرمؐ کی وساطت سے) ان مجاہدین سے کہا کہ

لَا يَغُرَّتْكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ هُمْ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ
مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ وَيُسَّ الْمُهَادَّةُ (۱۰۳-۱۰۵)

اس نظام کی مخالفت کرنے والوں کی جہل پہل۔ بستیوں میں ان کی گہا گہی، تمہاری نگاہ کو فریب نہ دے دے اور تم یہ نہ سمجھو بیٹھو کہ قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے بھی زندگی کی خوشگواریاں مل سکتی ہیں! یہ خوشگواریاں بڑی بے حقیقت ہیں اور ان سے ان تھوڑی مدت کے لئے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد، تباہی اور بربادی کا جہنم ہوگا اور یہ سب گئے — اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ان کے برعکس :-

لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا سَرَّ بِهِمْ لَهُمْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
خَالِدِينَ فِيهَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لِّالْبِرِّ (۱۰۷)

جو لوگ خدا کے قانون ربوبیت کی نگہداشت کرتے ہیں اور وحی خداوندی کے مطابق، بلند کردار زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لئے خوشگوار یوں کی سدا بہار جنتیں ہیں۔ خدا کے ہاں ان کی ایسی قدر و منزلت ہوگی جیسی کہ معزز مہمانوں کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلند کردار اور ماستباز انسانوں کے لئے خدا کے ہاں جو کچھ بھی ہے بیکسر خیر ہے۔ اس میں خرابی کا شائبہ تک بھی نہیں ہو سکتا۔

اور اس میں رنگ و نسل۔ زبان۔ وطن۔ وغیرہ کی کوئی تفریق نہیں۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ
إِلَيْهِمْ خَشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ لَهُمْ
أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۰۸)

اور خدا کی اس جنت کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں — ان اہل کتاب (یہودی) کے لئے بھی جن کا عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سوا کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اہل کتاب میں سے بھی جو لوگ (اس طرح) اللہ پر ایمان لے آئے ہیں (جس طرح تم لائے ہو)۔ اور اپنی سابقہ کتابوں پر ایمان لانے کے بعد، اس کتاب (قرآن) پر ایمان لائے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ اور انہوں نے اس طرح، قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے اور اپنی سابقہ روٹل کو چھوڑ دیا ہے جس میں وہ احکام خداوندی کو دنیاوی مفاد کے عوض بیچ دیا کرتے

تھے۔ تو ان کا بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہونا، ان کے راستے میں حائل نہیں ہوگا)۔ ان کے ایمان و اعمال کا اجر ان کے رب کے قانونِ مکافات کی مدد سے ملے گا۔ وہ قانون جو ان کے ہر عمل کا حساب بلانا خیر کر دیتا ہے (۱۱۳-۱۱۲) (۱۱۳-۱۱۲)



قرآن کریم کا عمومی انداز یہ ہے کہ وہ ہر سورہ کے آخر میں دین کی کسی نہ کسی حقیقت کو نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ اس سورہ میں زیادہ زور مؤمنین کی اجتماعی زندگی پر دیا گیا ہے۔ آخر میں بتایا کہ اس اجتماعیت کی اساس کیا ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۱۹۹)

لیکن یہ سب کچھ اس معاشرہ میں ہو سکتا ہے جس میں تمام افراد کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے نظام پر نہایت ثابت قدمی سے قائم رہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنیں اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کریں۔ مخالفین کے مقابلہ میں استقامت دکھائیں۔ اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام رکھیں۔ ایک دوسرے سے جڑ کر رہیں۔ مقصد پیش نظر کے حصول میں مسلسل کوششیں کریں۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ اسے جماعتِ مؤمنین اتم ہی روش اختیار کرنا، تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔

ان چار الفاظ (اصبروا، صابرؤا، رابطو، واتقوا اللہ) پر غور کیجئے اور قرآن کے ایجاز و اعجاز پر جھوم جھوم جائیے۔ یہی امتِ مسلمہ کی اجتماعیت کا راز ہے۔ اور آج اسی کے نہ ہونے سے ہم ملت (یا امت) کی زندگی نہیں، بلکہ افراد کی زندگی جیتے نہیں اور دنیا میں ناکام و نامراد ہوتے ہیں۔



چوتھا باب

معاشرتی اور عالمی زندگی

- ۱۔ یتیموں کی پرورش اور نگہداشت
- ۲۔ ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل
- ۳۔ قوانین وراثت
- ۴۔ ربوہ اور تجارت میں فرق
- ۵۔ صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات
- ۶۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد
- ۷۔ اولی الامر کون ہیں ؟
- ۸۔ منافقین کی نقاب کشائی
- ۹۔ خدا اپنے پروگرام انسانوں کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچاتا ہے
- ۱۰۔ اللہ اور طاغوت کی راہ میں جنگ
- ۱۱۔ جرم قتل کی سزا
- ۱۲۔ وکالت کا پیشہ
- ۱۳۔ مذہبی پیشوائیت کی پیدا کردہ توہم پرستیاں
- ۱۴۔ شہادت کا عظیم اصول
- ۱۵۔ سابقہ لغزشوں سے درگزر
- ۱۶۔ یہودیوں پر بعض حلال چیزیں حرام قرار دے دی گئیں
- ۱۷۔ قوموں کی تباہی کب ہوتی ہے ؟
- ۱۸۔ دین میں غشلو کی ممانعت

چوتھا باب

معاشرتی اور عائلی زندگی

(آیت ۲ تا ۴۷)

سابقہ سورہ کا بیشتر حصہ اُن تراحمات و تصادمات کے احوال و کوائف پر مشتمل تھا جن سے اسلام کے ابتدائی دور میں جماعتِ مؤمنین کو عہدہ براہو نا پڑا تھا۔ لیکن ان تصادمات میں بھی قرآن کریم اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ خارجی قوتوں سے وہی قوم بطریقِ احسن نہر د آزما ہو سکتی ہے جس کے گھروں کی زندگی اطمینان و سکون کی ہو۔ اس زندگی کی بہت کے پیش نظر، اگلی سورہ (یعنی سورہ نساء) کا بیشتر حصہ عائلی زندگی سے متعلق مسائل کے لئے وقف ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے پہلے تخیلِ ان کو مختصر الفاظ میں دہرایا :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (۲)

اے نوبہ انسان! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتداء، ایک جڑوڑہ زندگی سے کی (۲/۲۹)۔ ازل بعد یہ جڑوڑہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، جس سے نر و مادہ کی تقسیم وجود میں آئی۔ اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے، اس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلا دی، جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔

(جب نوبہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں ہے تو انسان کی خود ساختہ تقسیم و تفریق کے کیا معنی؟ تم تمام انسانوں کو ایک ہلوری سمجھو) اور اس طرح خدا کے نظام ربوبیت کی نگہداشت کرو جس کے ذریعے تمہاری وہ ضروریات پوری ہوتی ہیں جن کے لئے تم ایک دوسرے کے تعاون محتاج ہو (۲/۳۷)۔

خدا کے نظام ربوبیت کے قیام کی ابتداء، اپنے خاندانی رشتے استوار کرنے سے کرو (جب یہ ہو جائے تو پھر اس

حلقہ کو وسیع کرتے چلے جاؤ تاکہ پوری کی پوری انسانیت اس کے دائرہ کے اندر آجائے (اگر تم نے ایسا کیا تو قانونِ خداوندی تمہاری ہر طرح سے نگرانی اور نگہبانی کرتا جائے گا۔

انسانی تخلیق کے متعلق، مطالب الفرقان جلد دوم، باب اول میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اُس باب میں آدم کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتداء کسی ایک فرد کے ذریعہ نہیں ہوئی تھی۔ زیرِ نظر آیت میں عمودی نکتہ یہ ہے کہ جب نوع انسان کی تخلیق نفیس واحد (واحد جو ثمرہ حیات) سے ہوئی ہے تو پھر زبان، وطن، رنگ، نسل کے اختلافات سے انسانوں میں تفریق کے کیا معنی؟ تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ وحدتِ خالق سے وحدتِ مخلوق قرآن کا بنیادی نکتہ ہے اور اس وحدت میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں؛ کیونکہ یہ تخلیقی سلسلہ ان دونوں کے اختلاط سے قائم ہے۔

(صمنا) بَشَرٌ مِّنْهُمْ۔ یا۔ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَّکَرٍ وَّ اُنْثٰی (۳۹) کہ خدا کا قانونِ پیدائش یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اختلاط سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بھی اسی طریق سے ہوئی تھی کیونکہ خدا نے اپنے اس قانون میں کہیں استثناء کا ذکر نہیں کیا۔ (تفصیل سابقہ باب میں گزر چکی ہے) وحدتِ انسانیت کا اصول بیان کرنے کے بعد کہا :-

وَالَّذٰی اٰتٰی سَمٰی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ
اِلٰی اَمْوَالِکُمْ اِنَّہٗ كَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا (۴۰)

اس قانون کی رو سے تمہارے اپنے بچوں اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس لئے، ان کے مفاد اور حقوق کی بھی اسی طرح نگہداشت کرو جس طرح تم اپنی اولاد کے مفاد کی نگہداشت کرتے ہو۔ ان کا مال واسباب، بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں، اپنی نئی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو، اپنا الگ۔ ان کے مال میں خرد برد کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے۔ (جو بیچارہ، معاشرہ میں تنہا رہ جائے، اس کی مدد کرنی چاہیے، نہ کہ الٹا اس کا حق تلف کر لینا چاہیے)۔

یتامیٰ کے متعلق سابقہ جلد دل میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں حوالے ملاحظہ فرمائیے)۔ وہاں یتامیٰ النساء کا بھی ذکر آگیا ہے جس کے معنی ایسی عورتیں ہیں جو بے شوہر کے ہوں۔ خواہ وہ ناکتہِ ازل کی لیاں ہوں اور خواہ نکاح کے بعد بے شوہر رہ جانے والی عورتیں۔ اُن کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ فرمایا :-

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ
 وَتِلْكَ وَرِثَةُ الْوَرَثَةِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
 ذَلِكَ أَذْنَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ (۴)

(لیکن یتیموں کا مسئلہ ان کے مال و اسباب کی حفاظت ہی سے طے نہیں ہو جاتا۔ بات اس سے آگے بھی چلتی ہے۔

اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں — مثلاً جنگ کی وجہ سے — کہ معاشرہ میں مرد و نساء
تعدد ازدواج ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے، لڑکیاں) زیادہ رہ جائیں — بالخصوص بے شوہر

عورتیں۔ (۴)۔ اور اس مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہ ملتا ہو۔ یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے

(جس کا فیصلہ تمہارا معاشرتی نظام ہی کر سکتا ہے) تو ایسے حالات میں تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیموں

اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر تم، ان بے شوہر عورتوں میں سے، حسب پسند (جو تمہارے نکاح میں

آنا چاہیں) نکاح کرو۔ (اس مقصد کے لئے ایک مرد ایک بیوی کے قانون میں استثناء کی جاتی ہے۔ اس

صورت میں، جیسا بھی حالات کا تقاضا اور معاشرہ کا فیصلہ ہو تم) دو دو۔ تین تین۔ چار چار بیویوں تک (نکاح

میں لا سکتے ہو)۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ تم، اس طرح، مختلف افراد خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے، تو پھر اسی

”ایک بیوی“ والے قانون پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم، اس سے قبل، اپنے نکاح میں لا چکے ہو کیونکہ اس

کے بعد تو لونڈیاں اور غلام کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا۔ بے انصافی (یا کثرتِ اولاد کے بوجھ) سے بچنے کے لئے، یہ راہ

زیادہ ترین صواب ہے۔

یاد رکھو۔ یہاں جس عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد مختلف بیویوں میں سلوک اور برتاؤ کا عدل ہے نہ کہ

جذبات کا عدل۔ اس لئے کہ جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا، نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا

جاسکتا۔ (۴/۱۲۹)

نکاح کی جملہ تفصیل اور تعدد ازدواج اور ما مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کے متعلق مطالب القرآن کی تیسری جلد میں لکھا جا چکا ہے

(نکاح اور تعدد ازدواج اور غلامی کے عنوانات اٹلکس میں دیکھئے)۔ بخود یہ آیت (۴) جلد سوم ص ۳۶ پر آچکی ہے۔

ان تفصیل کے دھرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن نکاح کے سلسلہ میں ہماری مذہبی پیشوائیت کی ایک ستم ظریفی کا تذکرہ

دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ کئے۔ وہ بالکل قرآن کے مطابق تو نہیں تھے، لیکن

اُن کی رو سے موجودہ قوانینِ شریعت میں قدرے اصلاح کی گئی تھی اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ بھی ناقابلِ برداشت

تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان قوانین کی سخت مخالفت کی۔ (مخالفت کی اصل وجہ بقول اُن کے یہ تھی کہ قوانین شریعت کا تعلق علماء سے ہے حکومت ان میں دخل دینے والی کون ہوتی ہے؟)۔ ان قوانین میں تعدد ازواج کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی سے شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی اور حکومت کی تصویب ضروری ہوگی۔ یہ حضرات اس شرط کو بھی ”غلاب شریعت“ قرار دیتے ہیں۔ لیکن قانون کی موجودگی میں وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کیا کرتے تھے، یہ ذرہ غور سے سننے کے قابل ہے۔

زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے: **وَإِنْ خِفْتُمْ أَكْلَ أَنْفُسِكُمْ أَوْ أَنْ تَفْسِدُوا فِي الْإِيمَانِ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ**۔ ”اگر تمہیں اپنی کھانسی اور منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو تم ان میں سے کسی کے ساتھ حسبِ پسند نکاح کرو“۔ ایک پانچویں جماعت کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ — ”اگر... تو“ — والا جملہ شرطیہ کہلاتا ہے۔ اس میں ”اگر اور تو“ دونوں ہوں تو پھر جملہ مکمل ہوتا ہے۔ (مثلاً) آپ اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں کہ ”اگر تم چار بجے آ گئے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا“۔ اب اگر تمہارا وہ دوست چار بجے نہ آئے، چھ بجے آئے اور ”اگر تم چار بجے آئے“ کا جملہ حذف کر کے کہے کہ تم نے کہا تھا کہ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا“ اس لئے تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو، تو آپ اُس کے متعلق کیا کہیں گے۔

نکاح خوان (مولوی صاحب) کو خطبہ نکاح میں **إِنْ خِفْتُمْ** والی آیت بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ اگر یہ آیت پوری پڑھی جائے تو ایک سے زیادہ بیوی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ لیکن یہ حضرات اس باب میں کسی شرط کو جائز نہیں سمجھتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا کرتے تھے؟ یہ **إِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُفْسِدُوا فِي الْإِيمَانِ** کا حصہ حذف کر کے آیت کو مشروع ہی ”فانْكِحُوا“ سے کرتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو دھوکہ دے لیتے تھے کہ ہم نے تعدد ازواج کے لئے اس شرط کو اڑا دیا؟ یہاں تک کہ میں نے ایک نکاح کا مطبوعہ فارم دیکھا تھا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت شروع ہی **فانْكِحُوا** سے کی گئی تھی!

اب آپ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا تھا کہ **وَلَا تَنْكِحُوا** آیت اللہ عز و انہ (۳۳)۔ ”ہمارے احکام کا مذاق مت اڑاؤ“ تو اس کی اس سے زیادہ نمایاں مثال کون سی ہو سکتی ہے؟ یہ ہے جو کچھ یہ حضرات خدا کی کتاب کے ساتھ کرتے ہیں اور قطعاً خدا سے نہیں ڈرتے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ مطالب الفرقان جلد سوم ص ۳۵ پر لکھا گیا ہے اُسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔

نکاح کے سلسلہ میں اس شرط کو پھر دہرا دیا۔

وَالَّذِينَ نَسِئُوا صَدُوقَتَهُمْ نَحْلَةً ۖ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا
فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا ۝ (۴۰)

اور اپنی بیویوں کا ہر کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر، اس طرح دے دیا کہ جس طرح شہد کی مکھی، شہد دیتی ہے
(اس میں کسی قیمت یا بدل کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہر تو ایک تحفہ ہے، نہ کہ کسی چیز کا بدلہ)۔
ہاں! اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بلا تامل اپنے صرف میں لا سکتے ہو۔ (۴۰)

اس آیت کا تعلق تہر سے ہے جس کے متعلق تیسری جلد (ص ۳۵۳) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

یثیٰ النساء کے درمیان تذکرہ کے بعد، یتیموں کی حفاظت کی طرف رجوع کیا گیا اور فرمایا :-

وَلَا تَوْلُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَمًا وَارْزُقُوهُمْ
مِنْهَا وَاسْؤُهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ (۴۱)

یہ بھی یاد رکھو کہ مال کو خدا نے تمہاری قومی معیشت کا ذریعہ (قیام کا موجب) بنایا ہے۔ اس سے قومیں اپنے پاؤں
پر کھڑی ہونے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس لئے اسے ایسے لوگوں کی تحویل میں نہ دو جو اس کے انتظام کی سوجھ بوجھ نہ
نہ رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے روٹی کپڑے اور صحیح تربیت کا انتظام کر دیا کرو۔

بات تو یہ تینانی کے سلسلہ میں کہی گئی ہے، لیکن اس اصول کا اطلاق عمومی ہے۔ اور ہم نے اس کا مفہوم اسی عموم کے پیش نظر
کیا ہے۔ یتیم اس کے اندر خود بخود آجاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے :-

وَابْتَالُوا إِلَيْهِمْ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ اسْتَمْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا
إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ وَمَنْ
كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ
أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهَدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ (۴۲)

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو، اور ان کی جا پچ پڑتا ل کر تے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوتی ہے
حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سیرت بلوغ ۶/۱۵، ۱۴/۱۴، ۱۵/۱۴) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی پختگی نظر آئے، تو ان کا
مال انہیں واپس دے دو (اگر ایسی صورت نہ تو پھر ۴۲ کے مطابق کرو)۔ اور اس خیال سے کہ وہ سیرت بلوغت کو
جلدی پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا، فضول خرچی کر کے، ان کا مال بخرپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے
مال کی حفاظت اور ان کی پردرشن کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورت مند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیے۔ لیکن

جو ضرورت مند ہو (یعنی ان کی جائداد کے انتظام کے لئے اسے جو وقت صرف کرنا پڑے اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگدست ہو جائے) تو وہ قاعدہ اور قانون کے مطابق، حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو، تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت ۳۱ حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لے لینے والا ہے۔

(ضمناً) نکاح کی عمر کے سلسلہ میں اس آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے، اسے مطالب الفرقان۔ جلد سوم ص ۳۳۶ پر دیکھئے



اس کے بعد چند آیات میں قوانین وراثت کا ذکر آیا ہے۔ وراثت کے مسئلہ نے ہمارے معاشرہ میں بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے اور اگر آپ دیوانی مقدمات کے اعداد و شمار جمع کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں اکثریت کا تعلق (بالواسطہ یا بلاواسطہ) وراثت سے ہوتا ہے۔ یہ تنازعات دیوانی (سول) ہی نہیں رہتے۔ بڑھتے بڑھتے فوجداری (CRIMINAL) تک پہنچ جاتے ہیں۔ قوم کی تباہی کا ایک اہم سبب یہ مقدمات بھی ہیں جن کی بیشتر بنیادی وجہ تقسیم وراثت کے پیدا کردہ تنازعات ہوتے ہیں۔ اس لئے وراثت کے قوانین کی اہمیت واضح ہے۔ لیکن ان قوانین تک پہنچنے سے پہلے چند تمہیدی وضاحتیں ضروری ہیں۔

قانون وراثت کی تمہیدات | ① وراثت کے معنی ہیں اس جائداد کی تقسیم جسے مرنے والا (متوفی) چھوڑ کر مرے۔ اسی اعتبار سے اسے ترکہ بھی کہتے ہیں۔ اور یہ اصطلاح قرآن کریم کے مَا تَرَكَ اور مِمَّا تَرَكَ سے ماخوذ ہے (یعنی مرنے والا جو کچھ چھوڑ کر مرے)۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ صودھ ہوتی ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو کسی شخص کے ترکہ کے وارث سمجھتے ہیں، وہ اس شخص کی زندگی ہی میں اپنے آپ کو اس جائداد کا مالک سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اس رسم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی جائداد کی جس طرح چاہیے (DISPOSAL) کرے۔ حتیٰ کہ وہ اسے اس کی منشاء کے مطابق اسے فروخت تک بھی کرنے نہیں دیتے۔ یہ خیال خام اور حقیقت کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جس شخص کو جس چیز پر حق ملکیت حاصل ہوتا ہے اسے اس چیز کی (DISPOSAL) پر پورا پورا اختیار ہوتا ہے اور اس کے وراثہ (یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث) اس کی زندگی میں کسی قسم کا حق اور اختیار نہیں رکھتے۔ وہ صرف "مَا تَرَكَ" (جو کچھ وہ چھوڑ کر مرے) میں اپنا حق رکھتے ہیں۔ یعنی اس شخص کی موت کے بعد۔ اگر وہ کچھ بھی چھوڑ کر نہیں مرنے والا کسی کو

کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

(۳) مالک کا اپنی زندگی میں حق ملکیت تو ایک طرف، قرآن کریم اُسے اس کا بھی حق دیتا ہے۔ (حق ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے) کہ وہ جو کچھ چھوڑ کر مرے، اس کی بابت وصیت کرے کہ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی۔ قانون وراثت کا صرف اس ترکہ پر اطلاق ہوگا جو وصیت پوری کرنے کے بعد باقی بچے۔ اگر وصیت پورے ترکہ کو محیط ہے تو دوسرے کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ (وصیت کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم ص ۱۸۰) (زیر آیت ۱۸۰) دیکھئے اور سوچئے کہ ان حضرات کی جرأت کس قدر بے باک ہے کہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ایک قانون وضع کرتے ہیں اور اسے قانونِ مشرعیّت کہہ کر نافذ کرتے ہیں۔ دیگر اہل مذاہب نے اپنی کتابوں میں اس وقت تحریف کی تھی جب وہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی تھیں۔ لیکن ہم قرآن مجید کی موجودگی میں اس کے خلاف قوانین وضع کرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے۔

(۴) قرآن کے معاشی نظام کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بنایا جا چکا ہے (انڈکس میں حوالے دیکھئے)۔ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاصلہ دولت رہتی ہے۔ نہ وہ جائیدادیں کھڑی کر سکتا ہے۔ نہ زمین پر حق ملکیت رکھتا ہے۔ لہذا، جب وہ نظام رائج ہو، تو پھر وصیت یا تقسیم وراثت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ سوال تو مآخِز سے متعلق ہوتا ہے۔ جب اس نظام میں کسی شخص کا مآخِز (ترکہ) ہوگا ہی نہیں تو اس کی تقسیم کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ لہذا، قرآن کریم کے وراثت یا وصیت سے متعلق احکام کا نفاذ اس دور تک محدود ہوگا جب ہنوز قرآن کا معاشی نظام قائم نہیں ہوگا۔ (انہیں عبوری دور کے احکام کہا جائے گا)۔ ہاں! اگر قرآنی نظام کسی چیز کو کسی شخص کی ملکیت میں دے دے گا تو اس پر قوانین وصیت اور وراثت کا اعلان ہو سکے گا۔

(۵) قرآن کریم نے وصیت اور وراثت کے متعلق جو قوانین دیئے ہیں، وہ اس قدر صاف، سیدھے اور عدل، انصاف پر مبنی ہیں کہ غیر مسلم تک بھی ان کی افادیت اور ان ملکیت کے قائل ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں فقہ کی رو سے جو احکام رائج ہیں وہ قرآن کے خلاف ہیں اور (معاف فرمائے) صریحاً ظلم اور نا انصافی پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پیچیدہ اتنے کہ اور تو اور علماء حضرات میں بھی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنہیں ان پر عبور حاصل ہو۔ (اسے ان کی اصطلاح میں علم الفرائض کہا جاتا ہے)۔ پیچیدہ ہونے کے علاوہ، وہ اس قدر ناقص ہیں کہ پانچویں جماعت کا طالب علم بھی انہیں دیکھ کر محو حیرت ہو جاتا ہے۔ تقسیم کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ مختلف حصوں کا حاصل جمع ایک (۱) نکلے۔ لیکن فقہی قوانین کی رو سے جو حصے کئے جاتے ہیں ان کی حاصل جمع ایک (۱) نہیں نکلتی۔ کبھی ایک (۱) سے زیادہ ہوتی ہے کبھی کم۔ اس کمی بیشی کو پورا کرنے کے لئے، کبھی ایک کے حصے سے کچھ کم کرنا پڑتا ہے، کبھی دوسرے کے حصے میں کچھ اضافہ۔ (۱) سے ان کی اصطلاح

میں عمل کہتے ہیں)۔ آپ سوچئے کہ جب ہم اس قسم کے قانون کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کریں گے تو دنیا اس کی بابت کیا کہے گی؟ وہ یہی کہے گی کہ ان کے خدا کو (معاذ اللہ) پانچویں جماعت کے بچے جتنا بھی حساب نہیں آتا، یہ سب کچھ ہے لیکن ہمارے مذہبی پیشوائیت ان فقہی قوانین پر نظر ثانی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتی۔ اس تمہید کے بعد آئیے قرآنی احکام کی طرف۔ ہم پہلے ان آیات کو ان کے مفہوم کے ساتھ درج کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کی رو سے تقسیم کو سادہ اور سلیس انداز میں پیش کریں گے۔

بَلِّغْ خَالَ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴/۷)

مردوں کے لئے حصہ ہے اس مال میں سے جو ان کے والدین یا وہ رشتے دار جو ان کے اقرب ہوں چھوڑ کر دیں اسی طرح عورتوں کے لئے حصہ ہے اس مال میں سے جو ان کے والدین یا وہ رشتے دار جو ان کے اقرب ہوں چھوڑ کر دیں۔ خواہ وہ تھوڑا سا مال ہو یا زیادہ۔ اس میں ہر ایک کا حصہ مقرر ہے۔ (اس سے ظاہر ہے کہ عورت اپنے مال و دولت کی آپ مالک ہوتی ہے)۔

اس آیت (اور دیگر متعلقہ آیات) میں والدین سے مراد صرف ماں باپ نہیں بلکہ باپ اور ماں سے اوپر تک سلسلہ بھی اس میں شامل ہے۔ (مثلاً) دادا، پردادا یا دوسری طرف نانی، پر نانی وغیرہ اسی طرح اولاد کا لفظ بھی بیٹے بیٹی تک محدود نہیں اس میں نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں۔ (مثلاً پوتا، پر پوتا، دوہتا (نواسہ)، پردوہتا وغیرہ۔ ان مفاہیم کی سمیت ذرہ آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں ”یتیم پوتے کی وراثت“ کے مسئلہ پر بحث کی جائے گی۔ سرِ دست آپ وراثت سے متعلق دیگر آیات ملاحظہ فرمائیے :-

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْضُوهُمْ فَاذْكُرُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَكَلِّمُوا الَّذِينَ الَّذِينَ يَكُونُونَ مِنْ خَلْفِهِمْ ذَرِيَّةً ضَعِيفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَالْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۚ (۴/۸-۱۰)

یتیموں کا مال ناحق کھانے والے | اگر تقسیم وراثت کے وقت ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو، یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے

کچھ دے دو اور سمجھاؤ دو کہ ترکہ کی تقسیم قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی، جس کی رو سے انہیں بطور حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دے دیا گیا ہے، محض ان کی دل جوئی کی خاطر ہے۔

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے اتناواں اولاد چھوڑ جاؤ، تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ ان سے بے انصافی ہو۔ لہذا، تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور نا انصافی سے شہیوں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھڑ رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی، اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی صلاحیتیں حل کر رکھو کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

اب آگے چلئے :-

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِي كَرِيَ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً
فَؤْتَيْنِ فَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثًا مِّمَّا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ
وَلِابْنِكُمُ الْبَكْرِ وَاحِدٌ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ
يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَتُهُ أَبَوَاهُ فَلِلْمَتِّ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِلْمَتِّ
السُّدُسُ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ يُوَصَّى بِهَآ أَوْ ذَيْنِ أَيْأُذُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَاتَنَزِّلُوا
إِيَّاهُمْ أَقْرَبَ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴)

ترکہ کی تقسیم

اس اصولی تمہید کے بعد قانونِ وراثت تمہارے سامنے آتا ہے۔ اس باب میں اولاد کے متعلق خدا کا حکم یہ ہے کہ

(۱) لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے — یعنی لڑکی = ۲/۳ اور لڑکا = ۱/۳ (اس لئے کہ کہنے کے اخراجات کا کفیل مرد ہے، عورت نہیں۔ ۴/۳)۔

سنہ آیت میں الفاظ الذکر اور الانثی ہیں۔ یعنی تر اور مادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں حصے مقرر نہ ہوں اور وارثوں میں مرد اور عورتیں شامل ہوں تو وہاں یہی اصول کارفرما ہوگا۔ یعنی عورت کے مقابلہ میں مرد کا دو گنا حصہ۔

اولاد کے معنی صرف بیٹا بیٹی نہیں، اس میں نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں (پوتا پوتی وغیرہ)

(۲) اگر لڑکیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا $\frac{1}{4}$ حصہ ہے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو نصف۔ (یعنی لڑکے ساتھ نہ ہوں۔ صرف لڑکیاں وارث ہوں)۔

(۳) اور متوفی کے ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا ($\frac{1}{6}$) حصہ ہے بشرطیکہ متوفی کی اولاد بھی ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا حصہ تیسرا ($\frac{1}{3}$) ہے اور باپ کا ($\frac{1}{2}$)۔ اور اگر اس کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا ($\frac{1}{6}$) ہے۔ یاد رکھو! یہ تقسیم متوفی کی وصیت (جو فرض ہے $\frac{1}{8}$ پوری کر دیے اور قرضہ چکا دینے کے بعد ہوگی)۔ (یعنی ترکہ سے سب سے پہلے متوفی کا قرضہ ادا کرو۔ پھر دیکھو کہ اس کی وصیت کیا ہے۔ اگر وصیت پورے مال پر حاوی نہ ہو۔ یا وہ وصیت کر ہی نہ سکا ہو۔ تو اس صورت میں ترکہ کی تقسیم مذکورہ بالا حصوں کے مطابق کرو)۔ اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کون سا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے۔ اس لئے یہ حصے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں؛ کیونکہ اس کا ہر فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ (یعنی متوفی تو جانتا تھا کہ کون سا رشتہ دار اس کے ترکہ کا زیادہ حقدار ہے۔ اس لئے اس کا وصیت کرنا فرض قرار دے دیا گیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پھر خدا نے اسے تم پر چھوڑنے کے بجائے حصوں کا تعین خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے)۔

اس آیت میں الفاظ الذکر اور الانثی آئے ہیں۔ یعنی ترا اور مادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں قرآن نے خود حصے متعین نہ کئے ہوں اور رثاء میں عورتیں اور مرد دونوں شامل ہوں وہاں اصول تقسیم یہ ہوگا کہ عورت کے مقابلے میں مرد کا دگنا حصہ۔ نسبی رشتوں کے بعد قرآن مجید عقدی رشتوں کا ذکر کرتا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۖ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكَنَّ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِ يَوْصِيْنَ بِهَا أَوْ دِيْنٌ ط
وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكَنَّ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۖ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ السُّمْنُ مِمَّا تَرَكَنَّ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِ يَوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دِيْنٌ ۚ وَإِنْ كَانَ سِرْجُلٌ يُوْرَثُ كَلَلَةً أَوْ امْرَأَةٌ ذَلَّةٌ ۚ أَحٌ أَوْ أُخْتُ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرًا مِّنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنَ الْبَعْدِ وَصِيَّتِ يُوْصِيْ بِهَا أَوْ دِيْنٌ ۚ غَيْرَ مُضَآءٍ ۚ وَصِيَّتٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ (۴)

(۱) جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ کر مریں اس میں سے تمہارا حصہ نصف ($\frac{1}{2}$) ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو۔

اگر ان کی اولاد ہو تو پھر ان کے ترکہ میں سے تمہارا حصہ (۱/۲) ہے۔
یہ تقسیم اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہوگی جو انہوں نے کی ہے۔ یا ان کے قرضہ کی ادائیگی کے بعد۔
(۲) تمہارے ترکہ میں تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ (۱/۴) ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو۔ اگر تمہاری اولاد ہو تو
بیویوں کا حصہ آٹھواں (۱/۸) ہے۔ تمہاری وصیت پوری کرنے یا قرضہ ادا کرنے کے بعد (۳) اگر متوفی
لا ولد ہو اور اس کے ماں باپ بھی ہوں اور بھائی بہن بھی تو

اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ (۱/۶)
اور اگر بھائی بہنوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو وہ سب ایک بھائی (۱/۶) میں شریک ہوں گے۔
(جب ایسے متوفی کے ماں باپ بھی نہ ہوں تو اس کے ترکہ کی تقسیم (۱/۴) کے مطابق ہوگی۔ یہ تقسیم بھی وصیت
اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے ”عَلَىٰ مِثْلَ مَا تَرَ“ تو اس کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سُدُس اور ثُلُث (چھٹے حصے اور
تیسرے حصے) کی تقسیم اس طرح کرو کہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ترکہ میں مختلف قسم کی چیزیں شامل ہوں گی۔ ان
کے حصے اس طرح کرو کہ کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔ (مثلاً ایک مکان ہے جس کے چھ حصے یا تین حصے کرنے
ہیں تو یہ حصے عمل دانصاف کی رو سے کئے جائیں)۔ (وصیت کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔
ص ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ زیر آیت ۱۸ دیکھئے)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ طریق تقسیم یہ ہے کہ پہلے عقدی رشتوں کے حقوق ادا کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں آیت (۱۸) میں
کہا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَّهِمَا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلَّذِينَ عَقَدَتْ
أَيْمَانُكُمْ فَاتُوهُمْ ذَوِي عِلْقَةٍ مِنْهُمْ إِنْ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ أُولَٰئِكَ

مردوں اور عورتوں کے ہر اگانہ حقوق ملکیت کا فطری تقاضا ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو
— صرف مردوں ہی کا نہ ہو — چنانچہ جو کچھ کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے لئے حصے

مقرر کر دیئے ہیں۔ (۱۸) یہ صرف نسبی رشتہ داروں تک محدود نہیں۔ عقدی رشتے بھی اس
میں شامل ہیں۔ عقدی رشتوں میں ایک تو میاں بیوی ہیں اور دوسرے وہ لوگ جنہیں
ادرنے وصیت (معاہدہ) تم کچھ دینا چاہا ہو۔ اصول تقسیم یہ ہے کہ پہلے ان لوگوں کا حصہ نکال لیا جائے اور اس کے

عقدی رشتے

بعد (یقیناً) دوسروں میں تقسیم کیا جائے۔ (اس طرح، بیوی کو اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ سے سب سے پہلے حصہ ملے گا)۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ خدا کی نگاہ ہر بات پر رہتی ہے۔

آیت (۴/۱۱) میں کَلَلَّةٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔ کَلَلَّةٌ کے معنی ہیں لا ولد متوفی۔ اس کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک وہ جس کے ماں باپ اور بہن بھائی ہوں۔ اس کے متعلق — مندرجہ بالا آیت میں حکم آگیا ہے کَلَلَّةٌ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں متوفی کے نہ اولاد ہو اور نہ ہی ماں باپ۔ اس کے متعلق حسب ذیل آیت میں حکم آیا ہے :-

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَلَةِ ۖ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنِ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلُثُ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رَّتْ جَالًا فَلَهُ لَكُمْ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَصِلُوا ۖ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (۴/۱۶۴)

(اس سورۃ کے شروع میں وراثت کے قوانین بیان کئے گئے تھے، جن میں کلالہ یعنی لا ولد کا ذکر بھی آیا تھا۔ وہاں اس لا ولد مرنے والے کا ذکر تھا جس کے ماں باپ اور بہن بھائی موجود ہوں)۔ اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خدا خود بتاتا ہے۔

اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔ تو اس کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی۔

(۱) اگر متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو، تو ترکہ میں اس کا نصف حصہ ہوگا۔

(۲) اگر متوفیہ عورت ہو اس کے ترکہ کا وراثت اس کا بھائی ہوگا۔

(۳) اگر ایک بہن کے بجائے دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ہوگا۔ دو سے زیادہ

بہنوں کے لئے بھی یہی اصول ہوگا۔ (۴/۱۱)۔

(۴) اگر بھائی بہن ملے جلے ہوں تو ”ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ“ کا اصول کاوند ما ہوگا (۴/۱۱)

(یہ تقسیم قرصہ کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ ۴/۱۱)۔

اللہ تمہیں یہ احکام کھل کھل کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو۔ اور اللہ ہر بات کا صحیح علم رکھتا ہے۔

اس لئے اس کے احکام و قوانین علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

وراثت کے متعلق الہی آیات میں آئے ہیں اگرچہ آیات کے اس مفہوم سے جو اوپر دیا گیا ہے، یہ احکام واضح ہو

جاتے ہیں، لیکن چونکہ ان معاملات سے ہم سب کا اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، اسی لئے سہولت اسی میں ہوگی کہ تقسیم کا یہ پورا نقشہ بیک نظر سامنے آجائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ذیل میں یہ نقشہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تقسیم اور حصص احکام قرآنی کے مطابق ہیں۔ ہمارے قوانین شریعت اور مرد و جدہ ملکی قوانین ان سے مختلف ہیں۔ نہ ہماری مرقبہ شریعت اور نہ ہی (سرودست) ہماری مملکت میں قرآنی احکام نافذ ہیں۔ پہلے یہ اصول دیکھئے :-

① سب سے پہلے متوفی کا قرضہ ادا کیا جائے گا۔ پھر وصیت پوری کی جائے گی۔ اس کے بعد جو بچے کا وہ اس کا ترکہ کہلائے گا۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی :-

② پہلے عقدی رشتوں کے حصے ادا کئے جائیں گے۔ یعنی میاں بیوی کے۔ (میاں بیوی کے علاوہ جنہیں وعدہ کے طور پر کچھ دیا گیا ہو، انہیں بھی عقدی کہا جائے گا، لیکن ان کا معاملہ وصیت کی رو سے طے پائے گا۔)

③ اس کے بعد جو بچے جائے، اس میں سے ان وارثوں کے حصے ادا کئے جائیں گے جن کے حصے خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔

④ اس کے بعد جو باقی بچے وہ ان میں تقسیم ہوگا جن کے حصے خود خدا نے مقرر نہیں کئے۔ ضرر اصول تقسیم بتایا ہے۔

⑤ اگر کوئی شخص لا وارث مرگیا ہو، یا مندرجہ بالا تقسیم کے بعد کچھ بچ جائے، تو وہ حق حکومت ہوگا۔

چونکہ ترکہ (یا وراثت) کی تقسیم کا مسئلہ معاشرہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ (قرآن کریم کی رو سے) اوپر بتایا گیا ہے، اسے ترتیب سے دوبارہ لکھ دیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ یہ تقسیم متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور وصیت پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچے، اس پر تہوگی۔

(۱) میاں بیوی

بیوی کے ترکہ میں سے خاوند کا حصہ :-

۱۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو $(\frac{1}{4})$ ۲۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو $(\frac{1}{2})$

خاوند کے ترکہ میں بیوی کا حصہ :-

۱۔ اگر خاوند کی اولاد نہ ہو $(\frac{1}{8})$ ۲۔ اگر خاوند کی اولاد نہ ہو $(\frac{1}{4})$

(۲) ماں باپ کا حصہ

۱۔ اگر متوفی صاحب اولاد نہ ہو تو —

ماں اور باپ ہر ایک کو $(\frac{1}{4})$ - (باقی اولاد کو)

۲۔ متوفی لادلد ہو اور وارث صرف ماں باپ ہوں تو ماں کو $(\frac{1}{3})$ - اور باپ کو $(\frac{2}{3})$

۳۔ اگر لادلد متوفی کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں کا حصہ $(\frac{1}{4})$ ہوگا۔

(۳) اولاد

{ اوپر کے حصے نکالنے کے بعد جو کچھ بچے اس میں سے }

۱۔ ایک لڑکا یا زیادہ لڑکے (جب لڑکی کوئی نہ ہو) تو یہ سب برابر برابر تقسیم کر لیں گے۔

۲۔ لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔

طریقہ یہ ہے کہ لڑکوں کی تعداد کو دگنا کر کے اس میں لڑکیوں کی تعداد جمع کر لو۔ یہ کل حصے ہو جائیں گے۔ ان

میں اکبر حصہ لڑکی کا۔ دو ہر حصہ لڑکے کا۔ مثلاً دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے اور ترکہ پانچ ہزار روپیہ ہے۔

طریقہ : $5 = 1 + 4$ ، $\frac{5000}{5} = (1000)$

ہر لڑکا = ۲۰۰۰ (کل = ۴۰۰۰)
 لڑکی = ۱۰۰۰

۳۔ اگر صرف لڑکیاں ہوں۔

۱۔ صرف ایک لڑکی ہو تو - $(\frac{1}{2})$

۲۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو $(\frac{2}{3})$ میں شریک۔ جو باقی بچے وہ حکومت کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

۳۔ یتیم پوتا پوتی اپنے مرحوم باپ کے حصے کے وارث ہوں گے۔ (تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی)

(۴) کلالہ (لادلد متوفی)

بیوی یا خاندن کا حصہ نکالنے کے بعد۔

۱۔ اگر اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سب ہوں۔

(۱) صرف ایک بھائی اور ایک بہن - ہر ایک کو $(\frac{1}{2})$

(۲) جب بھائی بہن زیادہ ہوں تو $\frac{1}{3}$ میں سب شریک۔

(۳) بقایا ماں باپ کو - اس طرح کہ ماں کو $(\frac{1}{3})$ باقی باپ کو

(۴) اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو $(\frac{1}{3})$ باپ کو $(\frac{2}{3})$

۲۔ کلالہ کے ماں باپ نہ ہوں۔ صرف بہن بھائی ہوں۔

۱۔ متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو تو اسے (۱/۲)

۲۔ ایک سے زیادہ بہنیں (۱/۲) میں سب شریک۔

۳۔ مے جلے بہن بھائی سارے کا سارے جائیں گے بھائی کے دو، بہن کا ایک کے حساب سے۔

[اخوۃ کے معنی بھائی بہن مے جلے ہیں۔ (۱۳:۱۲) - (۴:۱۷۷)]

۴۔ متوفیہ عورت ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا — بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب سادی

تقسیم کریں گے۔

(کلالہ: - لیس للہ ولد - ولہ، اُح' او اخت او اخوۃ) (۴:۱۷۷) - (۴:۱۷۷)

لافلہ متوفی۔ ماں باپ ہونے یا نہ ہونے کی شرطیں نہیں۔ ماں باپ ہوں گے تو تقسیم اور طرح ہوگی۔ اگر ماں باپ بھی نہ ہوں تو دوسری طرح۔ دونوں صورتیں اوپر دے دی گئی ہیں۔

ان حصص کو بیان کرنے کے بعد ارشاد خداوندی ہے :-

قَدْ حَدُّوْا لِلّٰہِ ۚ وَ مَنْ یُّطِيعِ اَمْرَہٗ یَدْخُلْہٗ جَنَّۃً تَجْرِیْ

مِنْ تَحْتِہَا ۚ اِلَّا نَہْمٌ خَلِدٰیْنِ فِیْہَا ۚ وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَ مَنْ

یَعْصِیْ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یَدْخُلْہٗ نَارًا اَخَالِدُ اِیْہَا مِنْ ذٰلِہٖ عَذَابٌ

مُہِیْنٌ ۝ (۱۳-۱۴)

یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ سو جو لوگ اس نظام خداوندی کی اطاعت کریں گے جس کی تشکیل رسول اللہ کے ہاتھ

سے ہوئی ہے، ان کے لئے ایسا جنتی معاشرہ پیدا ہو جائے گا جس کی مثال دنیا میں نہیں ملے گی۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی

اور جو اس نظام کی نافرمانی کرے گا۔ یعنی ان حدود اللہ سے تجاوز کرے گا۔ تو اس کی زندگی ایسے ذلت آمیز عذاب

میں گزرے گی جو اس کی انسانی صلاحیتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔

اس سے آپ ان احکام کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اس کے بعد اس حقیقت پر خون کے آنسو بہائیے کہ جو

قوامین وراثت ہمارے ہاں شریعت کے نام سے مروج چلے آ رہے ہیں، وہ علی الرغم ان کے خلاف ہیں!

فاعتبروا یا اولیالباب!

ان قوانین کے خلاف قرآن ہونے کے علاوہ ان میں اکثر و بیشتر بے انصافی سے کام لیا گیا ہے اور اس بے انصافی میں ہمارے نزدیک سب سے زیادہ نمایاں مثال یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم کرنے کا قانون ہے۔ چونکہ اس مسئلہ نے آج کل بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اسے ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ میں اس موضوع پر گزشتہ قریب تیس سال سے لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میرا آخری مقالہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں درج کر دیا جائے کیونکہ وہ اس متنازعہ فیہ مسئلہ کے تمام گوشوں کی وضاحت کر دیتا ہے۔

قرآن مجید میں قانون وراثت کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے :-

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ..... (۴)

اقربوں جن میں والدین بھی شامل ہیں جو کچھ چھوڑ کر فوت ہوں (اس کی تقسیم یوں ہوگی)۔ دوسری آیت یہ ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ..... (۵)

اولاد میں ترکہ کی تقسیم کے متعلق یہ حکم ہے :-

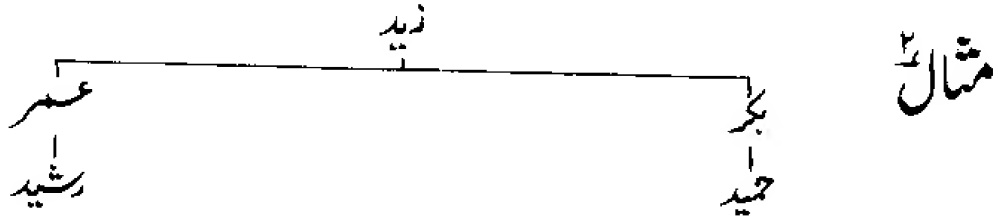
ان آیات میں والدین۔ اولاد اور اقربوں کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ہماری زبان میں والدین سے مراد صرف ماں باپ ہوتے ہیں اور اولاد سے مراد بیٹے بیٹیاں۔ لیکن عربی زبان میں ماں باپ اور ان سے اوپر تک (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں اور اولاد میں بیٹے بیٹیاں اور ان سے نیچے تک (پوتے پڑپوتے وغیرہ) سب۔ اس حقیقت کو اہل فقہ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اختلاف اقربوں کے مفہوم میں ہے۔

قرآن کریم نے والدین کے ساتھ جو اقربوں کا اضافہ کیا ہے تو اس میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے

مثال	زید بکر عمر حمید رشید	اس میں بکر سے لے کر رشید تک سب زید کی اولاد میں شامل ہیں اور حمید سے لے کر زید تک سب رشید کے والدین میں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے زید کی وفات پر بکر سے لے کر رشید تک سب اس کے وارث قرار پا جائیں گے اور رشید کی وفات پر حمید سے لے کر زید تک۔ لیکن اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہو جائیں۔ قرآن مجید نے اقرب کا اضافہ کر کے معاملہ صاف کر دیا۔ لیکن جس لفظ
------	-----------------------------------	---

نے قرآنی منشاء کو اس قدر واضح کر دیا تھا فقہ نے اسی سے سارے معاملہ کو الجھا دیا۔ اقربوں کا عام ترجمہ رشتہ دار یا قریبی رشتہ دار کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ یا مفہوم کی رو سے کہا جاتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار

وارث نہیں ہو سکتا۔ اقربوں کے اسی مفہوم کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم قرار دیا جاتا ہے۔ بات ذیل کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔



اہل فقہ کا کہنا ہے کہ بکر اور عمر ذید کے "قریبی رشتہ دار" ہیں۔ اس لئے وہی ذید کے ترکہ کے وارث ہوں گے۔ حمید اور رشید "دور کے رشتہ دار" ہیں۔ (بکر اور عمر کی موجودگی میں) وہ ذید کے ترکہ کے وارث نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک بات ٹھیک ہے کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، یہ اقرب کے قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ ذید کی زندگی میں بکر وفات پا جاتا ہے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں عمر جو ذید کا قریبی رشتہ دار ہے وہ اس کے کل ترکہ کا وارث ہوگا اور حمید جو ذید کا دور کا رشتہ دار ہے وہ اس کے ترکہ سے محروم ہو جائے گا۔ یتیم پوتے کی محرومی کی ساری عمارت اس فقہی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

(۳) اقرب (جمع اقربوں) کا مندرجہ بالا مفہوم صحیح نہیں۔ "اقرب" کا لفظی ترجمہ "قریب تر" ہے۔ "رشتہ دار" نہیں۔ رشتے داروں کے لئے قرآن مجید میں ذی القربی وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ "اقرب" قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ ترکہ "اقربوں" کو ملے گا۔ اس نے کہا ہے کہ جو کچھ اقربوں چھوڑ جائیں وہ ان کے ورثاء میں تقسیم ہو۔ یعنی اقرب کا لفظ متوفی کے لئے آیا ہے، وارث کے لئے نہیں۔ بظاہر ان دونوں میں کچھ فرق نظر نہیں آتا لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان میں بڑا اہم فرق ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ متوفی جس کے وارث اس کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔ مثال کے طور پر کو سامنے لائیے۔ ذید، بکر اور عمر دونوں کا اقرب ہے کیونکہ اس کے اور اس کے ان بیٹوں کے درمیان کوئی اور وارث حائل نہیں۔ لیکن وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں کیونکہ اس کے اور ان دونوں کے درمیان بکر اور عمر روک بن کر کھڑے ہیں۔ یعنی ذید اور حمید کے درمیان بکر اور ذید اور رشید کے درمیان عمر۔ لہذا، بکر اور عمر کی موجودگی میں وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا۔ وہ بے شک حمید اور رشید کا "والد" ہے لیکن ان کا اقرب نہیں۔ اس سے مثال مذکی حکمت بالغہ واضح ہو جائے گی۔

لیکن اگر ذید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو وہ حمید کا اقرب ہو جائے گا کیونکہ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی جس کی وجہ سے وہ حمید کا اقرب نہیں تھا۔ البتہ وہ رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اور رشید کے درمیان

عمر کی رکاوٹ موجود ہے۔ لہذا، زید کی وفات پر رشید تو اس کے ترکہ سے محروم رہے گا، حمید نہیں۔

اب آپ سوچئے کہ جب قرآن مجید نے کہا ہے کہ اقرب جو کچھ چھوڑ کر مرے ان کے ترکہ کی وارثان کی اولاد ہو گی تو حمید کو، جو زید کی اولاد بلا رکاوٹ ہے، زید کی وراثت سے محروم کر دینا قرآن مجید کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو کیا ہے؟ فقہ کا فیصلہ ہے کہ عمر جس طرح رشید کے راستے میں رکاوٹ ہے اسی طرح حمید (یتیم) کے راستے میں بھی رکاوٹ ہے۔ سوچئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بکر کی زندگی میں زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر تھا، نہ کہ عمر تو بکر کے مرنے کے بعد عمر، حمید کی رکاوٹ کیسے بن گیا؟ ذیل کی مثال کی دلائلوں پر غور کیجئے۔

مثال ۳

زید اور زید	{	یہ دونوں لائیں الگ الگ ہیں۔ بکر حمید کی رکاوٹ ہے اور عمر رشید کی۔
بکر		
عمر		
حمید	{	آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ فقہ بھی اسے تسلیم کرتی ہے کہ زید اور رشید
رشید		

حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر ہے، عمر نہیں۔ اگر زید اور بکر کی زندگی میں حمید فوت ہو جائے تو اس کا وارث بکر ہوتا ہے۔ زید نہیں۔ لیکن اگر بکر، حمید سے پہلے فوت ہو جائے تو پھر فقہ، زید کو حمید کا وارث تسلیم کر لیتی ہے خواہ عمر زندہ ہی ہو۔ یعنی اس صورت میں عمر، زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بالفاظ دیگر، ہماری فقہ کی رو سے یتیم پوتہ تو دادا کی وراثت سے محروم قرار پا جاتا ہے لیکن دادا اپنے یتیم پوتے کی وراثت سے محروم نہیں قرار پاتا۔ یہ بات آپ کو عجیب سی لگے گی۔ لیکن عجیب ہو یا غریب ہے یہ واقعہ۔ فقہ کا یہی فیصلہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ فقہ خود تسلیم کرتی ہے کہ اقرب کے معنی ”قربہی رشتے“ نہیں بلکہ وہ ستوفی ہے جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔

(۴) فقہ کے فیصلے کی رو سے جو لکھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ زید اور اس کے دونوں بیٹے (بکر اور عمر) ایک جگہ کھڑے ہیں۔ کچھ ڈاکو زید پر حملہ کرتے ہیں۔ عمر اپنے باپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ بکر اسے بچانے کے لئے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتا ہے۔ گولی اسے بھی لگتی ہے اور زید کو بھی۔ بکر وہی موقع پر مر جاتا ہے اور زید ہسپتال جا کر کچھ وقت بعد دم توڑ دیتا ہے۔ فقہ کے فیصلے کی رو سے بکر کی یتیم اولاد زید کے ترکہ سے محروم رہ جائے گی اور عمر جو باپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ باپ کے سارے ترکہ کا وارث بن جائے گا۔

جب زید اور بکر کو گولی لگی تھی، اگر زید پہلے مر جاتا اور اس کے دو منٹ بعد بکر فوت ہو جاتا تو حمید کو زید کے ترکہ سے حصہ مل جاتا۔ لیکن اگر بکر زید سے دو منٹ پہلے مر جائے تو پھر حمید کو کچھ نہیں مل سکتا۔

(۵) اہل فقہ کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پوتا اپنے باپ کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے۔ جب بکر کو اپنے باپ سے پہلے مرجانے پر باپ کے ترکہ سے کچھ ملا ہی نہیں تو حمید کون سے ترکہ کا وارث ہو جائے گا؟ ان سے پوچھنے کہ اگر دلیل یہی ہے تو اگر بکر اور عمر زید سے پہلے مرجائیں تو زید کے مرنے پر حمید اور رشید کو اس کے ترکہ کا وارث کیسے بنایا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے تو اپنے باپوں کا ترکہ لینا تھا۔ جب ان کے باپوں نے زید کا کوئی ترکہ ہی نہیں پایا تھا تو ان کے بیٹوں کو زید کا ترکہ کیسے مل جائے گا؟ لیکن فقہ خود اپنی دلیل کے خلاف انہیں ترکہ دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ حمید اپنے باپ کے مرنے پر باپ کی جگہ آجاتا ہے اسی طرح رشید اپنے باپ کے مرنے پر اس کی جگہ۔ اس وقت یہ زید کے ”پوتے“ نہیں رہتے۔ ”اولاد“ میں شامل ہونے کی جہت سے اس کے ”بیٹے“ بن جاتے ہیں۔ یعنی زید کے بیٹوں کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ یتیم پوتہ اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔

مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ حضرات اپنے مؤقف کی تائید میں کون سی سند پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سن لیجئے۔ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم قرار دینے میں مودودی (مرحوم) پیش پیش تھے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ اس کے لئے سند کیا ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا:-

فقہاء اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہاء امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (رسائل ومسائل جلد دوم۔ ایڈیشن سوم ۱۴۱۰ھ - ۲۰۹)

یعنی انہیں اپنے مؤقف کی تائید میں نہ قرآن کریم سے کوئی حکم ملا نہ حدیث سے لیکن چونکہ اسلاف سے یہ مسلک متواتر چلا آرہا ہے اس لئے اتباع اسی کا کرنا چاہیئے۔ یہ وہی دلیل ہے جسے قرآن کریم متعدد مقامات پر یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْمِعُوا مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّنْ رَّبِّكُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** (۳۱) ”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جو ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے“

ما انزل اللہ کے اتباع کی دعوت طلوع اسلام نے دی تھی۔ ان کے متعلق مودودی (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ

یہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نئی الجھن کی بات نکالا

کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری اُمت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے اس طرح کے خطبوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے ؟

(ترجمان القرآن بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

علم اور دین کی بارگاہ سے اس قسم کے جوابات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ جب تک یتیم پوتوں کا دادا زندہ تھا وہ ان کی پرورش کا ذمہ دار تھا کیونکہ اس کی جائداد اس کے اپنے قبضے میں تھی اس کے مرنے کے بعد یہ جائداد یتیموں کے چچا کے پاس چلی جائے گی اور انہیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا تو یہ بے سہارا رہ جائیں گے۔ ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کا انتظام کریں۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ص ۲۱)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ دادا ان کے حق میں کچھ وصیت بھی کر سکتا ہے۔ یعنی پہلے تو انہیں اس حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور پھر ان کے چچا کو ترغیب دلائی کہ وہ ان بے سہارا یتیموں کی طرف (جن کے حصے کو وہ ہٹا کر چکے ہیں) بھیک کے کچھ ٹکڑے پھینک دیا کریں (یتیموں کی جس طرح پرورش ہوا کرتی ہے اس کا کسے علم نہیں)۔ اس سے ہمیں یہودیوں کی وہ ذہنیت یاد آگئی جسے قرآن کریم نے ہماری عبرت آموزی کے لئے بیان کیا ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اپنے ہاں کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو بستنیوں سے نکال دیتے اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر قیدی بنا لیتے تو یہ ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے آپس میں چندے اکٹھے کرتے کیونکہ ان کے نزدیک قیدیوں کو رہا کرنا بڑے ثواب کا کام تھا۔ قرآن کریم نے اس پر ان کی سخت سرزنش کی ہے اور کہا ہے کہ اس ثواب کمانے کی خاطر تم جو پہلے جرم کرتے ہو تمہیں اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں اور کیا تمہارا یہ (بزعم خویش) ثواب کا کام اس کا کفارہ بن سکتا ہے ؟ اس کے بعد کہا کہ اَفَتُوْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے سے کفر بتاتے ہو۔ یاد رکھو : فَمَا حَزَّ اَءُ مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۵۶) اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا کہ دنیاوی زندگی میں تم ذلیل و خوار ہو اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا۔

یتیم پوتوں کے سلسلے میں ہم یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ پہلے انہیں ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں اور پھر

ان کے اپنی رشتے داروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کر کے ثواب کمائیں نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔
 اس ضمن میں اتنا اضافہ غیر زمحل نہ ہوگا کہ ۱۹۶۱ء میں حکومت کی طرف سے عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ پاسکے گا۔ ہمارے علماء حضرات اس وقت سے لے کر آج تک ان قوانین کے بالعموم اور یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق شق کو بالخصوص منسوخ کرانے کی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سطور کی تحریر (۱۹۶۹ء) تک تو انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اس میں کامیاب ہو جائیں جب یہاں حدود (شرعی سزائیں) جیسے فقہی قوانین نافذ ہو سکتے ہیں جو قرآن کریم کے بھی خلاف ہیں اور ناممکن العمل بھی تو یتیم بچوں کو سہارا دینے والا قانون کیوں نہیں منسوخ ہو سکتا ہے؟ بہر حال، یہ بحث جداگانہ ہے۔ قانون وراثت کے سلسلے میں آخری (اور نہایت اہم) شق، یتیم پوتے کی وراثت کا سوال تھا جسے ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ ترکہ وراثت اور وصیت کے متعلق احکامات اس عبوری دور کے لئے ہیں جب قرآن کا معاشی نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا ہوگا۔

تقسیم وراثت کے بعد قرآن کریم عائلی زندگی کی طرف آتا ہے اور اس ضمن میں بات تحفظ عصمت سے شروع کرتا ہے۔ تحفظ عصمت کو قرآن کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۴۰) میں بتایا جا چکا ہے، اب خود مغرب کے محققین بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ جنسی مسئلہ انفرادی نہیں۔ اس کا اثر قوم کی اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے، اور جو قوم جنسی تعلقات کی پابندیوں میں ڈھیل دے دیتی ہے، وہ دوبہ انحطاط ہو جاتی ہے اور (ڈاکٹروں کی تحقیق کی رو سے) زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے حفاظتِ عصمت کو غیر متبدل ابدی قدر قرار دیا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر سابقہ جلدوں (بالخصوص جلد سوم) میں بڑی وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ کی اہمیت سے صرف نظر کر کے اپنے آپ کو اس کے قانونی پہلوؤں تک محدود رکھیں گے۔

(۱) زنا

اپنی منکوحہ بیوی کے سوا، کسی اور سے جنس اختلاط زنا ہے۔ قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیات کے سلسلے میں کہا گیا ہے:-

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ ذُنُوبِهِمْ يَحْفَظُونَ ۝ اِلَّا عَلَىٰ اَرْوَاحِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

لیکن (فقہ پر مبنی) جو قوانین پاکستان میں نافذ ہوئے ہیں۔ اُن کی رُو سے :-

۱۔ سو کوڑے غیر شادی شدہ مجرمین کی سزا ہے ۔

۲۔ شادی شدہ کی سزا جہم (سنگسار) ہے۔

جہم کی سزا | جہم یا سنگسار کی سزا یہودیوں کے ہاں رائج تھی۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ لہذا، فقہ کی رُو سے یہ سزا، قرآن کریم میں کھلی ہوئی تحریف ہے۔ یہاں سے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب قرآن کریم میں یہ سزائیں مذکور نہیں تو یہ حضرات اس کی سند کہاں سے لاتے ہیں؟ سند لاتے ہیں، حسب معمول، وضعی روایات سے اسے غور سے سُنئے۔ ”الانفان فی علوم القرآن“ کی دوسری جلد (ص ۲۵) میں، حضرات ابی بن کعبؓ سے ایک روایت درج ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

عن ذر بن جیش، قال قال لی ابی بن کعب کا بین تعد سورۃ الاحزاب قلت اشدین و سبعین آیۃ او ثلاثۃ و سبعین آیۃ۔ قال ان کانت لتعدی سورۃ البقرۃ۔ کتّا لتقرأ فیہا آیۃ الرجم قلت وما آیۃ الرجم۔ قال اذا نزل الشیخ والشیخۃ فاس جموها البتۃ۔ نکالا من اللہ۔ واللہ عن یزحکیم۔

(الانفان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ ص ۲۵)

حضرت ذر بن جیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعبؓ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۃ اخراہ میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ سی ۴۲۔ ۴۳ (جو سورۃ احزاب میں موجود ہیں) انہوں نے کہا کہ نہیں۔ سورۃ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ ناقل)۔ ان میں ایک آیت رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آیت رجم کیا تھی، فرمایا کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخ والشیخۃ آئے ہیں۔ عربی زبان کا متبذی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔ عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے۔ لیکن ان واضح روایات نے تو زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا۔ اس لئے سورۃ النور کی آیت میں جو الفاظ..... الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي آئے ہیں ان کے معنی کئے گئے ”غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد“ اور اس کے بالمقابل الشیخ والشیخۃ کے معنی کئے گئے۔ ”شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت“

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ سورہ احزاب میں سورہ بقرہ جتنی آیات تھیں یعنی ۲۸۶ آیات۔ قرآن مجید میں سورہ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟ وہ کہاں چلی گئیں؟ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رحم سے متعلق تھی انہوں نے تحقیق کر لی غور سے سُنئے کہ وہ تحقیق کیا تھی۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے)۔ کہا گیا ہے کہ جب قرآن کریم مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرامؓ کو دو آہستیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت رحم سے متعلق تھی، اور دوسری رضاعت سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا کہ آیہ رحم اور آیہ رضاعت کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہذا ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن (روایات کی رُو سے) اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ہم آیہ رحم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ (غالباً اس زمانے میں جب وہ برسرِ اقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس آیت کی تلاوت رسول اللہ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ تو آپ اسے قرآن کریم میں درج کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

وقال عمرؓ لولا ان يقول الناس زاد عمر في كتاب الله لا ثبت في المصحف۔

(تفسیر کبیر۔ از امام رازی۔ نیا ایڈیشن۔ جلد ۳۲۔ ص ۱۳۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کر دیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ تھا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہم اے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ صرف تلاوت

کے لئے رہ گئی ہیں۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں تو موجود نہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ جیسے آیہ رحم۔

آپ نے غور فرمایا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآن مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں لیکن اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہل حدیث ہوں یا اہل فقہ قرآن حکیم کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔



یہ تو ہمارے رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابق فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے۔ اس موضوع پر بخاری کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمائیے:-

عن عمرو بن ميمون قال رأيت في الجاهلية قريظة اجتمع عليها قريود قد ذنت
فرجموها فرجمت معهم۔ (صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانہ جاہلیت میں، میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا۔ اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:-

عن عمرو بن ميمون قال كنت في اليمن في غنم لاهلي وانا على مشرف - فجاء قرد مسح
قريظة فتوسد يدها فجاء قريدا صغرمته - فغمرها - فسلت يدها من داس القريود
سلاد فبقا - فتبعته - فوق عليه وانا انظر - ثم رجعت وجعلت تدخل يدها تحت
قرد اقل برفق - فاستقطف فرعا - فشمها - فصاح فاجتمعت القريود فجعل يصيح ويلوح
اليها بيد - فنهب القريود يمينه ويساره فجاء ابد لك القريود اعرفه - فحفوا
لها حفرة فرجموها۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی - جلد ہفتم - ص ۱۳)

حضرت عمرو بن مامون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چارہ اٹھا اور میں ایک اونچی جگہ پر

کھڑا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری۔ تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا سرور ہے) چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بیٹھا کہ چیتا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر ادھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے۔ جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمر بن مہمون نے بھی انہیں پتھر مارے تھے)۔

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی جسے ان روایات کی رو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرو کی ضرورت نہیں۔ یہ ہے یہ جہنم کی اس سزا کی سند جسے پاکستان میں قانون مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے۔



آیت (۲۴) میں مجرم زنا کی سزا مائتہ جلدۃً مقرر کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ ہے ”تو کوڑے“

کوڑوں کی تفصیل | ہمارے ہاں اس سے پہلے کوڑوں کی سزاجیل خانوں میں ایسے قیدیوں کو دی جاتی تھی جن سے (قید خانے کے اندر) کسی سنگین جرم کا ارتکاب ہوتا تھا۔ چونکہ یہ سزاجیل خانے کے اندر دی جاتی تھی، اس لئے باہر کی دنیا کو بالعموم اس سزا کی نوعیت یا شدت کا علم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پاکستان میں (۱۹۷۷ء سے) جو آرٹیکل نافذ ہوا، تو اس میں کوڑوں کی سزا معمول بن گئی۔ یہ کوڑے (بالخصوص) سر عام لگائے جاتے تھے۔ اس کے لئے انتہام یہ کیا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کیا جائے تاکہ ان کے سامنے کوڑے لگائے جائیں بعض اوقات ان مجرموں کے منہ کے سامنے لاؤڈ سپیکر نصب کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کی چیخ و پکار دور دور تک سنائی دے۔ ان کوڑوں کی سنگینی کا یہ عالم تھا کہ کڑیل سے کڑیل نوجوان بھی پانچ سات کوڑوں سے زیادہ کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ اس سے یہاں تو بڑا اثر پیدا ہونا تھا وہ ہوا، مغربی ممالک میں یہ اعتراض کیا گیا کہ اسلام میں زنا کی سزا سو کوڑے مقرر ہے، کیا کوئی مجرم اس قسم کے سو کوڑے کھانے کے لیے زندہ بھی رہ سکتا ہے؟

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جلدۃً سے قرآن کریم کی مراد کیا ہے۔ اس کے متعلق جو تحقیق کی گئی، اس کا ملخص طلوع اسلام

کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں کہا گیا تھا:

۱۔ فقہی تحقیق

”قرآن مجید میں کوڑے کے لئے ”جلدۃ“ کا لفظ آیا ہے۔ جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجرم کو کسی ایسی چیز سے سزا دی جائے جس کا اثر صرف اس کی کھال تک محدود رہے۔ اسلامی فقہ کی تفصیلات کے مطابق اگر کوڑے لگانے سے مجرم کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا، یا کھال پھٹ گئی، یا زخم کھال کے اندر تک پہنچ گیا تو ایسی سزا جائز نہیں ہوتی چنانچہ حفظہ ما تقدم کے طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن سے اس قسم کے زخم وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔ دور نبوی میں تو جرائم کی تعداد بڑی محدود تھی اور شافو و نادر ہی کوڑوں کی سزا تک نوبت پہنچتی تھی۔ اس لئے اس دور میں کوئی مخصوص قسم کا کوڑا تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا تو اسے جوتوں یا کھجور کی چھال سے سزا دی جاتی۔ قاضی ابوبکر حصاص و دور نبوی کی سزا کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كَانَ مِنْ ضَرْبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجَبْرِيدِ وَالنَّعَالِ -

(احکام القرآن - جلد سوم - صفحہ ۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوڑے مارنے کا کام جوتوں یا کھجور کی چھال سے لیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ دور نبوی میں چمڑے سے بنے ہوئے کوڑے سے سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ یہی صورت حالات حضرت ابوبکرؓ کے دور میں رہی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس مقصد کے لئے مخصوص کوڑا تیار کرایا تھا جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

اَتَى عُمَرُ بَسُوطٍ فِيهِ شِدَّةٌ فَقَالَ اِرْبِدِ الْيَنَ مِنْ هَذَا - فَاَتَى بَسُوطَ فِيهِ لِيَنَ

فَقَالَ اِرْبِدِ اَشَدَّ مِنْ هَذَا فَاَتَى بَسُوطَ بَيْنَ السَّوْطَيْنِ - فَقَالَ اَضْرِبْ - وَلَا

يَرَى اِبْطَلًا وَاعْطِ كُلَّ عَفْوَ حَقَّهُ - (ایضاً - ص ۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک کوڑا لایا گیا جو بہت سخت تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اس سے ذرا نرم ہونا چاہیے۔ اس پر آپ کے

پاس دوسرا کوڑا لایا گیا۔ جو پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے ذرا سخت چاہیے۔

چنانچہ آپ کے پاس ان دونوں کوڑوں کے درمیانی معیار کا کوڑا لایا گیا تو آپ نے مارنے والے سے فرمایا کہ اس سے

اس طرح ضرب لگائی جائے کہ تیری بغل (ARMPIT) نظر نہ آئے۔ اور پھر یہ کہ یہ کوڑے جسم کے بر حصے

پر لگائے جائیں۔

خیال رہے کہ کوڑوں کی سزا وہ اہل علم صحابہ دیتے تھے جنہیں شرعی احکامات و اصول کا پورا پورا علم ہوتا تھا۔ اور پھر یہ کہ یہ سزا کپڑے اتار کر نہیں بلکہ موسم کے مطابق مجرم نے جو کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے ان کو اتارے بغیر دی جاتی تھی۔ بلکہ اگر کوئی مجرم خود بھی کپڑے اتارنا چاہتا تو اسے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح سے روایت ہے:

ان ابا عبیدہ بن الجراح اتي برجل في حد مذهب الرجل ينزع قميصه وقال
ينبغي لجسدي هذا المذنب ان يضرب وليس عليه قميص - فقال ابو عبیدة
لا تدعوه تنزع قميصه فضربه عليه (ایضاً - صفحہ ۲۶۲)

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے پاس شرعی سزا کا ایک مجرم لایا گیا۔ تو اس نے اپنی قمیض اتار فی شروع کر دی۔ اور کہنے لگا کہ اس گناہگار جسم کو اس حالت میں کوڑے پڑنے چاہیئے کہ اس پر قمیض نہ ہو۔ لیکن حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا کہ اسے قمیض نہ اتارنے دو۔ پس اسے قمیض کے اوپر کوڑے مارے گئے۔

یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جلد کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے مجرم کو بھیڑ یا بکری کی کھال پہنا دی جاتی تھی۔ تاکہ کوڑوں کا اثر جلد کے اندر تک نہ پہنچنے پائے۔ حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت ہے:

ولقد حدثني ابي ان امه ام كلثوم امرت بشاعة فسلخت حين جلد ابو بكره
فالله مسكها - فهل كان ذلك الا من ضرب شديدا - (ایضاً - صفحہ ۲۶۱)

مجھ سے میرے باپ نے روایت بیان کی کہ ان کی والدہ ام کلثوم نے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا۔ اور جب ابو بکرہ کو کوڑے لگائے گئے تو وہ کھال انہیں پہنا دی گئی تو کیا یہ ضرب شدید سے بچنے کے لئے نہ تھا۔ (دوسری روایت میں ضرب خفیف آیا ہے)

سعودی عرب میں شرعی سزائیں دی جاتی ہیں۔ وہاں کس قسم کے کوڑے لگائے جاتے ہیں، اس کا اندازہ کوڑوں کی اس سزا سے لگائیے جس کی تفصیل جون ۱۹۷۶ء میں اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا ہے:

لندن، ۱۵ جون (رائٹر) شراب کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سعودی عرب میں مزید دو برطانوی باشندوں کو سرعام کوڑے لگائے گئے اور سزائے قید دی گئی ہے ان دو برطانوی باشندوں کو سزائے قید اور کوڑوں کی سزا کا انکشاف برطانوی دفتر خارجہ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو باشندوں کو شراب تقسیم کرنے پر سرعام کوڑے

لگائے گئے تھے، برطانیہ واپس چلے گئے ہیں۔ میڈمنٹ اور کوپر کو ستر ستر کوڑے لگائے گئے تھے اور چھ چھ ماہ سزائے قید دی گئی تھی۔ میڈمنٹ اور کوپر نے ہیلتھ روکے ہوئی اڈے پر بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں تاہم انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ جن دو مزید افراد کو سزائے قید اور کوڑے لگائے گئے ہیں ان میں ۲۰ سالہ پیرسن اور ۵ سالہ پیڈی وائش ہیں اور دونوں امریکی فرم لاک ہیڈائر کرافٹ کارپوریشن کے ملازم ہیں۔ پیرسن کو دو سو کوڑے اور دو سال قید اور پیڈی کو ڈیڑھ سو کوڑے اور اٹھارہ ماہ قید کی سزا دی گئی۔

(نوائے وقت - ۱۶/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ کوڑے ایسے ہوتے ہیں کہ پچاس پچاس سال کے بوڑھے، ڈیڑھ ڈیڑھ، دو سو کوڑے لگا کر بھی ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اس کا آنکھوں و کبھیا حال، تاریں طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

۲۔ عینی شاہد کی روئداد

گزشتہ سال مجھے چند ماہ سعودی عرب کے ایک شہر ”الحرج“ میں گزارنے کا موقع ملا جہاں میں نے ایک بار کوڑوں کی سزائے نفاذ کا منظر بھی دیکھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سو، دو سو کوڑے بیک وقت نہیں لگائے جاتے، بلکہ چالیس چالیس کوڑے ایک وقت لگاتے ہیں۔ یہ سزا نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد کے باہر میدان میں دی جاتی ہے۔ ایک سو کوڑے سزا ہو تو چار ہفتوں میں پوری کی جاتی ہے۔

اس روز دو مجرموں کو سزا دی گئی۔ جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک سعودی تھا۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ میدان میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے پاکستانی کو زمین پر منہ کے بل ٹایا گیا، دونوں ہاتھ سر سے اوپر آگے کر رکھے گئے۔ ایک قاضی کا نمائندہ اور ایک اور افسر سر ہانے کھڑے ہو گئے اور دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں بید کی چھڑیاں لئے مجرم کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ بید کی چھڑی تقریباً چار فٹ لمبی ہوگی۔ مجرم کے کپڑے نہیں اتار دئے گئے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے کھڑے کھڑے باری باری بید مارنے شروع کر دیئے۔ بید مارتے وقت نہ تو انہوں نے گھٹنے جھکائے اور نہ کوئی زور لگایا۔ میرا خیال ہے کہ ۳۰ کوڑے لگانے میں انہیں ۳۰ سیکنڈ لگے ہوں گے مجرم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح سعودی بھی چالیس کوڑے کھا کر اٹھ گیا، اور دونوں پولیس کی گاڑی میں

جانیٹے۔ ان میں سے زکسی کا کپڑا پھٹا اور نہ ہی کسی ضرب پر ان کے منہ سے آہ نکلی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوڑوں کی سزا، معمولی چھڑی جتنی بھی نہیں ہوتی۔ چونکہ قرآن کریم نے جلدۃ کا تعین خود نہیں کیا، اس لئے قرآنی مملکت اس کی نوعیت خود متعین کرے گی۔

ان تفصیل سے یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ مِائِدَةُ جَلْدَةٍ کا مفہوم کیا ہے۔

باقی رہا جرم اور سزا کا باہمی تعلق اور اس کا فلسفہ، سو اس کے متعلق 'مطالب الفرقان' کی سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں 'جرم و سزا'۔ 'جزا و سزا' کے عنوانات دیکھیے)۔

جنسیات کے سلسلے میں جرائم اور ان کی سزائوں کے متعلق مزید احکام حسب ذیل ہیں :-

لوندی زنا کی ترکیب ہو تو اس کی سزا (شریعت عورت کے مقابلہ میں) نصف ہے۔

فَاِذَا اُحْصِنَ فَاِنَّ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ط (۲۴/۵)

”جب یہ لوندن تمہارے نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی ترکیب ہوں، تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا (۲۴/۵) سے نصف ہے۔ (اس لئے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول

میں نہیں ہوئی، اور ان کی پہلی زندگی میں اس قسم کی حرکات معیوب تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے ان سے اخلاق کا وہ

بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو شریف گھرانے کی عورتوں سے متوقع ہو سکتا ہے۔ سزا کے تعین میں ان امور کا خیال

رکھنا ضروری ہے۔) ع

اس سے ایک اہم اصول مستنبط ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کس جرم کی سزا کا فیصلہ کرتے وقت، مجرم کے ماحول، تربیت،

ذہنیت وغیرہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ”لوندی“ کی سزا نصف مقرر کرنے سے مقصد یہی ہے۔ دوسری طرف کہا گیا ہے

کہ اگر (بفرض محال) نبیؐ کی بیویوں سے اس قسم کا جرم سرزد ہو تو ان کی سزا دوگنی ہوگی :

يَنْسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ

ع: اگر (جیسا کہ ارباب شریعت کہتے ہیں) شادی شدہ مجرمین کی سزا رجم ہے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ لوندیوں کو رجم کی

نصف سزا کس طرح دی جائے گی؟

ضُعْفَيْن ۖ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝ (۳۳)

”اے نبی کی بیوی! اگر تم میں سے کسی سے نازیبا حرکت سرزد ہو گئی تو اس سے اس کی دگنی سزا ملے گی۔ قانون خداوندی کی رو سے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری زہرگی کو وہ سری عورتوں کے لئے مقرر نہیں جانا ہے)۔“

ایسے حالات پیدا نہ کرو جن سے وہ جو تمہارے ذریعہ ہوں، زنا کے لئے مجبور ہو جائیں۔ سورہ النور میں ہے:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَّتَكُمْ عَلَى الْبَغَاءِ ۖ إِنْ أَرَدْتَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا ۖ وَمَنْ يُكْرِهْمَنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِمْ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(۲۴/۳۳)

”اور تمہاری نو جوان لڑکیاں (نوکریاں یا لونڈیاں) جو نکاح کا ارادہ رکھتی ہوں، انہیں اپنے دنیاوی مفاد کی

خاطر نہ روکو۔ اس طرح وہ بدکاری پر مجبور ہو جائیں گی۔ اور اگر کوئی انہیں اس طرح مجبور کرے گا، تو قانون

خداوندی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ وہ اس چیز کے خلاف، ان کی حفاظت کرے اور انہیں سامان نشو و نما

مہیا کرے۔ (اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا کرے)۔“

رجم کی سزا کے سلسلے میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ حکومت پاکستان نے ۱۹۷۹ء میں اسے قانونی حیثیت دے

اضافہ

دی تھی۔ اوائل ۱۹۸۲ء میں خود حکومت کی طرف سے قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت نے اسے خلاف قرآن

قرار دے کر کہا کہ ۱۹۷۹ء کے قانون کو منسوخ کیا جائے۔ اس پر علماء کرام کی طرف سے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا

مطالبہ یہ کیا گیا کہ اس قانون کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے۔ وفاقی، شرعی عدالت کے فیصلہ کو درخور اعتناء سمجھا جائے۔ ان تجویز

کو تبدیل کر دیا جائے جنہوں نے مذکورہ بالا فیصلہ دیا ہے اور شرعی عدالت میں علماء حضرات کو بطور رنج منفر کیا جائے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اس مخالفت اور مطالبہ پر تمام فرقوں کے علماء منفق ہیں۔ (یہ ہمدادی بد نصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے

مختلف فرقوں کا جب بھی کسی اتفاق ہوا ہے باطل پر ہوا ہے!) اس وقت (مئی ۱۹۸۲ء) تک کی اطلاع یہ ہے

کہ حکومت نے وفاقی شرعی عدالت میں تین علماء کو بطور رنج مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نیز یہ کہ حکومت اس پر غور کر

رہی ہے کہ یا تو اس عدالت کے فیصلہ کے خلاف حکومت خود سپریم کورٹ میں اپیل کرے اور یا موجودہ قانون میں تبدیلی

کر کے، شرعی عدالت کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کی مجاز قرار دے دے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس معاملہ

میں آخر الامر فیصلہ کیا ہوگا، لیکن اس وقت تک کے واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ جس تھیکا کر لسی کو ختم کرنے کے لئے

مملکت پاکستان کا وجود عمل میں آیا تھا، یہاں وہ تھیکا کر لسی بڑے زور شور سے قائم ہو رہی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے خلاف ان حضرات کی دلیل وہی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ یعنی، عدالت نے کہا کہ سزائے رجم کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ قرآن کے حکم کے مطابق ہے۔ کہا گیا کہ قرآن میں تو ایسی کوئی آیت نہیں۔ جواب میں کہا گیا کہ قرآن میں یہ آیت تھی، لیکن موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ پوچھا گیا کہ پھر وہ آیت ہے کہاں؟ فرمایا، وہ ہمارے پاس ہے۔ اور فیصلہ اُس قرآن کے مطابق نہیں ہوگا جس کی حفاظت کا فرض خدا نے لے رکھا ہے، اور جوامت کے پاس ہے۔ فیصلہ اُس آیت کے مطابق ہوگا جو ہمارے پاس ہے۔

اور یہ کوئی نئی دلیل نہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات پہلے نازل کی گئی تھیں لیکن بعد میں ان آیات کو بھی اٹھایا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا۔
۲۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں جو صرف تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں حکم ان کا منسوخ ہے۔ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو کہیں نہیں کہا کہ قرآن کی فلاں آیت کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کا فیصلہ ائمہ تفسیر کرتے ہیں کہ کون کون سی آیات کا حکم منسوخ ہے۔ اور

۳۔ ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن میں موجود نہیں لیکن حکم ان کا باقی ہے۔ وہ آیات ہمارے پاس ہیں۔ حکم اُس قرآن کا نافذ نہیں ہوگا جوامت کے پاس ہے۔ ان آیات کا نافذ ہوگا جو ہمارے پاس ہیں۔ آیت رجم انہی میں سے ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے علماء کے متعلق کہا تھا کہ ان کی جڑاقتیں اس حد تک بیاک ہو چکی ہیں کہ یکتبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ (۲/۹۷)۔ "یہ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھتے ہیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے" (نیز ۲/۱۳۰)۔ بعینہی کچھ ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔

اسی ضمن میں آتی ہیں ان کی وہ (مزعومہ) آیات جو قرآن میں نہیں ہیں، لیکن جن کے متعلق دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ منزل من اللہ ہیں اور ان کے پاس ہیں۔ حکم انہی کا چلے گا۔ ناطقہ سرگرمیاں کہ اسے کیا کہئے؟ اس کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف چلے۔

۲۔ لواطت اور سحاق

اگر وہ مرد یا دو عورتیں "مفحش" کی ترکیب ہوں تو انہیں مناسب سزا دو۔ (اس کی سزا قرآن کریم نے خود مقرر نہیں کی) لیکن اگر ان میں اصلاح کا امکان ہو تو (عدالت کی صوابدید کے مطابق) انہیں معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔

وَالَّذَانِ يَأْتِيَاهُمَا مِنْكُمْ فَأَذُوهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ

كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا (۴/۱۶)

”اگر دوسرا اس قسم کی (بے حیائی) کی حرکت کے مرتکب ہوں تو انہیں (مناسب) سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو ان سے درگزر کرو۔ اللہ کے قانون میں معافی کی گنجائش بھی ہے (جو اکثر حالات میں جرم کی روک تھام کا موجب بن کر باعث رحمت بن جاتی ہے)۔“

اس آیت میں صیغہ (وَالَّذِينَ) تو مذکر کا ہے (یعنی دوسرو) لیکن استنباطاً اس سے مراد ”دو عورتیں“ بھی ہو سکتی ہیں۔ ہم نے اس لئے عنوان میں ”سحاقیت“ بھی لکھ دیا ہے جس کی مرتکب دو عورتیں ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے قصہ قوم لوط میں ”لواطت“ (HOMO SEXUALITY) کو برا ہی شیع اور مذموم فعل قرار دیا ہے اس سے بھی اس فعل کا ارتکاب جرم قرار پایا جاتا ہے۔ (دیکھئے: ۲۴/۵۵)

ذوٹ: اختلاف ہم جنس کے لئے ہمارے ہاں ”لواطت“ کی اصلاح عام ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ذہن حضرت لوط (علیہ السلام) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو خدا کے رسول تھے، اس لئے اس اصطلاح کو نہ ہی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔ اس کے لئے ”اغلام“ کی اصطلاح بھی رائج کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مبادیات زنا

۱۔ جو عورت کسی ایسی حرکت کی مرتکب ہو جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو (یعنی عام بے حیائی کی باتیں) اور اس کے لئے چار گواہ موجود ہوں، تو اسے مکان سے باہر جانے سے روک دینا چاہیئے۔

وَالَّذِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاءِكُمْ فَاَسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ
فَاِنْ شَهِدُوا فَاَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَقَّهِنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ
لَهُنَّ سَبِيلًا ۝ (۴/۱۵)

اگر تھاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتی ہو) تو اُن کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ (اگر وہ اس کی شہادت دیں اور جرم ثابت ہو جائے) تو ان عورتوں کو باہر لے جانے سے روک دو تا آنکہ انہیں موت آجائے یا خدا کا قانون اُن کے لئے ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے روک جائیں۔ مثلاً اگر وہ شادی شدہ نہیں تو ان کی شادی ہو جائے۔ (زمانہ کی سزا کا ذکر ۲۴/۲۲)

میں ہے اور تہمت لگانے کا (۲۴/۲۲) میں {

اس آیت میں ”الْفَاحِشَةُ“ کا ترجمہ عام طور پر زنا کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں اس لئے

کہ قرآن کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے (۲۴/۲۴) اور یہاں سزا صرف ”پابند مسکن“ کرنا ہے، اس لئے اس سے مراد زنا نہیں بلکہ ایسی بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا پر منتج ہو سکتی ہیں۔ ہم نے اس لئے اس کا مفہوم ”مبادیات زنا“ یا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں صرف عورتوں کا ذکر ہے۔ زنا میں عورت اور مرد دونوں شامل ہوتے ہیں تنہا عورتوں سے زنا نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس میں فاحشہ کا لفظ زنا کے لئے نہیں آیا۔

جرم زنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔

۲۔ شادی شدہ عورت سے ”کھلی ہوئی بے حیائی“ کا ارتکاب ہو تو اس کے ہر میں سے کچھ رقم وضع کی جاسکتی ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم، صفحہ ۳۸۸۔ زیر آیت (۴/۴۹) میں گورچکی ہے)

۴۔ فواحش

۱۔ فواحش کے قریب مت جاؤ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا چھپی ہوئی: وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۱۵۴/۶ ذیہرہ ۳۴/۴) ”بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ“

۲۔ فواحش کی اشاعت و تشیریت کرو ————— ایسا کرنا مستوجب سزا جرم ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲۴/۲۴)

یاد رکھو۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مؤمنین کے اندر بے حیائی کی باتیں پھیل جائیں، انہیں اس زندگی میں بھی راز و خفیے قانون سخت سزا ملے گی۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس قسم کی باتیں کس قدر تباہی کا موجب ہوتی ہیں اور تم اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس میں تمام وہ اسباب و ذرائع آجائیں گے جن سے معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں یا خیالات پھیلتے ہیں۔

۳۔ ان جرائم کے مرتکبین میں اگر اصلاح کا امکان ہو تو معافی کی گنجائش ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا
لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَتَفَرَّوْا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ۝ (۳۵/۳)

اگر مومنین سے کبھی (غلطی سے) کوئی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے، یا وہ اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں، تو وہ اس پر جان بوجھ کر اصرار پیش کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور اس کے مطابق، اپنی اصلاح کر کے، اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غلط اقدامات کے مضر اثرات سے، قانونِ خداوندی کے سوا اور کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟

۵۔ شریف زادوں سے چھڑ چھاڑ یا ان کے خلاف غلط باتیں مشہور کرنا۔

یہ سنگین مجرم ہے جس کی سزا حقوقِ شہریت سے محرومی سے لے کر موت تک ہو سکتی ہے۔ سورہ احزاب میں پہلے کہا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ
مِنْ جَلَابِئِسِهِنَّ ۖ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يَعْرِفْنَ فَلَا يُؤْذِينَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا

(۳۳/۵۹)

اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے اوپر، ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو (۳۳/۶۱)۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جاسکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں) اور کوئی بد فحاش انہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز، ان کے لئے قانونِ خداوندی کی رو سے حفاظت اور تربیت کا موجب بن جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا:

لَٰكِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۚ مَلْعُونِينَ ۖ اٰیْذًا نَّعْفُو ۚ
اُخِذُوا وَقُتِلُوا ۖ اَتَقْتِلَا ۚ (۳۳/۶۱-۶۲)

تم انہی اعتبار بر تو۔ اگر اس کے بعد بھی منافقین یعنی وہ لوگ جن کے دل میں جانشیں بھری ہوتی ہیں اور وہ فتنہ برور جن کا کام ہی معاشرہ میں شر انگیز خبریں پھیلانا ہے، اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف فوج کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ، کچھ عرصہ بعد، یہاں سے دور ہو جائیں گے اور ان تمام مراعات سے محروم کر دیئے جائیں گے (جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں) اگر یہ، اس پر بھی اپنی سرکشی سے

باز نہیں آئیں گے تو جہاں کہیں بھی ہوں گے، اُنہیں گرفتار کیا جائے گا، اور سختی سے قتل کیا جائے گا۔
 {اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول - صفحہ ۲۱۸ - زیر آیت (۲/۹) بھی لکھا جا چکا ہے۔}

۴۔ تہمت تراشی

۱۔ پاک دامن عورتوں کے خلاف تہمت لگانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ لائے۔ اگر مجرم ثابت نہ ہو تو تہمت لگانے والے کی سزا اسی کوڑے سے ہے۔ اس کے بعد اُس شخص کی گواہی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ہاں اگر اس میں اصلاح کا امکان ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَا يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَالِجِدُّو
 هُمْ ثَمَنَيْنِ جَلْدَةٍ وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ
 الْفَاسِقُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأُصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ
 غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲۴/۵)

{نیز دیکھیے: (۲۴/۳) اور (۶۰/۱۲)}

عصمت متاثر گراں بہا اور مستقل قدر ہے، اس لئے اس کی حفاظت کے لئے بڑی پختہ تدابیر کرنی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ، اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی، جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں، گواہی قبول نہ کرو، (اور انہیں اُن حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو انہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو۔) (۲۴/۳) اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

ہاں اگر یہ لوگ اس کے بعد اپنی غلط روش سے باز آجائیں، اور اپنی اصلاح کر لیں، تو پھر انہیں معاف کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ قانون خداوندی میں، توبہ و اصلاح کے بعد عفو اور درگزر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے (اس سے اصلاح کے قابل ہر مہرے، مہرے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور وہ سامانِ نشوونما سے بھی محروم نہیں رہتا۔)

۲۔ جو شخص خود اپنی بیوی کے خلاف تہمت لگائے اور گواہ نہ لاسکے تو وہ چار مرتبہ قسم اٹھائے اور پانچویں مرتبہ اپنے اوپر لعنت وارد کرے، لیکن اگر اُس کے خلاف، اُس کی بیوی اپنی بریت کے لئے بھی اسی طرح قسم اٹھالے تو

پھر وہ مجرم تصور نہیں ہوگی۔ سورہ النور میں ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَنْزُلًا وَاجِبُهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَدَاتٍ بِمَا اللَّهُ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۝ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَذِبِينَ ۝ وَيَذَرُ أَغْنَاهَا لَعْدَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَدَاتٍ بِمَا اللَّهُ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَذِبِينَ ۝ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۲۴-۹۳)

”جو لوگ خود اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں، اور ان کے پاس، سوائے اپنے آپ کے، اور کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے معاملہ میں یوں فیصلہ کیا جائے کہ مرد چار بار اللہ کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہو، تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ (یعنی میں ان تمام حقوق و مفادات سے محروم کر دیا جاؤں جو مجھے مملکتِ خداوندی (اسلامی حکومت) کا شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں)“

اس سے وہ عورت مجرم قرار پا جائے گی۔ لیکن اگر وہ بھی، اپنی مدافعت میں، اسی طرح خدا کو حاضر ناظر جان کر گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹ بولتا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ (یعنی مجھے اس حلف دروغ گوئی کی سزا ملے، تو اس سے وہ بری الذمہ ہو جائے گی)۔

۳۔ جرم خود کرے (خواہ وہ کوئی جرم ہو) اور اس کی تہمت دوسرے پر لگا دے، تو یہ خود جرم ہے:

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِي بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ۝ (۴-۱۱۲)

سوچو کہ اگر کوئی شخص جرم یا خطا تو خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی دوسرے بے گناہ کے سر، تو یہ، بجائے خوین بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح اس نے اپنے اوپر دوہرا بوجھ لا دیا۔ ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس سے سرزد ہو گیا تھا، اور دوسرا اس بُہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے کے اوپر لگا دیا۔

جنسیات سے متعلق قرآنی قوانین ہمارے سامنے آگئے۔ اس میں سورہ النساء کی آیات (۴-۱۵) اور (۴-۱۶) بھی آگئی ہیں۔ آیت (۴-۱۶) میں کہا گیا ہے کہ اگر مجرم اپنے لئے پُرنا دم ہو اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسے توبہ کہا جاتا ہے۔ توبہ کے متعلق مزید تصریح یہ کہہ کر کر دی کہ

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتَوُوبُونَ مِنْ

قَرِيبَ فَاُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ طَوْفًا وَّكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝
وَلَيْسَتْ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ
الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ طَوْفًا فَاُولَٰئِكَ
اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۱۸ تا ۲۱)

لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معافی ان کے لئے ہے جو غلطی سے کوئی جرم کر بیٹھیں اور پھر اس کا احساس بیدار ہونے پر فوراً اصلاح کی طرف لوٹ آئیں۔ خدا کے قانون میں معافی انہی کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے۔

ان کے لئے معافی نہیں جو عادی مجرم ہوں اور اپنی حرکات پر اس وقت نادام ہوں جب موت ان کے سامنے آکھڑی ہو۔ نہ ہی ان کے لئے جو قانون کو سرے سے تسلیم ہی نہ کریں اور ساری عمر اسی سرکشی میں بسر کر دیں۔ انہیں الہم انگیز سزا دینی چاہئے۔

توبہ کے قرآنی مفہوم کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۲۶ آیت (۱/۱۶) اور جلد دوم صفحہ ۲۶۶ آیت (۲/۲۵۵) میں لکھا جا چکا ہے۔ جرائم کے سلسلہ میں توبہ کی گنجائش خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ محض انبات جرم پر مجرم کو سزا نہیں دینی چاہئے۔ سزا کا مقصد اصلاح ہے۔ اگر سزا کے بغیر اصلاح کا امکان ہو تو مجرم کو اس کا موقع دینا چاہیے۔ جرائم میں اس کی گنجائش رکھنا فی الواقعہ خدا کی رحمت ہے۔

اس کے بعد آیات (۲۱-۱۹) نکاح اور طلاق سے متعلق ہیں اور مطالب الفرقان جلد سوم صفحات ۳۸۸-۳۸۹ (آیت ۲۲۵) کے تحت آچکی ہیں۔ یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں اس میں البتہ اتنا اضافہ ضروری ہے کہ آیت (۲۲۸) سے واضح ہے کہ اگر عورت سمجھے کہ حالات اس کے موافق ہیں تو اسے جس کارائہ انداز سے الگ کر دینا (طلاق دے دینا) چاہئے، روکے نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد آیات (۲۴-۲۲) میں ان عورتوں کی تفصیل دی گئی ہے، جن سے نکاح حرام ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۴۲-۳۴۱ زیر آیت (۲۲۱) تفصیل دی جا چکی ہے۔

شروع پارہ ۵

اگلی آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

﴿۴۵﴾ لَوْنَدِیُّوْنَ سَے نِکَاح

وَمَوْءَدُكُمْ یَسْتَلِمْنَ بِنُكْحِ طَوْلَا اَنْ یَّذِیْعَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ طَفِیْنِ
مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ ذَیْبَتِکُمْ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَیْمَانِکُمْ بِعُضْکُمْ

مِنْ بَعْضٍ فَاَنْکَحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاتَّوَهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
مُحْصَنَاتٍ غَیْرَ مُسْفِیْحَتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ اَفْءَادِ اَوْ اُحْصٰی فَاِنْ اَتٰیْنَ
بِفَاحِشَةٍ فَعَلٰیہُنَّ نِصْفُ مَا عَلٰی الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِکَ لِمَنْ
غَشٰی الْعَنَتَ مِنْکُمْ طَوَّ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ طَوَّ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۵﴾

”اگر تم میں سے کسی میں اس کی استطاعت نہ ہو کہ وہ آزاد مومن عورت سے شادی کرے، تو وہ مومنہ لونڈی سے شادی کرے۔ (زنا کر وہ لونڈیاں جو اس وقت تمہارے معاشرہ میں موجود ہیں، رخصتہ رفتہ معاشرہ کا جز و بنتی جائیں اور اس طرح غلامی کا خاتمہ ہو جائے) یہ خیالی نہیں کرنا چاہیے کہ لونڈی سے شادی کرنا باعثِ ذلت ہے۔ جب وہ ایمان لے آئی اور تمہارے نکاح میں آگئی، تو آزاد عورتوں کے ہم مرتبہ ہو گئی۔ اللہ کی نگاہ تمہارے ایمان پر ہے یہی معیارِ فضیلت ہے۔ اسی کی بنا پر تم ایک دو سرے کے اجزا بنتے ہو (یعنی سب ایک ہو جاتے ہو) کوئی غیر نہیں رہتا۔ لیکن لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالک کی اجازت سے نکاح کرو اور قاعدے اور قانون کے مطابق ان کے مہر ادا کر دو۔ وہ ایک پاکیزہ منکوحہ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لئے نکاح کرے۔ محض تمہاری شہوت رانی کے لئے نہیں، خواہ اس کے لئے رسمِ نکاح ادا کر لی گئی ہو۔ یا ان تعلقات کو پوشیدہ رکھا جائے۔ دونوں شکلیں ناجائز ہیں (۵/۵) جائز صورت یہی ہے کہ باقاعدہ میاں بیوی کی زندگی بسر کرنے کے لئے ان سے نکاح کیا جائے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جنسی اختلاط سے مقصد، جائز طریق سے اخراجِ نسل ہے۔ محض جنسی تسکین اور لذت کشتی نہیں۔ جو اختلاط محض حصولِ لذت کے لئے ہو وہ منشائے فطرت کے خلاف ہے، خواہ معاشرہ اسے محبوب سمجھے یا نہ۔ (۲/۲۲۲)

جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی قراکب ہوں، تو ان کی سزا، آزاد عورتوں کی سزا (۲/۲۲۲) سے نصف ہے۔ (اس لئے کہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوتی اور ان کی پہلی

زندگی میں اس قسم کی حرکات معیوب تصور نہیں کی جاتی تھیں، اس لئے ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں ہو سکتا جو آزاد گھرانے کی عورتوں سے متوقع ہوتا ہے۔ سزا کے تعین میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہے)

یہ بھی یاد رکھو کہ جس انداز سے لونڈیوں کی تربیت ہوتی ہے، اس سے ان کی ذہنیت پست رہتی ہے۔ لہذا لونڈیوں سے شادی انہی کو کرنی چاہیئے جو سمجھتے ہوں کہ نکاح کے بغیر ان سے لغزش سرزد ہو جانے کی۔ لیکن اگر تم ضبط نفس سے کام لو، تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ خدا کا قانون، جو تمہیں محنت و پاکبازی کی تعلیم دیتا ہے، تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تمہاری سیرت کی نشوونما کا ذریعہ بنے گا۔ یاد رکھو: ضبط نفس ناممکن نہیں (۲۴۴)

جنسیات کے معاملہ میں، بھوک پیاس کی طرح، اضطراری حالت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک کی اضطراری حالت میں تو حرام کھانے کی اجازت ہے (۲/۳۱۲)، لیکن جنسی اختلاط کے لیے ناجائز فعل کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں۔

غلام اور لونڈی (مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ) کے متعلق بحث مطاب الفرقان جلد اول صفحہ ۲۶۰۔ زیرایت (۲/۳۱۲) اور جلد دوم صفحہ ۲۵۸ آیت (۲/۳۱۲) میں گزر چکی ہے۔

قرآن کریم نے کتاب اور عادت و ونوں کو منزلوں میں اللہ کہا ہے۔ (جیسا کہ مختلف مقامات پر واضح کیا جا چکا ہے) کتاب کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد ان قوانین کی غرض و غایت۔ ان کا مقصود و مطلوب۔

مندرجہ بالا آیت میں غامضی زندگی سے متعلق قوانین بیان کرنے کے بعد کہا:

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّيسَ وَيَهْدِيَكُمْ سُبُلَ الدِّينِ مِنْ قَبْلُكُمْ وَيَتَوَقَّعَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۳۷﴾ (۲/۳۱۲)

عالمی زندگی کے یہ احکام، اس وضاحت سے، اس لئے بیان کئے گئے کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں بتائے کہ اقوام سابقہ میں سے جنہوں نے معاشرتی و راز و اجی زندگی کو صحیح قوانین کے تابع رکھا، ان کی زندگی کس قدر خوشگوار تھی، اور جنہوں نے اس میں توازن برقرار نہیں رکھا، وہ کس طرح تباہ ہو گئیں۔ اللہ کا قانون، جو سزا و علم و حکمت پر مبنی ہے، تم پر اپنی توجہات مرکوز رکھنا چاہتا ہے (تاکہ تم تباہ اور برباد نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھو۔ جنسی اختلاط محض انفرادی مسئلہ نہیں۔ قوموں کی موت و حیات سے اس کا بڑا کبر العلق ہے۔ اس لئے معاشرہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ ہوئے جس سے جنسی بد نہادی پیدا ہو جائے۔)

قرآن کریم نے جہاں اقوام سابقہ کے احوال و مالی کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کی اہمیت کا اندازہ عصر حاضر کے محققین کی تحقیق سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ڈاکٹر انون کا حوالہ پہلے دے چکے ہیں۔ تجدید یا دواشت کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۷۰ ملاحظہ فرمائیے۔

اگلی آیت میں اس کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کر دی:

وَاللّٰهُ يُرِيدُ اَنْ يَّتُوبَ عَلَيْكُمْ ذَقُوا الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ (۲۷-۴۷)

پھر سن لو کہ خدا کا قانون چاہتا ہے کہ تم تباہیوں سے بچ جاؤ۔ اس لئے وہ بار بار لوٹ کر تمہاری طرف آتا ہے۔ لیکن جو لوگ محض اپنے جذبات کے پیچھے چلتے ہیں، وہ یہی چاہیں گے کہ تم بھی (ان کی طرح) اعتدال چھوڑ کر، افراط و تفریط کی راہ اختیار کر لو۔

اور اس کے بعد اس ہدایت (راہ نمائی) کی ضرورت کو اس طرح واضح کر دیا کہ

يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يَخَفَّفَ عَنْكُمْ وُجُوْدَ الْاِنْسَانِ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ (۲۸-۴۷)

خدا کو اس کا علم ہے کہ اگر انسان کو علی مالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خدا نے یہ قوانین و ضوابط اس لئے عطا کر دیئے ہیں کہ وہ انسان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہ ان کے جذبات کو رہبانیت کے شکنجوں میں کسنا چاہتا ہے (۲۸-۴۷) اور نہ ہی انہیں بلا لگام چھوڑ کر ان کے لئے سامانِ ہلاکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

انسان کو اگر وحی کی رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم ص ۳۷ پر دیکھیے۔ انسان اور اس کے جذبات کے متعلق انڈکس میں ”جذبات“ کا عنوان دیکھیے۔ جذبات سے مغلوبیت کا ذکر آیات قرآن کریم نے نگاہ کا رخ اُس گوشے کی طرف پھیر دیا جو سب سے زیادہ وجہ فسادِ آدمیت ہے۔ یعنی معاشی نظام۔ اس نظام کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔

انڈکس میں دیکھیے ”معاشی نظام“ یہاں اس کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ذَقُوا نَفْسَكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَءِيْمًا ﴿۲۹﴾ (۲۹-۴۷)

تجارت

انسان کا جذبات سے مغلوب ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ دوسرے کا مال بھی اس کے پاس آجائے گا، خواہ اس کے لئے اسے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ یہ بڑی تباہ کن ذہنیت ہے۔ لہذا، اسے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھاؤ۔ معاشرہ میں، ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے (جیسے تجارت کہتے ہیں)، اس کا انتظام باہمی رضامندی سے ہونا چاہیئے، اس اصول کے مطابق کہ، ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ مل جائے۔ (۵۳/۴)۔ یہ نہیں کہ ایک شخص، محض سرمایہ کے زور پر دوسروں سے زیادہ سے زیادہ بھور لینے کی کوشش کرے یہ رہتا ہے جسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ (۲۵/۲) اگر ایسا کرو گے تو تم اپنے آپ کو تباہ کر لو گے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ تم سب کی نشوونما ہوتی رہی۔ لہذا جس معاشی نظام میں یہ مقصد نفل ہو جائے، وہ ناجائز نہیں قرار پاتا۔

جائز اور ناجائز تجارت کا فرق: رہو اسے متعلق بحث میں، جلد سوم (صفحہ ۴۷۹) میں آچکا ہے۔ یہاں صرف ایک مکتہ کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کہا گیا ہے، "إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ شَرَائِنِ مُنْكَحَرَةٍ"۔ "باہمی رضامندی سے تجارت" ہمارے ہاں کے باطل معاشی نظام میں تجارت پیشہ (دکان دار) حضرات کہا کرتے ہیں کہ ہم جس قدر منافع لیتے ہیں، گا ہک کی رضامندی سے لیتے ہیں۔ جبراً نہیں لیتے، اس لئے ہماری تجارت قرآن کی رو سے بالکل جائز ہے۔

اس "جائز" تجارت کی کیفیت کیا ہے، اس کے لئے آپ کسی دن صبح سویرے کسی منڈی میں جائنگئے۔ وہاں آپ یہ آواز ہر ایک کی زبان سے سنیں گے کہ فلاں چیز کا "بھاؤ کیا نکلا؟" نظر بٹھا ہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا یہ "بھاؤ" صبح سویرے چوہے کے کسی پل سے باہر نکلا ہے جسے ان لوگوں نے دیکھ لیا ہے۔ لیکن یہ بھاؤ اس طرح نہیں نکلتا۔ ہونا یہ ہے کہ اس چیز یا اس جنس کے کاروبار کرنے والے تاجر آپس میں مل بیٹھ کر یہ طے کرتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے میں بیعتی چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں "بھاؤ نکلا"۔ اور پھر ہر خریدار اس چیز کو اس قیمت پر خریدنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ چیز کہیں سے بھی اس سے کم قیمت پر نہیں مل سکتی۔ بھاؤ نکالنے کا یہ طریق، پالاک، مولیٰ کی منڈی سے لے کر جنرل موٹرز اور بوئنگ ہوائی جہازوں کے کاروبار تک ہر جگہ کارفرما ہے۔ یہ تو اجتماعی تجارت کی کیفیت ہے۔ انفرادی طور پر یہ مسلک عام ہے کہ آپ کو (مریض کی جان بچانے کے لئے) کسی دوائی کی ضرورت ہے، جو یا تو واقعی کم یا ب ہے یا مصنوعی طور پر اس کی قلت (SHORTAGE) پیدا کر دی گئی ہے۔ وہ دوائی صرف ایک دوا فروش کے ہاں موجود ہے۔ اس کی مقررہ قیمت (مثلاً) بیس روپے ہے، لیکن وہ پچاس روپے مانگتا ہے آپ کہتے ہیں کہ یہ قیمت

بہت زیادہ ہے۔ وہ جواب میں کہتا ہے کہ آپ کو سسٹے داموں کہیں اور سے مل سکتی ہو، تو وہاں سے لے لیجئے۔ اور کہیں اور سے وہ دوائی مل نہیں سکتی۔ آپ کو اُس کے منہ مانگے داموں خریدنی پڑتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ دکان وار بڑے دھڑلے سے کہتا ہے کہ میں نے اُس کی جیب نہیں کاٹی۔ ڈاکہ نہیں ڈالا۔ اُس نے اپنی مرضی سے وہ قیمت ادا کی ہے۔

یہ ہے باطل معاشرہ میں تجارتِ اسیٰ عَنْ تَرَاضٍ وَّعُكْمٍ کی ایسی تفسیر۔

تجارت، اشیاء کی تقسیم کا نام ہے۔ اور اس میں تقسیم کنندہ صرف اپنی محنت کا وہ معاوضہ لے سکتا ہے جسے اسلامی حکومت مقرر کرے۔ اس سے زیادہ لینا، قانونِ خداوندی سے سرکشی، اور ظلم و زیادتی ہے، جس کا نتیجہ اس معاشرہ کی تباہی ہے۔ (وَلَا تَقْنُتُوا اَنْفُسَكُمْ ارْشَادِ خُداوندی ہمارے سامنے آچکا ہے)

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدُوًّا وَاَنَا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَّكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ (۴)

ایسی کھلی کھلی تکبیر کے بعد بھی، جو قوم اپنا کاروبار اس انداز پر رکھے گی کہ ہر شخص دوسرے کے حق میں کمی کرے اور اپنی حد سے تجاوز کر جائے، تو وہ معاشرہ بہت جلد تباہیوں کی آگ سے جھلس کر رہ جائے گا۔ قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ، جو نظام، منفعت عامہ کے خلاف قائم ہو اس کی تباہی کے سامان خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

یہ نہایت سنگین جرم ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نَكْفِرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مِّنْ دُوْنِهَا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ (۴)

جن باتوں سے تمہیں روکا جا رہا ہے، یہ معمولی باتیں نہیں۔ یہ انسانیت کے خلاف سنگین جرائم ہیں۔ اگر تم ان سے بچتے رہے تو تمہاری چھوٹی چھوٹی ناہمواریاں دور ہو جائیں گی اور تمہیں عزت اور مرفہ الحالی کی زندگی نصیب ہو جائے گی۔

(۴۲/۴۳ : ۵۳/۵۴)

غلط کاموں کے نقصانات کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے، اس کے لئے توبہ کا عنوان دیکھئے۔ اصول یہ ہے: اِنَّ الْحُسْنٰتِ يَدْهِيْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱) تخریبی امور سے نقصانات کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام مرنجام دو۔ میزانِ خداوندی میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ پلڑا کونسا بھاری ہے۔ تخریبی کاموں کا یا تعمیری کاموں کا۔

مالی معاملات میں ظلم اور تعدی کی بات آئی تو ایک اور گوشہ بھی سامنے لایا گیا جس میں ظلم و تعدی عام تھی (اور اب بھی ہے) لیکن اسی کا اس طرف دھیان تک نہیں جانا تھا، کہ یہ بھی ظلم و تعدی ہے۔ یعنی سمجھایہ جاتا تھا اور اب بھی اکثر و بیشتر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے کہ عورت کسی چیز پر حق ملکیت نہیں رکھتی۔ ملکیت صرف مرد کی ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا:

﴿۴۲﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِخَلْقِ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۴۳﴾ (۴۲/۴۳)

عورتوں کے حقوق ملکیت | ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوق ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۴۲/۴۳)، عورت اپنے مال اور جائداد کی آپ مالک ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ مرد اور عورتیں، سب اکٹبا رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ (یہ الگ بات ہے کہ گھر کی زندگی میں میاں بیوی کس طرح باہمی تعاون سے کام لیں۔) یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے، بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اپنے آپ کو اپنا بیج بنا کر، مردوں کی کمائی کو ٹکٹی رہیں اور خود کچھ نہ کریں۔ انہیں چاہیے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ اکٹبا کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ دوہی آیتیں آگے چل کر بتایا جائے گا، تقسیم عمل اور اختلاف وظائف (فرائض) حیات کی رو سے، گھر کے اخراجات کی بنیادی ذمہ داری مرد کی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عورتوں کے لئے اکٹبا رزق ممنوع ہے۔ وہ (عند الضرورت) کمائی کر سکتی ہیں اور اس کمائی کی مالک بھی وہ آپ ہوتی ہیں۔ اس طرح انہیں جو کچھ ورثہ میں ملے، وہ بھی ان کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ تقسیم ترکہ (وراثت) کے متعلق تفصیلی بحث پہلے آچکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس تقسیم میں سب سے پہلے عقدی اور عہدی وارثوں کا حصہ نکالا جائے گا۔

﴿۴۴﴾ وَ لِكُلِّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَلِلَّذِينَ عَقَدْتَ أَيْمَانُكُمْ

فَاتَّوَهُمْ نَصِيبَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿۳۵﴾ (۴/۳۳)

مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوق ملکیت کا فطری تقاضا ہے کہ مرنے والے کے ترکہ

عقدی رشتہ کا ترکہ

میں ان سب کا حصہ ہو۔۔۔۔۔ صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔۔۔۔۔ چنانچہ جو کچھ

کسی کے والدین یا اقربا چھوڑ جائیں، ہم نے اس کے لئے حصے دار مقرر کر دیئے ہیں (۴/۳۳)۔ یہ صرف نسبی رشتہ نہیں

محدود نہیں۔ عقدی رشتے بھی اس میں شامل ہیں۔ عقدی رشتوں میں ایک تو میاں بیوی ہیں اور دوسرے وہ لوگ جنہیں ازدواجی

وصیت (معاہدہ) تم کچھ دینا چاہو۔ اصول تقسیم یہ ہے کہ پہلے ان لوگوں کا حصہ نکال لیا جائے اور اس کے بعد (بقایا)

دوسروں میں تقسیم کیا جائے۔ (اس طرح، بیوی کو اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ سے سب سے پہلے حصہ ملے گا)۔ اسے اچھی

طرح یاد رکھو کہ خدا کی نگاہ ہر بات پر رہتی ہے۔



اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس کے غلط ترجمہ اور مفہوم نے ہماری عائلی (گھر کی) زندگی اور اجتماعی معاشرہ کو

جہنم بنا رکھا ہے۔ یعنی الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النَّسَاءِ..... کَبِيرًا (۴/۳۴)۔ یہ آیت، مع اس کے سیاق و سباق

کے، مطالب الفرقان جلد سوم میں آپ کی جیسے اور قریب دس صفحات (۳۶۹-۳۵۹) میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔

اس تشریح پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ عورتوں کے متعلق دیگر تشریحات کے لئے انڈکس میں 'عورت'

کا عنوان دیکھئے۔

نوٹ: اس آیت میں عورتوں کی طرف سے سرکشی کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کبھی مردوں کی طرف سے اس قسم کی صورت پیدا ہو جائے،

تو اسلامی نظام اس آیت کی روشنی میں ان کے خلاف بھی مناسب اقدامات کر سکتا ہے۔ نیز دیکھئے (۴/۳۴)

۴/۳۵ اِذَا بَعْدَ مِائَةٍ يَوْمٍ فِي شِقَاقٍ (ناچاقی) کا معاملہ سامنے آتا ہے جو اکثر و بیشتر طلاق پر منتج ہوتا ہے۔ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ

بَيْنِهِمَا..... عَلَيَّ مَا خَبِيرًا (۴/۳۵) طلاق کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۳۸۵)

میں آچکی ہے، جس کا آغاز اس (۴/۳۵) آیت سے ہوتا ہے۔ اسے دُبر لانے کی ضرورت نہیں۔

قرآن قریم عائلی زندگی (فیملی لائف) کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۷۶-۳۷۷)

آیت ۴/۳۵۔ وہ فیملی کو میاں بیوی اور ان کی اولاد تک محدود نہیں رکھتا، ماں باپ اور دیگر اقارب کو بھی اس میں شامل

کرتا ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک کے رشتہ کی نوعیت اور ان کے ساتھ تعلقات کو الگ الگ بیان کرتا ہے۔

میاں بیوی سے متعلق گفتگو کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے :

﴿۴﴾ **وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنَوبِ وَابْنِ
السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴿۴﴾**
(۴)

حُسنِ سلوک یہاں بیوی کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا سوال سامنے آتا ہے۔ لیکن معاملہ کسی کا بھی ہو، اصول ہر جگہ یہی کارفرما رہے گا کہ تم نے صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہے۔ اس کے ساتھ نہ اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنا ہے، نہ کسی دوسرے انسان کے فیصلہ کو۔ خدا کے قانون کا یہ فیصلہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ۔ رشتہ داروں سے آگے بڑھ کر، ان تمام لوگوں کے ساتھ جو والدین کے قوت ہو جانے سے، یا ویسے ہی (معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ یا جو حرکت سے معذور ہو جائیں۔) اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ اور ہمسایہ کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ، خواہ وہ قریب کا ہمسایہ ہو یا دور کا۔ وہ اپنا ہو یا بیگانہ۔ رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔ نیز اپنے دفعتائے کار کے ساتھ بھی، اور ان مسافروں کے ساتھ بھی، جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسنِ سلوک مستثنیٰ ہوں۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ جو تمہارے ماتحت کام کریں۔

دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے وہی پیش آ سکتا ہے جس کا سینہ جو ہر انسانیت سے معمور ہو۔ جو اخلاقِ کریمانہ کا پیکر ہو۔ جو دوسروں کی امداد میں خوشی محسوس کرے۔ جس میں کثرتِ ظرف اور وسعتِ نگاہ ہو لیکن جو لوگ اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہوں۔ کوئی جو ہر ان میں ہو، اور وہ باتیں بڑی بڑی کریں۔ شیخی بہت بھگادیں، لیکن دیں کسی کو کچھ نہ۔ تو ایسے لوگ قانونِ خداوندی کی نگاہوں میں کس طرح مستثنیٰ ہو سکتے ہیں؟

والدین کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۴۵۔ آیت ۲۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ ان کی اطاعت فرض قرار نہیں دیتا۔ والدین کے علاوہ، ذی القربی۔ یتامی۔ مساکین۔ ابنِ السبیل کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ (اندکس کی رو سے ان سے متعلق مقامات دیکھ لیجئے)۔ آیت زیرِ نظر میں البتہ جار کا لفظ پہلی بار سامنے آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں وہ شخص جسے تم نے کسی ظالم کے جو دستم سے بچنے کے لئے پناہ دی ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ ہمالیہ کے لئے بھی استعمالی ہونے لگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس اودہ ہمسایہ کا مفہوم

لے رکھا ہو۔ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر حق ہمسائیگی کیا ہو سکتا ہے ؟

”مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ“ کے عام معنی غلام اور لونڈیاں کہا جاتا ہے۔ (دیکھئے انگلش میں عنوان غلامی)

لیکن اس کا مفہوم وہ لوگ بھی ہیں جو کسی کی زیر نگرانی — یا مروجہ اصلاح کی رُو سے — کسی کی ماتحتی میں کام کرتے ہوں۔

مخال اور فخور | اس آیت میں ”مُخْتَالًا“ اور ”فَخُورًا“ کے لفاظ بھی آئے ہیں۔ ”مُخْتَال“ (مادہ - خ - ی - ل) ایسے

شخص کو کہتے ہیں جس میں جوہر ذاتی کوئی نہ ہو، لیکن وہ اس غریب نفس میں مبتلا ہو کر اس میں تمام جوہر انسانیت موجود ہیں۔ اور پھر اس خود فریبی کی بنا پر زعم باطل اور غرور اور تکبر کا شکار ہو جائے۔

فخر (مادہ - ف - خ - س) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں - ۱۔ وہ اونٹنی یا بکری جس کے ٹخن تو بڑے بڑے ہوں،

لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو۔ اور (۲) وہ ٹکے جو اندر سے خالی ہوں، لیکن بچنے بہت زور سے ہوں۔ ہمارے ہاں

مشہور محاورہ ہے: ”مختوتھا چنا، باجے گننا“ یہ فخور کی صحیح تصویر ہے۔ لیکن شیخی بہت زیادہ گھمارنے والا۔

اگلی آیت میں اس کی وضاحت کر دی کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں:

”الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ“

مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۳۷﴾ (۴۴)

ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھتے ہیں، اور کسی کو کچھ نہیں دینا چاہتے۔ پھر ایسے قوانین و

ضوابط بناتے ہیں جس سے معاشرہ کی عام روش بھی ہو جائے اور بخل کو معیوب ہی نہ سمجھا جائے۔ اور یوں، ہر شخص

ان چیزوں کو اپنے لئے چسپا چسپا کر رکھنا چلا جائے جو اسے خدا کے فضل و کرم سے عطا ہوئی ہوں۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کرتے ہیں۔ اور ناسپاس گزاری یہ ہے کہ نہیں چسپا چسپا کر

رکھا جائے اور نوع انسان کی پرورش کے لئے خرچ نہ کیا جائے۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ذلت آمیز تباہی ہے۔

بخیل کے متعلق اس جلد میں زیر آیت (۳۹) بات ہو چکی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۱۶۴) اس کا صحیح مطلب اس کی

”ضد اتفاق“ کے مفہوم کو سامنے لانے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ”اتفاق“ کے سلسلہ میں دیکھئے مطالب الفرقان جلد

اول (صفحہ ۱۰۵) اور جلد سوم صفحات (۳۰۳ تا ۳۲۶) اور بالخصوص صفحہ ۳۶۴ اور اس سے آگے

ایک گروہ تو وہ ہے جو دوسروں کی مدد کرنے کے لیے کچھ دیتا ہی نہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو دیتے تو ہیں

لیکن اس سے ان کا مقصد، دوسروں کی لگاہ میں بڑا بننا ہوتا ہے۔ اسے ریاکاری کہا جاتا ہے۔ یعنی دکھاوے کے لئے

صرف کرنا۔ اتفاق کے سلسلہ میں حوالے اوپر درج کئے گئے ہیں، ان میں ان لوگوں کا بھی ذکر آ گیا ہے جو محض دکھاوے

کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ اس لئے اس نکتہ کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

آیت اور اس کا مفہوم حسب ذیل ہے:

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ النَّاسِ وَالْيَوْمِئَاتِ بِاللَّهِ وَلَا يَلْبِسُ
الْأَخْصِطَ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ﴿۳۸﴾

یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو مال و دولت کو اپنے مفاد کے لئے چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ بعض
ایسے بھی ہیں جو اسے خرچ تو کرتے ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت

کی صداقت، قانون مکافات عمل، اور موت کے بعد زندگی کے مسلسل آگے بڑھنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ محض
لوگوں میں اپنی نمود نمائش کے لئے دبا کرتے ہیں۔ اس کا جذبہ محرکہ اپنے ایغو کی تسکین ہوتا ہے اور بس۔ سو ظاہر
ہے کہ جس عمل کی بنیاد اس قسم کے پست جذبات پر ہو، اس کا نتیجہ کس طرح خوشگوار ہو سکتا ہے۔

یاد رکھو! اچھے سے اچھا معاشی نظام بھی، جس کی بنیاد ایمان بالآخرت پر نہ ہو، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔
یہ ایمان بالآخرت ہی ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے (پیدا کرے)

اور اپنی ضروریات سے زائد، بطیب خاطر، دوسروں کے لئے دے دے۔

اس آیت میں، قرآن کے معاشی نظام اور سوشلزم یا کمیونزم کے نظام کی بنیاد کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ قرآن کے
نظام کی بنیاد ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے۔ اور سوشلزم یا کمیونزم، اللہ کا بھی منکر ہے اور آخرت کا بھی۔
اقبال نے جو روس سے کہا تھا کہ

ایکہ می جوئی نظامِ عالمی جُستہئی اور اساسِ محکمہ ؟

تو یہ اساس محکمہ، اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ اس کے بغیر عالمگیر ربوبیت کا کوئی نظام بھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ روس
اور چین کی ناکامی ہمارے سامنے ہے۔ اس سلسلہ میں دیکھئے (انڈکس میں) عنوان ”سربایہ داری کا نظام“۔

اس کے بعد کہا:

وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ كُؤُومًا مِّنْ أَمْنٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِئَاتِ وَالْأَخْصِطِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ

۱۔ حیوانی سطح زندگی کو ہم نے ایغو (EGO) سے تعبیر کیا ہے، اور جو جذبات خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار انسانیت
کے لئے بروئے کار آئیں، وہ انسانی ذات (PERSONALITY) کی نمود ہوتی ہے۔

وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿۳۹﴾ (۳۹)

یہ محض نگاہ کا پیر اور پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ ورنہ اگر یہ لوگ خدا کی متعین کردہ اقدار کی صداقت، اور قانونِ مکافات پر یقین رکھتے، اور دولت کو انہی مقاصد کے لئے خرچ کرتے، نہ کہ اپنی نمود کی خاطر، تو ان پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ لیکن خدا کو خوب علم ہے کہ انسان کس ہذبہ کے تحت کوئی کام کرتا ہے۔

اس کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضْعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۰﴾ (۴۰)

اور چونکہ ہر عمل، اس مقصد کے مطابق نتیجہ پیدا کرتا ہے جس کے لئے وہ کیا جائے، اس لئے جو لوگ، اپنی نمود و نمائش کیلئے دولت خرچ کرتے ہیں، اگر سیرانِ خداوندی میں ان کے اس عمل کا کوئی وزن نہیں ہوتا، تو یہ ان پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی۔ اللہ کسی پر ذرا برابر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ انہوں نے لوگوں کو دکھانے، اور ان میں بڑا بننے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ ان کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اگر ان کا مقصد، قانونِ خداوندی کی اطاعت ہوتا، تو یہ ایسا حسنِ عمل تھا جس کا بدلہ ان کے صرف کردہ مال سے، کئی گنا زیادہ ملتا۔ اس سے معاشرہ میں خوشگوار نتائج پیدا ہوتے اور ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی۔ یہ ہے وہ اجرِ عظیم جو قانونِ خداوندی کی رُو سے ملتا ہے۔ آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ بھی فروعِ انسانی کی بھلائی کے کام کرتے ہیں، ان کے ان اعمال کا انہیں اجر ملنا چاہئے۔ اُن پر جنت کے دروازے کیوں بند کر دیئے جاتے ہیں۔

کُفَّار کے نیک اعمال کا اجر | اس اعتراض کا تفصیلی جواب تو آپ کو ”مکافاتِ عمل“ کے عنوان کے تابع (سابقہ جلدوں میں) ملے گا۔ یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے وہ کہنا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو جب جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہمارے نیک اعمال کا کیا ہوا؟ کیا ہمیں اُن کا بدلہ نہیں ملے گا؟ فرمایا:

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَذَّابْتُمْ طَيِّبَتْكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۖ فَالْيَوْمَ تُجْرَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿۴۱﴾ (۴۱)

ان لوگوں کو رُج ہمارے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں، جب تباهی کے جہنم کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے گا تو ان سے

کہہ دیا جائے گا کہ تم نے صرف دنیا کی طبعی زندگی کی آسائشوں کو اپنا نصب العین بنایا۔ وہ تمہیں وہاں مل گئیں مگر وہ تمہاری طبعی موت کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ تم اپنی آسائشوں (مال و دولت) کے بل بوتے پر اکرے پھرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم کام تو ایسے نہ کرو جو حق و انصاف کے مطابق ہوں، لیکن بڑائی تمہارے حصے میں آجائے۔ اس لئے تم نے ہمارا تجویز کردہ سیدھا راستہ چھوڑ کر، اور راہیں اختیار کر لی تھیں۔ سو اس کا نتیجہ یہ رسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے جس کے سامنے تم کھڑے ہو۔

رباء الناس کی خاطر پہلے کام کرنے والوں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝ ط
يَوْمَئِذٍ يَكْفُرُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَا يَسْئَلُ عَنْهُمْ إِلَّا رِضًا وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۝ (۴۲-۴۱)

ان لوگوں نے یہ روشن اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ ان کا خیال ہے کہ معاشرہ کا نقشہ ہمیشہ اسی انداز پر رہنا ہے جس میں فریب اور تصنع سے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ خیال خام ہے۔ اس نے ایسی شکل اختیار کر کے رہنا ہے جس میں مختلف جماعتوں کے سربراہ نمائندے اکٹھے ہوں گے اور رسول اللہ، ان سب پر نگران کار ہوں گے۔

(۱۶ : ۲) (۸۹-۸۸)

اس وقت یہ لوگ، جو اب قوانین خداوندی سے انکار، اور رسول کے فیصلوں سے سہ تابی اختیار کر رہے ہیں، سخت پشیمانی اور ندامت سے اس کی تمنا کریں گے کہ اسے کاش اہم اس سے پہلے نسیا منسیا ہو چکے ہوتے۔ اس لئے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں، خدا پر خوب روشن ہے۔

اگر ان میں سے کسی پر یہ وقت یہاں نہ آیا، تو موت کے بعد ایسا ہو گا۔ اس لئے کہ خدا کے قانون مکانات کا سلسلہ یہاں سے وہاں تک برابر پھیلا ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے (متعدد مقامات میں) بتایا جا چکا ہے کہ اعمال کے نتائج کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے اور آخرت تک چلتا ہے۔ اس بنا پر ہم اس قسم کی آیات کا وہ مفہوم بھی بیان کر دیتے ہیں جو (ہماری بصیرت کے مطابق) اسی دنیا میں ظہور نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور اس کے بعد اس کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں کہ یہی صورت آخری زندگی میں بھی پیش آئے گی۔

رسول اللہ کے شاہد ہونے کا مطلب | قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کو شاہد اور شہید کہا ہے۔ سورہ احزاب میں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (۳۳) - نیز (۴۸) -

اور شہید کا لفظ آیت زیر نظر (۳۳) میں بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے شاہد یا شہید ہونے سے مراد کیا ہے؟

شاہد یا شہید (مادہ شی - ۵ - ۵) سے مراد نگران، نگہبان، یا شہادت دینے والا (گواہ) ہوتے ہیں۔

رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا کہ آپ اپنی امت پر شہید ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط (۱۲۳)۔ یہی الفاظ

آیت (۳۳) میں بھی آئے ہیں۔ ان آیات میں اُمتِ مسلمہ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اقوامِ عالم پر شہید ہے

اس میں، اس اُمت کے مقام، اس کے منصب، فریضہ اور ذمہ داری کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس اُمت کا اتنا ہی فریضہ نہیں کہ وہ خود حق و صداقت کے راستے پر چلے، بلکہ یہ فریضہ بھی ہے کہ وہ دیکھے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی دوسروں پر ظلم و تعدی نہ کرے۔ قرآن کریم نے مومنین کا مقام اَعْلَوْنَ بتایا ہے (۱۳۸)۔ اور نظامِ خداوندی کے متعلق کہا ہے۔ کہ وہ تمام نظام ہائے عالم پر غالب آجائے گا۔ (۹)۔

ظاہر ہے کہ جس نظام کی یہ کیفیت ہو، اُس کی حامل اُمت، تمام اقوامِ عالم کے اعمال اور کاروبارِ حیات پر نگاہ رکھے گی کہ کوئی جو ردِ استبداد کی روش اختیار نہ کرے۔

اور خود اس اُمت کی کیفیت یہ ہوگی کہ رسول اُن کے اعمال و کردار پر نگاہ رکھے گا۔ جیسا کہ

الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدٌ ط میں کہا گیا ہے، دوسرے مقام پر شَهِيدًا عَلَيْكُمْ (۱۱۵)۔ اس

آیت میں اُمتِ مسلمہ اور اقوامِ عالم دونوں آجاتے ہیں۔ نظامِ خداوندی کے متعلق ہم جو کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں اُس کی روشنی میں یہ سمجھنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد یہی فریضہ، اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ادا کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اقوامِ عالم یا نوعِ انسان کے اعمال و کردار پر نگرانی کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے

خود واضح الفاظ میں بتا دیا۔ سورہ النحل میں پہلے کہا: وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ

مِّنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا اَعْلٰی هُوَ لَآ اِط "جس دن ہم ہر قوم میں سے خود اُن کے افراد بطور

گواہ اُٹھائیں گے۔ اور ان سب پر اے رسول! تم بطور شاہد کھڑے کئے جاؤ گے" اس کے بعد ہے: وَتَوَلَّوْنَا

عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهْدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرٰی لِّلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶﴾ (۱۶)۔

”اور ہم نے تیری طرف اس کتاب کو نازل کیا ہے جو تمام امور کو واضح کر دیتی ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، ہدایت اور رحمت اور زندگی کی خوشگوار یوں کی خوشخبری دینے والی ہے۔“ اس کے بعد اس کتاب کی نمایاں خصوصیات ”عدل و احسان“ وغیرہ بتائیں۔ (۱۶/۹) اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس نگرانی یا شہادت سے مطلب یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اقوام عالم ان اصولوں کے مطابق چل رہی ہیں یا نہیں جو اس کتاب خداوندی میں دیئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر، بعثت محمدیہ کے بعد غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار، قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے برہنہ کو کتاب دی تھی جو اس کی زندگی میں، یا جب تک وہ کتاب غیر محرف رہی، غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار بنی۔ بالفاظ دیگر اس دور میں، وہ رسول، اپنی قوم پر شاہد یا شہید تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، تا آنکہ آخر میں خدا نے اپنی آخری کتاب، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نازل کر دی جو قیامت تک، تمام نوبع انسان کے لئے ضابطہ ہدایت ہے۔ لہذا نزول قرآن کے بعد، یہ کتاب، غلط اور صحیح کا معیار قرار پا گئی۔ اور یوں حضور نبی اکرمؐ ان سب پر شہید ہو گئے۔

جیسا کہ (قانون مکافات عمل اور اخروی زندگی وغیرہ عنوانات میں بتایا گیا ہے) قیامت میں ہر انسان اپنا اعمال نامہ آپ ہوگا، لیکن سمجھانے کی غرض سے قرآن نے (تمثیلی انداز میں) اس کا نقشہ ایسا کھینچا ہے گویا ایک کمرہ عدالت ہے اس میں جج تشریف فرما ہے۔ ملزم اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر گواہ بلائے جاتے ہیں۔ ان کی رائے کے حق میں اور اس کے خلاف، شہادت ہوتی ہیں۔ اس طرح جب جرم ثابت ہو جاتا ہے، تو اسے سزا سنائی جاتی ہے اس سلسلہ میں بھی کہا گیا ہے: **يَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنْفُسِهِمْ** (۱۶/۸۹) **وَهُوَ** (۲۸/۲۷)۔ یہ رسول اپنی اپنی امت کے متعلق اس زمانے تک جب وہ خود یا ان کی کتاب ان کی امت میں مشہور طور پر رہی شہادت دیں گے۔ بعثت نبی اکرمؐ کے بعد انبیائے سابقہ کی اُمینیں تو دنیا میں موجود تھیں (اور موجود ہیں) لیکن ان کے خلاف شہادت، ان کے رسول کی نہیں، بلکہ حضور نبی اکرمؐ کی ہوگی، کیونکہ رسالت محمدیہ (قرآن) تمام اُمم سابقہ کو محیط ہے۔ بالفاظ دیگر، اب عدالت خداوندی کے میز پر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے کے لیے ضابطہ، قرآن کریم ہے۔ یہ مطلب ہے اس ارشاد خداوندی کا: **وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلٰی هَٰؤُلَاءِ** (۱۶/۸۹)۔ ”ان سب پر، اے رسول! تم گواہ ہو گئے۔“

یہ شہادت کیا ہوگی؟ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پیغامات خداوندی ان تک پہنچا دیئے تھے تو انہوں نے کیا جواب دیا تھا۔ ان کا رد عمل کیا تھا؟ **مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ** (۲۸/۲۷) (۵/۱۰۹)

ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد ابلاغ رسالت کا فریضہ امت مسلمہ پر عائد ہوگا۔ اور خدا کی طرف سے یہ سوال ہم سے ہوگا۔ لیکن ہم تو خود مجرمین کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، اس لئے ہم کیا شہادت دیں گے؟ ہم پر تو دہرا عذاب ہوگا ایک خود قرآن کو چھوڑ دینے کا، اور ایک، دوسروں تک قرآن نہ پہنچانے کا۔

اس کے بعد ایک آیت میں یہ بتایا ہے کہ جماعتِ مؤمنین کے ہاتھوں اس مقصد کے لئے جو نظام قائم ہوگا، اسے نظامِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات اس نظام کا لاینفک حصہ ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی، صلوٰۃ کے عنوان میں ملے گی جو اندکس میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگلی آیت میں اس وقتی اجتماعِ صلوٰۃ کے متعلق راہ نمائی دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَفْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ
حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ

اجتماعاتِ صلوٰۃ

۴
۴۳

حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُم مِّنَ
الْمَضَامِ أَوْ لِمَسْتُمُ النِّسَاءِ فَلَمْ يَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا
فَأَمْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُورًا غَفُورًا ﴿۴۳﴾

اس معاشرہ کے قیام و استحکام کے لئے صلوٰۃ کے اجتماعات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان اجتماعات میں شرکت کے سلسلہ میں چند ضروری ہدایات یہ ہیں کہ۔

۱۔ جب تم ہوش میں نہ ہو۔ یعنی تمہیں معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہے ہو، (خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو) تو اجتماعِ صلوٰۃ میں

شریک نہ ہو۔ اس صلوٰۃ سے فائدہ کیا جس میں تم سمجھو ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہو!

۲۔ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کئے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو (اگر ایسی حالت

میں پانی نہ ملے تو اس کے لئے آگے ہدایت دی گئی ہے) البتہ ایسی حالت میں اگر تمہیں اس اجتماع میں

تیمم کا حکم

یونہی گزرنا پڑے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ اگر تم ریض ہو۔ اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے۔

یا حالتِ سفر میں ہو۔

یا۔ جائے ضرور سے فارغ ہو کر آئے ہو

یا۔ عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو

اور پانی نہیں ملتا۔

تو ان حالات میں، وضو کرنے کے بجائے (۵/۴) تیمم کر لیا کرو۔ یعنی، پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے پونچھ لئے۔

یہ رعایت اس لئے دی گئی ہے کہ خدا کا قانون، مجبوری کی حالت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ان مخصوص حالات میں، عام حکم کی پابندی سے درگزر کر دیتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اجتماعات میں شریک نہ ہونے سے تمہیں جو نقصان پہنچ سکتا تھا، اس سے تمہاری حفاظت ہو جائے۔

اس ضمنی گوشے کے بعد پھر نظام خداوندی کی طرف مراجعت کی گئی۔ فرمایا:

﴿۵۴﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الصَّلٰةَ وَبِرِيْدٍ وَّنَ اَنْ يَّمْلِكُوْا السَّبِيْلَ ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَاكُمْ ۗ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۚ وَكَفٰی بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۵۵﴾ (۴۴-۴۸) (نیز دیکھئے آیت ۵/۴)

اس ضمنی گوشے کے بعد، پھر انہی لوگوں کی کیفیت کو سامنے لاؤ، جو نظام خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں (اور جن کا ذکر ۴/۴۸ میں کیا جا رہا تھا)۔ ان ہیں، ان لوگوں کی حالت خاص کر قابل غور ہے جنہیں اس ضابطہ حیات کا، جس کی تکمیل اب قرآن میں ہوئی ہے، ایک حصہ دیا گیا تھا۔ یہ لوگ اپنی ساری کوششیں، گمراہی خریدنے میں صرف کر رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ تم بھی صحیح راستہ سے بھٹک جاؤ۔

اللہ تمہارے ان تمام دشمنوں سے واقف ہے (تم ان سے مت ڈرو)۔ تمہارے لئے قانون خداوندی کی سرپرستی اور نصرت کافی ہے۔

اہل کتاب کو مکمل ضوابط قانون نہیں دیئے گئے تھے | یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ سابقہ اہل کتاب کو مکمل ضابطہ قوانین

نہیں دیا گیا تھا اس کا صرف ایک حصہ دیا گیا تھا۔ جو ان کے زمانے کے تقاضوں تک کے لئے کافی تھا۔ مکمل ضابطہ قوانین صرف قرآن ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ سابقہ آسمانی کتابیں نہ صرف اس لئے ناقابل عمل ہیں کہ وہ محرف ہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ ان میں مکمل ضابطہ قوانین نہیں دیا گیا تھا۔ دین کے اصول تو ہر رسول کو یکساں دیئے گئے تھے، لیکن قانونی ضوابط میں سے صرف اتنا حصہ دیا جاتا تھا جو اس رسول کے زمانے کے لئے مطلوب تھا۔ تحریف کتب سابقہ کے سلسلے میں فرمایا:

﴿۴۶﴾ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوا يَمْحَوْنَ الْكِتٰبَ عَنْ مَّوٰضِعِهِۦ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ

عَصَيْنَا وَاسْمَعُ غَيْرَ مَسْمُوعٍ وَرَاعَيْنَا لِيَا بَالِيسَنَتِهِمْ وَطَعْنَا فِي الدِّينِ ط
وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَبِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعُ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمُ
وَلَاحِزٌ لِّعَنَائِهِمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٣٧﴾ (۴)

تحریف کتب

ان میں سے یہودی تو بہت ہی پست سطح پر آتے ہیں۔ یہ وحی کے الفاظ تک کو، ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر، ان کے مفہوم میں رد و بدل کر دیتے ہیں۔ (۵) اور عام گفتگو میں بھی عجیب انداز سے دو معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ ”سَبِعْنَا“ ”أَطَعْنَا“ کہیں۔ (یعنی ہم نے آپ کی بات سُن لی اور ہم اس کی اطاعت کریں گے)۔ یہ ”سَبِعْنَا“ ”وَعَصَيْنَا“ کہیں گے۔ (ہم نے اسے سنا ہے اور ہم اس کی نافرمانی کریں گے)۔ یا کہیں گے ”إِسْمَعُ غَيْرَ مَسْمُوعٍ“ (تو ہماری بات سن، اگرچہ نیری بات نہیں سنی جائے گی۔ یا طنزاً کہیں گے کہ تو بہرہ ہو جائے)۔ یا یوں کہیں گے کہ تم ہمیں فلاں رعایت دو تو پھر ہم تمہاری بات نہیں گے (۲)۔ غرضیکہ یہ عجیب انداز سے زبان کو توڑ موڑ کر بائیں کریں گے۔ مقصد اس سے ان کا یہ ہے کہ دینِ خداوندی کو بدعتِ طعن و تشنیع بنایا جائے۔ اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر ان کی نیت نیک ہوتی اور سیدھی طرح کہتے کہ ”سَبِعْنَا“ ”أَطَعْنَا“ (ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے) یا ”إِسْمَعُ“ ”انْظُرْنَا“ (ہماری بات سُنئے اور ہم پر نگہ التفات رکھئے) تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات ساف اور سیدھی ہو جاتی۔ لیکن انکار و سرکشی کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو چکی ہے یہ عام معاشرتی حسنِ آداب سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو ایمان سے آئیں۔ جن لوگوں کی ذہنیت اس حد تک پست ہو چکی ہو، وہ ایسی بلند تعلیم کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں!

دنائت اور کمینگی

بات مفہوم سے واقع ہے۔ ایک مخالفت قریش کی طرف سے تھی، جو شدت کے اعتبار سے انتہائی کمینگی کی سطح پر نہ تھی۔ لیکن وہ اپنی مخالفت میں بھی اپنے قومی کردار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ وہ دنائت اور کمینگی کی سطح پر نہیں اترتے تھے۔ لیکن یہودی تھے کہ مخالفت میں کمینگی کے مقابلہ میں آنے کے بجائے انتہائی پست سطح کے کردار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رکیک حربے، شریف مخالفت کے لئے بڑے سوبانِ روح ہوتے ہیں۔ وہ مقابلہ میں اس قسم کی پست سطح پر اتر نہیں سکتا۔ اس لیے اسے یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو قوم صدیوں سے غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑی رہے، اس میں اس قسم کی کینہہ عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی اصلاح کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ قرآن جیسی بلند پایہ کتاب پر ایمان لے

آئیں۔ یہ ان کے کردار کو خود بلند کر دے گی۔ اس لئے انہیں اس کی دعوت دی گئی۔ فرمایا:

﴿۴۴﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ائْمُنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَطْغَسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّ هَا عَلٰى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ط وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۴۵﴾ (۴۴-۴۵)

ان اہل کتاب سے کہو کہ تم اس ضابطہ حیات پر ایمان لاؤ جو تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے (کہ

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

آنے والا آئے گا۔۔۔ باطل کو شکست ہوگی۔ حق کا غلبہ ہوگا۔ زمین پر خدا کی مٹی چلے گی۔ وغیرہ۔ اس پر ایمان لے آؤ، قبل اس کے کہ دونوں فریقوں کے آخری ٹکراؤ کی فوجت آجائے۔ اُس وقت، یاد رکھو، تمہارا ان بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا، اور وہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے، یہاں تک کہ زندگی کی خوشگوار یوں سے اس طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح تمہارے اسلاف میں سے ”اصحاب سبت“ محروم رہ گئے تھے (جی کا ذکر ۲/۱۶۵ میں آچکا ہے) یاد رکھو! یہ تنبیہ یونہی دھکی نہیں۔ یہ قانونِ خداوندی کا اعلان ہے اور خدا کے قانون کے نتائج سامنے آکر رہا کرتے ہیں۔ اس کی کوئی ایسی کم ناکام نہیں رہ سکتی۔

ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ارباب و رسلان کو خدا کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے ان انسانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام کی اطاعت کرتے تھے جس سے وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو چکے تھے۔ اسے شرک کہتے ہیں جو ایسا جرم ہے جس کے پیدا کردہ نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

﴿۴۶﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَآءُ عِجٌّ وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ فُتِّرَ اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ (۴۶)

یاد رکھو! اسہو و خطا سے کوئی لغزش ہو جانا اور بات

شرک کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے

ہے۔ اس کے نقصانات سے انسان قانونِ خداوندی

کے مطابق، محفوظ رہ سکتا ہے۔ لیکن جو شخص خدا کے قانون کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کرے۔ یا، ان کے علی الرغم، اپنے جذبات ہی کی اطاعت شروع کر دے (۴۵)۔ یا جو صفات اور قوتیں صرف خدا کے لئے مخصوص ہیں ان میں دوسروں کو بھی شریک سمجھ لے، تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ یہ تصور کہ کائنات میں، خدا کے علاوہ اور بھی صاحبِ اختیار ہو سکتے ہیں

یہاں، اس کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی چل سکتا ہے، ذہن انسانی کا خود ساختہ تصور ہے جو بڑی غلط فہمیوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ اس سے انسان کا دل، خوف کا شیمیں ہی جاتا ہے (۲۲)۔ وہ ہر وقت اپنے ذہن کے تراشیدہ ”خداؤں“ سے ڈرتا رہتا ہے اور اس طرح اس کی جرأت و بے باکی کی قوتیں مضاعف ہو جاتی ہیں۔ ایسا شخص ان تباہیوں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اسے پھر سن لو کہ شرک صرف بت پرستی کا نام نہیں۔ بت پرستی تو جہالت کا مظاہرہ ہے۔ شرک یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اوروں کو بھی صاحب اقتدار سمجھا جائے اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کر لیا جائے خواہ وہ قوانین، مذہبی پیشواؤں کے فیصلے ہوں اور خواہ ارباب حکومت کے وضع کردہ ضوابط۔

(۹ / ۳۱ و ۱۴ / ۳۶ و ۳۹ / ۳۵ و ۴۰ / ۱۲)

شرک کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) اس لئے اس آیت کی تشریح میں کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

شرک سے انسان، شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت سے محروم رہ جاتا ہے، لیکن اس قسم کے لوگ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارا ”تزکیہ نفس“ ہو رہا ہے، ہماری ذات کی نشوونما ہو رہی ہے، ہم ”روحانیت“ کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے ہاں کی خانقاہوں اور مزارات کو دیکھئے، اور غور کیئے کہ وہاں کس قسم کے محسوس شرک کا مظاہرہ پیش ہوتا۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے ”روحانیت“ کے بلند مدارج حاصل ہو رہے ہیں:

﴿ ۴۰ / ۸۹ ﴾ اَلَمْ نَرَاۤلِی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیۡ مَنْ یَّشَآءُ
وَلَا یُظَلِّمُوۡنَ قَتِیۡلًا ﴿ ۴۱ / ۸۹ ﴾

جو لوگ اس باطل تصور کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں، ذرا ان کی حالت پر غور کرو۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم جس نبی پر چل رہے ہیں اس سے ہماری ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس سے ہم ”روحانیت“ کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

یاد رکھو! انسانی ذات کی نشوونما صرف اس ضابطہ خداوندی کی رُو سے ہو سکتی ہے جسے اس نے اپنی مشیت کے مطابق، بندید و حی عطایا سے۔ اس کے مطابق، جو چاہے اپنی ذات کی نشوونما کر سکتا ہے۔ اس کی سعی و عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا نتیجہ ٹھیک ٹھیک مرتب کئے جاتے ہیں۔

ترکیہ نفس صرف اتباع قرآن سے ہو سکتا ہے | یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس سے اغماض

برتنے سے ہم اس قدر کھلی ہوئی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ارشادِ خداوندی یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ازکیہ نفس کا ثبوت یہ نہیں کہ وہ شخص خود اپنے متعلق اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ معیارِ خداوندی (قرآن کریم) پر بھی پورا اترتا ہے یا نہیں۔ آپ غور کیجئے۔ کشف و الہام کے جس قدر دعویٰ ہیں، ان کے پاس اپنے دعویٰ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ ثبوت تو ایک طرف، وہ اپنی ”روحانیت“ کے متعلق کسی اور کو کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔ وہ پوچھنے والے کے جواب میں اتنا ہی کہتے ہیں ————— ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانجشی ————— ”یہ وہ شراب

ہے جس کے نشہ کی کیفیت وہی سمجھ سکتا ہے جو اسے خود پئے۔“ گویا وہ اپنے دعویٰ ہی کو اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا معیار اُس کی کتاب ہے، اور بس۔ جو شخص کتاب اللہ سے اس کا ثبوت پیش نہیں کرتا، اور اس کے باوجود اسے منسوب کرتا ہے خدا کی طرف، وہ خدا پر بہتان باندھتا ہے۔

﴿۴۵﴾ اَنْظُرْ كَيْفَ يُفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَفَىٰ بِهِ اِثْمًا مُّبِينًا ﴿۵﴾

(سج۴۵)

دیکھو! ”یہ روحانیت“ کے مدعی کس طرح اپنے خود ساختہ مشرب و مسلک کو، خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اس طرح کتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ ان کی اپنی ذات میں (تقویت اور نشوونما کے بجائے) ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی چیز ان کی تباہی کے لئے کافی ہے ————— ایسا کھلا ہوا جھوٹ۔ اتنا واضح جرم اور دعویٰ یہ کہ ہم خدا کے مقرب ہیں!

چونکہ ہم تصوف کے متعلق سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں، اس لئے اس باب میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں (تصوف کے موضوع پر میں نے ایک خود لکتنی ضخیم تصنیف الگ مرتب کی ہے)

یہ ان کے رہبان (اربابِ طریقت) کی حالت ہے۔ دوسری طرف ان کے اجار (ایمان شریعت) کو دیکھئے:

﴿۴۶﴾ اَلَمْ يَسِّرْ لِيَ الَّذِينَ اُوْتُوا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْحُبَّتِ

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُوَ لَا يَهْدِيْ مِنَ الدِّيْنِ

اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ط وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ

فَلَنْ يَجِدَ لَهُ سَبِيْرًا ﴿۶﴾ (سج۴۶-۴۵)

اُن کے علماء کی حالت

(یہ اُن کے اہل طریقت کا حال ہے۔ دوسری طرف) ان اہل کتاب کے ارباب شریعت کو دیکھو! یہ چند بے جان رسومات اور بے حقیقت

معتقدات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور غیر خدائی نوثتوں (مذہبی پیشواؤں اور حکمرانوں) کے بنائے ہوئے قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور چند کا یہ عالم ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں، کافر زیادہ سیدھی راہ پر ہیں (حالانکہ تم، ان اہل کتاب کو، کفار پر ترجیح دیتے ہو)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے صمیم اور سچے ضابطہ حیات کی برکات سے محروم رہ گئے۔ اور جو اس ضابطہ کی برکات سے محروم رہ جائے، اس کا کوئی حامی دنا نہیں ہو سکتا۔

حجیت کے معنی

طاغوت کے متعلق سابقہ جلدوں میں لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مراد غیر خداوندی ارباب

اقتدار ہیں۔ حجیت ہر کھوکھلی شے کو کہتے ہیں۔ یعنی توہم پرستانہ نظریات اور مسالک، شعائر اور رسومات جن میں روح باقی نہ رہی ہو، جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ غور کیجئے، جو قوم ہی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے دین کو چھوڑ دیتی ہے، وہ کس طرح طاغوت اور حجیت کو اپنا معبود بنا لیتی ہے یہودیوں کا ہیکل (جس کا نقشہ باب دوم میں ہمارے سامنے آچکا ہے) طاغوت اور حجیت کی پرستش کا مرکز تھا ان کے ارباب شریعت خدائی اختیارات کے حامل تھے اور ان کے اصحاب طریقت، کھوکھلی ریاضتوں کے پیکر۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ غنیمت تھا کہ ان (مذہبی پیشواؤں) کا دائرہ اختیار شخصی قوانین تک محدود تھا۔ اگر انہیں کہیں مملکت کے اختیارات کا بھی کچھ حصہ مل گیا ہوتا، تو یہ کسی کو کچھ بھی نہ دیتے، سب کچھ خود ہر ٹپ کر جاتے۔

تھیکا کر کسی میں کیا ہوتا ہے

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذْ لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿۵۴﴾ (۵۴)

یہ تو غنیمت ہے کہ انہیں ملک میں اقتدار اختیار حاصل نہیں، ورنہ یہ لوگوں کو تلی کے برابر بھی کوئی شے نہ دیتے۔

تاریخ انسانیت میں بدترین ادوار وہ ہیں جن میں حکومت، مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ آگئی تھی۔ (اسے

THEOCRACY کہتے ہیں) کسی فرعون یا نمرود نے "ابلیس" کے نام پر ایسے مظالم نہیں کئے

ہوں گے جیسے ان "مقلد مسیح" کے ہاتھوں "خدا" کے نام پر روا رکھے گئے۔

حسد کی وجہ سے مخالفت | بات یہودیوں کی طرف سے نبی اکرمؐ کی مخالفت کی ہو رہی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت ابراہیمؑ کے دو بڑے بیٹے تھے۔ حضرت اسحقؑ

اور حضرت اسماعیلؑ۔ یہودی (بنی اسرائیل) حضرت اسحقؑ کی اولاد سے تھے اور نبی اکرمؐ حضرت اسماعیلؑ کی ذریت سے۔ یہودیوں کو حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت سے شروع ہی سے کد تھی۔ اس سے پہلے نبوت اور حکومت بنی اسرائیل کے ہاں چلی آرہی تھی، لیکن ظہور نبی اکرمؐ سے، یہ دونوں العبادت خداوندی (نبوت اور حکومت) بنی اسماعیل کی طرف سے منتقل ہو گئے۔ یہودی اس سے بہت برا فروختہ تھے اور حضور نبی اکرمؐ کے خلاف معاندت اور مخالفت کا جذبہ محرک ان کا یہی حسد تھا۔ اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:

﴿۴۴﴾ اَمْ يَحْسَدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ۚ

اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کے فریق مقابل (جماعت مومنین) کو اس قدر خوشگواریاں کیوں عطا کر دی ہیں؟ ان سے کہو کہ خدا کے فضل و کرم کی یہ بارش کسی قومی طرفداری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ یہ قانون خداوندی کی اطاعت کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی طرح، اس سے پہلے، خود ان کے اسلاف، یعنی آل ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت عطا ہوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک عظیم مملکت بھی۔

کتاب و حکمت اور عظیم مملکت | آپ غور کیجئے۔ کتاب و حکمت تو خاصہ نبوت تھی، لیکن ان کے ساتھ انہیں ایک عظیم مملکت بھی عطا ہوئی تھی۔

اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین، عمل شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اور دین کی عملی شکل کو اسلام کہتے ہیں۔

اس کے بعد کہا کہ آل ابراہیمؑ اب دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو نبوت محمدیہؐ پر ایمان

لا کر جماعت مومنین میں داخل ہو چکا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔

﴿۴۵﴾ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝

(۴۵)

اُسی آل ابراہیمؑ میں ایک گروہ وہ ہے جو اس ضابطہ خداوندی پر ایمان لے آیا ہے (لہذا، اس کی برکات سے

متمتع ہو رہا ہے) اور دوسرا گروہ وہ ہے جو اس کی طرف نہیں آیا۔ ان کی غلط روش، ان کی سعی و کاوش کو نذر آتش

کر رہی ہے۔ اور یہ (بجائے اس کے کہ صحیح راہ اختیار کر کے ان خوشگوار یوں میں برابر کے حصہ دار ہو جائیں)

جل نہیں کر، ان سے حسد کرتے ہیں۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں کا مال مزید وضاحت سے بیان کر دیا۔ فرمایا:

﴿۵۴﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ط كُلَّمَا تَفَجَّتْ
جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ط
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (۵۴)

ان سے کہہ دو کہ جو لوگ بھی قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں گے وہ تباہ و برباد ہو کر رہیں گے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک دفعہ مقابلہ کے لئے اٹھیں گے تو انہیں ایسی شکست ملے گی جس سے ان کی قوت ٹوٹ جاسکے گی۔ یہ پھر قوت فراہم کر کے سامنے آئیں گے اور پھر شکست کھائیں گے۔ اس طرح پیہم شکستوں اور ناکامیوں سے ان کی سختی اور شدت، قوت اور صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ ایسا ہو کر رہے گا، اس لئے کہ خدا کا قانون مکافات، بڑی قوتوں کا مالک اور اپنی جگہ محکم ہے۔ سنکھیا کھانے والا ہلاکت سے کیسے بچ جائے گا؟

تبدیلی جلود کا مفہوم | ہم نے تبدیلی جلود کا جو مفہوم اوپر درج کیا ہے، اس کا تعلق اس دنیا میں سزا و تخریبی اعمال کے نتیجہ سے ہے۔ آخر وہی زندگی میں اس عذاب کی کیا شکل ہوگی، اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ ویسے جنت اور جہنم کے بیانات نمثیلی ہیں۔ (دیکھئے اُنڈکس میں عنوانات جنت اور جہنم)۔

الْجِلْدُ (جمع جُلُودٌ) کے عام معنی کھال کے ہوتے ہیں، لیکن اس مادہ کے بنیادی معنی قوت اور سختی کے ہیں (دیکھئے لغات القرآن)۔ اس نہج سے ہم نے مفہوم میں اس سے مراد مخالفین کی قوت کا ٹوٹ جانا لیا ہے۔ یہ ایک گروہ تھا۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا:

﴿۵۵﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط لَهُمْ فِيهَا أَنْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ز
وَسَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ۝ (۵۵)

اس کے برعکس، جو لوگ ہمارے قانونِ حیات کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو وہ ایسی شاواہیوں کی زندگی بسر کریں گے جو کبھی پڑمردہ نہیں ہوں گی۔

اور ان کے رفقاء، جو انہی کی طرح پاکباز ہوں گے، سب اس جنتی زندگی میں شریک ہوں گے اور انہیں خدا کی حفاظت اور ساری عاطفت نصیب ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس دنیا میں یہ جنتی زندگی، اس نظام خداوندی کی رُو سے حاصل ہوگی جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں قائم ہوگا۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت کے متعلق فرمایا:

﴿۴۸﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّواْ الْاَمْنَٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعَمًا يَّعِظُكُمْ بِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ (۴۸)

اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ یہ عظیم ذمہ داریاں انہی کے سپرد کی جائیں جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے اچھی طرح اہل ہوں۔ انہیں نا اہلوں کے سپرد نہ کرو۔ یہ ذمہ داریاں، درحقیقت نظام خداوندی کی امانتیں ہیں جن میں کبھی خیانت نہیں ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جب تم لوگوں کے معاملات میں فیصلہ دو، تو یہ فیصلہ عدل کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جو حکومت (فیصلے کرنے کی مشینری) عدل کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یاد رکھو! یہ بڑی اہم بات ہے جو تم سے کہی گئی ہے۔ امور حکومت کو سہ انجام دیتے وقت ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ جب کوئی اور سننے والا نہ ہو، اس وقت بھی ایک سننے والا، اور جب کوئی اور دیکھنے والا نہ ہو، اس وقت بھی ایک دیکھنے والا (اللہ) موجود ہوتا ہے۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ ”عدل“ کے معنی ہیں الحق (کتاب خداوندی) کے مطابق بلا دروغایت فیصلے کرنا۔ (۴۸)

امانات اور عدل کا مفہوم | اُمْنٰتِ کا مفہوم مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۶۴ (آیت ۱۲۸) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے مراد وہ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جو کسی کے سپرد کی جائیں

لہذا نظام خداوندی کے قیام و استحکام کی شرط اول یہ ہے کہ مملکت اور معاشرہ سے متعلق ذمہ داریاں اُن لوگوں کے سپرد کی جائیں جو ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ اسلامی مملکت میں ارباب حل و عقد کے سپرد اقتدار اور اختیارات نہیں کئے جاتے۔ اُن کے سپرد اُمْنٰت کی جاتی ہیں۔ ایمان کا مادہ بھی (ایمان اور مومن کی طرح) اُمْنٰت ہے۔ لہذا اس ارشاد خداوندی کا مقصود یہ ہوگا کہ یہ فرائض اُن لوگوں کے سپرد کئے جائیں تاکہ افراد معاشرہ امن و اطمینان کی نیند سو جائیں۔ انہیں کسی قسم کا خوف، خطرہ یا خدشہ نہ رہے۔ یہ دہنمانی (بلکہ حکم) قرآن کے لئے ہے جو

ان لوگوں کا انتخاب کریں جن کے سپرد مملکت کی ذمہ داریاں کی جائیں۔ اب رہے وہ جن کے سپرد یہ ذمہ داریاں کی جائیں، تو ان سے کہا گیا کہ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ کرو (حکومت - حکمرانی کے لئے انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے، بالخصوص جلد سوم صفحہ ۹ آیت ۲)۔ اور عدل کے عمومی مفہوم کے لئے عنوان عدل۔ لیکن یہاں بات عدالتی عدل کی ہو رہی ہے۔ مروجہ مفہوم کے مطابق، جب کسی معاملہ (منقدمہ) کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق کیا جائے تو اسے عدل کہیں گے۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر وہ قانون، جس کے مطابق اس معاملہ کا فیصلہ کیا گیا ہے، ظلم پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ اس سلسلہ میں اُس نے کہا کہ عدل کرنے والے وہ لوگ ہیں اُمّۃٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهِ یَعْدِلُوْنَ ۝ (۱۸۱ ف ۱۵۹)۔ جو الحق کے مطابق دوسروں کی راہ نمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں، یعنی قرآن کریم کی رو سے عدل کے مطابق وہ فیصلہ ہوگا، جو الحق کی رو سے کیا جائے، اور الحق خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے (۳۳ ف ۵/۳۸ ف ۲۸)۔ یہ درجہ ہے جو قرآن کریم خدا کے سوا کسی کو قانون سازی کا حق اور اختیار نہیں دیتا۔ الحق صرف خدا کے نازل کردہ قوانین ہیں اور انہی کے مطابق فیصلہ عدل کہلا سکتا ہے۔



اس کے بعد وہ آیہ جلیلہ سامنے آتی ہے جو نظام خداوندی (یا اسلامی مملکت) کا عروۃ الوثقی ہے اور جس کا غلط مفہوم امت کی تمام اختلاف انگیزیوں اور تفرقہ بازیوں کا موجب ہے۔ اور وہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ (۵۹)

اس آیت کا مروجہ ترجمہ اور صحیح مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اس پس منظر کو دیکھئے جس میں اس آیت نے بنیادی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

اس وقت تک قرآن کریم کا جتنا حصہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس سے آپ نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا ہوگا کہ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ حکومت یا اطاعت صرف خدا کی ہے۔ اُس کے سوا کسی کی نہیں۔ یہی الدین کی لم ہے۔ یہی الاسلام کی غایت ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی خدا پر ایمان کا مقصد اولین ہے۔

قرآن کا سیاسی نظام | لیکن خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اُس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے

آنا تو ایک طرف، وہ ہمارے قیاس و خیال، گمان و وہم سے بھی ماوراء ہے۔ اس سے سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس کے لئے اُس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیت، میری اطاعت یا محکومت ہوگی۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹ زیر آیت (۲/۱۱۱) گذر چکی ہے۔

اگر اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہوتا، تو شریعت اپنے اپنے طور پر کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت کر لیتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم - صفحہ ۲۱۳ - زیر آیت ۲/۱۱۱) اس لئے کتاب اللہ کی اطاعت، اجتماعی نظام کی رُو سے کی جاسکتی ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اُس مملکت یا حکومت کی اطاعت ہوگی جو قرآن مجید کے احکام و اصول و اقتدار کے نافذ کرنے کے لئے قائم کی جائے۔

اس قسم کی پہلی حکومت، حضور نبی اکرمؐ نے، قائم فرمائی تھی، اور خود حضورؐ اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ اس بنا پر اس مرکزی اتھارٹی (رسول) کی اطاعت و حقیقت کتاب اللہ کی اطاعت یا، بالفاظ دیگر، خدا کی اطاعت تھی۔ اس کے لئے قرآن کریمؐ نے ”اللہ اور رسولؐ کی اطاعت“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مراد ہے اس نظام خداوندی کی اطاعت، جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا۔ چونکہ اطاعت خداوندی کے اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی قائم رہنا تھا۔ اس لئے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت تھا۔ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کو ”مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

”اللہ اور رسولؐ کی اطاعت“ | یہ حقیقت کہ اللہ اور رسولؐ سے مملکت (یا نظام خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ) مراد ہے، قرآن کریمؐ میں ایسے واضح الفاظ ہیں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی اس کے لئے قرآن مجید سے بکثرت شہادت پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگِ احد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے ان پر بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرمؐ نے دی تھی۔ لیکن چونکہ یہ بلاوا حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا، بلکہ آپؐ نے بحیثیت سربراہ مملکت یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو خدا اور رسولؐ کی آواز قرار دیا گیا۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ط
لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (۳۴)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرہ ہی پہلے وہ) زخم کھانچکے تھے، سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں، یقیناً ان کے لئے اللہ کے حضور بہت بڑا اجر ہے !

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو ”خدا اور رسول“ کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے، اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی :
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ
الْعِقَابِ ۝ (۵۹)

یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے ”اللہ اور اس کے رسول“ کی مخالفت کی ہے، اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ کا قانون رپا و دش عمل میں سخت سزا دینے والا ہے۔

۳۔ نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں :

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ
فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ
خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي
الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۵۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں خرابی پھیلانے کیلئے دوڑتے پھرتے ہیں یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ لئے جائیں۔

۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں : ”زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے سے رکھی ہو۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔“

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۶۵ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ مزا ان کے لئے ضروری ہو، انہیں دی جائے)۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب عظیم ہے

۴۔ یہاں تو ”اللہ اور رسول“ کے خلاف جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ سورہ احزاب میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ⑤ (۳۳-۵۹)۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے، اور خدا کی لعنت اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ اور رسول سے مراد رسول اللہ کی ذات لی جائے تو اس سے بڑی پیمیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ کو اذیت پہنچانے کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے، کیونکہ آپ ایک انسان (بشر) تھے، اور ایک انسان ریا انساؤں کا گروہ (دوسرے انسان کو اذیت پہنچا سکتا ہے۔ رسول اللہ کو اذیت پہنچانے کا ذکر قرآن مجید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے)۔ لیکن اللہ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسے کون اذیت پہنچا سکتا ہے؟ اس لئے اس آیت میں ”اللہ اور اس کے رسول“ کو اذیت پہنچانے سے مقصد نظام خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

۵۔ اب آگے چلیئے۔ جب نظام حکومت کے قیام کے بعد، سب سے پہلا اجتماع عظیم (حج اکبر) ہوا، تو اس میں اس حکومت کی طرف سے کچھ عام اعلانات کئے گئے جن میں بتایا گیا کہ اس حکومت کی پالیسی اور امور خارجر میں مسلک کیا ہوگا۔ اس ضمن میں جو سب سے پہلا اعلان کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے:-

بَوَّأَعُوذُ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ⑥ (۹)

(اے پیروان دعوت ایمانی!)

جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الزمہ ہونے کا اعلان ہے۔

مفسر تیسری آیت میں ہے:

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ إِنَّ اللَّهَ بَرِئٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ⑦ وَرَسُولُهُ فَإِنْ تُبْتُمْ فَلَهُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَ بَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ⑧ (۹)

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی (یعنی ان میں اور نظام خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم راب بھی ظلم و شرارت سے باز آ جاؤ تو تمہارے لئے اس میں بہتری ہے اور اگر نہ مانو گے تو جان رکھو، تم نظام حکومت خداوندی کو عاجز نہیں کر سکتے، اور (اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں، انہیں عذاب دردناک کی خوش خبری سنا دو۔“

پھر ساتویں آیت میں ہے :

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا
الَّذِينَ عَاهَدُوا عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَهُمْ
فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (۹)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (مدینہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا اور انہوں نے اسے نہیں توڑا، تو ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں، تم بھی ان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

اللہ اور رسول سے مراد مرکز نظام اسلامی ہے | غور کیجئے۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے، اور اسی حکومت کے نمائندہ کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے تھے، لیکن انہیں اللہ اور رسول کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس تبیان حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نکتہء ماسکہ کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسول کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں، اس لئے کہ یہ نظام حکومت خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دین کے غلبہ، لیکن اور حزب اللہ کی کامیابی و ظفر مندی کے متعلق متعدد مقامات پر وعدے کئے ہیں۔ اس غلبہ اور کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسول کی کامیابی ہے:

كَتَبَ اللَّهُ لَا غَلِبَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ رَسُولِهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۵۸)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسول ہی غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوت و غلبہ والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ و تسلط اسلامی حکومت ہی کا تسکین و تسلط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے۔ لہذا اللہ اور

رسول کے غلبہ سے مراد نظام اسلامی کے غلبہ ہی سے ہے۔ جب مسلمانوں کی مملکت قائم ہوگئی (جسے حکومت خداوندی یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس حکومت کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ مملکت کی آمدنی تھی، اسے بھی قرآن کریم نے ”خدا اور رسول“ کی دولت کہہ کر پکارا ہے۔ (۱۰۱)۔ مالی غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ خمس (پانچواں حصہ) ”اللہ اور رسول“ کے لئے الگ کر لو۔ (۱۰۵) ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی ہے کہ یہ پانچواں حصہ، امور مملکت کی سرانجام دہی کے لئے صرف کیا جائے گا۔

یہ حقیقت کہ ان مقامات میں اللہ اور رسول سے مراد نظام خداوندی یا اسلامی حکومت ہے، میری اختراع نہیں۔ متقدمین اور متاخرین کے ممتاز مفسرین نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے۔ میں ان کے اقتباسات درج کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ (میں اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھنا چلا آ رہا ہوں، بالخصوص ”اسلامی نظام“ اور ”اسلام میں قانون سازی کا اصول“ نامی کتابچوں میں۔ طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۹ء میں، علامہ اسلم جبر جبروی کے محققانہ مقالہ ”اسلامی نظام“ میں بھی متقدمین کے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں۔



ان نشریحات کی روشنی میں، آیت زیر نظر (۱۰۵) کی طرف آئیے۔ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ اس سے پہلی آیت (۱۰۴) میں بات نظام حکومت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت میں اس نظام کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا ہے۔ کوئی حکومت بھی ہو، اس میں ایک تو اس کی مرکزی اتھارٹی (سنٹرل گورنمنٹ) ہوتی ہے، اور دوسرے اس کے افسران ماتحت (عمال حکومت)۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ“۔ یعنی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی بھی اطاعت کرو، اور اس کے افسران ماتحت کی بھی۔ اس کے بعد ہے: ”فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ“۔ اگر تم میں اور ان افسران ماتحت میں اختلاف ہو جائے تو اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو۔ پوری آیت کا مفہوم حسب ذیل ہوگا:

بیزیر بھی ضروری ہے کہ تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو، جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے، رسول نے قائم کیا ہے۔ اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگان حکومت (افسران ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسران ماتحت میں، کسی بات میں اختلاف ہو جائے، تو اس کے لئے مرکز کی طرف

رجوع کرو۔۔۔ یعنی افرانِ ماتحت کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو، جو اس تنازعہ کا، قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ (۴۲/۱ و ۵۸/۱)۔

مرکزی اتھارٹی کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ، آخری ہوگا۔ اور چونکہ وہ فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا، جس پر تم ایمان رکھتے ہو، اس لئے اس فیصلہ کو بطیب خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرائی محسوس نہ کرو۔ (۴۵/۱)

یہ شہادت ہوگی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطہ ہدایت، اور قانونِ مکافاتِ عمل، اور حیاتِ اخروی پر یقین رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ، اور انجام کار معاشرہ کا صحیح صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہوگی۔

بعد میں کیا ہوا؟ | جب تک اسلامی نظامِ حکومت قائم رہا، اس آیت کا یہی مفہوم یا جاتا رہا۔ حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ ”تم پر میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کا اتباع لازمی ہے“ تو اس سے

یہی مراد تھی۔ خلفائے راشدینؓ، کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ جب تک اسلامی نظام قائم رہا، اس کے سربراہ خلفائے راشدینؓ کے لقب سے سرفراز رہے۔ یہ سوء اتفاق ہے (اور امت کی حراماں نصیبی) کہ یہ سلسلہ معدودے چند تک قائم رہا۔ بعد میں جب یہ نظام، ملکیت میں بدل گیا، تو اس آیت کے مفہوم میں دشواری پیش آگئی۔ نظامِ ملکیت میں امت میں شمولیت پیدا ہو گئی۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں آ گئے، اور امورِ شریعت، علماء کی تحویل میں۔ اس شمولیت کی رو سے، اس آیت کے معنی یہ کئے گئے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی۔ اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی اور اربابِ حکومت (أُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ) کی۔ اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کے رفع کرنے کے لئے حضراتِ علماء کرام کی طرف رجوع کرو تا کہ وہ بتائیں کہ اس باب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا کیا حکم ہے۔ علماء کا فیصلہ تمہارے (عوام) اور حکومت دونوں کے لئے قولِ فیصلہ ہوگا۔

تجلیا کر بیسی | باد تلے تدبیرِ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ اس سے آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آ گیا، اور چونکہ وہ اپنے فیصلے کو ”اپنا فیصلہ“ قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے ”خدا اور رسولؐ کا

فیصلہ“ کہہ کر صادر کرتے تھے۔ اس لئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے مرزبانی کر سکے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم خدا اور رسولؐ کے نام پر مٹنے کے لئے ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے ایسی تجلیا کر بیسی وجود میں آگئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات (مذہبی پیشوائیت) نے کسی حکومت کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جب تک حکومت ان کے ساتھ ساز باز رکھتی، یہ اس کے ہر فیصلے کو خدا اور رسولؐ کا فیصلہ

قرار دیتے۔ جو نبی اس سے کوئی اختلاف ہوتا، یہ خدا اور رسول کے نام پر عوام کو اس کے خلاف اٹھ کھڑا کرتے یہی کچھ آج تک ہو رہا ہے۔



لیکن ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حضرات ”طِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ“ میں دو الگ الگ اطاعتیں بتاتے تھے۔ ایک اللہ کی اطاعت، اور دوسری رسول کی اطاعت۔ ”اللہ کی اطاعت“ کے لئے تو قرآن مجید کو دیا لیکن دشواری یہ پیش آئی کہ رسول کی اطاعت کس طرح کرائی جائے؟ اس مقصد کے لئے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے پڑے۔ یہ بات قارئین کے لئے شاید نئی ہو، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ **رسول کی اطاعت احادیث کی رو سے** مختصر لفظ میں ”احادیث“ کی تاریخ سامنے لائی جائے۔ (یہ تاریخ اور احادیث سے متعلق دیگر مباحث ادارہ طلوغ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ”مقام حدیث“ میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ذیل میں انہیں اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ رسول اللہ نے اس کی کتابت کرائی۔ حفاظ کو یاد کرایا۔ انہیں عود سنایا، ان سے سُنا۔ اور حجتہ الوداع کے خطبہ میں اعلان کیا۔ ”میں تم میں خدا کی کتاب چھوڑ چلا ہوں۔ اس کا اتباع کرتے رہو گے، تو گمراہ نہیں ہو گے۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے کسی اور چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اس نے نہ تو احادیث کو جمع کرایا، نہ ان کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ اور نہ ہی ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسول کا اس باب میں کیا طرز عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے، اس لئے کہ احادیث نبی اکرم کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ جزو دین نقیب تو جس طرح آپ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سُنا، توہرایا، اور ہر طرح سے اطمینان فرمایا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے، احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ منصب رسالت کا یہی تقاضا تھا۔ اور بحیثیت رسول حضور کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں امت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضور نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا، احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا برعکس اس کے خود کتب احادیث میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضور نے فرمایا کہ

لَا تَكْتَبِرْ عَنِ الْقُرْآنِ - وَمَنْ كَتَبَ عَنِ الْقُرْآنِ فَلْيَسْحَ - (صحیح مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو جس نے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز لکھی ہو اُسے مٹا دے۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرمادی تھی کہ وہ چاہیں تو حدیث لکھ لیا کریں لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اثبات ہو گا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی، اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر، اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں، اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا تو قرآن کریم کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی! یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا تو لفظ لفظ یا دکر لیا جاتا تھا اور پھر اُن سے سن لیا جاتا تھا اور اس کی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کسی نے کچھ احادیث اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو امت کے لئے وہ سند نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ نبی اکرمؐ ان احادیث کو سن کر ان کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے، اور انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر کے اُمت کو نہ دے جاتے اور پھر وہی احادیث قرآن کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمائیے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو نہ ہوتیں تو کیا رسول اللہؐ ان کی حفاظت کا کچھ انتظام بھی نہ کرتے؟

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلمبند ہونی چاہئیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

۱۔ پندرہ سو صحابہؓ کے نام (ایک جسطرہ میں)

۲۔ مکتوبات گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و امراء کو لکھے۔

۳۔ چند تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

۴۔ کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔ ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُن کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی وہ بعد میں اپنی اصلی شکل میں

کہیں موجود رہیں۔ لہذا رسول اللہؐ نے جو کچھ امت کو دیا تھا وہ صرف قرآن تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے امت کو نہیں دیا۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے امت کے لئے کیا چھوڑا ہے، تو آپؐ نے کہا کہ مَا تَرَكَ إِلَّا مَا بَيَّنَّ الدَّفْتَيْنِ۔ یعنی حضورؐ نے قرآن کریم کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔

(اُردو ترجمہ جلد سوم صفحہ ۲۰۔ عربی بخاری جلد سوم کتاب فضائل القرآن صفحہ ۱۴۳)

حضور نبی اکرمؐ کے بعد صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ کا عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ صحابہ کا عمل

مسند امام احمدؒ میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا۔

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہؐ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے تب ایک دن رسول اللہؐ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب ہے (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے)۔ پھر فرمایا دستھری کرو۔ خالص رکھو (اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو۔ صحابیؓ کہتے ہیں) کہ نبی ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا۔ پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔ (تدوین حدیث ص ۲۴۹)

امام ذہبی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جیں میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہیئے کہ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو۔ اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی بحوالہ تدوین حدیث ص ۳۲۱)

۱۔ ہم نے ذیل کی روایات کو مولانا مناظر حسن گیلانی (مرحوم) کی کتاب ”تدوین حدیث“ سے اقتباس کر کے لکھا ہے تاکہ ان کی صحت کے متعلق کوئی اعتراض نہ کیا جاسکے۔

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے رسول اللہؐ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت عدیؓ) اکبرؓ بہت زیادہ کرٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ کرٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خیر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپؐ چین ہو رہے ہیں۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا) جب صبح ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: میں! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس نسخہ کو جلادیا۔ (تذوین حدیث - ص ۸۸-۲۸۵)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے، علامہ ابن عبد البرؒ نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ عمرؓ بن خطابؓ نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہؐ کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوالی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

(تذوین حدیث ص ۳۹۴)

اور یہ اس لئے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ حدیث کو جمع اور مدون نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے چنانچہ طبقات میں ہے کہ :-

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہو گئی تو آپؐ نے لوگوں کو قہیں دے دے کہ حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیئے۔ تب آپؐ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ (طبقات - جلد ۵ ص ۱۴۱) (تذوین حدیث)

یعنی حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے

انہیں جلایا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قصیں دے دے کر، ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذر آتش کر دیا۔

یہ کچھ دار الخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کے متعلق حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

عمرؓ ابن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کر لیا جائے۔ مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلمبند کرنا ان کا مناسب نہ ہوگا۔ تب الاحصار (یعنی چھادینوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو، چاہیے کہ اسے محو کر دے۔ یعنی ضائع کر دے۔

(جامع بیان العلم۔ جلد ۷ ص ۶۵) (تدوین حدیث ص ۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے ”قرن اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعت حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امر انفاقی نہیں، بلکہ معنی بر مصلحت ہے“ انہوں نے اس سے پہلے امام ابن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے تمام تک، اور شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے، ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

(تدوین حدیث ص ۲۱۶)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ و دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

یہ ہے کیفیت صحابہ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی۔ یعنی۔

۱۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

۲۔ صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور پر لکھی تھیں، انہیں انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔

۳۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے مدون کردہ مجموعہ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے ایک مائتہ غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدون نہیں کرنی چاہئیں۔

۵۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

۶۔ اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوتی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے۔ اور

۷۔ یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا۔ بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں ایسا دیدہ و انتہ کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قزاع بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو

مزید شدت

عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جانتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دڑے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابو درداءؓ اور ابو مسعودؓ انصاریؓ کو کثرت روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ ان تمام روایات کے لئے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ، ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محل نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشاء قرآنی اور عمل رسول اللہؐ کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر ہمیں یہ داخلی شہادت نہ بھی ملتی تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافت راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعہ احادیث نہیں ملا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا ان کی زیر نگرانی مدون کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات رضی اللہ عنہم، احادیث کو دین کا جزو سمجھتے، تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا انتہام فرما دیا تھا، خلافت کی زیر نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد، خلافت راشدہ میں بھی جمع و تدوین حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

علمائے حدیث کو بڑی تحقیق و کاوش کے بعد پہلی صدی ہجری کا ایک مجموعہ صحیفہ ہمام ابن منبہ | احادیث ملا ہے جو صحیفہ ہمام ابن منبہ کے نام سے متعارف ہے اس صحیفہ کو چند سال ادھر، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا تھا، امام ہمام ابن منبہ

کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس صحیفہ میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں جن کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے استاد حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے لکھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی تھی۔ لہذا اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ ۵۸ھ سے پہلے کا مرتب شدہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ امام ہمام ابن منبہ ۵۸ھ سے پہلے، مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور انہیں صرف ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں۔ اور تیسری صدی ہجری میں جب امام بخاریؒ احادیث جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں چھ لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ اور امام بخاریؒ ابن معین کو بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں) نیز حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد کے مجموعہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔ بہر حال پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر احادیث جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی۔ اس کا حاصل، صحیفہ امام ہمام ابن منبہ کی ایک سواڑ تیس احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔

اس کے بعد ۳۱ھ کے قریب خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ احادیث اپنے طور پر جمع کرائیں۔ ان کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) نے خلفائے بنی امیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعہ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار لگا۔ لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدون صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود رہا۔ البتہ بعد کی کتب احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا۔ جب لوگوں کو قرونِ اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان تصانیف کا مسالہ (MATERIAL) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمٹایا اور صرف انہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری صدی ہجری میں بعض حضرات نے ان باتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جو عام طور پر مروج نہیں اور جنہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے۔

کے معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے، امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس زمانے میں مدینہ میں ارکان اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتب احادیث مدون ہوئیں۔ عہد عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتب احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتب احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم ہیں) امام بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب کہا جاتا ہے۔ کتب احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں اہل سنت و الجماعت (سنی حضرات) صحیح ترین مانتے ہیں (انہیں صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں کہا جاتا ہے) واضح رہے کہ شیعوہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ وہ شیعوں کے مجموعوں کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی سنی ان کے مجموعوں کو قابل سند تسلیم کرتے ہیں۔

صحاح ستہ یہ ہیں :-

۱۔ صحیح بخاری -

۲۔ صحیح مسلم -

۳۔ ترمذی -

۴۔ شیعوہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسب ذیل ہیں :-

۱۔ الکافی :- جامع ابو جعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔

۲۔ من لایستضرہ الفقہ :- یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔

۳۔ تہذیب :- مؤلف شیخ ابو جعفر محمد بن حسن۔ متوفی ۴۸۶ھ۔

۴۔ استبصار :- یہ بھی ابنی کی تالیف ہے۔

ان میں سے بھی کوئی عرب نہیں۔

۴۔ ابو داؤد۔

۵۔ ابن ماجہ۔

۶۔ نسائی۔

ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے بخاری کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ۔ ان مجموعوں کے جامعین کے مختصر تعارف حسب ذیل ہے :-

۱۔ امام بخاریؒ :- یہ بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ (یا بعض کے نزدیک ۲۶۰ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شہر بہ شہر اور قریب بہ قریب پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف قریب (۷۳۰۰) احادیث کو صحیح پایا اور انہیں اپنی کتاب میں درج کر لیا۔ رافعی قریب پانچ لاکھ تیرانوے ہزار کو مسترد کر دیا۔ ان (۷۳۰۰) میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکرر رت کو شمار نہ کیا جائے تو باقی (۲۷۶۲) رہ جاتی ہیں۔ (یا ۲۶۳۰)

۲۔ امام مسلمؒ :- صحیح مسلم کے جامع امام مسلم بن حجاج تھے جو ایران کے مشہور شہر نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۲۶۱ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔

۳۔ ترمذی :- امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی۔ یہ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ سال ولادت ۲۶۹ھ اور وفات ۳۲۰ھ ہے۔

۴۔ ابو داؤد :۔ سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۵ھ میں وفات پائے۔

۵۔ ابن ماجہ :۔ ابو عبد اللہ محمد بن زید ابن ماجہ۔ یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن پیدائش ۲۰۹ھ اور رحلت کا سن ۲۴۳ھ ہے۔

۶۔ امام عبد الرحمن نسائی :- یہ مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں نساء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات ۳۲۳ھ ہے۔

ان ائمہ حدیث کے اس مختصر سے تعارف سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں :-

۱۔ یہ سب کے سب ایرانی تھے۔ ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقام حیرت ہے کہ

۷۰۰ میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اٹھایا۔ اور احادیث کی جمع و تدوین کا کام غیر عربوں (غجیبوں) کے

ہاتھوں سرانجام پایا۔

۲۔ یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

۳۔ انہوں نے لاکھوں حدیثیں پائیں لیکن ان میں سے بہت مختصری ایسی تھیں جنہیں انہوں نے صحیح قرار دے کر

اپنے مجموعوں میں درج کیا۔

۴۔ یہ تمام احادیث، لوگوں نے انہیں زبانی سنائیں۔ ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے کا موجود

نہیں تھا۔

۵۔ ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلہ کا نتیجہ تھا۔

ان احادیث کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس حد کی سند تھی (یعنی خدا نے انہیں بذریعہ وحی نہیں بتایا تھا کہ

فلاں حدیث صحیح ہے) اسے رکھ لو اور فلاں غلط ہے اسے مسترد کر دو۔ نہ ہی اس کی کوئی سند رسول اللہ نے عطا

فرمائی تھی (کہ تم نے جن احادیث کا انتخاب کیا ہے وہ فی الحقیقت میرے اقوال ہیں)۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا

کوئی تحریری ریکارڈ تھا جس سے انہوں نے ان احادیث کا انتخاب کر لیا ہو۔ لوگوں کی زبانی باتیں جنہیں انہوں

نے اپنی فراست کے مطابق، صحیح تصور کر کے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی انفرادی کوششوں کے نتیجے کے متعلق کسی طرح بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ یقینی طور

پر رسول اللہ کے ارشادات ہیں؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ اس دواڑھائی سو سال کے عرصہ میں، جو باتیں

لوگوں کی زبانی آگے منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ رسول اللہ

کے الفاظ تھے جو اسی طرح باپ سے بیٹے یا استاد سے شاگرد نے سن کر حفظ کر لئے تھے۔ ان باتوں کو ہر راوی

اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)

نہنما، یہ بھی دیکھئے کہ ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان میں سے انہوں

نے کتنی حدیثوں کو رد کر دیا | نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا:

۱۔ امام بخاری۔ چھ لاکھ بیس سے مگر رات نکال کر صرف ۲۶۶۲

۲۔ امام مسلم۔ تین لاکھ بیس سے صرف ۴۳۴۸

۳۔ ترمذی۔ تین لاکھ بیس سے صرف ۳۱۱۵

۴۔ ابوداؤد۔ پانچ لاکھ بیس سے صرف ۴۸۰۰

۵۔ ابن ماجہ - چار لاکھ میں سے صرف ۴۰۰۰

۶۔ نسائی - دو لاکھ میں سے ۴۳۲۱

ظاہر ہے کہ جب رد و قبول کا مدار جامع احادیث کی ذاتی بصیرت ہو، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان لاکھوں کے انبار میں جنہیں ان حضرات نے مسترد قرار دے دیا تھا، کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہو گئی ہوں گی۔ باقی رہا یہ کہ جن احادیث کا ان حضرات نے انتخاب کیا، ان میں کتنی حدیثیں آگئی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی حضور نبی اکرمؐ کے اقوال یا افعال نہیں قرار دیا جاسکتا اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔



ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ جمع احادیث کی یہ سب کوششیں ان حضرات کی انفرادی تھیں جنہیں خدا اور رسولؐ کی سند حاصل نہیں تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر آپؐ خیال فرمائیے کہ کیا دین بھی ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ اور نبی اکرمؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ امام بخاری اور دیگر حضرات نے ان باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی تھیں۔ اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو ”دین کا آدھا حصہ“ (معاذ اللہ) بالکل کھو چکا تھا۔ آپؐ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کا اعلان قرآن کریم میں بالتصریح فرمائے اور وہ رسولؐ گرامی جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسولؐ نے نہ آنا ہو، وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے؟ ایسا تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

یہ ہے احادیث کی کیفیت اور ان کے جمع کرنے کی تاریخ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ان احادیث کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہا جاتا کہ یہ لفظاً لفظاً حضورؐ کے ارشادات ہیں۔ ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اقوال منسوب الی الرسولؐ ہیں۔ یعنی جس زمانے میں انہیں جمع کیا گیا تھا، اس زمانے میں لوگوں میں عام طور پر مشہور تھا کہ خلائ قول رسول اللہؐ کا ہے۔ چنانچہ آج بھی کوئی حدیث درج کی جاتی ہے، اسے اس طرح لکھا جاتا ہے:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (رسول اللہؐ نے فرمایا)، اور آخر میں لکھا جاتا ہے: ”أَوْ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ“ (یوں یا جس طرح بھی رسول اللہؐ نے فرمایا ہو) یعنی کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ رسول اللہؐ

سلفہ ”آدھا حصہ“ ہی نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین کا پہلے حصہ احادیث میں ہے اور صرف پہلے حصہ قرآن میں۔

نے حتمی طور پر ایسا ہی فرمایا تھا۔

علاوہ اس کے کہ احادیث ظنی اور قیاسی ہیں، کہ ان میں بے حد اختلاف ہے۔ احادیث کی مختلف کتابوں میں ہی نہیں، ایک ہی کتاب میں متعدد احادیث ایک دوسرے کے خلاف ملتی ہیں۔ مسلمانوں میں جس قدر فرقے ہیں، ان سب کی بنیاد احادیث پر ہے کوئی کسی حدیث کا پیرو ہے، کوئی کسی کا۔ اور چونکہ ہر فرقہ اطاعت رسول اللہ کا مدعی ہے، اس لئے وہ اپنے مسلک میں ذرا سی تبدیلی بھی جائز نہیں سمجھتا کیونکہ ایسا کرنا اس کے نزدیک معصیت رسول کے مراد ہوگا۔ احادیث کے متعلق ان حضرات کے عقائد کیا ہیں، یہ بھی غور سے سمجھنے کی بات ہے۔ جمعیت اہل حدیث، پاکستان کے سابق صدر، مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ ”جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث“۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

احادیث کے متعلق عقیدہ تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عربی کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت

پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عربی کے انکار کا۔۔۔۔۔ جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مراد (ص ۴۸)

یعنی جو احادیث فرقہ اہل حدیث کے نزدیک صحیح ہیں ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار (یعنی یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ کی حدیث نہیں ہے)، کفر ہے اور ایسا کہنے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک بخاری اور مسلم، صحیحین ہیں اس لئے ان کی کسی حدیث کا انکار کفر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی احادیث پر اُمت متفق ہے۔۔۔۔۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ص ۵۵)

”امت“ سے مراد ہے فرقہ اہل حدیث۔ کیونکہ (اور تو اور) حنفی حضرات (جو اُمت کی اکثریت کا فرقہ ہے) بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔

ان احادیث کا انکار کفر کیوں ہے؟ اس کے متعلق مولانا اسماعیل مرحوم فرماتے ہیں۔

حدیث بھی وحی ہے جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل

یعنی قرآن اور حدیث دونوں وحی خداوندی ہیں اور دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اس کے لئے ایک روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر قرآن بھی نازل ہوتا ہے اور مثلہ، معہ اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز (حدیث بھی) پھر ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحی جلی (قرآن) اور وحی خفی (حدیث)۔ وحی جلی کو وحی متلو بھی کہتے ہیں (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے)۔

وحی کی دو قسمیں

اور وحی خفی کو وحی خفی غیر متلو (یعنی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) واضح رہے کہ وحی کی ان دو قسموں کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ حدیث کے اولین لٹریچر میں بھی اس اصطلاح کا کوئی پتہ نشان نہیں ملا۔ یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شب کتب (جو لکھی جاتے) اور دوسری قسم شب علقہ (جو لکھی نہ جائے، روایت آگے منتقل ہو) ان حضرات نے اس عقیدہ کو یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا، اور اسے عین دین بنا کر پیش کر دیا۔ ہم اس مقام پر اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ عقیدہ کس طرح قرآن کریم کی ضد ہے اور اس سے کس طرح دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ ہم صرف پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر حدیث بھی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل "خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی تو وحی کی حفاظت کا ذمہ تو خود خدا نے لیا تھا۔ اس وحی (یعنی حدیث) کو خدا نے محفوظ کیوں نہ رکھا (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اسے نہ پہلے رسول اللہؐ نے محفوظ کر کے امت کو دیا نہ خلفائے راشدینؓ نے اسے منضبط اور محفوظ کیا۔ نہ صحابہؓ میں سے کوئی اور اسے ضبط تحریر میں لایا۔ جس نے اپنے طور پر کچھ لکھا تھا اسے بھی جلا، یا جلوا دیا۔ اگر حدیث اور قرآن دونوں وحی تھے تو وحی کے ایک حصہ (قرآن) کی حفاظت کا وہ اہتمام اور اس کے دوسرے حصہ (حدیث) سے یہ بے اعتنائی بلکہ مخالفت کیا یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آسکتی ہے؟

حدیثیں کیوں نہ لکھی گئیں

ضمناً اس اعتراض کا جواب بھی سن لیجئے کہ حدیث اگر وحی تھی تو اسے قرآن کے اندر شامل کیوں نہ کر دیا گیا۔ مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں

کہ اگر ایسا کر دیا جاتا تو۔

اس سے قرآن مجید کم از کم انسانی کلوپیڈ یا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔

(تفہیمات - حصہ اول - ص ۲۳۶)

یعنی چونکہ اس طرح قرآن کی ضخامت بہت بڑھ جاتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وحی کے اس حصہ کو قرآن میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ بہت اچھا۔ قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کے خدشہ کی وجہ سے اسے قرآن میں شامل نہ کیا تو اسے ایک علیحدہ جلد میں کیوں نہ لکھ لیا گیا۔ تو اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کیاب تھا۔

(ترجمان القرآن - بابت مارچ ۱۹۵۷ء)

یہ جواب مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن حیدرآباد (دکن) کے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (جواب پیرس میں مقیم ہیں) اس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں وہ اپنے ایک مقالہ میں (جو کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ الاسلام کی یکم و پندرہ جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں۔

نبی اکرمؐ بہ حیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) واقعہ ہوئے تھے۔ بہ حیثیت رسول خدا انہوں نے اس امر کے لئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لئے تھے کہ خدا کا پیغام، یعنی قرآن، نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جائے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے اقوال کی حفاظت کے لئے بھی اس قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ اسے انانیت پر محمول کرتے۔ اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے۔

(طلوع اسلام - اپریل ۵۹ء - ص ۶۵)

یہ ہے اُس ”وحی“ کی کہانی جو قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل قرار دی جاتی ہے۔ جسے جبریل اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کی کم کو اور جس کے انکار سے اسی طرح کفر لازم آتا ہے جس طرح قرآن کے انکار سے یہاں للعجب۔



حدیث، قرآن سے اونچی ہے | یہاں تک تو ہم نے دیکھا ہے کہ اتنا ہی کہا جا رہا ہے کہ حدیث، قرآن کی مثل ہے۔ یعنی دونوں ہم پایہ ہیں۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام

اوزاعی کا قول ہے کہ

قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔

اور ایک اور امام حدیث، یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔

یعنی اگر قرآن اور حدیث باہم گرتعداد میں ہوں تو جو فیصلہ حدیث دے اُسے قبول کرنا چاہئے نہ کہ اُس فیصلہ کو جو قرآن دے۔

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے | انہا ہی نہیں، ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم اپنے

کتابچہ ”فتنہ افکار حدیث“ میں لکھتے ہیں۔

نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا خَصَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا مِّنَ الْوَصِيَّةِ لِمَوْلَاكَ (۲۴۰) ”تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةٌ لِّمَوْلَا بَرٍّ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تو ان سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے

قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسول، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۸۵)

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اَطِيعُوا اللَّهَ سے مراد ہے قرآن کی اطاعت اور اَطِيعُوا الْمُرْسُول کی عملی شکل ہے احادیث کی اطاعت۔ لیکن جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اطاعت کے لئے قرآن کا نام محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ اسلام تمام کا تمام انہی احادیث میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حدیث کا مقام بڑا نازک ہے۔ ایسا نازک کہ۔ نفس گم کردہ می آید جفید و بایزید اینجا۔ اس کی نزاکت کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ جب کسی بات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ اس کی بابت رسول اللہ نے یہ فرمایا ہے تو کس کی جرأت ہے کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ وہ اگر یہ بھی کہے کہ یہ بات قرآن کے خلاف ہے، تو جواب ملے گا کہ رسول اللہ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے یا تم زیادہ سمجھتے ہو؟ حالانکہ وہ رسول اللہ کے کسی ارشاد و کرامی پر (معاذ اللہ) اعتراض نہیں کر رہا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ جسے آپ رسولی اللہ کا قول کہہ رہے ہیں، وہ حضور کا قول ہو نہیں سکتا کیونکہ حضور کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔ لیکن اس کے خلاف عوام کے جذبات اس قدر بھڑک اٹھتے جاتے ہیں کہ اس پین سے فرق کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔

میں اس مقام پر اپنے دل کے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ اس حقیقت کو نوکِ فلم پر لانے کی جرأت کروں گا کہ جب تک احادیث کے مجموعوں کے متعلق وہ عقیدہ رہے گا، جو پہلے درج کیا جا چکا ہے، امت قرآن کی طرف کبھی نہیں آسکتی۔ اور جب تک یہ قرآن کی طرف نہیں آئے گی، نہ اس کے اختلافات دور ہوں گے نہ فرق پرستی ختم ہوگی، اور نہ انتشار کا خاتمہ ہوگا۔ یعنی نہ امت میں وحدت پیدا ہوگی نہ اسلامی نظام قائم ہو سکے گا، نہ اسلامی

مملکت وجود میں آسکے گی۔ اسلامی مملکت کی بنیادی شرط ساری مملکت میں ایک ضابطہ قوانین کا نفاذ ہے۔ لیکن مروجہ احادیث کی موجودگی میں اس قسم کا ضابطہ مرتب ہونا ناممکن ہے۔ مملکت پاکستان میں قانون سازی کی سعی ناکام اس کی زندہ شہادت ہے۔ اسلامی نظام کے احیاء اور امت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ احادیث کے مجموعوں کو قرآن مجید کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو روایت قرآن کے خلاف ہو، اسے یہ کہہ مسترد کر دیا جائے کہ یہ قول یا عمل رسول اللہ کا ہو نہیں سکتا۔ یہ انکار حدیث نہیں ہوگا، عمل تطہیر ہوگا تاکہ دامن ناموس رسالت ان دھبوں سے پاک اور صاف ہو جائے جنہیں غلطی سے حضور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

یہی میری عمر بھر کی پکار ہے، جس کی میں نے سزا بھگتی ہے۔

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی اب اس سے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

باقی رہا اطاعت کا عملی مفہوم، سودہ اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی سمجھ میں آسکے گا، جس میں 'قول فیصل' خدا کی کتاب ہوگا۔



اب آکے چلئے۔ آیت (۴/۶۰) میں اسلامی نظام کا مثبت پہلو سامنے لایا گیا تھا۔ یعنی احکام خداوندی کی اطاعت بوساطت نظام اسلامی۔ اب اس کا منفی پہلو سامنے آتا ہے۔ تاکہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے تقابل سے حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ فرمایا:

الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (۴/۶۰)

یہ تو سچے مومنین کا شیرہ ہے۔ ان کے برعکس، ان لوگوں کی حالت قابلِ غور ہے جن کا دعویٰ یہ ہے۔ غیر اللہ کی ملوکیت

ایمان رکھتے ہیں، لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی رو سے کریں۔ حالانکہ ان سے

کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہر غیر خدا کی قانون سے انکار کر دیا جائے۔ (۲/۲۵۶)

ان کی یہ روش اس لئے ہے کہ یہ، قانون خداوندی کے اتباع کے بجائے، اپنے مفاد پرستانہ جذبات کے پیچھے چلنا

چاہتے ہیں، حالانکہ یہ چیز انہیں راہِ راست سے بھڑکا کر کہیں کا نہیں لے جاتی ہے۔

طاغوت سے فیصلے

طاغوت کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی حکومت اختیار کی جائے، وہ طاغوت ہے، خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو یا افراد کا گروہ (مثلاً)

کوئی قانون ساز ادارہ جو قرآنی حدود و قیود کے خلاف قوانین وضع کرے۔

اس آیت میں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے منکر ہیں، یعنی کافر ہیں، اُن کی یہ حالت ہے کہ وہ غیر اللہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں ذکر ان لوگوں کا ہے جو بزعم خویش اپنے آپ کو مومن (ایمان لانے والے) سمجھتے اور کہتے ہیں لیکن عملاً حالت یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے غیر خداوندی گوشوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہ کچھ ہمارے متعلق ہی نہیں کہا گیا؟ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدیوں سے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین و احکام کی اطاعت کرتے چلے آ رہے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی کتاب کے ماننے والے بھی سمجھتے ہیں! قرآن کریم نے کفر اور اسلام کی حد امتیاز ہی یہ بتائی ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (۵)

جو لوگ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے، اُنہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر اس نے ایمان باللہ اور کفر باللہ کا فرق واضح کر دیا ہے۔ یعنی اگر

کفر باللہ طاغوت نہیں تو ایمان باللہ بھی نہیں۔ (۲۵۶)



اس طرح کے مدعیان ایمان کو وہ منافق قرار دیتا ہے۔

وَإِذْ أَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ سَرَّأَيْتَ الْمُنْفِقِينَ

يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝ (۶)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے خدا کے قانون، اور اسے عمل نافذ کرنے والے

رسول کی طرف آؤ تو، جیسا کہ (اے رسول) تم دیکھتے ہو، یہ لوگ تم سے اعراض برتنے ہیں اور معاملات کے فیصلوں

کے لئے تمہاری طرف آنے سے رکھتے ہیں۔ یہ ایمان نہیں، منافقت ہے۔ کفر ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ قرآن

کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، اُنہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ (۵)

یہاں پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق انفرادی طور پر فیصلے کرنے کا

یہ منافقت ہے

نام اسلام نہیں۔ اس کے لئے نظام خداوندی کی مرکزی انتظامی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

اس مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ ہزار برس سے ہمارے ہاں بھی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ نماز میں آمین اُچھی آواز سے کہنا چاہیے یا خفی، تراویح کی رکعت بیس ہیں یا آٹھ۔ اقبال کی اصطلاح میں یہ ”صلوٰۃ بے امام“ ہے جس میں کوئی کھڑا ہوتا ہے، کوئی رکوع میں ہے اور کوئی سجدہ ہے میں۔ سب خدا کی اطاعت کو رہے ہوتے ہیں لیکن کسی ایک کی حرکت دوسرے سے نہیں ملتی۔ صحن مسجد عجیب انتشار اور انفری کی آماجگاہ ہو رہا ہے۔ یہی حالت، بڑے پیمانے پر ”ملت بے امام“ کی ہوتی ہے۔ منافقین کے متعلق کہا:

﴿۴۳﴾ فَكَيْفَ إِذَا آتَيْنَهُم مَّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ﴿۴۴﴾ بِاللَّهِ إِنَّ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿۴۵﴾ (۴۳)

منافقین کی حالت ذرا سوچو کہ اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی، جب ان پر، ان کی اپنی کھڑکیوں کی وجہ سے، مصیبت آئے گی، تو یہ تیرے پاس، خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے اور

کہیں گے کہ دوسروں کی طرف رجوع کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ آپس میں میل ملاپ رہے اور حسن کارنامہ طور پر زندگی بسر ہو۔ ورنہ ہمارا ایمان بڑا مضبوط ہے۔

یہاں یہ لکھ کر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ مسئلہ تقدیر کو حل کر کے رکھ دیا۔ (تقدیر کے متعلق سابقہ جلدوں میں شرح و بیسط کے ساتھ لکھا جا چکا ہے) اس قسم کے لوگوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا

فرمایا:

﴿۴۳﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿۴۴﴾ (۴۳)

لیکن خدا خوب جانتا ہے کہ ان کے دل میں کیا ہے اور یہ زبان سے کیا کہتے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں (۴۳) سو تم انہیں اپنی جماعت میں شامل نہ کرو۔ ان سے اعراض برتو۔ البتہ انہیں حق و صداقت کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے رہو، اور اس انداز سے تلقین کرو کہ بات ان کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے۔ حق و صداقت کی زندگی اسی وقت بسر ہو سکتی ہے جب انسان میں واقعی انقلاب پیدا ہو جائے۔ جب تک دل نہ بدلسے، انسان کی روش نہیں بدل سکتی۔ اس وقت ایمان محض، ان کی زبان تک ہے۔ ان کے قلب کے اندر جاگزیں نہیں ہوا۔

نظام کے تابع اطاعت خداوندی کے تصور سے طرح طرح کے سوالات دل میں ابھرتے ہیں۔ اس میں انسان اور خدا کا تعلق کس قسم کا ہوتا ہے۔ مرکز نظام خداوندی (رسول) کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ افراد کا اس مرکز کے ساتھ

کس انداز کا تعلق ہوتا ہے۔ ان سوالات کا جواب بڑے بلیغ انداز میں دیا۔ فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا
[۴۴] أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ
لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا (۴۴)

مجرم۔ خدا اور رسول کا باہمی تعلق حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سلسلہ ہدایت محض نظری عقائد اور رسالت کے لئے نہیں آتا۔ نہ ہی دین، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ

تعلق کا نام ہے کہ زبان سے خدا کا اقرار کر لیا اور پھر جس طرح جی چاہا، اپنے اپنے طور پر زندگی بسر کرتے رہے۔ دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جو سب سے پہلے، خود رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے، اور اس میں، اس کی حیثیت مرکزی اتھارٹی کی ہوتی ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق، اس کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے ذہن کے مطابق ”خدا کی اطاعت“ اطاعت خداوندی نہیں کہلا سکتی۔ اس اطاعت کی عملی شکل وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ قوانین خداوندی کے ساتھ، رسول کو بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں دیکھو کہ خدا کی اطاعت، اور خدا اور بندے کے تعلق کی عملی شکل کیانتی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی سے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے، اور اس کے بعد اس پر نادم ہو، تو (خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کے نظریہ کے ماتحت) وہ اپنے گھر میں بیٹھا، توبہ کرے گا اور خدا سے معافی مانگ لے گا۔ لیکن دین کے نظام میں اس کی شکل مختلف ہوگی۔ اس میں، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ (اسے رسول) تمہارے پاس آئے اور اپنی لغزش کی سزا سے بچنے کے لئے، قانون خداوندی سے حفاظت طلب کرے (اسے معافی مانگنا کہتے ہیں)۔

یہ معافی تم، (اسے رسول) ذاتی طور پر نہیں دے سکتے۔ اس کی معافی قانون خداوندی کی رو سے ہوگی۔ اس کے لئے تم دیکھو کہ قانون خداوندی میں اس معافی کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر گنجائش ہو تم اسے معافی دے دو۔

اس معافی کا حکم اگرچہ تمہاری طرف سے صادر ہوگا، لیکن یہ درحقیقت خدا کی طرف سے معافی ہوگی کیونکہ قانون خداوندی میں اس کی گنجائش نہ ہوتی تو تم معافی نہیں دے سکتے تھے۔

فیصلہ قانون خداوندی کی رو سے ہوگا تم نے دیکھا کہ دین کے نظام میں، مجرم۔ رسول اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔ نہ مجرم، براہ راست خدا سے معافی طلب

کر سکتا ہے، نہ خدا اسے براہ راست معافی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس نظام کی وساطت سے ہوتا ہے جو قوانین خداوندی کے

نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے۔ اور جب یہ نظام اسے معافی دیتا ہے، تو یہ معافی اس نظام کی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے، کیونکہ یہ اس کے قانون کے مطابق ملی تھی۔

مفہوم سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظام یا نظام کے مرکز، یا رسول کی اطاعت بالذات نہیں یعنی یہ اس نظام کے ارباب حل و عقد کی ذاتی اطاعت نہیں۔ اس قسم کی اطاعت کا تو (خدا کے سوا) کسی کو بھی حق حاصل نہیں۔ یہ اطاعت قانونِ خداوندی کی ہے جس کا عملی ذریعہ نظامِ مملکت ہے۔ حج، مقدمہ کا فیصلہ سنا ہے، تو وہ کوئی اپنا ذاتی حکم نہیں منواتا۔ وہ قانون کی اطاعت کرتا ہے۔ ذاتی طور پر وہ نہ کسی کو مراد سے سکتا ہے، نہ معاف کر سکتا ہے وہ تو خود اس قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا خود حضور نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے ان الفاظ میں اعلان کرایا:

إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ سَابِقِي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ⑤ (۱۵)

رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں | اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں، تو اُس کے عذابِ عظیم سے بچ نہیں سکتا۔ میں اس سے خائف ہوں۔

اپنا حکم منانا تو ایک طرف، اس میں فیصلہ کرنے والے کے جذبات کا بھی کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ایک اولوالعزم نبیؐ سے کہا گیا:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ⑥ (۳۴)

اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں صاحبِ اقتدار بنایا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے الحق (قانونِ خداوندی) کے مطابق کرو، اور اسے اپنے جذبات سے متاثر نہ ہونے دو۔ یاد رکھو! یاد رکھو اس باب میں تمہارے جذبات تمہیں خدا کی راہ سے ہٹکا دیں گے۔

یہاں تک تو بات تھی فیصلہ کرنے والوں کی۔ اب ان لوگوں کے متعلق ایک بنیادی حقیقت بیان کی جن کے فیصلے نظامِ خداوندی (اسلامی حکومت) کو سے گی۔

آج دنیا کی ہر مہذب قوم میں عدالتی نظام قائم ہے، جہاں سے مجرموں کو سزائیں ملتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمام اقوام عالم شکوہ سنج (بلکہ فوج گراہی) کہ جرائم (کم ہونے تو ایک طرف) بڑھتے جا رہے ہیں! اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے بڑے بڑے کمیشن قائم ہوتے ہیں۔ تحقیقین کے مذاکرات ہوتے ہیں۔ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا بنیادی سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجرم، اپنے خلاف فیصلہ کو (خواہ

وہ فیصلہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو) اپنے اوپر ظلم اور زیادتی سمجھتا ہے۔ اس سے اس کے دل میں قانون (اور نظامِ عدل) کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اور سرکشی پر اترتا ہے اس سے جرائم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مُجْرِم کے دل میں قانون کا احترام | مجرم اپنی اصلاح اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کے دل میں قانون کا احترام ہو، اور عدالت کے متعلق یہ یقین کہ

اُس نے اس کے خلاف فیصلہ میں حق و انصاف سے کام لیا ہے۔ اس سے وہ اپنے کردار کا جائزہ لے گا، اور جو زیادتی اُس سے سرزد ہو گئی تھی اس پر نادم ہوگا۔ اس سے اصلاح کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ مجرم و سزا کا بنیادی فلسفہ ہے جسے مطالب الفرقان جلد سوم میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے (صفحہ ۱۷۱-۱۷۲)۔ قرآن کا نظامِ عدل ان ہر دو شرائط کو پورا کرتا ہے۔ یعنی قانون کا احترام اور قانون نافذ کرنے والوں کے متعلق یہ یقین کہ وہ کبھی ظلم و زیادتی سے کام نہیں لیں گے، ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

قانون کے احترام کے سلسلہ میں اُس کا پروگرام یہ ہے کہ وہ ضابطہ قوانینِ خداوندی (قرآنِ عظیم) کو تعلیم کا نصاب بناتا ہے، اور علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے یہ حقیقت متغلبین کے دلوں میں راسخ کرتا ہے کہ اس میں دیئے گئے احکام و قوانین مبنی برحق ہیں اور ان کی اطاعت سے خود اس کا بھلا ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی سے اُس کا نقصان۔ اس کے ساتھ ہی ان قوانین کے نافذ کرنے والوں کی سیرت و کردار کھلی کتاب کی شکل میں ان کے سامنے ہوتی ہے، جس سے وہ اعلیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہوگا۔

دل میں بھی کبیدگی نہیں ہوگی | اس نظامِ عدل کی رُو سے جو فیصلہ کسی کے خلاف ہوگا، اس سے اُس کے دل میں بغاوت تو ایک طرف، کبیدگی تک بھی پیدا نہیں ہوگی اور

وہ اسے دل کی انتہائی رضامندی سے قبول کرے گا۔ اس سے وہ اپنی لغزش پر نادم ہوگا اور اصلاح کے لئے کوشاں۔

یہ ہے وہ نظامِ عدل جسے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ⑤ (۴/۶۵)

یہ ہے خدا پر ایمان کا عملی مفہوم۔ لہذا، اے رسول! تم ان لوگوں کو ہمدادی طرف سے کہہ دو کہ خدا اس پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ

تم صادر کرو۔ اس کے سامنے اس طرح تر تسلیم خم نہ کرو کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرائی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (۳۳)۔ دل میں گرائی اور کبیدگی محسوس نہ کرنے کا اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ فیصلہ کسی مستند حاکم کا فیصلہ نہیں جسے طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ فیصلہ اس قانون کا ہے جس کی صداقت پر یہ، بطیب خاطر، ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس فیصلہ کو دل کی رضا مندی سے تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو تو یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ انہوں نے، اس قانون کو بطیب خاطر قبول نہیں کیا تھا۔ ان کا اس پر ایمان نہیں تھا۔ رسول، قرآن کے مطابق ہی فیصلے کرتا ہے۔ اپنی طرف سے نہیں کرتا (۳۴)۔

اصلاح کی بنیاد تغیر نفس پر ہے | آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے، اصلاح کی بنیاد تغیر نفس پر ہے (جسے وہ ایمان کہہ کر پکارتا ہے)۔ اس تغیر نفس کا نتیجہ ہے کہ

یہ حقیقت افراد معاشرہ کا جوہر ایمان بن جاتی ہے کہ ————— وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ ط (۳۵)

جو کسی کے خلاف ظلم اور زیادتی کرتا ہے، تو وہ وحقیقت خود اپنی ذات کے خلاف ظلم اور زیادتی کرتا ہے۔

اور اس سے ہمیں نیٹشے کا وہ قول یاد آ جاتا ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ

جو مجرم تم نے میرے خلاف کیا ہے، اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو مجرم تم نے خود اپنے خلاف کیا

ہے، اسے کون معاف کرے گا؟

اسے مجرم خود ہی "معاف" کر سکے گا، یعنی اصلاح خویش کے ذریعے۔

آیت (۳۵) کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کا تعلق صرف جرائم سے نہیں۔ اس کا اطلاق ہر

اختلافی معاملہ پر ہوگا۔ یعنی اسلامی نظام میں ہر اختلافی معاملہ (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کے تصفیہ کے لئے

حکومت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور دہاں کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ اس طرح امت میں

کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔ اختلاف تو (قرآن کی رو سے) خدا کا عذاب ہے۔ (۳۶)

لیکن اس ضمن میں ابھی ایک اہم سوال باقی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اگر اس فیصلہ کے خلاف کوئی اپنے دل میں گرائی

تک بھی محسوس کرے گا، تو اس کا دعویٰ ایمان باطل ہوگا۔ اسے مومن تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور اس پر خود خدا

نے شہادت دی ہے کہ اس کا ایمان باقی نہیں رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ایسا شدید جرم کیوں ہے جس سے (خود

خدا کی شہادت کے مطابق) ایمان ہی باقی نہیں رہتا؟ بات بالکل واضح ہے۔ ایمان کا نام ہے دل اور دماغ کی

کامل رضامندی کے ساتھ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور میں اس کے ہر حکم کے سامنے تسلیم خم کروں گا۔

اختلافی معاملات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ** (۴۲)۔ ”ہر اختلافی معاملہ میں خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلہ کو قول فیصل تسلیم کرو“ کتاب اللہ سے فیصلہ لینے کے لئے رسول کی طرف رجوع کرو، اور رسول سے کہا کہ **فَاُخْضِعْكُمْ بَيْنَهُمْ** **بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ** (۴۸)۔ ”ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو“

لہذا رسول (یا مرکز نظام خداوندی) کا فیصلہ درحقیقت قرآن کے حکم کا نفاذ ہوگا۔ اور چونکہ یہ شخص، قرآن پر، قلب و دماغ کی رضامندی سے ایمان لائے کا مدعی ہے، اس لئے اگر قرآن کے کسی فیصلہ کے خلاف اس کے دل میں کبیدگی پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا قرآن پر ایمان نہیں تھا۔ آیت (۴۸) میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ

۱۔ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ (۴۸) اور

۲۔ جو لوگ قرآن کے فیصلوں (سے مرتبائی تو ایک طرف ان) کے خلاف دل میں گرائی تک بھی محسوس کرتے ہیں، ان کا دعویٰ ایمان باطل ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

یہ ہے مفہوم قانون کے احترام کا۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں قانون کا احترام نہیں ہوتا، ان کا معیار مفاد طلبی ہوتا ہے۔ وہ اگر قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں تو اس کی اطاعت کرتے ہیں، اور اگر اس کی خلاف ورزی سے کسی منفعت کی امید ہوتی ہے تو اس سے فرار کی راہیں تلاش اور بہانے تراشتے ہیں۔

وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ اقْتُلُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ **وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيثًا** **وَإِذْ أَلَا تَيْنَاهُمْ مِّنْ لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا** **وَلَمَّا دَعَوْهُمْ صَرَأَطًا مُّسْتَقِيمًا** (۴۷-۴۸)

جن لوگوں کی عام معاملات میں یہ حالت ہے کہ غیر خدا کی قانون میں ذرا زیادہ فائدہ دیکھتے ہیں

تو اس کی طرف دوڑے دوڑے جاتے ہیں، اگر کہیں ایسا وقت آجائے کہ نظام خداوندی

کی خاطر انہیں جان و دینی پرے باگھر بار چھوڑنا پڑے، تو ان میں بہت تھوڑے ایسے نکلیں گے جو ان احکام کی

مفاد پرستی

تفیل کریں۔ حالانکہ اگر یہ اپنی زندگی کو اس پنج پر ڈال لیں جس کی انہیں تلقین کی جاتی ہے، تو یہ ان کے لئے ہزار خیر و برکت کا موجب ہو، اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ثبات و استقامت کا باعث بنے۔

اگر یہ ایسا کر لیتے تو انہیں، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق، بہت بڑا معاوضہ ملتا اور یہ اُس توازن بدوش سیدھی راہ پر چلتے رہتے جو انہیں زندگی کی منزل مقصود تک پہنچا دیتی۔

”مراط مستقیم“ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۴۷-۴۸-۴۹-آیت ۱/۵)

اس راستے پر چلنے والوں کو منعم علیہ بتایا گیا تھا۔ اور ان انعاماتِ خداوندی کی تفصیل بھی وہیں بتادی گئی تھی (صفحہ ۵۳-۵۴) یہاں ان سعادت مند افراد کی نشان زدگی کی گئی ہے جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فرمایا:

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۖ ﴿۱۱﴾ (۴۹)

یہ اُن لوگوں کی راہ ہے جو انعاماتِ خداوندی سے نوازے جاتے ہیں (۱۱) — انبیاء۔ صدیق۔ شہداء اور صالحین کی راہ — انبیاء جنہیں یہ قانونِ من بجانب اللہ ملتا ہے۔ صدیق، جو اس قانون کے دعاوی کو عملاً سچ کر دکھاتے ہیں۔ شہداء، جو اس نظام کے بقاء و استحکام کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور صالحین، وہ افراد معاشرہ جن کی صلاحیتیں اس نظام کے مطابق نشوونما پاتی ہیں اور وہ ان صلاحیتوں کو اس نظام کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرتے ہیں۔

لہذا، جو شخص بھی خدا و رسول کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جس طرح اوپر کہا گیا ہے، وہ مذکورہ بالا جماعتوں کا رفیقِ سفر بن

منعم علیہ حضرات کی رفاقت

جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سفرِ زندگی میں ان سے بہتر رفیق اور کون ہو سکتے ہیں۔

انبیاء۔ صدیق۔ شہداء۔ صالحین کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ اس لئے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ (دیکھئے انڈکس) آیت کا مفہوم واضح ہے۔ لیکن ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والوں کو انبیاء۔ صدیق۔ شہداء اور صالحین کی معیت نصیب ہوگی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے دعویٰ نبوت کے لئے اس آیت کو بھی بطور دلیل پیش کیا کرتے تھے، اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص خدا اور رسول کی اطاعت سے صالح، صدیق، شہید بن سکتا ہے تو وہ نبی بھی بن سکتا ہے۔ یہ دلیل اس قدر بزدلی

مرزا غلام احمد کا بے محل دعویٰ

اور قرآن کے خلاف ہے کہ اس کی تردید کے لئے جسے چڑے دلائل کی ضرورت نہیں۔ نبوت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بنادیا کہ وہ خدا کی طرف سے وہی طور پر ملا کرتی تھی۔ اس میں کسی کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا (دیکھئے اُنڈکس میں عنوان وحی)۔ لہذا نہ کوئی شخص اپنے کسب و ہنر سے نبی بن سکتا تھا، نہ کوئی کسی کو نبی بنا سکتا تھا۔ پھر اس آیت میں کہا گیا ہے کہ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ۔ یعنی انہیں ان حضرات کی معیت نصیب ہوگی۔ اور آیت کے آخری ٹکڑے نے معیت کے معانی یہ کہہ کر واضح کر دیئے: وَحَسَنَ أَوْلَٰئِكَ سُرْقِيْقًا۔ یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔“ بالفاظ دیگر انہیں ان حضرات کی رفاقت میسر آئے گی۔ اگر انبیاء کی معیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ خود نبی بن جائیں گے، تو پھر تمام صحابہ کرام کو نبی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (۴۸) اس میں وَالَّذِينَ مَعَهُ سے مراد صحابہ کرام نہیں۔ اگر نبی کی معیت سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے تھے، تو اس آیت کی رو سے جملہ صحابہ کو نبی ماننا پڑے گا

ایک قدم اور آگے۔ اگر کسی کی معیت سے انسان وہی کچھ بن سکتا ہے، تو قرآن مجید میں بیشتر مقامات میں ہے: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ وغیرہ۔ تو اس دلیل کی رو سے، صابرین وغیرہ کو (معاذ اللہ) خدا تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان تصریحات کی رو سے واضح ہے کہ انسان جو کچھ اپنی محنت سے بن سکتا ہے، وہ کچھ بننے کا امکان ہر ایک کے لیے ہے۔ لیکن جو کچھ انسان خدا کی طرف سے وہی طور پر بنتا ہے، وہ کچھ اپنی سعی و کاوش سے نہیں بن سکتا۔ صدیقی اور شہداء بن جانے کے متعلق (۵۱) میں تصریح موجود ہے۔ اور صالحین، مومنین کی لازمی خصوصیت ہے۔ خود نبی بن جانے یا کسی کو نبی بنا دینے کا تو تصور قرآن سے نہیں ملتا۔

لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے دعاوی کی بحث اب داستان پارینہ بن چکی ہے، کیونکہ پاکستان میں ان کے متبعین (قادیانی اور لاہوری، دونوں کو) دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا ہے۔ نظری طور پر جو حضرات اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت“ کا مطالعہ فرمائیں۔



اس کے بعد ان انعامات خداوندی کے متعلق کہا کہ

ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝ (۵۲)

ان حضرات کی معیت اور رفاقت اللہ کی عنایت اور فضل ہے جسے ایمان و اعمال صالح کی رو سے حاصل کیا جاسکتا

یہ یونہی نہیں کہا جا رہا۔ علم خداوندی کی رو سے کہا جا رہا ہے جس کے بعد کسی اور سند اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی اسے یاد رکھو کہ خدا اور رسول کی اس طرح اطاعت سے کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا۔ وہ صرف صدیق و شہید

و صالح بن سکتا ہے (اُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ ۝۵۴)

لیکن ان حضرات کی معیت اور نوازشات خداوندوں سے نفع، تفریح کے لئے نہیں۔ اس سے بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا ملخص یہ ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخْذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوا جَبِيعًا ۝۵۵

اس نظام کے استحکام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تم اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان، ہر وقت تیار رکھو۔ اور عند الفور جنگ کے لئے نکلو۔ انگ انگ ٹولیوں میں، یا سب کے سب اکٹھے۔ جیسا بھی حالات کا تقاضا ہو۔



اور یہ کوئی نیا پروگرام نہیں۔ ہر نبی اس مقصدِ عظیم کو لے کر آتا رہا، اور رہا، انہوں کی جماعت اُس کی معیت میں میدانِ کارزار

میں سرفروشانہ انداز سے لڑتی رہی۔ (۵۵) اور مفاد پرست بھی اس طرح نقاب پوشانہ ان کے ہمرکاب رہے:

وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيَبْتَغِيَ ۖ فَإِنْ أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا قَدْ أَنْعَمَ

اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُنْ مَعَهُمْ شَهِيدًا ۝۵۶ وَلَٰكِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللَّهِ

لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يُّلَيْتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ

فَأَقْوَ زُفُورًا عَظِيمًا ۝۵۷ (۴۳-۴۲)

اور (ہم جانتے ہیں) کہ تم میں اگلا دکا ایسا بھی ہے جو جنگ کی آواز پر (مختلف بہانوں سے) منافقین کی حالت

خود بھی سستی کر کے پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسروں کو بھی سست بنا دیتا ہے۔ پھر

اگر ایسا ہو کہ اس جنگ میں تمہیں نقصان پہنچے تو کہتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے اور اس کا احسان کہ میں ان کے ساتھ

نہ گیا، ورنہ مجھ پر بھی یہ مصیبت آ جاتی۔

اور اگر تمہیں بفضلِ خدا، کامیابی نصیب ہو تو کہتا ہے کہ اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تاکہ ان

کا مرانیوں میں، میرا بھی برابر کا حصہ ہوتا۔

یہ اس قسم کی باتیں یوں کرتا ہے گویا، اس میں اور تم میں کبھی کوئی تعلق اور رابطہ ہی نہ تھا۔ (حالانکہ یہ

تمہاری جماعت کا فرد ہونے کا مدعی ہے!)

ان کے برعکس جماعتِ مومنین ہے:

﴿۴۷﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۸﴾

یہ درحقیقت وہ لوگ ہیں جو مفادِ عاجلہ کو مستقبل کے مفاد پر، اور اپنی طبعی زندگی کو آخرت کی حیاتِ جاوداں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جماعتِ مومنین ہے، کہ جب دنیاوی زندگی کے کسی تقاضے اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہوتا ہے، تو وہ اول الذکر کو قربان کر دیتے ہیں اور مستقل قدر کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، چاہئے کہ وہ (بلا کسی حیل و حجت کے) اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اس میں دونوں طرح فائدہ ہے۔ اگر انہیں کامیابی ہو جائے تو بھی اجرِ عظیم اور میدانِ جنگ میں مارے جائیں، تو بھی صلہٴ جزیل اس سے واضح ہے کہ غازی اور شہید دونوں یکساں مدارج کے مستحق ہیں۔



اس کے بعد وہ آیہ جلیلہ سامنے آتی ہے جس میں ایک ایسی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے جس کی مثال دُنیا سے مذاہبِ باعالم و انش و بنیش میں کہیں نہیں ملتی۔

خدا نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا کیا | اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم ایک فقرہ میں بتاؤ کہ قرآن نے وہ کون سی ایسی حقیقت بیان کی

ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی اور جو عالمِ انسانیت میں عظیم انقلاب آفرین ہے، تو میں پلا تاملِ جواہرِ دوں گا کہ قرآن نے انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کیا ہے۔ یہی اس کی تعلیم کا نقطہٴ ماسکہ اور اس کے پیغام کی انقلاب آفرین ہے۔

آپ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے، ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں انسان کی جو حالت تھی، اقبالؒ نے اس کا نقشہٴ الفاظ میں کھینچا ہے:

نابود و ناکس و نالود و مند و زیر دست	بُود و انسان، درجہاں انسان پرست
بندھا و در دست و پاؤ گرو نش	سلطنتِ کسریٰ و قیصر دہز نش
بہر یک نچیر صد نچیر گیر	کاہن و پاپا و سلطان و امیر
نغمہ ہا اندر نئے او خون شدہ	از غلامی فطرت او دہول شدہ

احسن تقویم | قرآن کریم نے سب سے پہلے تخلیقِ انسان کے متعلق کہا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ

تَقْوِيَةٍ ۝ (۹۵) - ”یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت — تقویم — میں پیدا کیا“ ”اَحْسَنَ“
 حَسَن سے ہے اور اس (احسن) سے اگلا درجہ کوئی ہو نہیں سکتا۔ پھر اسے ”مُسْجِدٌ مَّلاَئِكَ“ قرار دیا۔ (۲۴/۲) -
واجب التکریم | اسے واجب التکریم بنایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۲۱/۲۹) ، اور اسے اپنی
 بیشتر مخلوق سے افضل قرار دیا: وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا
 تَفْضِيلًا ۝ (۲۱/۳۰)

یہ خصوصیات ہی کچھ کم باعثِ شرف و اجباء نہیں لیکن ان سب سے اوپر ایک ایسی خصوصیت ہے جسے ہم نے
 بلند ترین مقام اور انقلابِ آفرین مقام کہہ کر پکارا ہے۔ اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنا رفیق قرار دیا ہے
خدا کا رفیق | لہذا قرآن کریم کی رو سے انسان اور خدا کا تعلق رفاقت کا ہے۔ فرمائیے: اس سے بلند مقام
 کسی کے تصور میں بھی آسکتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں مختلف طرق و انداز سے بیان کیا گیا ہے۔
 خدا کا تخلیقی پروگرام کچھ اس انداز کا ہے کہ جس شے کی تخلیق مقصود ہوتی ہے، اُس کا خاکہ یا پلان (PLAN) عالم
 امر میں مرتب ہوتا ہے، (عالمِ امر و خلق کی تفصیل جلد اول میں آچکی ہے) اس میں اس شے کی آخری منزل (یعنی جو کچھ اُس نے
 آخر الامر بنانا ہوتا ہے، اس منزل) تک پہنچنے کی صلاحیت اور اس صلاحیت کو بردے کار لانے کے قوانین اور
 اصول (جنہیں وہ کلمات اللہ کہہ کر پکارتا ہے) سب متعین کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسے عالمِ خلق میں لایا
 جاتا ہے، اور اس کا آغاز نقطہ اولیں سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ارتقائی منازل طے
ارتقائی منازل | کرتی، اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل الیغاً
 ہوتے ہیں۔ سورہ السجدہ میں ہے:

يَذَبِّرُ الْاَمْوَ مِنْ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يُعْرِجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مُّقْدَرًا
 اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۳۲)

(اللہ تعالیٰ، عالمِ امر میں طے شدہ اسکیم) کا آغاز اُس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے
 ارتقائی مدارج طے کرتی، آہستہ آہستہ بتدریج اُس منزل تک جا پہنچتی ہے جو خدا نے اُس کے لئے متعین

۱۔ یہ جو ہمارے ہاں انسان کو ”اشراف المخلوق“ کہا جاتا ہے، تو یہ صحیح نہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ یہ بیشتر مخلوق سے افضل ہے۔ کیا
 معلوم کہ اس حدود و فراموش کائنات میں کہاں کہاں اور کس کس قسم کی مخلوق ہے، جن میں سے بعض، انسان سے بھی افضل ہیں۔

کیا تھا۔ ان ارتقائی مراحل کی مدت تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال، (بلکہ بعض اکیسوں کے سلسلہ

میں پچاس پچاس ہزار سال) ہوتی ہے۔ (۳۲)

ماہرینِ علم ارتقاء (EVOLUTION THEORY) بتاتے ہیں کہ اشیائے کائنات ہمیں جس حالت میں آج نظر آتی ہیں انہیں اس منزل تک پہنچنے کے لئے کثیر التعداد مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ ان مراحل میں سے ہر ایک مرحلہ کی مبعاد لاکھوں، کروڑوں سال کی تھی۔ اقبالؒ کی حسین و جمیل تشبیہات کے مطابق:

سکوتِ شام سے تانغہ سحر کا بھی ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نسیمِ شبی
کشاکشِ نرم و گریا تب و تراش و تراش ز خاکِ تیرہ درون تا پر شیشہ جلی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید میانِ قطرہٴ نیکسان و آتشِ غبی

اس میں اصول ارتقاء یہ مضمون ہے کہ ہر مرحلہ سے گزرنے کے بعد، وہ شے پہلے سے بہتر اور برتر ہو جاتی ہے۔

مغان کہ وادہٴ انکور۔ آبِ می سازند ستارہ می شکند، آفتابِ می سازند

(بانگِ درا — ارمغان)

اور یہ سلسلہ ارتقاء بدستور جاری و ساری ہے۔

گماں بر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغان ہزار بادۂ ناخودہ در درگِ تاک است

قرآنِ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ان اشیاء کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ خدا کے قانون ارتقاء کے مطابق نہایت طویل المیعاد عرصوں میں آگے بڑھتی اور بلند ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اس طریقِ عمل (PROCESS) کے ساتھ انسان کی رفتار شامل ہو جائے، تو ہزار ہزار سال کے وہی مراحل، انسانی حساب و شمار سے دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ سورہ فاطر میں اس عظیم حقیقت کو ان معجزانہ الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا: اَلَيْسَ يَضَعُ الْكَلِمَ الطَّيِّبَ - (۳۵) ”خدا کے مقرر کردہ خوشگوار نظریاتِ حیات، جن میں بار آور کی صلاحیت مضمون ہوتی ہے، اپنے زورِ دروں سے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے اور اٹھتے چلے جاتے ہیں“ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۶) ”لیکن اگر انسان کے اعمالِ صالح ان کے دست و بازو بن جائیں، تو وہ نہایت تیزی سے اوپر کو اٹھ جاتے اور اپنے نتائجِ بلند کر دیتے ہیں“ خارجی کائنات میں انسان کی مشاطگی سے گیسوئے کائنات کس طرح سنورتے اور اس حسن میں کس قدر نکھار پیدا کرتے ہیں، اقبالؒ نے اسے (پیامِ مشرق میں) اپنے مخصوص انداز میں ”محاربہ مابین خدا اور انسان“ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ (گو یا) انسان کے تخریبی کارناموں پر اسے ملعون کرتے ہوئے اُس سے کہتے ہیں:

جہاں راز یک آب و گل آفریدم تو ایران و آتا روزنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم تو شمشیر و تیغ و تنگ آفریدی

تیر آفریدی نہالِ چمن را

تقص ساختی طائرِ نغمہ زن را

اس کے جواب میں انسان کہتا ہے کہ (حضور! اگر جان کی ان پائوں تو) عرض کروں کہ

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم! سفال آفریدی، ابلاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راز آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیام مشرق صفحہ ۱۳۲)

ہاں جبریل میں انداز اور بھی شوخ ہو گیا ہے جہاں کہا کہ حضور!

قصور وار، غویب الدیار ہوں لیکن ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے وہ دشتِ سادہ، و ورا جہاں بے بنیاد

مقامِ شوق ترے قدیوں کے بس کا نہیں انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

❦

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے ”کلم الطیب“ خوشگوار، بار آور، نظریات حیات مقرر کئے ہیں، اسی طرح انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے لئے بھی اس قسم کے قوانین اور نظریات متعین کئے ہیں۔ ان نظریات اور اصول حیات کو اگر ان کے حوالے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ تہہ بہ تہہ ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسان کی رفاقت شامل ہو جائے تو وہی نتائج چند دنوں میں سامنے آ جاتے ہیں۔ نظامِ خداوندی (قرآنی نظامِ مملکت) کا قیام اسی رفاقت کا دو سر نام ہے۔ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے انسان جن زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، خدا کے نظریاتِ زندگی نے انہیں توڑنا تو تھا، لیکن اس کے لئے بڑا باعزتہ و درکار تھا۔ ظہورِ نبوتی سے جب انسانی اعمالِ صالح ان نظریات کے دست و بازو بنے تو یہ زنجیریں دنوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اس لئے بعثتِ نبوتی کا مقصد یہ بتایا:

وَيُضَعُّ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَاَلَا غُلْلَ الَّذِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۖ (۱۵۷) - ”وہ (رسول) ان بوجھل سلوں کو

اُنار پھینکے گا جس کے پیچھے انسانیت دہی چلی آ رہی تھی۔ اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جس میں وہ جکڑی ہوئی تھی، اقامتِ نظامِ خداوندی کا پورا پروگرام، اسی مقصد کا حصول تھا۔ یہ خدا اور بندے کی رفاقت کا پروگرام تھا۔ جماعتِ مومنین کا اپنے مال اور جان کو خدا کے ہاتھ بیچ دینا (۹۱) اس رفاقت کا عملی ثبوت تھا۔ یعنی اس سے پہلے جو مقاصد، براہِ راست خدا کے ہاتھوں بروئے کار آنے تھے، وہ اب انسانی دست و بازو کی وسعت سے حاصل ہوئے تھے۔ قرآنِ کریم میں اس رفاقت کی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن اس کی تین تیریں مثالیں اس آیت میں سامنے لائی گئی ہیں جس کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے یہ تمہید پیش کی گئی ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیشتر آبادی اگرچہ وہ ہنوز تھی معدود سی، مدینہ چلی گئی، اور وہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی جس کی وجہ سے وہ ہر انسانی استبداد سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ آبادی مکہ میں رہ گئی اور قریش نے انہیں اپنے بے پناہ ستم و استبداد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان مجبور و مقہور، بے دست و پا مظلوموں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے خدا سے فریاد کرتے کہ وہ انہیں ان ظالموں کے نیچے ستم سے رہائی دلائے۔ خدا قادر مطلق ہے اس کے اہل مدینہ کی پکار

لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے کیا کیا، اسے غور سے سنئے۔ اُس نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اهْلُهَا
وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۖ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (۹۲)﴾

”اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ تم سن نہیں رہے کہ مکہ کے کمرور و ناتوان مرد، عورتیں، بچے ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں۔ اور ہمارے لئے اپنی جناب سے کوئی محافظ نگران، کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔“

غور کیجئے! مکہ والے پکار تو رہے ہیں خدا کر، اور خدا اہل مدینہ سے کہہ رہا ہے کہ تم سننے نہیں کہ وہ مظلوم تمہیں کس درد و سوز سے پکار رہے ہیں۔ تم ان کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں!

صدرِ اول کے مومنین کی جس قدر رائیاں تھیں وہ اس غرض سے لے گئیں جسے خدا نے، اپنے رفیق ہونے کی جہت سے، اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہاں بات تو اہل مکہ کی نسبت سے کی گئی ہے، لیکن یہ حکم عام ہے۔

مظلوم کوئی بھی ہو، اور اس کی آواز کہیں سے بھی کیوں نہ اُٹھے، اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ ان مظلوموں کی امداد کے لئے اُٹھے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ صدرِ اول کے مجاہدین نے جس قدر لڑائیاں لڑیں، وہ خدا اور بندے کی اس رفاقت کا نتیجہ تھیں۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی سب سے پہلی جنگ غزوہ بدر کے سلسلہ میں کیا ہے کہ اسی جنگ میں نظر تو یہی آ رہا تھا کہ تم مخالفین کو قتل کر رہے تھے لیکن: فَلَمَّ تَفْتَلَوْهُمْ وَلَحِجَّ اللَّهُ قَتْلَهُمْ (۱۲)۔ ”تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، انہیں تیر خود خدا چلا رہا تھا“ (یوں سمجھ لو) خود خدا قتل کر رہا تھا۔ وَمَا سَمِيتَ وَلَحِجَّ اللَّهُ مَرَحِيًّا (۱۳)۔ ”اور کے خلاف تو تیر تو تمہاری کمانوں سے نکل رہے تھے، لیکن وہ حقیقت وہ تیر خدا خود چلا رہا تھا“ یہ بھی رفاقت کی گہرائی۔

غالب نے اس حقیقت کو ایسے عمیق لیکن سبید و لکش انداز میں بیان کیا ہے کہ میرے نزدیک، نعت کی دنیا میں، اس بہتر انداز شاید ہی کہیں اور ملے۔ اُس نے کہا ہے کہ

تیر فضا ہر آئینہ در ترکش خن است اما کشاد آں ز کمان محمد است

یہ ٹھیک ہے کہ فضا کے تیر خدا کے ترکش میں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تیر اپنے ٹھکانے پر اسی صورت میں لگتے ہیں، جب وہ محمد کی کمان سے نکلیں۔ خدا کی فضا کے تیر اور محمد کی کمان — جب یہ دونوں یک جا ہوں تو پھر باطل کا جگر چھتا ہے۔

بیعت رضوان ایک قدم آگے بڑھئے۔ کشاکش حدیبیہ میں ایک ایسا نازک مقام آ گیا تھا جب حضور کو جماعتِ مومنین سے، خدا کے ساتھ باندھے ہوئے (جان سپردگی کے) عہد (۹) کی تجدید کرنی پڑی اُس زمانے کے طریق کے مطابق ایک مجاہد آنا۔ اپنا ہاتھ حضور کے سامنے رکھنا۔ اور حضور اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر اُس عہد کی توثیق فرما دیتے۔ اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يَبَايِعُونَ اللَّهَ طِبْدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۱۴)

اے رسول! یہ مجاہدین جو تجدید عہد کے لئے تیرے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں، تو یہ معاہدہ تیرے ساتھ نہیں ہوتا، خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ توثیق عہد کے لئے جو تیر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے، تو وہ تیرا ہاتھ نہیں ہوتا۔ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اقبال نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین، کار کشا، کار ساز

یہی تھا انسان اور خدا کا باہمی رفاقت کا تعلق جس کی یاد حضور نبی اکرمؐ نے اپنی حیات ارضی کے آخری سال میں یہ کہہ کر تازہ کی تھی کہ بل هو الرفیق الاصلی۔ اُس رفیقِ اعلیٰ کی طرف حضورؐ نے اس رفاقت کے تعلق میں بھی ”خدا کو رفیقِ اعلیٰ“ قرار دے کر کسی عظیم حقیقت کا اظہار فرمایا ہے!

صدرِ اوّل کے بعد | صدرِ اوّل میں خدا اور بندے کی رفاقت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد ہماری بد نصیبی نے اسے ختم کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد خدا کے حیات بخش نظریات (کلم الطیب) معطل ہو کر رہ گئے؟ نہیں۔ خدا کے نظریات کبھی معطل نہیں ہوتے۔ انہوں نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ ہم اپنی کوتاہ نگہی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس کے بعد اسلام ایک عضوِ معطل بن گیا تھا۔ یہی نہیں۔ ہم اس سے بھی زیادہ گہرے فریب میں مبتلا ہیں۔ آج کل اسلام کے سلسلہ میں جو کوششیں عام طور پر ہو رہی ہیں۔ انہیں ”احیاء اسلام“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ احیاء اسلام یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام (معاذ اللہ) مُردہ ہو چکا تھا، ہم اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کس قدر گمراہ کن ہے یہ تصور! اسلام نام ہے خدا کے متعین فرمودہ نظریاتِ حیات کا جواب دی اور غیر متغیر رہی۔ وہ خدا کے زندہ کے فرمودہ نظریات ہیں جو زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اب رہا یہ کہ یہ نظریات اس انداز سے اپنے نتائج کیوں نہیں پیدا کر رہے جس انداز سے انہوں نے صدرِ اوّل میں برآمد کئے تھے! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہماری رفاقت نہیں رہی۔ اس وقت وہ کائناتی رفتار سے ہلک حرام ہیں۔ ہماری رفاقت اُن کے شامل حال ہو جائے تو یہ پھر اُس برق رفتاری سے اپنے نتائج سامنے لے آئیں گے۔

حقیقت کہ یہ نظریات کائناتی رفتار سے عالمِ انسانیت پر اثر انداز ہو رہے ہیں، ہماری خوش فہمی نہیں۔ اس چودہ سو سال کی تاریخِ انسانیت اس کی شاہد ہے۔ میں اس موضوع پر مختلف مقامات پر بڑی کثرت سے لکھ چکا ہوں، اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا جو ”سیلم کے نام خطوط“ کی تیسری جلد سے ماخوذ ہیں۔ اس میں، میں نے کہا تھا:

لے ایک پمفلٹ۔ کیا اسلام ایک چلہ بٹوا کار تو ہے؟ اپنے اختصار کے باوجود برا معلومات افزا ہے۔

اسلام ہی آگے چل رہا ہے

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملکیت عین فطرتِ انسانی کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور یہ تصور

دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اُس وقت ذہن کے لئے یہ تصور نامانوس تھا۔ آپ سوچئے کہ اس کے بعد اس نیرہ سو سال میں، ذہنِ انسانی کا دُخ ملکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ ”اسلام قبول

کرتا“ چلا گیا ہے، اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

علامی

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرے کا جز و لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ۔ اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جاسکتا۔ قرآن کریم نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں و اجیب الشکریم ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنالینا کبیر خلافتِ انسانیت ہے۔ اُس وقت کے ذہنِ انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو ناقابلِ قبول سمجھا۔ لیکن غور کیجئے کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابلِ قبول سمجھایا اپنے قدیمی تصور کو؟

نسل پرستی

ذہنِ انسانی کا اُس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہے نہ کہ انساباتِ نسبی سے۔ اُس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے نا آشنا پایا۔ لیکن دیکھئے کہ اُس زمانے کے بعد زمانے نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا؟

شخصیت پرستی

اس زمانہ میں ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ اس لئے ہیرودشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تصور ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئید یا دجی کی بنیاد پر تشکیل ہوگی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اُس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے نا آشنا پایا، اس لئے اسے مسترد کر دیا۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ کیا آج تمہارے زمانہ کا دُخ اس رد کردہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

سرمایہ پرستی

اُس زمانے میں جاگیر داری، زمین داری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے یہ انقلاب اُگیز تصور پیش کیا کہ ہر فردِ انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشو و نما

ہے، اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا۔ اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اُس زمانے سے اس تصور کو ٹھکرا دیا، لیکن اب سوچئے کہ کیا زمانہ اس ٹھکرے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب اور بے چسپ نہیں ہے؟

اُس زمانے میں مختلف خاندانوں، قبیلوں، قوموں کا تو تصور تھا، لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن کریم نے آکر کہا کہ نوع انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کا نظام حکومت ایک ہو۔ یہ بات اُس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی۔ لیکن دیکھئے کہ اس کے بعد دنیا کا رخ عالمگیر انسانیت کی منزل کی طرف رہا، یا انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف ہے؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہیں تو (میری کتاب) ”انسان نے کیا سوچا“ میں سیاسیات سے متعلق باب ملاحظہ فرمائیں۔ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی نیشنلزم کے بعد مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رخ کیا۔ لیکن چند ہی قدم چلتے کے بعد نیشنلزم نے محسوس کر لیا کہ یہ راستہ بھی انہیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر، عالمگیر انسانیت (UNIVERSALISM) اور تمام دنیا میں واحد حکومت (ONE WORLD GOVERNMENT) کی طرف آرہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں۔ (یہ بنیاد قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ انسانیت کس طرح پیکار پیکار کر اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے کہ

ہر گناہی جہاں رنگ و بو آنکھ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اور ابہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است



”خدا اور بندے کی رفاقت“ کے تصور سے ہی اس اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے جو آج کل عام طور پر زبان زدِ خلعت ہے۔ غلط معاشرہ میں جب مظالم کا شکار انسان دیکھتا ہے کہ اس کے مصائب کا کہیں سے مداوا نہیں ملتا، تو وہ دل کے انتہائی کرب کے ساتھ پیکار اٹھاتا ہے کہ خدا کہیں موجود ہے تو وہ ان ظالموں کی کھائی کیوں نہیں مرنے والا؟ اُس نے انہیں کبھی کیوں دے رکھی ہے کہ وہ ہم کمزوروں اور ناتوانوں پر ظلم پر ظلم کرتے چلے جائیں۔

مساب کا خاتمہ نظام خداوندی کے ہاتھوں ہوگا | یہ اس لئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون عدل، انسانی نظام رفاقت کے

ہاتھوں بروئے کار آتا ہے اور آج کی دنیا میں وہ نظام رفاقت کہیں موجود نہیں۔ وہ نظام موجود ہو تو مظلوم کو خدا سے دعا کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ اس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا تھا جب کہا تھا کہ خدا نے مجھے منصب خلافت اس لئے تفویض کیا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اُس تک نہ پہنچنے دوں۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ تمہاری ہر مشکل کا حل بہم پہنچاؤں اور ہر ضرورت کو پورا کروں۔ اس لئے، اول تو تم میں سے کسی کو اپنی کسی مشکل کے حل کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اور اگر کسی وجہ سے اسے اس کی ضرورت لاحق ہو جائے تو اس کی ضرورت میں پوری کروں گا اور اس طرح اُس کی دعا کو خدا تک پہنچنے سے روک لوں گا۔ یہ ہے خدا اور بندے کی رفاقت سے عالمگیر انسانیت کی مشکلات کا حل۔



ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلامی مملکت کو جنگ کس مقصد کے لئے کرنی پڑتی ہے — دنیا بھر کے مظلوموں کی داد رسی کے لئے — اس کے برعکس، اقوام عالم جنگیں اپنے اپنے مفاد کی خاطر لڑتی ہیں۔ اس حقیقت کو اگلی آیت میں بیان کر دیا جب کہا کہ

جنگ کا مقصد | الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿٩٠﴾

بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور جنگ دو فریقوں میں ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کون کس مقصد کے لئے جنگ کرتا ہے۔ ایک جنگ دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہوتی ہے۔ اسے ”اللہ کی راہ میں“ جنگ کہا جائے گا۔ دوسری جنگ مظلوموں اور کمزوروں کا گلہ گھونٹنے کے لئے ہوتی ہے یہ ”طاغوت کی راہ میں“ جنگ ہے۔ (طاغوت ہر وہ قوت یا نظام ہے جو قوانین حق و صداقت سے سرکشی اختیار کر کے، دنیا میں اپنی من مانی کرے)۔

ایمان والے ہمیشہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ کفار، طاغوت کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ سوائے جماعتِ مومنین! تم اُن قوتوں کے خلاف جنگ کرو جن کا مقصد قوانین حق و عدل سے سرکشی اختیار کرنا ہے۔

اور اس کا یقین رکھو کہ یہ لوگ تمہارے خلاف کتنی ہی خفیہ تدبیریں اور سازشیں کیوں نہ کریں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جو تدبیریں ظلم و استبداد کے لئے کی جائیں، ان میں قوت کہاں سے آسکتی ہے؟ ریت کی بنیادوں پر قلعے تعمیر نہیں ہو کر تے۔

یہاں فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کا مفہوم واضح ہے۔



اسلامی نظام ایک دن میں قائم نہیں ہو جاتا۔ اس کا پہلا مرحلہ تعلیم و تربیت، یعنی اگلے مرحلہ کے لئے ٹریننگ کا ہوتا ہے جہاں پنچکھ طاغوتی قوتوں سے تصادم ہوتے ہیں۔ دین کو مذہب سمجھنے والے اس مرحلہ تک تو بہت خوش ہوتے ہیں اور جماعت کا سانچہ دیتے ہیں، لیکن جب اگلا مرحلہ آتا ہے تو عذر تراشیاں اور بیاناں سازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

نماز روزے تک اسلام جنگ سے گریز | اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ
كُفُّواْ اَيْدِيَكُمْ وَاَقِمُوا

الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ
عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَا اٰخَرُ تَنَّا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۖ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰ ۚ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۲۷﴾ (۴/۲۷)

تم ان لوگوں کی حالت پر غور کرو کہ جب "اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کے نظام کا ابتدائی دور تھا، جس میں اس تصور کو تعلیم و تربیت کے لئے نظری اور انفرادی طور پر پیش کیا جاتا تھا، اور کسی سے ٹکراؤ کی شکل پیدا نہیں ہوتی تھی، (تو یہ لوگ کس مستعدی کا ثبوت دیتے تھے۔ یوں نظر آتا تھا کہ وقت آنے پر یہ اپنا سب کچھ اس نظام کی خاطر قربان کر دیں گے)۔ لیکن جب امتحان کا وقت آیا، اور انہیں جنگ کا حکم دیا گیا، تو ان میں سے ایک گروہ کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ فریقِ مقابل کے اپنے ہی جیسے انسانوں سے یوں ڈرنے لگ گئے جیسے اللہ (کے قانونِ مکافات) سے ڈرنا چاہئے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ۔ اور کہنے لگے کہ کیا اللہ اتنے یہ جنگ ہم پر کیوں فرض قرار دے دی؟ اسے کچھ وقت کے لئے اور ملتوی کیوں نہ رکھا (تا کہ ہم کچھ اور دنیاوی مفاد حاصل کر لیتے) ان سے کہو کہ طبعی

زندگی کے مفاد، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، آخر وہی زندگی کے مقابلہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مستقبل کے مفاد کس قدر خیر و برکت لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کے معاوضہ میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو مذہب پرست طبقہ کے لئے عرفِ مرحلہ اول رہ جاتا ہے۔ مرحلہ دوم حکومت کا ذمہ قرار پا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں (یعنی تمام دنیا کے مسلمانوں میں) صدیوں سے یہی تقسیم جاری ہے۔ آپ نے خود اپنے ہاں (پاکستان میں) دیکھا ہوگا۔ میدانِ جنگ میں صرف حکومت کی فوجیں گئی تھیں۔ مدعیانِ مذہب، نوافل پڑھنے افانہیں دیتے اور دعائیں مانگنے میں مصروف رہتے تھے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے تو موت کا خطرہ ہوتا ہے اور موت کے تصور تک سے ان کی جان جاتی ہے۔ ان کے اس خدشہ کے سلسلہ میں کہا کہ

﴿۴۸﴾ اَيْنَ مَا تَكُونُوا يَدْرِكَكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ ط
(۴۸)

موت بہر حال آئے گی | باقی رہا یہ خیال کہ میدانِ جنگ میں جانے سے موت آجائے گی۔ سو موت کو تو بہر حال آنا ہے۔ اگر تم نہایت محکم اور مضبوط قلعوں کے اندر بھی ہو

وہ (ایک دن) وہاں بھی آکر رہے گی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو کیوں ترجیح نہ دی جائے۔ طبیعتی موت ایک بے اختیار عمل ہے، اور حق کی خاطر جان دے دینا، عملِ با اختیار۔ اس میں راز حیات ہے۔

ہم نے دانتہ اس آیت کا آدھا حصہ اوپر درج کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اگر اس کے باقی ماندہ حصہ کے الفاظ کو سلی طور پر لیا جائے تو اس سے بہت بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ حصہ یہ ہے: وَ اِنْ تُصِيبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ط (۴۸) ”اُن کی کیفیت یہ ہے کہ جب انہیں کوئی کامیابی ہوتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اس میں اس رسول کے حسن تدبیر کا کیا دخل ہے۔ ہمیں یہ سب خدا کی طرف سے مل رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ رسول کی غلط تدبیروں کا نتیجہ ہے۔“ فرمایا: قُلْ كُلُّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط (لفظی ترجمہ اس کا یہ ہوگا)۔ ”اُن سے کہو کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔“ اس کے بعد کہا کہ فَمَالِ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيثًا ط (۴۸)۔ ”یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ اعتراض کئے جاتے ہیں اور اصل بات کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔“ اصل بات یہ ہے کہ

﴿۲۹﴾ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنْ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

(۴/۲۹)

(۱) اے رسول! تم اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں سے کہو کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کامیاں اور خوشگوریاں تمہیں نصیب ہوتی ہیں، وہ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، اور جو نقصانات تمہیں پہنچتے ہیں، وہ سب تمہارے اپنے کاموں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ایک بظاہر تضاد کا حل | ہم نے جس پیچیدگی کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ سامنے آگئی۔ آیت (۲۹) میں کہا گیا ہے کہ نفع ہو یا نقصان، رنج ہو یا راحت — كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ

سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور آیت (۳۰) میں کہا گیا کہ کامیاں اور خوشگواروں تو خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، لیکن ناکامیاں اور نقصانات تمہارے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے ہیں۔

(نظر بظاہر) ان دونوں میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ تضاد عدم تفقہ کا نتیجہ ہے۔ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ

حَدِيثًا۔ اگر غور و فکر سے بات کو سمجھا جائے تو ان میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ ان آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ

۱۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونی مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ، برے

کام کا بُرا نتیجہ۔ لہذا اس اعتبار سے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ — كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ —

مفہوم اس کا یہ سمجھنا چاہیے کہ سب کچھ خدا کے قانونی مکافاتِ عمل کی رو سے ہوتا ہے۔

۲۔ اس قانون کی رو سے ہوتا یہ ہے کہ جو کام ہدایتِ خداوندی کے مطابق کیا جائے، اُس کا نتیجہ خوش گوار

ہوتا ہے۔ — مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنْ اللَّهِ — اور جو کام اس کے خلاف کیا جائے، اُس کا

نتیجہ نقصان رساں — — — — — وَأَمَّا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ — — — — — (۴/۳۰)

اس سوال کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اب رہا یہ سوال کہ ان تصادمات میں بعض اوقات جماعتِ مومنین کو بھی کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے حالانکہ

وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہوتے ہیں، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت کے

عالمگیر انسانیت کا مفاد | پیش نظر اپنا مفاد ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی کلی منفعت ہوتی ہے جس کی خاطر

یہ بطیب خاطر رزمگاہوں میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔ لہذا یہ ایک بڑی منفعت

کے لئے چھوٹے نقصان کو اپنی رضامندی سے برداشت کرتے ہیں اُن کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں
عام لوگوں کے سامنے صرف مفاد و خویش ہوتا ہے۔ رسول کے پیش نظر عالمگیر انسانیت کا مفاد کل۔ وَ أَسْرُ
سَلْسَلَتِكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ط وَ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَرِيْدًا ۝ (۷۹)

اقبال ان ہر دوزاویہ ہائے نگاہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

عقل خود بین غافل از بہود غیر سود خود بیند، نہ بیند سود غیر
وحی حق بیند سود ہمہ در نگاہش سود و بہود ہمہ (اقبال)

اور رسول چونکہ قوانین خداوندی کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کرتا ہے، اس لئے اس پروگرام کی اطاعت
در حقیقت اطاعت خداوندی ہوتی ہے:

۷۸. مَنِ يُطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلٰٓى فَمَا اَسْرَسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ
خَفِيْظًا ۝ (۷۸)

رسول کی اطاعت، خدا کی اطاعت کا مفہوم | لہذا جو شخص اس رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ

اور جو شخص (اپنے مفاد کی خاطر) اس سے روگردانی کرتا ہے، تو وہ اس کا نتیجہ خود بھگتے گا۔ (اے رسول!) تمہارا
کام یہ نہیں کہ تم انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح گھیر گھیر کر، باڑے میں روکے رکھو تا کہ یہ تباہیوں سے محفوظ رہیں۔
(انہیں، اپنے لئے خود فیصلہ کرنے دو۔ اس نظام میں وہی لوگ شامل رہ سکتے ہیں جو دل کی رضامندی سے اس کی
اطاعت اختیار کریں)

بطیب خاطر اطاعت اور مصلحت خویش کے لئے اطاعت میں بڑا بنیادی فرق ہوتا ہے:

۷۸. وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۖ فَاِذَا اَبْرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآٓئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ
تَقُوْلُ ۗ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ تَوَكَّلْ عَلٰٓى اللّٰهِ ط
وَ كَفٰٓى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝ (۷۸)

منافقین کی حالت | جو لوگ اپنی مصلحت کی خاطر تمہارے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں (اور یوں ان کی اطاعت
دل کی رضامندی سے نہیں بلکہ، اپنی منفعت کی خاطر ہوتی ہے)، ان کی بھی یہ
کیفیت ہوتی ہے کہ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اطاعت قبول کی، لیکن جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو

رائوں کو چپکے چپکے ان باتوں کے خلاف مشورہ کرتے ہیں جو تم کہتے ہو (اور جی میں سمجھتے ہیں کہ اس کا کسے تیر چل سکتا ہے؟ حالانکہ خدا کا قانون مکافات، ان کی تمام باتوں کا ریکارڈ محفوظ رکھتا ہے۔

سو تم ان لوگوں سے قطع نظر کرو، اور قانونِ خداوندی کی محکمیت پر کامل اعتماد کرتے ہوئے، اپنے پروگرام پر کاربند رہو۔ یہ قانون تمہارے لئے کافی کارساز ثابت ہوگا۔

انسانی جذبات اور وحیِ خداوندی میں فرق کیا ہوتا ہے، اسے باسانی سمجھا جاسکتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ إِنَّ طَوْكَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝﴾ (۴/۸۲)

(ضمناً) ان لوگوں کی اس روش سے غور و تدبر کرنے والوں پر، یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ انسان جذبات اور ضابطہ خداوندی میں کیا فرق ہے؟ انسانی جذبات کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ ابھی کچھ کہتے ہیں، ابھی کچھ دن کو کچھ کرتے ہیں، رات کو کچھ زبان پر کچھ ہوتا ہے، دل میں کچھ۔ لیکن خدا کا ضابطہ قوانین (قرآن) ہے کہ اس میں کہیں، کوئی بات ایک دوسرے کے خلاف نہیں ملے گی۔ یہاں سے وہاں تک ایک ہی حقیقت ہے جسے مختلف پہلوؤں سے سامنے لایا گیا ہے۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کا کلام ہوتا، تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ یہاں قرآن کے منجانب اللہ تعالیٰ کی ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ کوئی باہمی تضاد نہیں۔ لیکن یہ

بات تدبر فی القرآن ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ سطح میں نگاہوں سے دیکھنے والوں اور بد باطن ذہنیت رکھنے والوں کو اس میں بکثرت تضادات نظر آئیں گے۔ تضاد اور مخالف نہ قوانینِ فطرت میں ہے، نہ کتاب اللہ میں۔

اس سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آگئی۔ اور وہ یہ کہ جو قوم قرآن کا اتباع کرے گی، اس میں باہمی اختلاف اور تفرق نہیں ہوگا۔ اگر کسی قوم میں باہمی اختلاف ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ قرآن کی متبع نہیں۔ قرآن کے اتباع کا دعویٰ اور فرقہ بندی، (باہمی تفرق) خدا کے اس دعویٰ کو جھٹلاتا ہے کہ اس میں اختلافات نہیں۔ اتباع قرآن کی تو محسوس شہادت، امت کی وحدت ہوگی۔ اس سے سوچ لیجئے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔

یہ اختلافات اسلامی نظام ہی میں دور ہو سکتے ہیں ایک امت، ایک ضابطہ قوانین، اور تمام معاملات میں قولِ فیصل کے لئے ایک مرکزی اتھارٹی ہوتی ہے۔ اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اسلام ہے۔ اس کے برعکس:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ كُنُوزُهُمْ غِنًى لِّئَلَّا يَقْبَضَهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۴/۸۳)

ہر افواہ کو تحقیقاتی مرکز تک پہنچاؤ

ان کا دعویٰ اطاعت کوش کی یہ کیفیت ہے کہ جب یہ کہیں سے امن یا خوف کی کوئی اڑتی ہوئی بات سن پاتے

ہیں، تو اسے بے دھڑتے ہیں اور خوب پھیلانے ہیں۔ حالانکہ نظام سے وابستگی اور اطاعت کا تقاضا ہے کہ ایسی باتوں کو رسول و مرکزی اتھارٹی یا اپنے افسران یا تحت تک پہنچایا جائے، تاکہ وہ لوگ جو بات کی نہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لیں۔

یہ تو اس نظام خداوندی کی برکات و رحمت ہے کہ ان لوگوں کی اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ اور سازشانہ حرکات سے تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو تم میں سے اکثر اس قسم کی افواہوں کے پیچھے لگ کر تباہی لے آتے ہیں۔

اس کی تشریح آیت (۴/۵۹) کے تحت تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد قرآن پھر اس موضوع کی طرف لوٹ آیا جس کے لئے فرمایا:

تَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسُكَ وَنَجِّ مَنِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ عَسَى اللَّهُ أَن يَكْفِكَ بِأَسَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ۝ (۴/۸۴)

سورہ (سورہ) اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ لوگ تمہارا سانحہ دیتے ہیں یا نہیں،

نظام خداوندی کے قیام و بقا اور مظلومین کی امداد و حفاظت کے لئے، مخالفین کا میدان جنگ میں مقابلہ کرو۔ تم صرف اپنی ذات کی ذمہ داری لے سکتے ہو، اور دوسروں کی نہیں۔ البتہ تم، مناسب تعلیم و تربیت اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما سے، اپنی جماعت کے افراد کی کمزوریوں کو رفع کرنے جاؤ تاکہ وہ جہاد زندہ گی میں مردانہ و شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اگر تم ایسا کرتے رہے، تو وہ وقت دور نہیں جب خدا، تمہارے مخالفین کی پیدا کردہ مشکلات و مصائب کی روک تھام کا انتظام کر دے گا۔ اس لئے کہ خدا کا قانون اتنی بڑی قوتوں کا مالک اور محکمہ گیر ہے کہ وہ ان سرکشوں کو جکڑ کر رکھ دے گا۔

اس کے بعد ہے:

۴
۸۵

مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا

تم صرف اپنی ذات پر اور اپنے مخلص رُفقاء کے بھروسے پر اپنا پروگرام مرتب کرو۔ اس کے بعد اگر کوئی اور بھی اس نظامِ حسنہ کے قیام کے لئے تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے گا، تو اسے بھی اس کے خوشگوار نتائج سے حصہ مل جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص خیریتِ مخالف کا ساتھ دے گا، اور غلط نظام کی تائید میں کوشش کرے گا تو اس کے تباہ کن عواقب میں وہ بھی شریک ہوگا۔

شفاعتِ حسنہ اور یہ ”شفاعت“ کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان۔ جلد دوم صفحات ۳۷-۳۸-۳۹ (زیر آیت ۲۸) آچکی ہے۔ وہیں زیر نظر آیت (۲۸)

بھی درج ہے۔ اس کے معنی کسی کی مدد اور معاونت کرنا ہے۔ ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا مفہوم واضح ہے۔ نظام کے قیام کے علاوہ، انفرادی طور پر بھی اچھے کام میں کسی کا ساتھ دینا اور اس کی مدد کرنا، شفاعتِ حسنہ ہوگی برے کام میں اس کی امداد، شفاعتِ سیئہ ہوگی۔

آیت کے آخر میں ہے۔ ”وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيتًا“۔ (۲۹)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے ”اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ باہر شے پر نگہبان ہے“ لیکن اس ترجمہ کی رو سے آیت کے دونوں ٹکڑوں میں ربط نہیں بنتا۔ آیت یہ ہے کہ جو شخص کسی اچھے کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس اچھے کام کے خوشگوار نتائج سے اسے بھی حصہ ملتا ہے۔ اور جو شخص کسی برے کام میں کسی کی معاونت کرتا ہے، تو اس برے کام کے خرابی نتائج سے اسے بھی حصہ ملتا ہے۔ اور اس کے بعد ہے ”اور اللہ ہر شے پر نگہبان ہے۔ یا قدرت رکھتا ہے“

مقیتاً کا مفہوم لفظ مُقِيتًا کا مادہ (ق۔ و۔ ت) ہے اور الْقُوْتُ (جمع اقْوَات) کے معنی ہیں انہی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے۔ راغب نے کہا ہے کہ الْمُقِيتُ، کے معنی ہوتے ہیں

”وہ شخص جو کسی چیز کی حفاظت کرے، اور نگہ رانی کرے، اور اس کی خوراک کا بندوبست کرے“ یعنی اس کے معنی کسی کی حفاظت اور نگہ رانی کرنا (اور صرف حفاظت اور نگہ رانی نہیں۔ اس کے ساتھ)۔ اسے سامانِ زیست بہم پہنچانا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے، اس آیت سے ایک عظیم حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی کیفیت یہ ہے کہ سامانِ زیست (خوراک وغیرہ) قوانینِ طبیعی کے ماتحت ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ہر نام سنگھ، قانونِ زراعت کے مطابق کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس کی زمین سے بھی

اسی طرح فصل پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی عبد اللہ کی زمین سے۔ اس میں کافر اور مومن کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں۔ اسی طرح قوانین طبیعی کے مطابق نتائج | اس میں بھی کوئی تفریق نہیں کہ ہر نام سنگھ اپنی فصل کو کس مصرف میں لٹاتا ہے وہ اسے اچھے کاموں میں صرف کرے یا بُرے کاموں میں، اس سے نتائج کی پیداوار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۸۴-۸۵ میں بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا، جن کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے:

(اس سے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب خدا کا قانون مکافات اس قدر محکم گیر ہے، تو پھر وہ قومیں، جو مستقل اقتدار کو تسلیم کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھتی ہیں، مادی ترقی کس طرح کرتی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ) ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی، اس دنیا میں، طبعی مفاد عاجلہ چاہتا ہے۔۔۔ اور اس کے لئے طبعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے۔۔۔ ہم اسے اپنے قانون مشیت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے ایسا بنایا ہے مادی مفاد دے دیتے ہیں۔ (جو کسان، ہمارے قوانین طبیعی کے مطابق، محنت کر کے فصل بوتا ہے، اُسے اُس کی محنت کا پھل مل جاتا ہے۔ اس میں کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے بعد) مستقبل کی زندگی میں، اُس قوم کے لئے تباہی کا جہنم ہوتا ہے جس میں وہ بد حال اور دھنکار ہی ہوئی داخل ہو جاتی ہے۔

$$\left(\frac{2}{200} - \frac{2}{201} \right) \div \frac{11}{15-14} \div \frac{2}{20} \div \frac{2}{21} \right)$$

اس کے برعکس، جو قوم (مفاد عاجلہ کے ساتھ ساتھ $\frac{2}{21}$) مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتی ہے، اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتی ہے، جیسا کوشش کرنے کا حق ہے۔ اور مستقل اقدار پر یقین کامل رکھتی ہے۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی کوششیں، حال اور مستقبل دونوں میں، بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

ہم اس طرح دونوں گروہوں کو (یعنی صرف مفاد عاجلہ طلب کرنے والوں، اور مفاد عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں چاہنے والوں کو)، اپنے طبعی قوانین کی رُو سے، ان کی کوششوں کے مطابق، آگے بڑھانے چلے جاتے ہیں، اور تیرے نشو و نما دینے والے کا عطا فرمودہ، سامان رزق، ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔ اسکے راستے میں، کسی کے لئے بند نہیں لگائے جاتے۔ (جو چیز قانون طبیعی کے مطابق حاصل ہوتی ہے، وہ ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اُس قانون کے مطابق، اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی اس دوڑ میں، کافر و مومن دونوں کے لئے یکساں طور پر میدان کھلا رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کافروں کو، اُس کی کوشش کے باوجود، پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے، اور مومن کو، خواہ وہ کوشش نہ ہی کرے، آگے بڑھا دیا جائے۔) $\left(\frac{2}{21} \right)$

ہم سمجھتے ہیں کہ آیت (۴/۸۵) میں وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی جو لوگ کسی اچھے کام کے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، انہیں بھی اس پروگرام کی تکمیل کے لئے سامان و ذرائع میسر آجاتے ہیں، اور جو لوگ کسی خیر سی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں، خدا کے قانون طبعی کے مطابق انہیں بھی اسباب و ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں۔ فرق اس میں نہیں پڑتا۔ فرق ان کاموں کے نتیجہ میں پڑتا ہے جو خدا کے (طبعی قوانین نہیں بلکہ) قانون مکافات عمل کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔

ربوبیت عالمین اس قسم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کی تقاضی تھی۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام اور استحقاق کے سلسلہ میں تقاضا کچھ اس سے آگے ہے۔ اور وہ یہ:

وَإِذَا خَرَبْتُمْ بُيُوتَكُمْ فَيُؤْتُوا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ سُدُّوا هَاطَاتٍ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ (۴/۸۶)

تجارت کا بدل جو تمہارے ساتھ کھڑا ہو کر تمہارے لئے زندگی اور سلامتی کا سامان ہم پہنچائے، تم اس کے لئے اس سے بہتر اور حسین تر، حیات بخش سامان ہم پہنچاؤ۔ اور اگر خود، حالات ایسے سازگار نہ ہوں کہ تم اسے، اس کی پیش کش سے زیادہ دے سکو، تو کم از کم اسے اتنا ہی لوٹا دو۔ نظام صدق و ندی ان تمام امور کا پورا پورا حساب رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

اور جب تم کو دعوے دے کوئی تو تم بھی دعوے اس سے بہتر یا وہی کہو اٹ کر۔ بے شک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (مرحوم))

اور اس ترجمہ کے حاشیہ میں اس کی تفسیر میں لکھا ہے: ”اگر کسی نے السلام علیکم کہا تو واجب سے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو۔ اور زیادہ ثواب چاہو تو رحمتہ اللہ بھی بڑھا دو۔ اور اگر اس نے یہ لفظ بڑھا یا ہو تو تم ”برکاتہ“ زیادہ کرو۔ اس میں شبہ نہیں کہ نتیجہ کے معنی دعوے یا بھی ہیں، لیکن جب اس کے مادہ میں حیات کا مفہوم بنیادی ہے تو آیت زیر نظر (۴/۸۶) میں تجارت کے معنی ”حیات بخش“ زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔

اسی نسبت سے ہم نے آیت کے مفہوم میں اسے ملحوظ رکھا ہے۔ ویسے بھی، سابقہ آیت میں ”مُقْتَدِرًا“ کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ قرین صواب ہے۔ لغت میں بھی تجارت کے معنی صرف دعوے یا نہیں، اس کے معنی کسی کو خوشگوار زندگی اور درازی عمر کی دعوے یا ہیں۔ ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ میں بھی سلامتی، رحمت اور برکات اسی مفہوم

کو محیط ہیں۔

لیکن یہ ”السلام علیکم“ جماعتِ مومنین کا ہے جو ایک دوسرے کی سلامتی اور حیاتِ بخش کے آرزو مند ہی نہیں ہوتے، عملاً اس کے لئے کوشاں بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا ”السلام علیکم“ نہیں جو محض دو لفظوں کا رسمی طور پر دھڑا دینا ہے اور یا منافقت کا پردہ۔ دل میں مخالف کے خلاف جذباتِ عداوت و نفرت موجزن اور زبان پر سرکراہٹ کے ساتھ ”السلام علیکم“!

جماعتِ مومنین کا یہ تمام پروگرام کس مقصد کے لئے ہوتا ہے؟ دنیا میں اقتدارِ خداوندی قائم کرنے کے لئے؛

﴿۴۸﴾ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لِيَجْمَعَ بَيْنَكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا سَبِيْطَ فِيْهِ وَمَنْ اٰصَدَقُ

مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝ (۴۸)

بہر حال کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تم اس آواز کو بلند کئے جاؤ کہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف ایک خدا کا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کے سامنے

اقتدار صرف خدا کا

جھکا جائے اور اس کی محکومی اختیار کی جائے۔ انسانوں کی دنیا میں بھی صرف اسی کا قانون رائج ہونا چاہئے۔ اس آواز کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ لیکن اس مخالفت کا فیصلہ اُس وقت ہوگا جب آنے والے انقلاب کے وقت، تم اور تمہارے مخالفین، میدانِ جنگ میں ایک ساتھ جمع ہوں گے۔ یہ ٹکراؤ ہو کر رہے گا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہ بات خدا کی طرف سے کہی جا رہی ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا سے زیادہ سچی بات کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ دنیا بھی یہی ہوگا، اور آخرت میں بھی ایسا ہی۔

یہ تو جماعتِ مومنین کی دعوت اور اس پر ان کا عمل ہوگا۔ ان کے برعکس:-

﴿۴۹﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِتْنٰتٍ وَاللّٰهُ اَسْرَضَهُمْ لِمَا كَسَبُوْا اَلَا تَرٰیۤ ذٰلِكَ اَنَّ تَفْهُدُوْا مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ ط وَمَنْ يُّضِلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا ۝ (۴۹)

باقی رہے یہ منافقین، جن کا دعویٰ رفاقت اپنی مصلحت کو شیوں پر مبنی ہے، وہ بظاہر تمہارے دوست بنتے ہیں لیکن باطن تمہاری تخریب چاہتے ہیں ان کی پوزیشن ایسی واضح ہے کہ ان کی بابت دو رائیں ہو ہی نہیں

منافقین

سکتیں۔ اس لئے ایسا کیوں ہو کہ تم میں سے کچھ لوگ، ان کے بارے میں، ایک خیال کے ہو جائیں، اور کچھ لوگ دوسرے

خیال کے، در آنحالیکہ وہ اپنی غلط روش اور بد عملی کی وجہ سے راہِ حق سے پھر چکے ہیں۔

تم یہ سوچو کہ جو لوگ اس غرضِ صمیم راستے سے ہٹ کر، دوسری ذہیں اختیار کر چکے ہوں، تم انہیں کس طرح

صحیح راستے پر لا سکتے ہو، یاد رکھو! جو شخص قافون خداوندی کی رو سے، غلط راستے پر پڑ جائے، اس کے لئے،
(ہجر قافون خداوندی کے اتباع کے) صحیح راہ کی طرف آنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی — اور قافون خداوندی
یہ ہے کہ انسان، بطیب خاطر، پوری دیاخنداری سے، صحیح راستہ اختیار کرے۔ لوگوں کو فریب دینے کے لئے منافقت نہ
برتے۔

اس آیت میں ”مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ“ اور ”وَمَنْ يَضِلَّ اللَّهُ“ کے صحیح مفہوم کے لئے سابقہ جلدوں میں تفصیر کا
عنوان دیکھئے (انڈکس کے حوالے سے)

﴿۸۹﴾

اسلامی زندگی، نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے تابع ہی بسر کی جاسکتی ہے۔ جس مقام پر اسلامی نظام قائم نہ ہو
وہاں اس نظام کے لئے کوشاں ہونا، اسلام ہے۔ اگر کسی مقام پر یہ نظام قائم ہو گیا ہے تو پھر اسلام اس نظام کے تابع
رہنے ہی کا نام ہوگا۔ اس لئے جب مدینہ میں یہ نظام قائم ہو گیا، تو جہاں جہاں مسلمان آباد تھے، اُن سے کہا گیا کہ وہ وہاں
سے منتقل ہو کر مدینہ آجائیں۔ اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ اگر کسی خطہ زمین کے مسلمان، وہاں سے منتقل ہونے کی استطاعت
اسباب و ذرائع کے باوجود ہجرت نہ کریں، تو قرآن انہیں مومن تسلیم نہیں کرتا۔ انہیں منافق قرار دیتا ہے اور ان کے
ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا برتاؤ منافقین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آیت (۴/۸۹) میں اس کی مراحت کی گئی ہے۔
فرمایا:۔

﴿۴/۸۹﴾ وَذُو الْاَوْتَكُفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا وَاَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ
حَتّٰى يَهَاجَرُوْا فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِخْذُوْهُمْ وَاَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدُوْهُمْ
لَمْ يُوْثِقُوْا مِنْهُمْ وَاَوْلِيَاءُ لَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ (۴/۸۹)

(تم سمجھتے ہو کہ انہیں اپنے ساتھ ملا لو گے۔ اور) ان کے ارادے یہ ہیں

کہ جس طرح یہ خود کفر اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح تم بھی دینِ حق کو چھوڑ دو،

ہجرت مومن ہونے کا ثبوت

تاکہ اس طرح یہ اور تم، دونوں، ایک سطح پر آجاؤ۔ لہذا، ان میں سے کسی کو اپنا رفیق اور مساز نہ بناؤ، تاکہ یہ اپنے

دعویٰ ایمان کی صداقت کا عملی ثبوت نہ دیں۔ اور وہ ثبوت یہ ہے کہ یہ نظام خداوندی کی خاطر، وہ سب کچھ چھوڑ دیں جس کا

چھوڑنا ضروری قرار دیا جائے۔۔۔۔۔ گھریلو۔ اعزہ۔ رفقاء۔ مال و دولت وغیرہ۔۔۔۔۔ ان سے یہ بات

واضح طور پر کہہ دو۔ اگر یہ اس کے بعد، گریز کی راہیں نکالیں تو انہیں گرفتار کر لو تاکہ یہ اس فتنہ پر دازی سے رک جائیں

اور اگر یہ تم سے جنگ کریں، تو تم بھی ان سے جنگ کرو، اور جہاں پاؤ انہیں قتل کرو سارا ان میں سے کسی کو بھی اپنا دوست اور حمایتی تصور نہ کرو۔

ہجرت اور اس سے متعلق مباحث، مطالب الفرقان جلد سوم۔ صفحات ۵۶-۵۷ میں بڑی وضاحت سے بیان ہو چکے ہیں۔ وہیں آیات (۴۰-۴۱) بھی درج کی جا چکی ہیں۔ اس لئے زیر نظر آیت (۴۱) اور بحوالہ بالا دیگر آیات کا یہاں دھڑانہ زوری نہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے متعلق بحث بھی پہلے گزر چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس) اس کے بعد کی آیت میں بھی انہی منافقین کے سلسلہ میں ہدایات دی گئی ہیں:-

[۴۰] إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يَقَاتِلُوكُمْ قَوْمَهُمْ وَكَوْشَاءَ اللَّهُ لَسَلَطُهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتِلُوكُمْ فَإِنْ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمَّ يُقَاتِلُوكُمْ وَالْقَوَا أَلَيْسَ كُفْرًا سَلَمًا فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۝ (۴۱)

جنگ اور صلح کی شرائط لیکن اگر یہ لوگ تمہارے دشمن کا ساتھ چھوڑ کر ایسے لوگوں سے جا ملیں جن کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں (تو پھر یہ بھی اس طبعیت قوم کے افراد سمجھے جائیں گے) یا یہ جنگ سے ننگ آکر تمہارے ساتھ آجائیں، اور نہ تم سے جنگ کریں اور نہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف جنگ کریں (غیر جانب دار رہنا چاہیں۔ تو اس صورت میں بھی ان سے کچھ مواخذہ نہیں کرنا چاہئے)۔ اس لئے کہ اگر ان کے پاس خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق تم پر غالب آ جانے کی قوت ہوتی تو یہ ضرور تم سے جنگ کرتے۔ لہذا، اگر یہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں، صلح کی درخواست کریں، تو پھر تمہیں، ان کے خلاف کچھ کرنے کی اجازت نہیں۔۔۔۔۔ اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں مقصود کسی سے انتقام لینا نہیں، بلکہ ان سرکش لوگوں کا زور توڑنا ہے جو دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کی مخالفت کریں۔ سو جب ان کا زور ٹوٹ جائے تو پھر ان کے خلاف کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

جنگ کے متعلق تفصیلی مباحث سابقہ جلدوں میں آچکے ہیں (دیکھئے انڈکس)۔ اس آیت میں نیز اس سے اگلی آیت اور آیت (۴۲) میں صلح کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان پر غور کریں اور دیکھیں کہ اسلام جنگ و قتال کا داعی ہے یا امن و سلامتی کا پیامبر؟ اس کی مرید وضاحت کر رہی:

۴/۹۱

سَتَجِدُونَ الْآخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُواكُمْ وَيَأْمِنُوا قَوْمَهُمْ كُلًّا سَدُّوا إِلَى
الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمْ السَّلَامَ وَ
يَكْفُؤُوا أَيْدِيَهُمْ فَعَزَّوهُمْ وَاتَّبَعُواهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَئِكَ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مَبِينًا ۝

لیکن تم ایسے لوگ بھی دیکھو گے کہ وہ (یوں تو) تمہاری طرف سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے
بھی۔ لیکن جب کبھی ان کی قوم، انہیں تمہارے خلاف فتنہ برپا کرنے کے لئے بلائے تو وہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے،
بلکہ اس فتنے کی آگ میں، اندھا دھند کود جاتے ہیں۔ سو اگر یہ لوگ، اس قسم کی فتنہ پر ماری کے بعد، نہ تو تم سے کنارہ کش
ہوں۔ نہ صلح کی درخواست کریں۔ اور نہ ہی اپنی دست درازیوں سے باز آئیں۔ تو انہیں گرفتار کرو (تاکہ یہ فتنہ رک
جائے)۔ لیکن اگر وہ تم سے جنگ کریں تو ان سے جنگ کرو اور جہاں یا وہ انہیں تہ تیغ کر دے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکے
خلاف اس قسم کی کارروائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے۔

اس کے بعد دو آیات میں قتل اور اس کی سزا کا ذکر ہے۔ سلسلہ کلام کی رو سے اس کا آغاز میدان جنگ میں قتل
سے ہے (جسے قتال کہا جاتا ہے)، لیکن جرم کے اعتبار سے ان آیات کا تعلق انفرادی قتل کے جرائم سے ہے۔ قتل
اور اس کی سزا کے متعلق جگہ جگہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ رائڈیکس میں دیکھئے عنوان قتل۔ قصاص۔ جرم اور سزا وغیرہ
لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی قانونی حیثیت کو یکجا بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قرآن
کے احکام کیا ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ رکھئے کہ قرآن کریم نے انسانی جان کو کس قدر گراں بہا قرار دیا ہے۔ سورہ المائدہ میں ہے:

مَنْ أَجْلٍ ذَلِكَ فَكَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنْتُمْ مَنْ قَتَلَ
نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ

انسانی جان کی قدر و قیمت

النَّاسِ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۝ (۵۴)

ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ تاکید حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر ڈالے۔ — بجز اس کے
کہ وہ جرم قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتل ناخنی کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے
مجرم کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے۔ — تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو گویا قاتل نے ایک
فرد کو قتل نہیں کیا، پوری کی پوری نوب انسان کو قتل کر دیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے کوئی ایک جان بچالی، تو

اُس نے گویا پوری نوع انسان کی جان بچالی۔

۲۔ ہر انسانی جان واجب الاحترام ہے۔ اسے صرف اُن جرائم کی سزا کے طور پر تلف کیا جاسکتا ہے جن کی قرآن کریم نے سزائے

انسانی جان واجب الاحترام ہے

موت تجویز کی ہے۔ اسے قتل بالحق کہا جائے گا۔ فرمایا :-

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ ط إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ﴿۱۷﴾ (۱۷/۴)

(یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ) جس جان کا مآرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے واجب الاحترام قرار دیا ہے یعنی بے گناہ کا قتل۔ ۱۷/۴) اسے قتل مت کرو، بجز اس کے کہ ایسا کرنا قانونِ عدل کا تقاضا ہو۔ ۱۷/۴)۔ جو شخص ظلم سے ناحق مارا جائے (تو قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں، اس لئے مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے) مقتول کے وارثوں کے لئے، ہم نے نظامِ خداوندی (اسلامی معاشرہ) کو صاحبِ غلبہ و اختیار بنایا ہے۔ اس لئے یہ نظام، خود مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا۔ لیکن معاشرہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جرم کی سزا، قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دے۔ اُن سے تجاوز نہ کرے۔

(۱۷/۴ ذ ۱۷/۴) (۱۷/۴)

۳۔ جرمِ قتل کا مؤاخذہ کر کے اُس کی سزا دینا اسلامی عدالت کا فریضہ ہے۔ اپنے طور پر اس کا بدلہ نہیں لیا جاسکتا

(اسے قصاص کہتے ہیں)

قصاص کا حکم | يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ الْحَرِّ بِالْحَرِّ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى ط فَمَنْ عَفَى عَنْهُ فَمَنْ غَفَرَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَّاعُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ط
فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ
يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۹﴾ (۱۸/۴-۱۹/۴)

یاد رکھو! جس اصول کے مطابق، مستبد قوم سے اجتماعی طور پر جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے (یعنی حقوقِ انسانیت کے تحفظ کی خاطر) اُس اصول پر، اپنے معاشرہ میں، انفرادی طور پر، جرمِ قتل کی سزا دینی بھی ضروری قرار پاتی ہے، کیونکہ اس کے کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی، اور انسانی جان کی قیمت بہت بڑی ہے۔ (۱۸/۴)۔ لہذا اس باب میں

قانون یہ مقرر کیا جاتا ہے۔ کہ قاتل کو معاشرہ کی طرف سے سزا ضرور دی جائے۔ (یعنی اسے خود معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے، افراد متعلقہ کے خلاف نہیں)۔

سزا کے سلسلہ میں، عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے۔ (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے، تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے، تو اس کا عورت ہونا اسے سزا سے نہیں بچا سکے گا، اسے بھی سزا جھگتنی پڑے گی۔

جرم قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قتل بالارادہ (قتل عمد)، یا سہواً (نادانستہ) قتل۔ اول الذکر کی صورت میں سزائے موت ہے (زبردستی نہیں)۔ — یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے، انتہائی سزا سے کم تر کوئی اور سزا (سورہ ۲۴) — لیکن سزا کو جرم کی حد سے بڑھ نہیں جانا چاہئے۔ (سورہ ۲۴ و سورہ ۱۷) — لیکن اگر قتل عمد نہیں کیا گیا۔ یہ نہی سہواً ہو گیا ہے، تو اس صورت میں (سورہ ۲۴ کے مطابق) دیت (خون بہا) کی سزا دی جائے گی۔ اس دیت کی رقم سے، اگر مقتول کا وارث، برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے، تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے۔ (سورہ ۱۷)۔ اس صورت میں مجرم کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ ملے ہو گیا ہے اسکی پابندی کرے۔ اور حسن کارنامہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ (قتل سہوی سزا مقرر کرنے میں) تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشو و نما پاتی رہیں۔

لیکن جو شخص اس طرح معاملہ ملے ہو جانے کے بعد، زبردستی کرے، تو اسے سخت سزا دی جائے۔ اگر تم، سطحی جذبات سے ہٹ کر، عقل و فکر کی رو سے غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قصاص کے اس قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم لا قانونیت کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

مندرجہ بالا آیت (سورہ ۱۷) میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ کہ اسلامی نظام مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا، اور مجرم کو قانون کے مطابق سزا دے گا۔

۴۔ یہودیوں کی شریعت میں قصاص کی یہ شکل تھی :-

وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ
وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْمَ وَحَقَّاصًا طَقَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَمَوْ
كَفَّارَةً لَهُ طَوْ مَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ -

(۵/۳۵)

اُنہی صحف میں ہم نے انہیں حکم دے رکھا کہ جس شخص نے کسی کو (ماحق) قتل کر دیا، اُس کی سزا موت ہوگی۔۔۔۔۔ جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ ناک کا بدلہ ناک۔ کان کا بدلہ کان۔ دانت کا بدلہ دانت۔۔۔۔۔ یعنی صرف جرم قتل ہی مستوجب سزا نہیں کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے گی۔ اور سزا جرم کے مثل ہوگی۔ لیکن اگر مستغیث، مجرم کو خود معاف کر دے، تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی۔

یہ تھا وہ قانون قصاص جو ان کی کتابوں میں ان کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں اُس کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں تھے، اس لئے کہ جو شخص اس ضابطہ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

یہ قانون بنی اسرائیل کے لئے تھا۔ قرآن کریم میں اس قسم کا قانون مسلمانوں کے لئے نہیں آیا۔ اس قسم کی ضربات کی سزا اسلامی حکومت خود مقرر کرے گی۔

۵۔ قتل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔۔۔۔۔ سہواً کسی کے ہاتھوں کسی کا قتل ہو جانا۔ اسے قرآن کریم قتل بالخطا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور عمدہ اور اراداً کسی کو قتل کر دینا، اسے وہ قتل عمد کہہ کر پکارتا ہے۔ ان دونوں جرائم کی سزا الگ الگ ہے:۔۔۔ قتل بالخطا

۶۔ قتل بالخطا کے متعلق ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ
رَقَبَةٍ سُّؤْمِنَةٌ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ
قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ سُّؤْمِنَةٌ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
سُّؤْمِنَةٌ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فُصْيَامٌ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ وَ
كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ④ (۹۲)

کسی مومن کے لئے سزاوار نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے، (آلہ یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اگر کسی کے ہاتھوں، کوئی مومن غلطی سے مارا جائے تو وہ اس کے بدلے میں، ایک مومن غلام آزاد کرے۔ نیز مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دیا کرے (۱۲۶)۔ اگر وہ خون بہا معاف کرے تو پھر اور بات ہے۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی قوم تم سے برسرِ پیکار ہے اور ان میں کوئی مومن فرد ہے جو تمہارے ہاتھوں غلطی سے مارا جاتا ہے، تو اس کے کفارہ کے طور پر ایک

قتل خطا کی سزا و ویت

مومن غلام آزاد کیا جائے گا۔ خون بہا نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ نہیں تم خون بہا دو گے وہ تو تم سے جنگ کر رہے ہیں)۔ لیکن اگر وہ شخص، اس پس قوم سے ہو (یعنی ان لوگوں میں رہتا ہو) جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ صلح ہے، تو اس صورت میں اس کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہوگا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ لیکن اگر قاتل کے پاس غلام آزاد کرنے کی مقدورت نہ ہو۔ یا ایسی صورت ہو کہ غلام ملے ہی نہیں۔ تو وہ دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ یہ چیز، قانون خداوندی کی رد سے عضو خطا کا موجب بن جائے گی، اس قانون خداوندی کی رد سے جو سزا مر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قتل بالخطا کی سزا موت نہیں۔ صرف دیت (خون بہا) کی ادائیگی ہے۔ ظاہر ہے کہ خون بہا کا تعین عدالت کرے گی۔ مقتول کے وارثوں کو البتہ اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اس میں کچھ کمی کر دیں یا بالکل معاف کر دیں۔

اس سے آپ غور کیجئے کہ ہمارے مروجہ قانون کی رد سے، قتل بالخطا کی سزا کے طور پر جنہیں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے، وہ کس قدر قرآن کریم کے خلاف ہے اور قتل ناحق جیسا سنگین جرم۔

۷۔ قتل عمد کے متعلق کہا:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿۴۳﴾ (۴۳)

اگر کوئی مومن کسی مومن کو عمدتاً قتل کر دے، تو اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا۔ اُس پر خدا کا غضب وارد ہوگا۔ وہ خدا کی نگاہوں میں ملعون ہوگا۔ اُس کے لئے خدا نے عذاب عظیم

تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں جرم قتل بالا راہ کی بنیادی سزا کا ذکر نہیں کیونکہ اس کی سزا کے متعلق آیات (۱۲۹-۱۳۰) میں حکم

دیا جا چکا ہے ————— یعنی سزائے موت۔ اس میں البتہ دو باتیں قابل غور ہیں :-

۱۔ خون بہا کی اجازت صرف قتل خطا میں ہے۔ قتل عمد میں خون بہا یا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کی سزا موت ہے۔

۲۔ آیت (۲/۱۷۸) میں جو کہا ہے کہ فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ (یعنی مقتول وارثوں کی طرف سے

کچھ معافی، تو یہ صرف دیت (خون بہا) کی صورت میں ہوگی۔ یعنی قتل الخطا کی صورت میں۔ قتل عمد میں جب خون بہا کی اجازت ہی نہیں تو اس میں سے کچھ معاف کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ آیت (۲/۱۷۸) میں جو جہنم، خدا کے غضب اور لعنت کا ذکر ہے، اگر ان کا اطلاق اس دنیا میں کیا جائے تو

اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قتل بالعمد میں بھی، جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزائے موت سے کم تر درجہ کی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس میں خون بہا کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں۔

جنگِ جبل اور جنگِ صفین (ضمناً) قتل عمد کے متعلق خدا کا فیصلہ ملاحظہ فرمادیں اور اس کے بعد صدرِ اول کی مروجہ تاریخ میں ذرا اس جالسوز منظر کو سامنے لائیں کہ جنگِ جبل اور صفین میں صحابہ

کبارؓ کی آدھی تعداد ایک طرف کھڑی ہے اور دوسری آدھی اس کے سامنے دوسری طرف، اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے وار کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں جنگِ جبل میں دس ہزار (عام مومن ہی نہیں بلکہ) صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں، اور دوسری جنگ (جبل) میں ستر ہزار صحابہؓ (معاف اللہ، صدبار معاف اللہ)۔ میں نے اپنی کتاب ”شاہکار رسالت“ کے تعارف (گور کا وہ خیال) میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ سب افسانے ہیں جو ہماری تاریخ میں ایک گہری سازش کی رُو سے داخل کر دیئے گئے۔ اور ہم انہیں (اپنا مقدس ورثہ سمجھ کر) سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ احادیث (روایات) کے سلسلہ میں ہوا، وہی کچھ تاریخ کے ضمن میں بھی ہوا جب تک ہم ان (وضعی) روایات اور تاریخ سے پیچھا نہیں چھڑاتے، جمیع اسلام ہمارے سامنے آ نہیں سکتا۔

✽

اس ضمنی جگہ گزری کے بعد پھر جنگ سے متعلق ہدایات کی طرف آئیے۔ فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا خَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَيِّتُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ

إِلَيْكُمْ السَّلَامَ كُنتُمْ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَعَانِمُ

كَثِيرَةٌ ۚ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنْ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَبَيِّتُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ

كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۹۴﴾ (۴/۹۴)

جنگ میں صلح

اے جماعتِ مومنین! جب تم خدا کی راہ میں (جنگ کرنے کے لئے) باہر نکلو، تو پہلے تحقیق کر لو کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ یونہی ہر ایک کو دشمن تصور کر کے حملہ نہ کرو۔ اگر کوئی تمہاری نظر امن و سلامتی کا پیغام بھیجے، تو اس کے متعلق تمہارا پہلا ردِ عمل یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ ایمان داری سے ایسا نہیں کر رہا۔ وہ اس کا خواہاں نہیں، دھوکا دیتا ہے۔ اس کے متعلق تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچو۔ یونہی ہر ایک سے لڑائی کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کی غرض سے باہر نہیں نکلے، دنیاوی مفاد (مالِ غنیمت وغیرہ) کی خاطر نکلے ہو، تم ایسا خیال تک بھی دل میں نہ لانا۔ تم تو انہیں خداوندی کے مطابق چلتے رہو اور پھر دیکھو کہ تمہیں کس قدر ساز و سامان جائز طریق سے ملتا ہے۔ اسلام سے پہلے تمہاری یہی حالت تھی کہ تم محض مالِ غنیمت کی خاطر لڑائیاں لڑا کرتے تھے۔ لیکن اللہ نے زندگی کا یہ نیا ضابطہ دے کر، تم پر پڑا کر م کیا، اور تمہارے مقاصدِ حیات اور نقاطِ نظر کو بدل دیا۔ اس لئے اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کی پوری پوری تحقیق کرو اور صرف انہی سے جنگ کرو جن کے خلاف حق و صدا کی خاطر جنگ کرنا ضروری ہو۔ یاد رکھو! اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس لئے تم اپنی نیت کو اس سے نہیں چھپا سکتے۔

مرزا غلام احمد کے متبعین

آیت کا مفہوم واضح ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سامنے آگیا۔ جب (۱۹۷۷ء) میں قوم کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مرزا غلام احمد کے متبعین (قادیانی اور لاہوری جماعتوں) کو غیر مسلم قرار دیا جائے، تو یہ (احمدی) حضرات کہا کرتے تھے کہ تم لوگ ہمیں غیر مسلم کیسے قرار دے سکتے ہو؟ قرآن کریم نے واضح ان الفاظ میں کہا ہے کہ وَلَا تَقْوُ لُوا الْإِنْسِ الْقِيَا إِلَيْكُمْ السَّلَاحَ كَسْتُمْ مَوْمِنًا (پہلے) اور اس کا ترجمہ کرتے تھے ”جو شخص تمہیں اسلام علیکم کہے، اسے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو“ یعنی ان کے خیال کے مطابق، ہر اُس شخص کو جو اسلام علیکم کہدے، تسلیم کر لینا چاہئے۔ کفر اور اسلام میں یہ کیسا دلچسپ خط امتیاز ہے؟ آپ نے دیکھا کہ قرآن کو کس طرح باز چھٹا اطفال بنایا جاتا ہے! آیت کا صحیح مطلب، مفہوم میں دیا جا چکا ہے۔

اگلی آیت میں جہاد میں شریک ہونے والوں کی دو روشوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کی، غالب کے الفاظ میں، کیفیت یہ ہے کہ

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اور بعض ایسے ہیں جو قدرے سست رفتار واقع ہوئے ہیں۔ جہاد کی برکات میں تو ان دونوں کا حصہ ہے، لیکن مدارج کے اعتبار سے (ظاہر ہے کہ) یہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ فرمایا:-

لَا يَسْتَوِ الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الْقَرْرَةِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكَذَلِكَ وَعَدَ اللَّهُ الْمُحْسِنِينَ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۖ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَسَرَاحَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (۹۵-۹۶)

تیز گام اور سست رفتار | مومنین میں سے اچھے جو لوگ بلا عذر، سست روی سے کام لیں، اور

نہایت ذوق و شوق سے، خدا کی راہ میں مصروفِ جدوجہد رہیں، اور

اس میں مال اور جان تک کی پروا نہ کریں، تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ قانونِ خداوندی کی میزان میں، جان و مال سے جدوجہد کرنے والوں کا درجہ، سہل انگاروں کے مقابلہ میں بلند ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ نظامِ خداوندی کی خوشگوار یوں میں، سست رویہ افراد کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ تو سب کے لئے ہیں۔ لیکن جب سوالِ فرقِ مراتب کا آئے گا تو مجاہدین کے مدارج بہر حال سست رفتاروں سے بڑھ کر ہوں گے۔ یہ مدارج وہ میڑھیاں ہیں جن سے انسانی ذات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ (۱۳۴)۔ ان لوگوں کی مجاہدانہ سعی و عمل، ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے مہر اثرات سے ان کی حفاظت کرتی ہے، اور قانونِ خداوندی کی رو سے ان کی صاحبیتوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ خدا کے قانون میں حفاظت اور پرورش کے سب سامان موجود ہیں۔

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

برابر ہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کا کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے۔ اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے بیٹھ رہنے والوں پر درجہ۔ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا۔ اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں۔

ذرا غور کیجئے کہ اس ترجمہ کی رو سے، نقصان کیا سامنے آتا ہے؟ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے۔ مومنین کی ایک جماعت سر بکف میدانِ جنگ میں پہنچ چکی ہے، لیکن انہی میں سے دوسرے لوگ، بلا عذر، اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ سوچئے کہ اس طرح، بلا عذر گھروں میں بیٹھے رہنے والوں کو بارگاہِ خداوندی میں مومن بھی قرار دیا جائے گا؟ لیکن (مندرجہ بالا ترجمہ کی رو سے) اللہ تعالیٰ ان دونوں گروہوں کو جنگ کے حسنات کا حقدار قرار دیتا ہے، صرف مدارج میں فرق بتاتا ہے؟ اگر صورت

یہی ہے تو ہر ایک کو کیا پڑی ہے کہ محض کچھ زیادہ مدارج حاصل کرنے کے لئے جنگ میں جانے کی صعوبات برداشت کرے اور جان تک کا خطرہ مول لے، بلکہ جان تک دے دے۔ جوتین صحابہؓ، کسی وجہ سے، ایک جنگ میں پیچھے رہ گئے تھے، سورہ توبہ میں دیکھئے کہ ان پر بتی کیا تھی؟ (قرآن کے الفاظ میں) ”زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ اور وہ اپنی جان تک سے تنگ آ گئے تھے۔“ (۹/۱۱۸)

آیت (۴/۹۵) میں لفظ قاعدین آیا ہے۔ امام راغب نے کہا ہے کہ کسی کام میں سستی کر لے دے کو ”قاعد“ کہا جاتا ہے۔ (لغات القرآن - پرویز - صفحہ ۸، ۱۳)۔

اس آیت میں مقابلہ تیزروں اور سہل انگاروں میں ہے، نہ کہ ان میں جو جنگ میں شریک ہو گئے اور وہ جو آرام سے گھروں میں بیٹھے رہے!



اس کے بعد آیات (۴/۱۱۱-۱۱۲) میں مہاجرین اور ہجرت نہ کرنے والوں کا بیان ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ آیات، مطالب الفرقان جلد سوم، صفحات ۵۲-۵۵ میں نشریات کے ساتھ آچکی ہیں۔ انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ان آیات کو (مع ان کے مفہوم سے) درج کر دیا جاتا ہے:-

﴿۴/۹۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي النَّفْسِ مِنْهُمْ قَالُوْا فِیْہُمْ کُنْتُمْ طَّٰلِقًا قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفٰیْنَ فِی الْاَرْضِ طَّٰلِقًا قَالُوْا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاَسْعٰہُ فَتَہَا جَہَنَّمُ فِیْہَا طَّٰلِقًا وَلِلّٰہِ مَا وَہَمُ جَہَنَّمُ طَّٰلِقًا وَسَاَعَتُ مُصِیْرًا ﴿۹۷﴾

اب رہے وہ جو غیر خداوندی نظام کے تحت اطمینان سے بیٹھے زندگی بسر کرتے اور اس طرح اپنی ذات کا نقصان کرتے رہیں۔ اگر اسی حالت میں ان کی موت آجائے، تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر خداوندی نظام کی محکومی میں پڑے رہے؟ وہ کہیں گے کہ ہم بہت کمزور و ناتوان، اور بے بس و معذور تھے۔ ان سے کہا جائے گا

کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم میں اتنی قوت نہیں تھی کہ تم وہاں کا باطل نظام بدلی کر، نظام خداوندی قائم کر لیتے۔ لیکن خدا کی زمین اس قدر وسیع تھی۔ کیا تم ہجرت کر کے کسی

ہجرت کی اہمیت

ایسے مقام کی طرف نہیں جاسکتے تھے جہاں نظام خداوندی قائم تھا، یا جہاں کی فضا اس کے لئے سازگار تھی؟

یہ لوگ جو یوں اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تابع قانع اور مطمئن ہو کر بیٹھے ہیں

ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ یہاں بھی جہنم، کہ طاعون، نظام کی غلامی میں رہے۔ اور وہاں بھی

جہنم، کہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوئی۔

إِلَّا الْمُسْتَغْفِرِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَمْتَدُّونَ سَبِيلًا (۴۸)

البتہ ان میں وہ کمزور و ناتوان، مرد و عورتیں اور بچے شامل نہیں جو فی الواقع اس قدر معذور ہو چکے تھے کہ نہ تو انہیں ہاں

تبدیلی حالات پر کوئی قدرت حاصل تھی اور نہ ہی وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ کھلا تھا۔

فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا (۴۹)

اس قسم کی — نہ جائے مائدہ نہ پائے رفت کی — حالت قابل معافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون

خداوندی میں ان جیسوں کے لئے، عفو و حفاظت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

❖

وَمَنْ يَهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَافِقًا كَثِيرًا وَأَسْوَءَ طَوَافٍ مِمَّنْ يَبْتَغِي مَهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكُهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۵۰)

نالک وطن کی جاذبیت محض جذباتی چیز ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وطن، اور نظام خداوندی کے کسی تقاضے میں ٹکراؤ ہو، تو اس وقت وطن کی جاذبیت کو اس بلند مقصد کی خاطر قربان کر دینا چاہیے۔ جو شخص، اس مقصد کی خاطر، وطن کو چھوڑ دے گا، اسے دوسرے مقامات میں بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش کی راہیں کھلی ملیں گی۔

جو شخص، اس طرح ”خدا اور رسول“ کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑا ہو، تو اس کا یہ عزم ہی اتنے بڑے اجر کا موجب بن جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی منزل مقصود تک نہ بھی پہنچ جائے، اور اسے راستے ہی میں موت آجائے، تو خدا کے ہاں سے اسے پورا پورا اجر مل جاتا ہے۔ خدا کے قانون میں ایسے افراد کے لئے حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ہجرت ایسے مقام کی طرف ہوگی جہاں نظام خداوندی قائم ہو، یا اس کے قیام کے امکانات

روشن ہوں۔ — اس کو ”خدا اور رسول“ کی طرف ہجرت کہا جائے گا۔ یونہی ترک وطن کا نام ہجرت نہیں۔

(ضمناً) یہاں ”اللہ اور رسول“ کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ مقام ہے جہاں

نظام خداوندی قائم ہو۔ اس سلسلہ میں آیت (۵۱) کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔

❖

ہجرت سے متعلق ان آیات سے پہلے بات جنگ کی ہو رہی تھی۔ اب پھر قرآن اسی موضوع کی طرف آتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حالت جنگ میں فریضہ صلوٰۃ کی ادائیگی کس طرح کی جائے گی۔

صلوٰۃ کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں (بالخصوص جلد اول صفحہ ۷۹ تا آخر) میں بھی شرح و بسط سے آچکی ہے۔ جلد سوم میں، حالت خوف میں، صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۴۱۳ آیات ۲۳۸-۲۳۹)۔ پہلی ہدایت یہ ہے کہ حالت جنگ میں صلوٰۃ کو مختصر کر لیا کر و۔

وَإِذَا حَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ ۖ إِنَّكُمْ عِنْدَ اللَّهِ لَكُنْتُمْ أَكْثَرُ نَجْوً ۚ (۲۳۸) (۴/۱۰۱)

اور جب تم جنگ کے لئے باہر نکلو اور تمہیں دشمن کی طرف سے ضرر رسانی کا خطرہ ہو، تو اس میں، کچھ مضائقہ نہیں کہ تم اجتماع صلوٰۃ کو مختصر کر لیا کر و۔ اس لئے کہ تمہیں تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ وہ ایسے مواقع کی گھات میں رہتے ہیں۔

جنگ میں صلوٰۃ اجتماعات صلوٰۃ کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ جنگ میں بھی ان کی تاکید کی گئی ہے جیسا کہ جلد اول صفحہ ۲۳ پر بتایا گیا ہے یہ اجتماعات درحقیقت مشاورت کے لئے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ زمانہ امن کے مقابلے میں جنگ کے زمانے میں مشاورت کی ضرورت اور اہمیت اور بھی زیادہ شدید ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس اختصار کی صورت یوں بیان کی کہ

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقِمُ طَائِفَةً مِنْهُمْ مَعَكَ وَلِيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَذَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرَضَىٰ أَنْ تَقْعُوا أَسْلِحَتِكُمْ ۚ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا (۲۳۹) (۴/۱۰۲)

اور (اے رسول!) جب تو خود اپنی جماعت کے ساتھ ہو، اور قیامِ صلوٰۃ کا انتظام کرے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ آکر تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھے۔ اور جب یہ سجدہ کر چکیں، تو تمہارے پیچھے چلے جائیں، اور دوسرا گروہ، جس نے ابھی تک صلوٰۃ ادا نہیں کی، تیرے ساتھ صلوٰۃ میں شامل ہو جائے۔ یہ بھی اسی طرح احتیاط برتیں اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھیں۔ اس لئے کہ تمہارے مخالفین تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم ذرا اپنے اسلحہ اور سامان سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ اس لئے تم ہتھیاروں کو حالتِ صلوٰۃ میں بھی الگ نہ کرو۔ ہاں اگر تمہیں بارش کی وجہ سے ایسا کرنے میں کوئی وقت ہو، یا مریض ہو، تو پھر ہتھیاروں کو الگ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی اپنی حفاظت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

ان مخالفین کے لئے، خدا کی طرف سے رسوا کن (نکست) کی سزا تیار رکھی ہے جو انہیں مل کر رہے گی۔ یہاں ایک اہم کلمہ قابلِ غور ہے۔ حضورؐ سے کہا یہ گیا ہے کہ **وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ**۔ ”جہاں یہ اجتماعِ صلوٰۃ ہو رہا ہو، اگو (اے رسول!) تو وہاں خود موجود ہو ان کی امامت کے فرائض ادا کرو۔“ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ جیوشِ مجاہدین کے کمانڈر۔ ان چیف بھی تھے اور اس حیثیت سے فوجوں کی قیادت فرمایا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا ارشادِ خداوندی سے مستنبط ہوتا ہے کہ فریضہ امامت، سربراہِ مملکت یا اس کی عدم موجودگی، کوئی

امامت نمائندگان حکومت کا فریضہ ہے

نمائند حکومت سرانجام دے گا۔ یہ جو ہمارے ہاں ائمہٴ مساجد کا تصور ہے، یہ مذہب کی نازکی امامت ہے۔ دین کی صلوٰۃ کے اجتماعات کا انعقاد اسلامی حکومت کی طرف سے ہوگا، اور ان کی امامت بھی عمالِ حکومت کا فریضہ ہوگی۔ جن اجتماعات میں اہم امورِ مملکت سے متعلق مشاورت مقصود ہوگی، انہیں خود سربراہِ مملکت یا دیگر نمائندگان حکومت ہی (CONDUCT) کر سکتے ہیں۔

اس آیت میں جنگ کی ہی ہنگامی حالت ہیں، مختصر شکل میں، صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ عام حالات میں اس کی ادائیگی

کا نہیں۔ اس کے بعد ہے:-

فَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۖ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَىٰ الْمُؤْمِنِينَ

کِتَابًا مَوْقُوتًا ۝ (۱۱۳)

جب تم اس طرح صلوٰۃ ختم کر چکو (تو یہ نہ سمجھو کہ تم فریضہ خداوندی سے بکدوش ہو گئے۔ صلوٰۃ تو تمہاری ساری زندگی کو محیط ہے۔ جو کچھ تم نے اس وقت کیا ہے وہ موقت اجتماع میں شرکت ہے جو کئی صلوٰۃ کا ایک جو وہ اس لئے تم اس کے بعد بھی اٹھتے بیٹھتے ایسے ہر وقت اور ہر حال میں، قانون خداوندی کو اپنے ساتھ رکھو (جیسا کہ ۱۱۳ میں کہا جا چکا ہے)

ذکر اللہ سے مراد اس میں دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ”ذکر اللہ“ نماز تک محدود نہیں۔ یہ مومنوں کی ساری زندگی کو محیط ہے، جیسا کہ آیات (۱۸۹-۱۹۰) میں گزر چکا ہے۔ سابقہ جلدوں میں جو کچھ ذکر کے متعلق کہا گیا ہے (دیکھئے ان جلدوں کا اندکس)۔ اس سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہ ”ذکر“ نہیں جس سے قلب پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ اس سے مراد زندگی کے ہر گوشے میں، ہر معاملہ میں، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا ہے صلوٰۃ کا اجتماع اس کلی ذکر کا ایک گوشہ ہے۔

سورہ جمعہ میں کہا گیا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَوَدَّىٰ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ** (۶۲) ”اے جماعت مومنین! جب صلوٰۃ جمعہ کے لئے تمہیں آواز دی جائے تو اپنا کاروبار چھوڑ کر“ ذکر اللہ کی طرف پیکر آ جایا کرو۔ اس کے بعد ہے: **فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝** (۶۳) ”جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر جہاں جی چاہے چلے جاؤ، اور تلاشِ معاش میں لگ جاؤ۔ لیکن وہاں بھی ذکر اللہ کو فراموش نہ کرو، بلکہ اور زیادہ شدت کے ساتھ اس پر عمل کرو۔ یہی فلاح اور کامیابی کی راہ ہے۔“ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ بھی ذکر اللہ کے لئے ہے اور ذکر اللہ کاروبار زندگی کے ہر گوشے میں جاری و ساری رہتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کو پیش نظر رکھنا۔ ان کے مطابق عمل کرنا۔

جمعہ کے دن کی چھٹی (ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن چھٹی کرنا شریعت کا حکم ہے۔ یہ تو ہمیں پتہ نہیں کہ یہ کونسی ”شریعت“ کا حکم ہے، لیکن یہ تو واضح ہے کہ اس دن کاروبار بند رکھنا قرآن کریم کی نصِ مریح کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب صلوٰۃ جمعہ کے لئے آواز دی جائے تو کاروبار چھوڑ کر اجتماع صلوٰۃ میں شرکت کے لئے پیکر آ جایا کرو۔ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ جمعہ سے پہلے کاروبار جاری رہے گا۔

اس کے بعد ہے کہ جب صلوٰۃ جمعہ ختم ہو جائے تو پھر کاروبار میں مصروف ہو جاؤ۔ اس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ جمعہ کے بعد بھی کاروبار بند نہیں ہوگا۔ کاروبار صرف صلوٰۃ کے وقت تک کے لئے بند رہے گا۔

❖

آیت (۳۳) میں صلوٰۃ کو مؤقت فریضہ قرار دیا گیا ہے یعنی یہ وہ فریضہ ہے جو وقت مقررہ پر ادا کیا جائے گا۔ جیسا کہ جلد اول میں بتایا جا چکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اجتماعات کے لئے جو وقت بھی مقرر کیا جائے (خواہ وہ اجتماعات فریضہ مؤقت کے معنی) انگامی ہوں اور خواہ نارمل (معمول کے مطابق) ان میں بروقت شرکت نہایت ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رُود سے وقت کی پابندی نہایت ضروری ہے خواہ وقت کسی مقصد کے لئے بھی کیوں نہ مقرر کیا جائے۔ جو قوم وقت کے معاملہ میں سہل انگار یا لاپرواہ ہوتی ہے، وہ کاروبار حیات میں ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ (جیسی کہ ہماری حالت ہے)۔ ہمارا ہاں نہ وقت کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ مقررہ وقت کی پابندی کی کوئی اہمیت۔ اور اس کا جو نتیجہ ہے، وہ ظاہر ہے۔ مغرب کی توہیں وقت کی پابندی سے کہیں کی کہیں جا پہنچی ہیں۔ سوچئے کہ زندگی کیا ہے؟ یہ وقت کے لمحات کے تسلسل ہی کا تو نام ہے۔ وقت کی اہمیت کے احساس کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور جب زندگی کی اہمیت ختم ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے قرآن کریم نے ”مؤقت فریضہ“ کہہ کر کتنی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں (PUNCTUALITY) پر زور دیا گیا ہے۔

❖

اجتماعات صلوٰۃ کے سلسلہ میں ان ہدایات کے بعد قرآن کریم پھر جنگ کے موضوع کی طرف آگیا اور فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ (۳۴)

اور دیکھو! میدانِ جنگ میں دشمن کا چھپا کرنے میں ہمتی نہ کرو۔ بات بالکل واضح ہے۔ اگر (لڑائی میں) تمہیں کچھ مشقت اٹھانی پڑتی ہے تو غریبی محنت

کو کسی اسی طرح مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ (لہذا اس باب میں تم اور وہ برابر ہو) لیکن نظامِ خداوندی کے قیام سے جو ثمرات و برکات تمہیں حاصل ہوں گی، وہ، انہیں تو حاصل نہیں ہوں گی، اس لحاظ سے تم ان کے مقابلہ میں، کہیں زیادہ فائدہ سے میں رہے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون، جو تمہیں اس قسم کے تاکیدِ احکام دیتا ہے، یہ نہیں اندھا دھند

ایسا نہیں کرتا۔ یہ احکام علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

جنگ یا دیگر کاروبار حیات کے سلسلہ میں کبھی کبھی ”ذکر اللہ“ کی یاد دہانی کی اہمیت کو ایک (ٹیش یا افتادہ سی) مثال کی رو سے سمجھئے۔ آپ نے کسی بڑھئی کو کام کرتے دیکھا ہوگا۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے کرتے، تھوڑے سے وقفہ کے بعد اپنے اوزاروں (رندہ، چوکی، آری وغیرہ) کو تیز کرنے لگ جاتا ہے۔ اوزاروں کا اس طرح تیز کرنا اس کے کام ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے بلکہ یوں کہیے اس کام کے بطریق احسن سرانجام دینے کا ذریعہ۔ کاروبار زندگی کے دوران وقتاً فوقتاً قوانین خداوندی کی تجدید یاداشت کا مقصد ہی ہے کہ ہم جملہ امور ان قوانین کے مطابق سرانجام دیں۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر آپ کسی بڑھئی کو دروازہ بنانے کے لئے روزانہ اجرت پر متعین کریں اور سارا دن اپنا رندہ تیز کرنے میں صرف کر دے تو کیا آپ شام کو اسے مقررہ اجرت دے دیں گے؟ آپ نے اجرت دروازہ بنانے کی دی تھی۔ رندہ تیز کرنا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ جب اس نے وہ مقصد پورا نہیں کیا تو وہ معاوضہ کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے متقی (خدا رسیدہ بزرگوں) کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے عبادت گزار ہیں۔ ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھتے ہیں اور وہیں لاکھ لاکھ دانے کی تسبیح پر وظیفہ کرتے ہیں۔ تو یہ سارا دن ”رندہ تیز“ کرتے رہنے والی بات ہوگی! دروازہ بنانے والی نہیں۔ ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ دین میں، شعائر اور ”عبادت“ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مذہب میں ان کی ادائیگی مقصود بالذات بن جاتی ہے۔ جلد سوم میں ضبط اعمال کا عنوان دیکھئے (صفحہ ۳۰۷) اور غور کیجئے کہ قرآن کریم اس حقیقت کو کیسے واضح گات انداز میں اجاگر کرتا ہے۔ اعمال کے بامقصد ہونے کا معیار قرآن کی رو سے یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا كُنتَ فِي الْأَعْرَاضِ (۱۳۱)

بقا اس میں کے لئے ہے جو نفع انسان کی منفعت کے لئے ہو۔

✽

جنگ ہو یا حالت امن، سربراہ مملکت اور دیگر ارباب حل و عقد کے سامنے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات آتے رہتے ہیں۔ ان کے فیصلوں کے متعلق اصولی حکم یہی ہے، کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں۔ اس لئے حضور کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

کتاب اللہ کے مطابق فیصلے ﴿۱۳۵﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ

النَّاسِ بِمَا أَسْرَكَ اللَّهُ ط وَلَا تَكُنْ لِلْخَافِيْنَ خَصِيْمًا ۝ (۳۳)

اسے رسول! تمہاری طرف یہ کتاب (ضابطہ قوانین) نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے اس علم کے مطابق کرو جو اللہ نے تمہیں اس طرح عطا کیا ہے۔ اور ایسا کبھی نہ کرو کہ دنیا باز اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔

اس نکتہ کی وضاحت کہ تمام اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں گے، مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر کی جا چکی ہے (بالخصوص دیکھئے جلد سوم - صفحہ ۹ - آیت ۲۱۳)۔ اس لئے اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا آیت زیر نظر کا آخری حصہ، سو اسی کے متعلق، آیت

خائفین کی وکالت مت کرو (۳۳) کے تحت بحث کی جائے گی۔

یہ حکم دینے کے بعد کہ معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جائیں گے، ایک ایسی اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی جو ہر فیصلہ کرنے والے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ فرمایا:

وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۳۴)

حکومت اور عدالت کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس میں انسان کے ذاتی میلانات فیصلوں پر اثر انداز ہو جایا کرتے ہیں۔ اس سے انسان اُسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ وہ، ہر وقت، قانونِ خداوندی کو اپنے ساتھ رکھے، اور اسی کے پیچھے پناہ لے۔ تم اسی طرح، اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے ہو۔ قانونِ خداوندی میں ایسی حفاظت اور مرحمت کا پورا پورا انتظام ہے۔

یہی ہے وہ احساس جس کی رو سے، ایک مومن حج اپنے فیصلوں میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ وہ دوسروں کے معاملات کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے کرتے وقت، اس کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے کہ خواص کا پاؤں جادہ عدل سے ادھر اُدھر نہ ہٹ جائے۔ دوسری ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے جو لزوم کے ساتھ کھڑے ہونے، اس کے حق میں گواہی دینے یا صفائی پیش کرنے کے لئے عدالت میں آئیں۔ ان سے کہا کہ:

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَافًا أَثِيْمًا ۝ (۳۵)

اس بات کو پھر سمجھ لو کہ جب ایک دوسرے سے، یا خود اپنی ذات سے، خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہو۔ خیانت کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس سے اسے کچھ مل گیا ہے، حالانکہ اس سے

اس کی ذات میں ایسی کمزوری آجاتی ہے جس سے اس کی انسانی صلاحیتیں مشعل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ راسی کو خود اپنی ذات سے خیانت کہتے ہیں۔ سو ایسے لوگ قانون خداوندی کی نگاہ میں کیسے پسندیدہ قرار پاسکتے ہیں؟

آیت (۱۱۲) میں کہا تھا کہ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِيَيْنِ خَصِيمًا۔ اور اب کہا گیا ہے کہ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَفُونَ أَنْفُسَهُمْ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خیانت دو قسم کی ہے۔ ایک خیانت دوسروں کے خلاف ہوتی ہے اور دوسری خیانت، انسان کی خود اپنی ذات کے خلاف۔ دوسروں کے خلاف خیانت تو کھلی ہوئی بات ہے لیکن خود اپنی ذات کے خلاف خیانت کو بھی اسی زمرہ میں شمار کرنا، قرآن ہی کا خاصہ تھا۔

خیانت، امانت کی ضد ہے۔ امانت کا مفہوم مطالب جلد سوم صفحہ ۱۶۴۔ آیت (۱۱۲) میں بتایا جا چکا ہے تجدید یادداشت کے لئے واضح کر دیا جائے کہ لفظ امانت کا مادہ امن ہے اس لئے امانت کے معنی ہونے میں کسی کے ساتھ کوئی بات یا کوئی معاملہ کر کے، اپنے آپ کو کامل امن اور اطمینان کی حالت میں پانا۔ یعنی دوسرے پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہونا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ کبھی اس کے خلاف نہیں کرے گا اور مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ مجھے اس کی طرف سے کسی خطرہ یا نقصان کا احتمال نہیں۔

اس کے برعکس خیانت ہے۔ یعنی کسی کے اعتماد کو توڑ دینا۔ بدعہدی کرنا۔ جو بھروسہ اس نے تم پر کیا تھا، اس پر

پورا نہ اترنا۔ عرب اس اعتماد شکنی کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کرتے تھے اور شاید آج بھی کرتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں خَانَ الدُّلَّو السَّرَّاءُ۔ رسی نے ڈول سے خیانت کی۔ اب تو ہمارے کنوئیں ہی ناپید ہو گئے ہیں اس لئے ہماری

نئی پود کی سمجھ میں یہ مثال مشکل آسکے گی۔ لیکن پرانے لوگ جانتے ہیں کہ کنوئیں سے ڈول کے ڈریے پانی نکالاجاتا تھا اور ڈول کے ساتھ رسی بندھی ہوتی تھی۔ پانی سے بھرا ہوا ڈول خاصا وزنی ہو جاتا ہے۔ اسے ہم اس بھروسے پر کھینچتے چلے جاتے ہیں کہ رسی اتنی مضبوط ہے کہ یہ ٹوٹ نہیں جائے گی۔ لیکن ذرا

تصور میں لائیے اس منظر کو کہ آپ پورے زور سے ڈول کھینچ رہے ہیں کہ عین درمیان میں رسی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس ڈول کا پانی میں گرنا تو ایک طرف، بسا اوقات ڈول کھینچنے والا بھی کنوئیں میں گر جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں رسی کے اس عمل کو خیانت کہتے ہیں۔ یعنی رسی کے جس اعتماد پر ڈول کرکھینچا جا رہا تھا، اس نے اس اعتماد کو پورا نہ کیا۔ اس نے خیانت کی۔

اس سے خیانت کا پورا پورا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جس معاشرہ میں ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہے، اس میں تمام

معاشرہ جس عدم اطمینان کے جہنم میں زندگی بسر کرتا ہے، اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

یہ تو رہا دوسروں کے ساتھ خیانت کا معاملہ۔ جہاں تک خود اپنی ذات کے خلاف خیانت کا تعلق ہے، وہ معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ آپ اپنے ساتھ وعدہ کرتے ہیں ”میں جھوٹ نہیں بولوں گا“ اور اس کے بعد آپ اس عہد پر قائم نہیں رہتے۔ یہ اپنے ساتھ خیانت ہے۔ اس سے آپ کی خود اعتمادی باقی نہیں رہتی۔ اس سے آپ کی قوتِ ارادی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں خود اعتمادی نہ ہو، اس پر دوسرے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟ اور قرآن کریم تو خَائِنَتِ الْأَعْيُنِ (ہم) نگاہ کی خیانت تک کو انسان کا خود اپنے خلاف جرم قرار دیتا ہے۔ جذباتی ”مجبوریاں“ نگاہوں کی خیانت کا موجب بنتی ہیں۔ اور یہ ”مجبوریاں“ درحقیقت قوتِ ارادی کی کمزوری کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ مگر نے اس درویدہ نگہی کو کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے جیسا کہ اس کے

کس قدر حسن بھی مجبور کشاکش ہے کہ، آہ! سر جھکائے نہ سینے، آنکھ اٹھائے نہ بنے

خیانت قوتِ ارادی کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، یا (بالفاظِ دیگر) خیانت سے قوتِ ارادی کمزور اور مضطرب ہو جاتی ہے دیکھئے قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ ”إِنَّ الدُّلَّةَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوًّا اٰثِيْمًا“ اس حقیقت کو کس طرح واضح کاف کیا ہے اثم کے معنی ہیں ہر وہ کام جو اضلال، افسردگی اور کمزوری پیدا کر دے۔ (دیکھئے، نڈکس میں اثم) خَوًّا (جس پر بھروسہ نہ کیا جاسکے) اثم ہوتا ہے!

یہ نور پا خائن۔ قرآن کہتا ہے کہ خیانت کرنے والے کی حمایت اور وکالت کرنے والا بھی برابر کا مجرم ہوتا ہے۔ اور یہاں سے قرآن کریم کے نظامِ عدل کا ایک اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔

یوں تو خلافِ قرآن نظامِ (باطل) کا ہر گوشہ جہنمِ باغوش ہوتا ہے لیکن اس میں نظامِ عدل کو خاص اہمیت حاصل ہے اس نظام کے غلط (یعنی قرآن کے خلاف) ہونے سے معاشرہ کا سارا توازن بگڑ جاتا ہے اور کوئی شے بھی اُس مقام پر نہیں رہتی جس مقام پر اسے ہونا چاہئے (اسے ظلم کہتے ہیں)۔ اس باطل نظام میں وکالت کا پیشہ بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں وکیل کو مقدمہ لینے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ خائن اور امین (خفدار اور غیر مستحقِ ظالم اور مظلوم) میں تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ امین کے مقابلہ میں خائن کا مقدمہ زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ بڑے بڑے نامور

وکالت کا پیشہ

وکلاء کی خصوصیت ہی یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سنگین ترین جرائم کے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب اس قسم کے فرائض ذریعہ معاش بن جائیں تو اس سے تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں سے پھر نظامِ عدل کے ڈانڈے معاشی نظام سے جاملتے ہیں۔

قرآنی نظامِ عدل میں وکلاء کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ (خائن کی کوئی وکالت نہیں کر سکتا اور امین کو کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہوتی)

یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی جہاں قرآن کے نظام عدل کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوگی۔

اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجرم اگر وکالت کے زور پر مواخذہ سے بچ بھی جائے۔ یا غیر مستحق اپنے حق میں فیصلہ لے لے تو اسے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مواخذہ سے بچ گیا۔ وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ اسے یاد رکھنا چاہئے کہ ان دنیاوی عدالتوں سے اوپر ایک اور عدالتِ عالیہ بھی ہے جس میں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ اس عدالت میں نہ کوئی بات چھپائی جاسکتی ہے۔ نہ کسی کی وکالت کا کوئی زور چل سکتا ہے۔ فرمایا:

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُكَلِّمُونَ مَالًا يُوْضِي مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا - (۴۰)

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم، اپنے جرائم، لوگوں سے چھپا سکتے ہیں، اس لئے ہم پر کیا گرفت ہوگی؟ لیکن یہ خدا کے قانون کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہیں؟ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ چھپ کر، ناپسندیدہ امور کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ (۴۰)

یہ تو رہا مجرموں کے متعلق۔ اب ان کی وکالت کرنے والوں کے متعلق کہا:

هَآأَنْتُمْ هُوَ لَا جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا - (۴۱)

قانونِ مکافات کے علی الرغم وکالت کیا کر سکتی ہے

(یاد رکھو: خدا کا قانونِ مکافات ایسا نہیں کہ اس کا سلسلہ صرف اسی

دنیا تک محدود ہو کہ اگر کسی نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ یہاں قانون کی گرفت سے بچ جائے، تو وہ مواخذہ سے چھوڑ گیا۔ بالکل نہیں، ہر مجرم کا اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوتا ہے (۴۱)۔ اور انسانی ذات اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی اس کا سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ اس لئے انسان کے اعمال کے نتائج مرنے کے بعد بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ بنا بریں، اگر تم کسی مجرم کے طرفدار بن کر، اس کی طرف سے، اس دنیاوی زندگی میں جھگڑتے ہو اور اسی طرح اسے غلط بیانیوں سے، قانون کی گرفت سے بچا بھی لیتے ہو، تو یہ بتاؤ کہ اس کے اعمال کے ظہور نتائج کے وقت، اس کی طرف سے کون جھگڑ سکے گا، اور کون اس کی وکالت کے لئے کھڑا ہو سکے گا؟

اس مواخذہ کے نقصان سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَكْبِدِ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا - (۴۲)

تم اس حکم اصول کو یاد رکھو کہ جرم کسی اور کے خلاف سرزد ہو، یا خود اپنی ذات کے خلاف، (مثلاً قلب و نگاہ کی خیانت۔ برے ارادے، تخریبی اسکیمیں وغیرہ) تو، تم دنیاوی قانون کی گرفت میں آ جاؤ یا اس سے بچ جاؤ۔ قانونِ خداوندی کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ اس خطا کے ازالے کی صرف ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اپنے کئے پر نادم ہو۔ آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کرو (۱۱۱)۔ اور جتنا بڑا تم نے جرم کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ بھلائی کے کام کرو (۱۱۲)۔

جرم خود اپنے خلاف | تو بڑا و مغفرت کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے چار لفظوں میں ایک ایسا اصول بیان کیا ہے۔ جو جرم و سزا کے فلسفہ اور علم النفس کے رموز و اسرار کے سلسلہ میں اساسِ حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز اس پر خدا کے قانونِ مکافات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ کسی کے خلاف زیادتی کرنے والا بڑے عم خویش سمجھتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے خلاف زیادتی کر رہا یا کسی اور کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ لیکن وہ اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کسی دوسرے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے خلاف جرم کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۱۱۱)

اسے پھر سن لو کہ جو شخص جرم کرتا ہے، اس جرم کا اثر خود اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جرم دوسرے کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت، خود اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر، خدا کا مالک ہی زائل کر سکتا ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (معاشرہ کا نظام عدل، جرم کی جو سزا دے گا اس سے اس نقصان کا ازالہ وہ خود ہی کر سکتا ہے۔ یعنی قلبی ندامت اور زیادہ سے زیادہ حسنات (اچھے کاموں) کے ذریعے (۱۱۲)) اس حقیقت پر ایمان رکھنے والا مومن کہلاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس کا اس حقیقت پر ایمان ہو وہ کبھی کسی جرم کے ارتعاب کا خیال تک بھی دل میں لاسکتا ہے؟ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ معاشرہ جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ایمان جو قرآن کے نظام عدل کی بنیاد قرار پاتا ہے۔

غالبِ خدا سے ”ناکردہ گناہوں“ کی حسرت کی واد چاہتا تھا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی لے داؤ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ملے
یہ محض شاعری ہے۔ جسے وہ ناکردہ گناہ کہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے خلاف سرزد نہ بھی ہوئے پاسے ہوں لیکن
وہ خود اپنی ذات کے خلاف تو سرزد ہو جاتے ہیں۔ جس جرم (گناہ) کی خواہش آپ کے دل میں پیدا ہو گئی اگر کسی وجہ
سے اس کا ارتکاب نہیں ہو سکا تو بھی آپ کی ذات کے خلاف اس کا ارتکاب ہو گیا۔ اس پر اس کا اثر پڑ گیا۔ اس سے اُس نے
اپنا نقصان کر لیا۔ اور جو اپنا نقصان اس نے خود آپ کیا ہے اس کا ازالہ بھی وہ خود ہی کر سکتا ہے۔

جرم خود کرے اور اسے تھوپ دے دوسروں کے سر | ایک طرف تو یہ لوگ ہیں کہ جس
جرم کا انسان کے دل میں خیال

تک بھی آگیا حالانکہ وہ سرزد نہیں ہوا (وہ اپنے آپ کو اس کا بھی مجرم گردانتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ
بھی ہیں جو جرم کے مرتکب خود ہوتے ہیں لیکن اسے تھوپ دیتے دوسروں کے سر۔ اس سے وہ دوسرے جرم کے
ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔

۴۳
۱۱۲ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِي بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا
إِثْمًا مُّبِينًا (۴۳)

اس بنیادی حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد تم سوچو کہ اگر کوئی شخص جرم یا خطا خود کرے اور اسے تھوپ دے کسی
دوسرے بے گناہ کے سر، تو یہ بجائے خویش کننا بڑا جرم ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اوپر دوہرا بوجھ لا دیتا ہے۔
ایک تو اس جرم کا بوجھ جو اس سے سرزد ہو گیا تھا، اور دوسرا اُس بُہتان کا بوجھ جو اس نے دوسرے پر لگا دیا۔
اس قسم کے بلند بالا اصولوں پر مبنی ضابطہ ہدایت کا ل جانا، فی الحقیقت خدا کا افضل عظیم اور اس کی رحمت عظیم ہے
انسانوں کا وضع کردہ ضابطہ قوانین ظاہر اور مرمی جو اُن تک کو محیط ہو سکتا ہے۔ انسانی جذبات پر کنٹرول اس کے بس کی
بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے جو انسانی نظام عدل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عدل کی کار فرمائی ارتکاب جرم کے
بعد شروع ہوتی ہے۔ جو جرم سرزد نہیں ہوا وہ عدل کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن قرآنی قانون مکافات پر
ایمان رکھنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ اگر کسی جرم کا خیال تک بھی ان کے دل میں گزر رہا ہو تو اپنے آپ پر
خود سزاوارد کر لیتے ہیں۔ اس قسم کا ضابطہ عدل خدا ہی کی طرف سے مل سکتا تھا۔

۴۴
۱۱۳ وَلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضْلَوْكَ وَ مَا يُضِلُّونَ
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَ مَا يُضْرُونَكَ مِنْ شَيْءٍ ط وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (۴)

یہ تو خدا کا خاص فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں اس قسم کا ضابطہ ہدایت دے دیا جس میں ان تمام امور کے متعلق واضح ہدایت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین خداوندی کی حکمت، غرض اور غایت کیا ہے، اور اس طرح تمہیں وہ کچھ سکھا دیا جو تم (نہا عقل کی رو سے) کبھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔ اگر تم پر خدا کا یہ فضل نہ ہوتا تو منافقین کا ایک گروہ اس کا تہیہ کر چکا تھا کہ تمہیں صحیح راستے سے بھٹکا دے۔ اب اس قسم کے ارادوں سے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خود اپنے لئے سالانہ طاقت بہم پہنچاتے ہیں۔

اور خدا کا یہی فضل اور رحمت تھی جس نے اس جماعت مومنین کو منافقین کی ریشہ و اینیوں اور وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رکھا ورنہ یہ حربہ ایسا تھا جس کی مدافعت انتہائی مشکل تھی۔ ان کی ان سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نُّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنَ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ لِّبَيْنِ النَّاسِ ط وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (۴)

یہ منافقین (جماعت مومنین سے الگ ہو کر) باہمی مشورے کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ مشورے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی۔ مشورے وہی چھپے ہوئے ہیں جو رفاہ عامہ کے کسی کام کے لئے عطیات دینے کے لئے ہوں۔ یا مہاشورے کے ان کاموں کے متعلق جنہیں قانون سمیع تسلیم کرے یا لوگوں کی اصلاح کی خاطر ہوں۔ جو لوگ ایسا کریں — اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس میں ذاتی تعلق کا خیال نہ ہو، خالصتہً لوجہ اللہ ہو۔ تو ایسے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ خوشگوار ہوگا اور انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔

مشوروں کا مقصد | نجوی کے معنی میں عام لوگوں سے الگ ہٹ کر آزادانہ طور پر مشورہ کرنا اسلامی نظام کا کاروبار باہمی مشاورت سے عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس مشاورت میں بعض اوقات

ایسے امور بھی آجاتے ہیں جنہیں سر دست عام نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے لئے کھلے بندوں کے بجائے (PRIVATE) میٹنگز کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ خیر (نوع انسان کی منفعت اور بھلائی) کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس منافقین جو میٹنگ کرتے ہیں تو وہ خفیہ سازشوں کے طور پر ہوتی ہیں۔ وہ خیر نہیں، شر ہے۔ دیکھئے! مقصد کا فرق ایک ہی عمل کو کس طرح خیر سے شر اور شر سے خیر بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کو متنبہ کر دیا کہ وہ منافقین کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ان کی سازشوں کو کامیاب نہ بنانے

میں ان کے معادن و مددگار نہ بن جائیں۔ اس سے اسلامی نظام کو سنت نقصان پہنچے گا۔

۴
۱۱۵

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ
تُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَتُضْلِخْ جَهَنَّمَ ۚ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (۴/۱۱۵)

اور جو شخص ایسی واضح راہنمائی کے بعد بھی الرسول (اسلامی نظام) کی مخالفت میں شریک ہو جائے اور جو راستہ جماعتِ مؤمنین (اسلامی نظام) باہمی مشورہ سے طے کرے (۴/۱۱۵) اس کے خلاف جائے اور مخالفین کی راہ اختیار کرے تو جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ جس منزل تک پہنچائے گی وہ وہیں پہنچے گا۔ یعنی جہنم میں جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ہمیں اس قسم کی آیات کے سمجھنے میں جو وقت پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم نے ایک جماعت (ریاست) کی تشکیل فرمائی جو حقیقی مؤمنین پر مشتمل تھی۔ بعض سازشی مسلمانوں کا بہرہ و بدلہ ان میں شریک ہو جاتے تھے۔ لیکن جب وہ اپنی کرتوتوں سے بے نقاب ہو جاتے تو انہیں اس جماعت سے نکال دیا جاتا تھا۔

لیکن ہماری آج حالت یہ ہے کہ ہم صدرِ اول کی جماعتِ مؤمنین کی طرح ایمانِ خالص اور عملِ صالح کی بنیاد پر کسی جماعت (ریاست) کے افراد نہیں بنے۔ ہم مسلمان نام رکھانے والی قوم میں پیدا ہو گئے اس لئے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم (مسلمانوں) میں اور صدرِ اول کی جماعتِ مؤمنین میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن کریم نے جو عیوب و ذائم مشرکین، کفار، منافقین، اہل کتاب کے گناہے ہیں وہ سب ہم میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم میں جماعتِ مؤمنین کی راہ اور مسلمانوں کی راہ الگ الگ ہیں۔ یہاں جماعتِ مؤمنین کی راہ سے ہی نہیں اس لئے اس راہ کو چھوڑ کر نئی اور دوسری راہ کو اختیار کر لینے کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ ہم (مِنَ الْبَيْتِ الْقَوْمِ) جہنم کی طرف لے جانے والے راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ ہم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔

سبیل المؤمنین

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ جو "غیر سبیل المؤمنین" اختیار کرے گا وہ جہنم میں جائے گا تو ہمارے ہاں اس کے عجیب و غریب معنی لئے جاتے ہیں۔ یہاں ہر فرقہ اپنے مسلک کو سبیل المؤمنین قرار دیتا ہے اور دوسرے فرقوں کے مسلک و مشارب کو غیر سبیل المؤمنین ٹھہراتا ہے۔ جو فرقہ آبادی کے لحاظ سے شرکت میں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سبیل المؤمنین سے مراد مسلمانوں کی اکثریت کا راستہ ہے۔ یعنی وہ مؤمنین اور غیر مؤمنین کی راہوں کا تعین مردم شماری کے حساب سے کرتا ہے۔ اور قرآن سرے سے فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔

اس آیت میں سبیل المؤمنین سے مراد یہ ہے کہ اسلامی نظام میں باہمی مشاورت سے جو فیصلہ کیا جائے اس کا

اتباع جماعت کے تمام افراد کے لئے لازمی ہوتا ہے (اس کو اجماع امت کہا جائے گا) جو شخص اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار اس جماعت میں نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی روش تو اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ہوگی۔ یہ مراد ہے ”سبیل المؤمنین“ سے نہ کہ موجودہ مسلمانوں کے کسی فرقہ کی راہ، بان کی اکثریت کی راہ۔ ہماری اکثریت جس راستے پر آچکی ہے۔ اس کے متعلق کچھ نہ کہنا بہتر ہے۔



بات منافقین کی ہو رہی تھی۔ منافقت کے متعلق ہمارے ذہن میں اتنا ہی ہے کہ دل میں کچھ اور اور ظاہر میں کچھ اور۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس دورخی پالیسی کا جذبہ محرکہ کیا ہوتا ہے؟ مفاد پرستی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ رہنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ اور جب دیکھتے ہیں کہ تمہارے مخالفین کے ساتھ مل جانے سے زیادہ فائدہ کی توقع ہے تو ادھر چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی طبیعت نگین پر غور کریں کہ وہ اسے بھی شرک قرار دیتا ہے۔ یعنی اپنے مفاد کی

منافقت شرک ہے

خاطر آقاؤں کو بد لینا، اور یہ میزان خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اس لئے کہا کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ۗ وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًاۙ﴾ (۱۱۴)

غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ منافقین کی یہ روش درحقیقت شرک کے مرادف ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا کہ جن باتوں میں تمہیں فائدہ نظر آئے، ان میں خدا کے قانون کا اتباع کرو اور اس جماعت کے ساتھ ساتھ چلو جو اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے عمل پیرا ہے۔ لیکن جب اپنا مفاد، کسی دوسرے طریق میں نظر آئے، تو اس جماعت اور نظام کا ساتھ چھوڑ کر، جھٹ دو مری راہ اختیار کرو۔

انسان کی معمولی لغزشیں اور خطائیں قابل معافی ہوتی ہیں، اور جو شخص (قانون کے مطابق) معافی چاہے، اسے معافی مل سکتی ہے۔ لیکن شرک ایسا جرم عظیم ہے جس سے معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ (۱۱۴)۔ یہ تو خدا کے مقابلہ میں متوازی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ روش، انسان کو صحیح راستے سے دور لے جاتی ہے۔ بہت ہی دور۔

قابل اعتماد وہی انسان ہوتا ہے جو اصول پرست ہو۔ لیکن اس کے برعکس جذبات (مفاد) پرست انسان پر بھروسہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قوانین خداوندی کو چھوڑ کر یہ لوگ بن لوگوں کے ساتھ جا ملتے

ہیں۔ ان کا سہارا بھی بڑا کمزور ہوتا ہے۔ ان دونوں کے دل میں چور ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایک دوسرے سے بھی مخلص نہیں ہوتے۔

﴿۴﴾ **اِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ الْاِلٰهِ اِنْتَاۤءَ وَاِنْ يَدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا** (۱۱۴)

اس طرح شرک کرنے والے، خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے، اور ان کے پیچھے چلتے ہیں — خواہ وہ خود اپنے

جذبات ہوں (۴/۱۱۴) یا مذہبی پیشوا (۴/۱۱۵) وہ بے حد بردے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی قنوت نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں،

قزاقین خداوندی سے سرکشی برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی کوششیں، صیغ نائج و ثمرات سے محروم رہتی ہیں۔ (۴/۱۱۶)

شیطان مرید | اس آیت میں شیطان کو مرید کہا گیا ہے۔ (مریم کے زہر کے ساتھ) اس کے معنی سرکش کے بھی ہیں اور اس درخت کے بھی جس کے پتے نہروں۔ جو ٹنڈنڈ رہ گیا ہو۔ اس نہج سے

میں نے اسے شاخ خزاں دیدہ سے تعبیر کیا ہے۔ مفہوم اس کا برقم کی خوشگوار یوں سے محرومی ہے شیطان کو جبریلین اور رحیم کہا گیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ لعنت کے اعتبار سے اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی ہے۔ یعنی

﴿۴﴾ **لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَا يُخٰذِلُكَ عِبَادٌ لَّكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا** (۱۱۸)

شاخ خزاں دیدہ یا بنجر زمین کی طرح محروم — اور تمہیں معلوم ہے کہ ان کے مذہبی پیشوا، انہیں ان

راستوں کی طرف کیوں لے جاتے ہیں؟ محض اس واسطے کہ خدا کے بندوں کی کمائی میں سے، ایک مقررہ حصہ (مفت

میں) خود لے لیں — چند میسوں کی خاطر اتنی بڑی قبیح حرکت! کیسی ملعون ہے یہ زندگی اور کتنے مذموم ہیں یہ

مقاصد

مذہبی پیشوا | اس سے واضح ہے کہ یہاں شیطان کا کردار مذہبی پیشوا ادا کرتے ہیں جنہوں نے مذہب کو ذریعہ معاش

بناد رکھا ہے۔ وہ عوام کو اپنے دام فریب میں باخوذ رکھنے کی خاطر انہیں طرح طرح کی توہم پرستانہ

رسوم میں الجھائے رکھتے ہیں۔

﴿۴﴾ **وَلَا ضَلٰلَہُمْ وَلَا مَنٰیئَہُمْ وَلَا مَرَنَہُمْ فَلَيَبْتَکُنَّ اٰذَانُ الْاِلٰہِ نَعَامٌ وَلَا مَرَہُمْ** (۱۱۹)

نہم فلیغیرون خلق اللہ ط و من یتخذ الشیطن ولیا من دون اللہ فقد

خسر خسرا نأما مینا۔ (۴/۱۱۹)

انہوں نے یہ غلطی — باطل عقائد اور توہم پرستانہ رسومات تجویز کر رکھی ہیں

توہم پرستی | محض اپنی ذاتی منفعت کی خاطر، لیکن لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مرادیں پوری ہو جائیں گی۔

اُن کی آرزوئیں برائیں گی اس کے لئے، کبھی ان سے کہتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے جانوروں کے کان چیرا کریں۔ اور کبھی یہ کہ وہ اشیائے فطرت میں یوں تغیر و تبدل کر دیا کریں۔ ————— وہ اپنے مفاد کی خاطر انہیں اس قسم کی توہم پرستیوں میں الجھائے رکھتے ہیں، اور یہ (ان کے متبعین) اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے، ان کو رکھ دھندوں میں الجھے رہتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جو قوم، عقل و بصیرت اور قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر، اس قسم کا توہم پرستانہ مسلک اختیار کرے اور ان پیشواؤں کو، اپنا کارساز اور رفیق بنائے، تو اس کا نتیجہ، کھلی ہوئی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ مذہبی پیشوا اور پیرانِ طریقت اپنے متبعین سے اسی دنیا کی مرادیں بر لانے کے وعدے ہی نہیں کرتے۔ انہیں جنت میں لے جانے کا فریب بھی دیتے ہیں۔

﴿۴۱۲﴾ یَعِدُّهُمْ وَيُؤْتِيهِمْ ط وَمَا يَعِدُّهُمْ الشَّيْطَانُ إِلَّا عُرْوًا - (۴۱۲)
شیطان (کے یہ نمائندے) لوگوں کو جنت کے وعدے دیتے اور اُن کی آرزوئیں بر لانے کے مژدے سناتے ہیں لیکن ان کے یہ تمام وعدے اور مژدے، دھوکا اور فریب ہیں۔

وعدے تو کرتے ہیں ان سے جنت، کہے، اور جس راستے پر خود چلتے اور انہیں چلاتے ہیں۔ وہ انہیں سیدھا جہنم میں لے جاتا ہے۔

﴿۴۱۳﴾ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ زَوْلًا يَحْدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا - (۴۱۳)
ان کا انجام جہنم کی تباہی ہے جس سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے ان کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں تو ان کی زندگی جنت کی ہوتی ہے۔

﴿۴۱۴﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا - (۴۱۴)
جنت کی زندگی

ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے متبعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، تو یہ لوگ ابدی شادابیوں کی جنت کی زندگی بسر کریں گے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ————— یہ خدا کا وعدہ ہے جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کوئی ہو سکتا ہے۔

جنت خوش فہمیوں سے نہیں مل سکتی | لیکن جنت کی زندگی خوش فہمیوں سے نہیں مل سکتی۔ اہل کتاب

اسی خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ جنت انہی کے لئے رہبر و ہدایت

ہے۔ اسی طرح اگر تم بھی یہ سمجھ لو کہ جنت فقط مسلمان کہلانے سے مل جائے گی تو یہ بھی خود فریبی ہے۔ جنت فقط حسین

آرزوؤں کے نتیجے میں نہیں مل جاتی۔ یہ کن جانکاہ مشقتوں کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل کے

ساتھ لکھا جا چکا ہے (انڈکس دیکھئے)۔ خاص مقامات میں تو قرآن ان میرزا ماحصل کی تفصیل دیتا ہے لیکن عام طور پر وہ

اس کے لئے "ایمان اور اعمال صالح" کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

۱۲۳ ﴿يُؤْتِي السَّلَاطَ بِأَمَانٍ نَّبِيِّكُمْ وَلَا أَمَانٍ أَهْلِ الْكِتَابِ ط مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِ بِهِ لَا

وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا يَصِيرُ ۝ (۱۲۳)

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگی کی شادایاں اور خوشگواریاں، تمہاری آرزوؤں کے مطابق مل سکتی ہیں۔

ذہنی مخالفت کی۔ اس میں کسی کے ذاتی جذبات کا سوال ہی نہیں۔ یہ سب ایک محکم اور غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتا ہے

اور وہ قانون یہ ہے کہ جو کوئی غلطہ روش اختیار کرے گا، اُس کے نتائج بھگنے گا۔ وہ ہزار جتن کرے کہ اسے کوئی

ایسا دوست اور مددگار مل جائے جو اسے ان تباہیوں سے بچائے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اُسے ان تباہیوں سے

خدا کا قانون بچا سکتا تھا جس سے اس سے سرکشی اختیار کو لی تھی۔

و اس کے بعد کہتا ہے:

۱۲۴ ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ (۱۲۴)

اس کے برعکس، جو شخص قانون خداوندی کی صداقت

پر یقین رکھے اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت نخب

جنت مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں

پر وگرام پر عمل پیرا ہو — وہ مرد ہو یا عورت — ایسے لوگ زندگی کی شادایوں سے بہرہ یاب ہوں گے

اور ان کی محنت کے ماحصل میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ ایسا کرنا ظلم ہوگا۔ اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

اور یہ جنت نظام خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس دین کا مخلص دو لفظوں

میں سنا کر بیان کر دیا۔

۱۲۵ ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا

وَ اتَّخَذَ اللَّهُ اِبْرٰهِيْمَ حَلِيْلًا - (۱۲۵)

ملت ابراہیمی

ان تصریحات کے بعد، ان سے پوچھو کہ اُس نظام زندگی سے زیادہ حسین اور کونسا نظام ہو سکتا ہے جس میں ہر فرد اپنے جذبات، توجہات، بلکہ پوری کی پوری ذات کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے، اور پھر نہایت حسن کار انداز کی زندگی بسر کرے۔ یعنی اُس مسلک کا اتباع کر جسے ابراہیمؑ نے تمام غیر خداوندی سمجھتوں سے منہ موڑ کر اختیار کیا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دست اور رفیق بنا لیا تھا۔ سوچئے کہ جس شخص کو خود خدا اپنی رفاقت کے لئے چن لے، اُس سے زیادہ خوش بخت اور کون ہو سکتا ہے؟ یہی خوش بختی تمہارے حصے میں بھی آ سکتی ہے۔

”مَنْ اَسْلَمَ وَ جَاهَدَ لِلّٰهِ“۔ یہ ہے اسلام۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دینا۔ یہی مسلک ابراہیمی تھا۔ قرآن کریم نے اس مسلک کی وضاحت کس طرح کی ہے۔ اور ملت اسلامیہ کو اس کے اتباع کی تاکید کیوں کی ہے، اس کے لئے سابقہ جلدوں میں، عنوانات ابراہیمؑ، کعبہ۔ حج۔ دیکھئے۔

جس نظام کے سامنے تسلیم خم کرنے کا حکم مؤمنین کو دیا یہ وہی نظام ہے جو طواغیٹ کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی کامل اطاعت۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا - (۱۲۶)

یہی وہ نظام ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ جہاں ہر شے خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اور خدا کا قانون، ان اشیاء کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ کوئی بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اگر انسان بھی یہی روش اختیار کرے تو اس کا نظام زندگی اسی حسن و خوبی سے چل سکتا ہے۔ جس حسن و خوبی سے نظام کائنات چل رہا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کائنات میں یہ کچھ مجبوراً ہو رہا ہے اور انسان اسے اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرے گا جس سے اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ یعنی معاشرہ کی زندگی بھی جتنی ہوگی اور افراد کی ذات کی تکمیل بھی ہوتی جائے گی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن کریم عالمی زندگی کی اہمیت پر بڑا زور دیتا ہے اور اس لئے اس نے اس شعبہ زندگی کے متعلق احکامات بڑی تفصیل سے عطا کئے ہیں۔ متعدد ازواج کے سلسلہ میں اسی سورت کی آیت (۱۲۶) میں اصولی

ہدایات دی گئی ہیں (وہاں جلد سوم کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں مزید تفصیلات ملیں گی)۔ اگلی آیت (۴/۱۳۴) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس آیت کا ذکر (جلد سوم - صفحہ ۳۷۲ پر) آچکا ہے۔ اس لئے اس کے صرف مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

وَيَسْتَأْذِنُكَ فِي النِّسَاءِ ط قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ط وَمَا يُنْثَلِ عَلَيْكُمْ
فِي الْكِتَابِ فِي يَتِمَى النِّسَاءِ (الَّتِي لَا تَوْلَوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ
تَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُومُوا
لِلْيَتَامَى بِالْقِسْطِ ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا - (۴/۱۳۴)

یتامی النساء یہی وہ نظام ہے جس کے ایک گوشے (معاشرتی اور عائلی زندگی) کے متعلق کچھ احکام پہلے (ابتداءً) سورۃ میں دیئے جا چکے ہیں۔ اسی ضمن میں، اسے رسول! لوگ تجھ سے عورتوں کے بارے میں مزید باتیں دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان امور کے متعلق، اللہ تمہیں، ان احکام کے تسلسل میں جو پہلے دیئے جا چکے ہیں، مزید احکام دیتا ہے۔ یہ احکام یتیم لڑکیوں یا ان عورتوں کے متعلق ہیں جو بلا حاد و ندرہ جائیں (بیوہ ہو کر یا ویسے ہی خاوندز مٹنے کی وجہ سے) (۴/۱۳۴)۔ تم ان کا وہ حق، نو دیتے نہیں جو قانون خداوندی نے ان کے لئے مقرر کیا ہے اور چاہتے یہ ہو کہ انہیں اپنے نکاح میں لے آؤ۔ یہ غلط ہے۔ ان کے واجبات انہیں ضرور دو۔ یہی حکم ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہے جو بے کس اور ناتوان رہ جائیں۔ مختصر یہ کہ یتیم کوئی بھی ہو — عورتیں ہوں، لڑکیاں ہوں، یا لڑکے ہوں — ان کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرو۔ بلکہ انصاف سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر، ان سے حسن سلوک کرو۔ جو بھلائی تم ان کے ساتھ کرو گے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ خدا تمہارے ہر عمل کا علم رکھتا ہے۔

آیت (۴/۱۳۴) میں عام عورتوں کی طرف سے سرکشی کے سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی بیوی کو اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی کا احتمال ہو تو اس صورت میں معاف نہ کیا اقدامات کرے۔ آیت (۴/۱۳۴) کی تشریح مطالب الفرقان - جلد سوم - صفحہ ۲۶۵ (زیر آیت (۲/۲۱۱) آچکی ہے اور آیت (۴/۱۳۴) کی تشریح اسی جلد میں صفحہ ۲۸۵ (۲/۲۱۱) میں۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ مردوں کی طرف سے نشور کا مسئلہ بھی عدالت کے طے کرنے کا ہے۔

اس سے اگلی آیت (۴/۱۳۵) بھی تعدد افواج کی صورت میں عدل کا ذکر آیا ہے۔ یہ مطالب جلد سوم - صفحہ ۲۸۵ (زیر آیت (۲/۲۱۱) آچکی ہے۔ اس کی مزید تشریح کی بھی ضرورت نہیں۔

اس سے اگلی آیت طلاق کے متعلق ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو مطالب جلد سوم - صفحات ۲۹۵ - ۲۸۵

گورچکی ہے۔ لیکن وہاں یہ آیت (۴۳) نہیں آئی اس لئے اسے مع مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔

[۴۳] وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهِ ط وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا۔ (۴۳)

طلاق کی صورت میں معاش کا انتظام | لیکن اگر باہمی بناء کی صورت میں ہر سے (اور مصالحتی کوششیں بھی ناکام رہ جائیں) تو اس کا علاج علیحدگی

(طلاق) کے سوا کچھ نہیں۔ تم اس علیحدگی (طلاق) سے اس لئے زور کے رہو کہ اس سے معاشی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ زمر داری نظام خداوندی کی ہے کہ اپنے وسیع ذرائع سے تم دونوں کی ضروریات کا سامان بہم پہنچائے۔ اس نظام کی بنیادی وسعت و حکمت پر ہے۔

سورہ الطلاق میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ تم سامانِ معیشت کے متعلق متفکر نہ ہو اسلامی معاشرہ اس کا انتظام کر دے گا۔

(۴۵)۔ اس سلسلہ میں خارجی کائنات پر نگاہ ڈالو۔

[۴۶] وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ اتَّقُوا اللَّهَ ط وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَمِيدًا۔ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا۔ (۴۶)

خارجی کائنات میں نظام ربوبیت | تم خارجی کائنات میں نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہر سے نظام خداوندی کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے، اودان کی

کس طرح نشوونما ہوتی جا رہی ہے! اسی لئے ہم نے، ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے ضوابط قانون دیئے تھے، کہا تھا، اور وہی بات اب تمہیں کہنے ہیں کہ تم ہمیشہ قوانین خداوندی کی نگہداشت رکھو۔ اس میں تمہاری بھلا ہے۔ اگر تم نے اس روش سے انکار کیا تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کا سلسلہ کائنات بدستور اسی طرح چلتا رہے گا۔ اُسے خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں۔ اور یہی چیز اس کے لئے وجہ حمد و ستائش ہے۔

خدا کے نظام کو کسی اور کار ساز و کار فرا کی ضرورت نہیں۔ اور اس حقیقت پر کائنات کی بستیاں اور بلندیاں

شاہد ہیں۔

خارجی کائنات میں تمام اشیاء قوانین خداوندی کا اتباع کئے جا رہی ہیں۔ وہ نہ اس سے سرکشی اختیار کرتی ہیں۔ نہ

تغافل برتنی ہیں نہ تساہل۔

انْ كَيْسًا بُذِ هَبُّكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ط وَكَانَ اللَّهُ
عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا - (۴۳)

تمام نوع انسان کی جگہ دوسری نوع لے آئے

لیکن انسان کا معاملہ دیگر اشیائے کائنات سے، ان
معنوں میں، مختلف ہے کہ اشیائے کائنات کو اس کا
اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ خدا کے قانون سے سرکشی برت سکیں، اور انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس
قانون اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ ہم نے یہ کچھ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق کیا ہے، ورنہ ہمارے
لئے یہ کیا مشکل ہے کہ ہم موجودہ نوع انسان کو (جو صاحب اختیار و ارادہ ہیں) ختم کر کے، اس کی جگہ ایسی نوع لے آئیں
جو اشیائے کائنات کی طرح، بے چون و چرا قوانین خداوندی کی اطاعت کئے جائے۔ ہم ایسا کرنے پر قادر

ہیں۔ (۴۳-۴۴ ف ۳۵)

لیکن خدا انسان کا اختیار و ارادہ سلب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اسے اس کا اختیار دیتا ہے کہ وہ جوئی راہ چاہے اختیار کرے
جس قسم کی راہ وہ اختیار کرے گا اسی قسم کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

مَنْ كَانَ يَرْيِدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط
وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا - (۴۴)

لیکن ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ ہم انسان کے اختیار و ارادے کو سلب نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم اسے اتنا بتا
دینا چاہتے ہیں کہ تم قوانین خداوندی کو چھوڑ کر، دوسرے راستے اس لئے اختیار کرتے ہو کہ تمہیں دنیاوی مفاد
حاصل ہو جائیں۔ ہمارے قوانین کی اطاعت سے تمہیں دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی
آخری زندگی کی کامیابیاں اور کامرئیاں بھی۔ خدا تمہاری موجودہ زندگی کی آسائش طلبی کی درخواستوں کو بھی سنتا
ہے اور مستقبل کی شادابیوں کو بھی نگاہ میں رکھتا ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کے قانون میں اس کا امکان نہیں۔
ثواب کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔



ثواب الدنیا اور ثواب الآخرہ (اس زندگی اور اگلی زندگی کی خوشگواریاں، قرآنی نظام قائم کرنے سے
سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور قرآنی نظام میں بنیادی اہمیت نظام عدل کو حاصل ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ اساس ہے جس پر
انسانوں کی ہیئت اجتماعی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور نظام عدل کا بنیادی ستون (CENTRAL PILLAR)

شہادت کا عظیم اصول (EVIDENCE) ہے۔ شہادت کی قانونی حیثیت کے متعلق مطالب جلد سوم ص ۲۸۶ پر تشریح کی جا چکی ہے۔ لیکن یہاں قرآن کریم نے ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر دنیا اس پر عمل درآمد کرنے لگ جائے تو عدالتی نزاعات (بلکہ عدالت کے باہر کے اختلافات کا بھی) وجود ختم ہو جائے۔ وہ اصول یہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَفْوَمِينَ بِالْقِسْطِ شَهَادَةً لِلَّهِ وَلَكُمْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَوَالُو الْبَدِينِ وَالْأَفْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا إِنْ تَعْدِلُوا أَوْ تَعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا - (۴/۱۳۵)

اس نظام کے قیام کے لئے، جس میں حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں، بنیادی شرط یہ ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگراں بن کر رہو (۴/۱۳۵)۔ عدل کے لئے ایک بنیادی عنصر یہی شہادت ہے۔ تم شہادت، نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مد نظر رکھ کر سچی سچی شہادت ہو، خواہ یہ شہادت (اور تواور) خود تمہارے اپنے خلاف جائے۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں، امیر اور غریب میں بھی کوئی امتیاز نہ کرو۔ (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو۔ ۴/۱۳۵) تم جادہ حق و صداقت سے ہٹ کر، ان کے خیر خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے جذبات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچیدہ بات کرو۔ نہ شہادت دینے سے پہلے ہی کرو یا درکھو! اللہ کا قانون مکافات تمہارے تمام اعمال (جذبات و رجحانات تک) سے اچھی طرح واقف ہے۔

آپ اس اصول پر غور کیجئے۔ ختمی بار آپ اس پر گہری نگاہ ڈالیں گے آپ پر وجدانیت کا عالم طاری ہو جائے گا۔ غیر مسلموں کے لئے تو یہ اصول صرف راہ نائی کا کام دے گا (کیونکہ یہ ان کی مرضی پر ہے کہ اسے اپنائیں یا نہ اپنائیں) لیکن جماعت بنو مین کے لئے یہ خدا کا حکم ہے۔ آپ سوچئے کہ جو قوم (امت) اس حکم پر عمل پیرا ہو اس کا نظام عدل کیا ہو گا؟ کیا اس میں کسی مقدمہ کا فیصلہ بھی غلط ہو سکے گا؟ کیا اس میں ذرا سی دھاندلی بھی ممکن ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم (امت) میں مقدمات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ (ضمناً) ہمارے ہاں اسلامی نظام۔ اسلامی نظام کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ اور اکثر سوچا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا کہاں سے

کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کی ابتدا اسی اصول شہادت سے کر دی جائے تو ہمارے اس قدر اچھے ہوئے مسائل اور معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ یہ بنیادی حکم کہ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵۷)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ مومنین کے لئے شہادت کی اہمیت کا ذکر (۵۸) اور (۵۹) میں بھی آیا ہے۔ (رضمنّا) چونکہ یہاں شہادت کا موضوع سامنے آگیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ قرآن کریم میں کون کون سے معاملات کے سلسلہ میں شہادت کا ذکر آیا ہے۔

کون کون سے معاملات میں شہادت کا ذکر ہے | ۱۔ قرضہ کے معاملہ میں، دستاویز کی تحریر کے سلسلہ میں۔ (۸۳-۸۴-۸۵)

- ۲۔ وصیت کے سلسلہ میں۔ (۸۸-۸۹-۹۰)
- ۳۔ جرم فحش (بے حیائی کی باتوں) کے سلسلہ میں۔ (۹۱)
- ۴۔ میاں بیوی میں تہمت تراشی کی صورت میں۔ (۹۲-۹۳)
- ۵۔ طلاق کے فیصلہ کن مرحلہ کے وقت (۹۴)
- ۶۔ گرد و پیش کے معاملات سے استنباط شہادت۔ (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے الزام کے سلسلہ میں ایک شاہد نے کہا تھا۔ (۹۵-۹۶)
- دائم رہے کہ قرآن کریم نے چند اہم امور کا ذکر کیا ہے۔ عدالت کو اختیار ہے کہ جن دیگر معاملات میں ضروری سمجھے گواہ طلب کرے۔

شہادت کی شرائط | شہادت کے سلسلہ میں اس بنیادی اصول کے علاوہ جس کا ذکر (۹۷) میں کیا گیا ہے یہ بھی تاکید ہے کہ :

- ۱۔ شہادت کو چھپاؤ نہیں۔ (۹۸)
- ۲۔ جھوٹ اور سچ کی آمیزش مت کرو۔ (۹۹)
- ۳۔ کبھی غلط بیانی سے کام نہ لو۔ (۱۰۰)
- ۴۔ سنی سنائی بات کے پیچھے مت لگو۔ (۱۰۱)
- ۵۔ جب گواہ کو طلب کیا جائے وہ حاضری سے انکار نہ کرے۔ (۱۰۲)

- ۶۔ گواہوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچانی جائے (۲/۸۲)
 ۷۔ عدالت کو اگر کسی گواہ کی دیانت پر شبہ ہو تو وہ اس کی جگہ دوسرا گواہ مہیا کر سکتی ہے۔ (۱۰۸-۱۰۷)



اگلی آیت بڑی اہم ہے جس میں کہا گیا ہے۔
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ
 رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ مِنْ قَبْلُ ط وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ
 وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا
 بَعِيدًا۔ (۴/۱۳۶)

اس نظام کے سلسلہ میں ایک اور اہم اور بنیادی حقیقت کو بھی سامنے رکھو۔ اس نظام کے حامل وہ افراد نہیں
 ہوں گے جو محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے سمجھ لیں کہ وہ جماعت مومنین کے ممبر ہیں۔ یہ جماعت آئیڈیالوجی
 و ایمان کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اور وہی شخص اس کا ممبر ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو اس آئیڈیالوجی کی صدا
 پر یقین رکھے۔ لہذا، اسے جماعت مومنین! ہم ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو۔
 (۲/۶۲ و ۵۹) اور بنیادی اصول ہیں۔ اللہ پر ایمان۔ اس کے رسول پر ایمان۔ اس کتاب پر ایمان جو
 اس نے اپنے رسول پر نازل کی۔ اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں۔ (اور بلاشبہ
 اور حیاتِ اخروی پر ایمان) جو شخص اللہ۔ اس کے ملائکہ۔ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر۔ اور حیاتِ اخروی
 پر ایمان نہیں رکھتا، ان سے انکار کرتا ہے۔ تو وہ زندگی کے صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ (مسلمانوں
 کے گھر پیدا ہونے والوں کے متعلق اصولاً قوی یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان امور پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے
 کہ وہ علی وجہ البصیرت بھی ان امور پر یقین رکھیں)

”مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کی تاکید“
 اس آیت را و راسی ضمن میں دیگر متعلقہ آیات، کی پوری پوری
 تشریح مطالب الفرقان۔ جلد اول صفحہ ۷۸ سے آخر تک
 کی گئی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اتنا اضافہ کافی ہے کہ ایمان قرآن کریم کی صداقت پر علی وجہ البصیرت یقین

کا نام ہے۔ (۲/۲۵)
 مطالب۔ جلد سوم۔ صفحہ ۴۰ (آیت ۲/۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ خود رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا

آیت (۱۳۴) میں جو بَآئِہَا الذِّینَ اٰمَنُوْا کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ حکم عہد رساتماہ کے مومنین کے متعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن کریم نے انہیں ”مومن“ حقاً کہہ کر پکارا ہے۔ یہ حکم ہم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے۔ خدا نے عظیم کوارس کا علم تھا کہ بعد میں ایسے مسلمان آئیں گے جن کا نام تو مسلمانوں جیسا ہو گا لیکن ان کا ایمان نہیں ہو گا۔ یہ حکم انہی کے لئے ہے یعنی ہمارے لئے۔ یہاں ایک کٹر کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بیان کئے ہیں۔ ۱۔ اللہ پر ایمان۔ ۲۔ رسولوں پر ایمان۔ ۳۔ ملائکہ پر ایمان۔ ۴۔ کتابوں پر ایمان اور ۵۔ آخرت پر ایمان۔ لیکن ہمارے ہاں ان میں اپنی طرف سے ایک اور جزو کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقدیر پر ایمان۔ (یعنی معاذ اللہ خدا کی فہرست میں جو کئی رہ گئی تھی اسے ہم نے پورا کر دیا) تفصیل اس کی مطالب جلد سوم۔ ۱۵۵۔ آیت (۱۳۴) میں گزر چکی ہے۔

چھٹا جزو ایمان؟

اس کے بعد کفر اور ایمان کی مرید وضاحت کی گئی۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا اُولٰٓئِکَ اِذَا دُوۡا اِلَیْہِمْ لَیَقُوۡلُنَّ اَللّٰهُ لَیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لَیْہِدَیْہُمْ سَبِیْلًا۔ (۱۳۴)

ایمان سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کے دل میں کسی وقت بھی تذبذب پیدا نہ ہو۔ اگر کیفیت یہ ہو کہ ابھی ایک بات کو مان لیا۔ پھر اس سے انکار کر دیا۔ پھر مان لیا اور پھر انکار کر دیا۔ اور اس طرح انکار میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ تو ایسے لوگ، قانون خداوندی کے سائے میں، اپنی حفاظت کا سامان نہیں پاسکتے اور نہ ہی انہیں زندگی کی خوشگوار یوں کا راستہ مل سکتا ہے۔

جو مسلمان اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب (کفر) اختیار کرے اسے مرتد کہا جاتا ہے اور ہمارا ہاں مرتد کی سزا قتل قرار دی جاتی ہے۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے بات ہو چکی ہے۔ (دیکھئے عنوانات۔ ارتداد۔ مرتد۔ جنگ۔

مرتد کی سزا قتل نہیں | دین وغیرہ) زیر نظر آیت بھی اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایمان کے بعد کفر اختیار کرے۔ کفر کے بعد پھر ایمان لے آئے

اور اس کے بعد پھر کفر ہو جائے اور اپنے کفر میں آگے بڑھنا چلا جائے تو اس کی مغفرت نہیں ہوگی۔ نہ ہی وہ صحیح راستہ اختیار کر سکیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کے بعد کفر اختیار کر لے، اگر اس کی سزا موت ہو تو اس کے لئے دوبارہ اسلام لانے کا امکان کیسے ہو گا؟ اسے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے ساتھ ہی قتل کر دیا جائے گا۔ اس کا اسلام لانے کا امکان واضح کرتا ہے کہ وہ کفر اختیار کرنے کے بعد زندہ رہے گا۔ اس طرح دوبارہ کفر کے بعد بھی وہ زندہ رہے گا اور اس کا امکان ہو گا کہ وہ اپنے کفر میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔

ایسے متذہبین کو قرآن منافق قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا - (۴/۱۳۸)

یہی ایمان کا یہ مطلب ہے کہ افراد نوکریاں اس آئیڈیالوجی کا، اور اتباع کرتے رہے اپنے جذبات و مفادات کی، یا ظاہر داری سے، ساتھ تو رہے جماعتِ مومنین کے، لیکن وہ پروہ ملے رہے جماعتِ مخالف سے۔ ایسے لوگوں کو منافق کہتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ اہم انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ :

الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمَوْمِنِينَ ط ابْتِغَاءَ
عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا - (۴/۱۳۹)

یہ لوگ جو جماعتِ مومنین کو چھوڑ کر، کفارین کے ساتھ یارانہ کاٹھتے ہیں، تو کیا یہ ان کے پاس عزت اور قوت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں؟ اگر یہ اس خیال کے ماتحت ایسا کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ حقیقی عزت اور قوت، صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے مل سکتی ہے۔ اس کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی وضاحت جلد اول - ص ۵۵ (آیت ۲) میں گزر چکی ہے۔ وہیں زیر نظر آیت بھی درج ہے۔

ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات تو ایک طرف، کہا ہے کہ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتَ اللَّهِ يَكْفُرُ بِهَا
وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ
إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهم ط إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا
(۴/۱۴۰)

فریقِ مخالفت (کفار) کے ساتھ دوستی کے تعلقات تو ایک طرف رہے، خدا نے اپنے ضابطہ قوانین میں، اس بات میں حکم یہ دیا ہے کہ جب تم کہیں دیکھو کہ آیاتِ خداوندی کا انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے، تو تم ایسی مجلس میں بھی نہ بیٹھو۔ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ تاکہ وہ اس قسم کی باتیں چھوڑ کر دوسری باتوں میں نہ لگ جائیں۔ اگر تم ان کی اس قسم کی باتوں میں شریک محفل رہے تو اُس وقت تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے، حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی

بالفاظ دیگر۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے
صفیں کچ، دل پریشان، سجدے بے ذوق کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے (اقبال)

اس کے بعد منافقین کی اضطرابی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَذْبُذِينَ بَيْنَ يَدَيْكَ لَا إِلَىٰ هُوَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَا يَخْلُفُ أَوْ كَيْفَ تَصْلَىٰ
اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا - (۴۴)

اُن کی اس روش سے انہیں وہ اطمینان حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو یقین محکم کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ پریشان خاطر
حواس باختہ، درمیان میں ٹسکے رہتے ہیں۔ نہ ادھر کے نہ اُدھر کے (۲۲)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ قانونِ
خداوندی کی خلاف ورزی سے، خود اپنے اوپر زندگی کی خوشگوار یوں کی راہ بند کریں، ان پر اس راہ کو کون کھول
سکتا ہے؟ (یہ راہیں تو یقین محکم اور عمل سہم ہی سے کھلا کرتی ہیں)

منافقین کا تذبذب | منافقین کے لئے مذہب میں کا لفظ بڑا معنی خیر ہے۔ اور اس کا مادہ (ذ۔ب۔ب) ہے جس کے معنی کھسکیے ہیں۔ آپ کسی کھسکی کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھئے۔ اسے کسی
ایک جگہ قرار نہیں ہوتا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ پھر آپ اس کے متعلق کہہ ہی نہیں سکتے کہ وہ جہاں بیٹھنی ہے وہاں سے
اُڑ کر کہاں جا بیٹھے گی۔ اس قسم کی حالت منافقوں کی ہوتی ہے۔

اس لئے وہ سخت ناقابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مومنین میں جن کی بنیادی خصوصیت استقامت اور
محکمیت ہوتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا اَسْرَبْنَا اللّٰهَ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا - (۲۴) جن لوگوں نے دل کے
کامل اطمینان کے بعد کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے (ان پر علامہ کا نزول
ہوتا ہے)

چونکہ منافقین کے قول اور فعل پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس لئے ان کے ساتھ دوست وارانہ تعلقات وابستہ نہیں
کئے جاسکتے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا - (۲۴)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے رفیق صرف وہی ہونے چاہئیں جو تمہاری جماعت کے افراد ہوں۔ اس لئے

تم ایسا کبھی نہ کرو کہ کفار (منافقین) کو اپنا دوست اور کار ساز بنا لو (۳۱)۔ یہ ایک ایسا جرم ہوگا۔ جو قانونِ خداوندی کی رُو سے تمہیں سزا مستوجب قرار دینے کے لئے، کسی ثبوت اور دلیل کا محتاج نہیں ہوگا۔ تمہاری بیروشن قمیص مجرم ثابت کرنے کے لئے اپنی دلیل آپ بن جائے گی۔

منافقین اور کفار (انعمنا) یہاں بات منافقین کی ہو رہی تھی اور اس آیت میں کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ دوست دارانہ تعلقات کبھی نہیں ہونے چاہئے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مانگیر انسانیت دو ہی تقسیم ہوتی ہے۔ مومنین اور غیر مومنین۔ غیر مومنین کو کافر کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مختلف خصوصیات کی رُو سے کفار کی بھی مختلف قسمیں ہوں گی۔ مشرکین، منافقین، اہل کتاب وغیرہ۔ کفار کے ساتھ تعلقات کے متعلق پہلے بحث آپ کی ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے منافقین کا صحیح مقام متعین کیا ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُمْ نَصِيرًا﴾ (۴۵)

یقیناً منافقین، جہنم کے سب نچلے درجے کے مستحق ہیں۔ یہ وہیں رکھے جائیں گے۔ ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہو سکتا۔

منافقین درکِ اسفل میں جہنم میں تو کفار بھی ہونگے اور منافقین بھی، لیکن منافقین سب سے نچلے درجے میں ہونگے۔ یعنی انہیں عام کفار کے مقابلہ میں زیادہ شدید عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ بات واضح ہے۔ کافر کھلا دشمن ہے۔ وہ اعلانِ بغاوت کرتا ہے اور کھلے بندوں وار کرتا ہے۔ اس کی مدافعت آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن منافق ماریستین ہے۔ وہ آپ سے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور آپ کی پشت میں خنجر گھونپ دیتا ہے۔ وہ آپ کے دشمن کے مقابلہ کے لئے آپ کے ساتھ جاتا ہے لیکن میدانِ جنگ کے نازک ترین مرحلہ میں حفیہ طور پر دشمن سے جا ملتا ہے۔ اس ذہنیت، اس کیر کیڑ، اور اس روش کے لوگ بدترین انسان ہوتے ہیں۔ اس لئے (کفار۔ کھلے دشمنوں۔ کو نہیں) منافقین کو جہنم کے درکِ اسفل میں بنایا گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن ان کے لئے بھی اصلاح کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:

﴿الَّذِينَ تَابُوا وَأُصْلَحُوا أَوْ اعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وَسَوْفَ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۴۶)

ہاں مگر جوان ہیں سے اپنی روش سے باز آجائیں، آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیں۔ اس ضابطہ خداوندی کو محکم طور پر رکھ لیں اور اطاعت و فرمان پذیری خالصتہ خدا کے لئے مختص کر دیں تو اس سے یہ لوگ جماعتِ مومنین کے افراد بن سکیں گے اور اُس اجرِ عظیم میں شریک ہو جائیں گے جو قانونِ خداوندی کی رو سے، عنقریب جماعتِ مومنین کو ملنے والا ہے۔

منافقین کے لئے بھی باز آفرینی کی گنجائش | ”قرآن کا خدا“ (ہمارے مفہوم کے مطابق) منتقم مزاج نہیں۔ وہ یوں کہئے کہ بڑا کشادہ ظرف اور وسیع القلب واقع ہوا

ہے۔ جو بندہ بھی اشکِ ندامت آنکھوں میں لئے اس کے آستانہ عالیہ پر دستک دیتا ہے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے دروازہ کھول دیتا ہے اور اس کی ماضی کی لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کی ہدایت دے کر اس کے سینے میں مستقبل کی تابناکی کی شمعیں روشن کر دیتا ہے۔

اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والے (مومنین) کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اور وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ہم نے جو خدا کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب کی بات کی تو ایسا اپنی طریقت سے نہیں کہا۔ خود خدا نے اگلی ہی آیت میں اس کی تصدیق کر دی۔ اور کیسے خوبصورت الفاظ میں اس کی تصدیق کر دی افرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔ (۴/۱۴۴)

ان سے کہو کہ اگر تم ضابطہ خداوندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لو اور خدا کی طرف سے عطا شدہ نعمتوں کی قدر کرو یعنی جس مقصد کے لئے وہ دی گئی ہیں، انہیں اسی کے لئے صرف کرو۔ تو خدا تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا؟ خدا کا قانونِ مکافات ہر ایک کے عمل سے واقف ہے، اور اس کی کوششوں کے بھرپور نتائج دیتا ہے۔

خدا منتقم مزاج نہیں | منتقم مزاج ”جھکنے والے“ کو ذلیل کرتا اور اسے اذیت پہنچا کر لذت لیتا ہے۔ (سایکالوجی میں اس ملعونِ زہینیت کو (SADISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے) خدا انسانی جذبات سے ماوراء، بلند و بالا ہے۔ وہ جھکنے والے کو گرا کر اسے ذلیل نہیں کرتا۔ اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیتا ہے۔ اقبال نے ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ:

نشد پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ؎ مرہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

بھلائی کی باتیں

باقی رہیں بھلائی کی باتیں۔ انہیں کھلے طور پر کر دیا پوشیدہ۔ یا برائی سے دو گزر کر دے۔ رتو ان میں سے کوئی بات بھی خدا کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ خدا کا قانون جہاں جرم کی سزا

دینے کی قوت رکھتا ہے، وہاں اس میں دو گزر کر دینے کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

ان کے برعکس۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُوا نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا (۴-۱۵۰)

جو لوگ خدا اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں۔ یا خدا کو مانتے ہیں تو اس طرح (کہ کارگزار کائنات ہیں اس کے قوانین جاری و ساری ہیں، لیکن جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے وہ) اس قانون سے انکار کرتے ہیں جو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجا ہے (۴-۱۵۰)۔ یا اس کے قانون کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ کسی ایک رسول کی طرف نازل شدہ قانون کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کر لیا اور دوسروں کی تکذیب کر کے ان کے من جانب اللہ ہونے سے انکار کر دیا (۴-۱۵۰)۔ یا ایک ہی ضابطہ قوانین کی ایک بات مان لی اور دوسری سے انکار کر دیا (۴-۱۵۰)۔ اور اس طرح، اقرار و انکار کے بین بین، تیسری راہ اختیار کرنے کی سوچتے رہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ”خدا اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا کفر ہے“ اس کے یہ معنی نہیں کہ (معاذ اللہ) رسولوں کو خدا سمجھ لینا چاہیے۔ (جیسا کہ عیسائیت میں کہا جاتا ہے) اس کا مطلب (جیسا کہ مفہوم میں متفقہ طور پر بیان کیا گیا ہے) یہ ہے کہ کائناتی خدا کو تسلیم کر لینا (یعنی قوانین فطرت کی اطاعت کرنا) لیکن جو ضابطہ قوانین خدا نے انسانوں کے لئے اپنے رسولوں

خدا اور رسولوں میں فرق کرنے کا مفہوم

کی وساطت سے بھیجا ہے، اس سے انکار کر کے حکومت سیکورٹ قائم کر لینا، یہ کفر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی، مطالب الفرقان جلد اول ص ۳۰۰۔ زیر آیت (۴-۱۵۰) ملے گی۔

اور ”کتاب کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے انکار“ کی تشریح مطالب جلد دوم ص ۳۵۲ (آیت ۴-۱۵۰)

میں کی گئی ہے۔

اس قسم کی راہیں اختیار کرنے والوں کو کافر حقا“ کافر کہا گیا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا (۴-۱۵۱)

نویاد رکھو! یہ اقرار کی راہ نہیں رکبیر انکار کی راہ ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام بالکل مہی ہوگا جو دوسرے منکرین اور مخالفین کا ہونے والا ہے۔ یعنی رسوا کن تباہی۔

آیت (۱۵۲) میں بھی اس عذاب کو دنیا میں ذلت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس
وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أَجُورَهُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا - (۱۵۲)

تفریق بین الرسل | مومن وہ ہیں جو خدا کو مانیں اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو مانیں۔ اور اسے بھی مانیں کہ یہ سلسلہ رشد و ہدایت شروع سے حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے آتا رہا ہے۔ وہ سب خدا کی طرف سے پچھے نبی تھے۔ منصب نبوت کے اعتبار سے، ان میں کوئی فرق نہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں کے ثمرات انہیں عنقریب مل جائیں گے۔ اور اگر ان سے کوئی کوتاہی ہو جائے گی، تو اس کے مضر اثرات سے ان کی حفاظت کر دی جائے گی اور ان کی نشوونما میں کوئی فرق نہیں گا۔ اس لئے کہ خدا کے قانون میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

تفریق بین الرسل کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۴ (آیت ۲۸) اور صفحہ ۲۸۵ (آیت ۲۹) میں بحث کی گئی ہے۔ اس تفریق کی بین مثال یہودی تھے جو بنی اسرائیل کے انبیاء پر تو ایمان کے مدعی تھے، اور ایک آنے والے کے منتظر بھی تھے۔ لیکن نبی اکرم کی رسالت کے منکر اور مخالفت تھے۔ وہ اپنے اس انکار اور مخالفت کے من میں کوئی دلیل یا خدائی سند تو رکھتے نہیں تھے۔ قسم قسم کی کٹ جتیاں کرتے تھے۔ انہی ہی کٹ جتیبوں میں حضورؐ سے محسوس معجزات کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرًا مِنْ ذَلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا آلَٰهَةً فَأَخَذَتْهُمُ
لَصْعَقَةٌ يُّظَلِّمُهُمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ
فَعَفَّوْا عَنْ ذَلِكَ ۚ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطٰنًا مُّبِينًا - (۱۵۳)

معجزات کا مطالبہ | یہ اہل کتاب (یہودی) تم سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں اس صورت میں خدا کا سچا رسول مانیں گے کہ ایک بنی بنائی کتاب آسمان سے اتار کر دکھاؤ۔

تم ان کی اس قسم کی جہالت آمیز باتوں سے کبیدہ خاطر مت ہو۔ یہ لوگ (خود اپنے پیغمبر موسیٰؑ سے، اس سے بھی

بڑھ کر مطالبے کیا کرتے تھے۔ اُس سے کہا کرتے تھے کہ خود خدا کو ہمارے سامنے لا کر دکھاؤ (۲/۵۵ : ۴/۱۵۵) انہیں، ان کی اس بیہودگی کی سزا ملی تو انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی (۲/۵۵) حالانکہ اس سے قبل، ان کے پاس خدا کی واضح تعلیم آچکی تھی۔ ہم نے ان کی اس حماقت سے بھی دو گزر کیا، اور موسیٰ کو کھلا ہوا اقتدار اور غلبہ عطا کر دیا۔

حضور سے معجزات کے مطالبہ اور انکار کے لئے انڈکس ملاحظہ کیجئے۔ یہودیوں کے متعلق پھر کہا۔
وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمْ ادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ
مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۱۵۴)

پھر ہم نے ان سے، کوہ طور کے دامن میں، قانون خداوندی پر کاد بند رہنے کا پختہ عہد لیا (۲/۵۵)۔ اور
(جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) (۲/۵۵) ان سے کہا کہ ہمارے قانون کے سامنے تسلیم خم کرتے ہوئے بیت المقدس
میں داخل ہو جاؤ۔ نیز ان سے یہ بھی کہا تھا کہ سبت سے متعلق احکام و ضوابط کی خلاف ورزی مت کرنا (۲/۵۵)۔
اور ان سے ان باتوں کا پختہ عہد لیا تھا۔

یہ تمام امور داستان نبی اسرائیل کے تحت بیان کئے جا چکے ہیں جس کے لئے انڈکس دیکھئے۔ اس کے

بعد کہا۔
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ
هُمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۴/۱۵۵)

لیکن انہوں نے اپنے کسی عہد کی پابندی نہ کی۔ ان میں سے ایک ایک کو توڑا۔ احکام
خداوندی سے کھلا ہوا انکار کیا۔ ان سے سرکشی برقی۔ اپنے انبیاء کو ناحق ذلیل و رسوا کیا۔
بعض کو جان تک سے مار دیا۔ انہیں جب کبھی قانون خداوندی کی طرف دعوت دی گئی، تو انہوں نے اس
دعوت کو نہایت استکبار سے، یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم اس سے بے نیاز ہیں۔ ہمارا دل ان باتوں کا اثر قبول

نہیں کرتا۔ ہمارے اپنے پاس بہت کچھ ہے۔ (۲/۵۵)
قتل انبیاء و رسل کی بحث بھی پہلے آچکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس کے بعد چار آیات (۱۵۶-۵۹) میں یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کا ذکر ہے یہ آیات سابقہ صفحات میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں آچکی ہیں۔

۴
۱۵۶-۵۹

یہودیوں کے ان جرائم کی جو سزا انہیں دی گئی اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ ان پر بعض حلال چیزوں کو حرام قرار دیدیا۔

فَبَطَّلْنَا مَنَ الذِّينَ هَادُوا وَآخَرًا مِّنَّا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٌ أُحِلَّتْ لَهُمْ
وَبَصَدَّ هُمُ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا - (۱۶۰)

۴
۱۶۰

ان جرائم کی سزا | رہبر حال، یہ ہیں وہ بنی اسرائیل جو آج ہم سے اس قسم کے مطالبات کر رہے ہیں کہ آسمان

سے لکھی لکھائی کتاب اتار کر بناؤں۔ ان کی اس قسم کی زیادتیوں اور سرکشیوں کا نتیجہ تھا

کہ وہ خوشگوار چیزیں جو پہلے ان کے لئے حلال تھیں، سزا کے طور پر، ان پر حرام قرار دی گئیں۔ (۱۶۱)

ان کے جرائم کی فہرست طویل ہے۔ لیکن مختصراً یہ سمجھو کہ یہ لوگ ہمیشہ نظام خداوندی کی راہ میں، جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع بخشوں کی راہ ہے، روک بن کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

ان چیزوں کی تفصیل جو ان پر اس طرح حرام قرار دی گئی تھیں، سورہ انعام (۱۶۶) میں دی گئی ہے۔ جہاں کہا

گیا ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا وَآخَرًا مِّنَّا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ، وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ
حَرًّا مِّنَّا عَلَيْهِمْ شَحُومُهُمَا إِلَّا مَا حَيْلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَا يَأْكُو
مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَدِّقُونَ - (۱۶۶)

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، بجز اس چربی کے جو ان

ان چیزوں کی تفصیل

جانوروں کی بیٹھیا یا انڈوں کے ساتھ لگی ہو۔ یا جو ہڈیوں کے اندر ملی ہو۔ (تو یہ چیزیں عام حالات میں حرام نہیں تھیں۔ بات یہ تھی کہ) انہیں، ان کی قانون شکنی کی سزا دی گئی تھی، اور بطور سزا ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا

گیا تھا (۱۶۶)۔

حلال چیزوں کو حرام قرار دینا خدا کا عذاب ہے | یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ حلال چیزوں کو قوم کے لئے حرام قرار دے دینا خدا کا عذاب ہے۔ آپ اندکس میں حرام اور حلال کا عنوان دیکھئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ

نے امت مسلمہ (امت محمدیہ) پر کتنی کی چیزیں حرام قرار دی تھیں لیکن ہمارے فقہائے حرام چیزوں کی لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کر رہے ہیں۔ یہ چیزیں صدیوں سے امت پر حرام چلی آرہی ہیں اور اب ان کا حرام ہونا اس قدر ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے کہ ان کے کھانے کے تصور تک سے ہمیں مہجھتی آ جاتی ہے۔ یہ خود خدا کا عذاب ہے کہ اس کی حلال کردہ اشیاء کے استعمال کے تصور تک سے انسان کانپ اٹھے!

یہودی پیشواؤں کا ایک سنگین ترین جرم خدا کی راہ (سبیل اللہ) میں روک بن کر بیٹھ جانا بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ علمائے شریعت اور ارباب طریقت جہاں بھی ہوں گے وہ یہی کچھ کریں گے۔ وہ خدا کی طرف سے جانے والی راہ میں روک بن جائیں گے۔ (۹/۱۱۳)

ان کا اگلا جرم یہ تھا کہ

وَأَخَذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ (۱۱۳/۹)

یہ محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے، ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے
انہیں کچھ قرض دیتے تھے تو اصل سے زیادہ واپس لیتے تھے حالانکہ انہیں اس سے

منع کیا گیا تھا۔ یہ اس طرح، نیز دوسرے طریقوں سے، لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جابا کرنے لگے تھے

اور اب تک یہی کچھ کرتے ہیں۔

(ربو کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس کی مدد سے حوالے دیکھ لیجئے)

یہودیوں نے اپنے مذہب کو اپنی نسل تک محدود کر رکھا تھا۔ کوئی انسان جو یہودی نسل سے نہ ہو، وہ نہ مذہب یہودیت اختیار کر سکتا تھا اور نہ ہی جنت میں جاسکتا (تفصیل بنی اسرائیل کے عقائد کے ضمن میں سابقہ جلدوں میں آچکی ہے) لیکن قرآن نے کہا کہ خدا کے دین (اسلام) کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں۔ جو چاہے اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ (تفصیل جلد اول - زیر آیت ۲/۲) آچکی ہے یہاں بھی یہودیوں کے عام جرائم گناہ کے بعد کہا کہ جو

لَكِنَّ الرِّسَالَةَ اسْمُكَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ
إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ

الرَّكُوعَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

ان میں سے ایمان لانے والے | الْأَخِرِ أُولَئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا۔

لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ لوگ اب، من حیث القوم راندہ درگاہ ہو چکے ہیں اور ان کے گھر پیدا ہو نہ ولا
بچہ، محض بنی اسرائیل کی نسل سے متعلق ہونے کی وجہ سے، ہمیشہ کے لئے اس عذاب میں مبتلا رہے گا۔ ان میں سے
جو شخص بھی اسلاف کی اندھی تقلید کے بجائے، غور و فکر سے کام لے کر، علی وجہ البصیرت، اپنی روش بدل گئے
وہ عذاب سے نکل جائے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایسے لوگ، جنہوں نے ذاتی تقلید سے علم میں پختگی حاصل کر
لی ہے، اس ضابطہ ہدایت (قرآن) پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تہذیب پر نازل کیا گیا ہے، اور ان کتابوں پر بھی ایمان
رکھتے ہیں جو اس سے پہلے انبیائے سابقہ پر نازل کی گئی تھیں۔ یہ لوگ اب، رجاعت مومنین کے افراد بن کر
قیام صلوٰۃ اور اتیانے زکوٰۃ کے نظام کو تشکیل کریں گے جس کی بنیادیں اللہ اور آخرت پر ایمان پر استوار ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتوں کا اجر عظیم بہت جلد مل جائے گا (اور ان کا بنی اسرائیل کی نسل سے ہونا ان کے خلاف
نہیں جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام، انسانیت کا دین ہے، یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق، کسی نسل میں
محدود کو کے نہیں رکھ دیا گیا)

یہ اس لئے کہ دین خداوندی نہ نسلی تھا نہ قومی۔ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ہدایت تھا (اور ہے) اور شروع
سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔

۴
۱۶۳

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْ
حَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَ
عِيسَى وَآيُّوبَ وَيُوسَى وَهَارُونَ وَصَلِّمْ
دین تمام انبیاء کو دیا گیا تھا
وَاتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا - (۱۶۳)

یہ کوئی نیا دین نہیں۔ (اصلاً) وہی دین ہے جو، نوحؑ اور اس کے بعد دیگر انبیاء کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا۔
جو ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو دیا گیا تھا۔ جو عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، اور سلیمانؑ کو دیا
گیا تھا۔ یہی ضابطہ ہدایت (و دیگر انبیاء کی طرح) داؤد کو بھی دیا گیا تھا۔ اور خود یہودیوں کے پیغمبر، موسیٰؑ سے
بھی خدا نے یہی باتیں کی تھیں۔

(اس کی تشریح اندکس سے دین کے عنوان کے تحت دیکھئے)

ضمناً، آپ دیکھئے کہ سلسلہ رشد و ہدایت کا آغاز حضرت نوحؑ سے کیا گیا ہے اور باقی انبیاء کو "میں بعدہ"
اس کے بعد آنے والے) کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے

نبی (حضرت) آدمؑ تھے، قرآن کی رو سے صحیح نہیں۔ (و آدم کی بحث جلد اول میں کی جا چکی ہے)
زبور کے متعلق بھی پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ (دیکھئے ۱۸۳)

ان انبیاء کے متعلق فرمایا۔

وَسِرُّنَا قَدْ قَضَيْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَسِرُّنَا لَمْ نَقْضُصْهُمْ

عَلَيْكَ مَا وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا - (۱۶۴)

غرضیکہ تمام انبیاء نے سابقہ کو یہی دین دیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم، اس سے پہلے کر چکے ہیں
لیکن بعض کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ذکر کیا ہو یا نہ، اصلاً ہر رسول کو یہی دین دیا گیا تھا اور رسول دنیا کی ہر قوم کی
طرف آئے تھے۔ ۱۳۰ و ۱۳۵ حضرت موسیٰؑ بھی انہی میں شامل ہیں۔

بعض رسولوں کا ذکر بعض کا نہیں | قرآن کریم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے
اور اجمالی طور پر ہمارے لئے ضروری ہے (یہ ہمارے ایمان

کا جزو ہے) کہ ہم ان سب کی نبوت کا اقرار کریں، خواہ ان کا قرآن میں بالتفصیل نام آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ جو اہل مذہب اپنے
کسی بزرگ کے متعلق کہیں کہ وہ ان کے مذہب کے بانی تھے، ہم اجمالی طور پر تسلیم کر لیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا
کے رسول ہوں۔ اس عقیدہ کی بنا پر دنیا کے ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام ہم پر لازم ہو گا۔ اگرچہ ہم خدا کی تعلیم
کی حامل اسی کتاب کو سمجھیں گے جو حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ یعنی قرآن کریم۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے بیان کے مطابق دنیا کی ہر قوم میں انبیاء آتے رہے لیکن اس نے نام لے کر انہی انبیاء
کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی اولین مخاطب قوم (عرب) شناسا تھی۔ یہ انبیاء ان کے وطن کے ارد گرد کے علاقوں اور
ان کے ساتھ رہنے سہنے والے اہل مذہب کے انبیاء تھے۔ اس لئے قرآن نے ان کا نام لے کر ذکر کیا۔ اگر ان سے
صرف چند ایک کا ذکر کیوں کیا | ایسے انبیاء کا ذکر کیا جاتا جن کا انہوں نے کبھی نام تک نہیں سنا تھا
تو، ان کے ذکر سے مستفید ہونا تو درکنار، یہ بحث چھڑ جاتی کہ وہ

تھے کون اور رہنے والے کہاں کے تھے۔ (مثال کے طور پر اگر ان سے کہا جاتا کہ جناب کنفیوشس نے اپنی قوم سے
یہ کہا تھا تو ان کے ہاں خود کنفیوشس کے متعلق بحث چھڑ جاتی اور جس مقصد کے لئے قرآن نے ان کا نام لیا تھا، وہ مقصد
فوت ہو جاتا) یہ وجہ ہے جو قرآن نے نام لے کر صرف ان انبیاء کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی اولین مخاطب قوم
بخوبی واقف تھی۔

حضرت موسیٰ کے خدا سے ہم کلام ہونے کے متعلق انڈکس رزیر عنوان موسیٰ (۴) دیکھئے۔ ان انبیاء کا مشن

کیا تھا، فرمایا:

مُرْسَلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِّئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ
حُجَّةٌ بَعْدَ السَّيْلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۶۵)

۴
۱۶۵

رسولوں کا مشن

ان رسولوں کا مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ نظام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے

سے کیا کیا خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے، اور اس کے خلاف جانے سے کیا کیا تباہیاں

آئیں گی۔ یہ رسول اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں صحیح راستہ تو بتایا نہیں گیا، اور تباہیاں

یونہی مسلط کر دی گئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کا قانون مکافات جہاں اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ

اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا، وہاں اس قدر پُر حکمت بھی ہے، کہ یونہی اندھا دھند تباہیاں نہیں

لے آتا۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ رسول اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ خدا نے

ہمیں آگاہ تو کیا نہیں کہ کوئی راستہ صحیح اور کونسا غلط ہے، اور یونہی دھاندلی سے ہم پر تباہی مسلط کر دی گئی ہے

تو اس میں بڑی اہم حقیقتیں مضمر ہیں جو وضاحت اور غور و فکر کی متقاضی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا اور ہر شے کو بنا دیا کہ وہ کونسی راہ ہے جس پر چلی کر

وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ (انسان کے سوا) یہ راہنمائی ہر شے کی فطرت کے اندر مضمر ہوتی ہے جسے

(INSTINCT) کہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مطالب الفرقان۔ جلد اول میں ہدایت اور صراطِ مستقیم کے عنوانات دیکھئے۔

۲۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ ہم نے ان کے لئے دونوں راستوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ (بنہ)۔ اسے خدا کی طرف

سے ہدایت ملنا کہتے ہیں۔ لیکن یہ راہنمائی اشیائے کائنات کی طرح انسان کی فطرت (جست)

میں نہیں رکھ دی گئی۔ اس کے لئے رسول بھیجے گئے، یعنی خدا نے انسانوں تک ہدایت

پہنچانے کی خود ذمہ داری نھئی، اسے پورا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا گیا۔ یہ رسول انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے

تھے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے اس ذمہ داری کی ادائیگی اسی صورت میں سمجھی جاسکتی ہے کہ۔

اس قوم تک پیغام خداوندی پہنچ چکا ہو اور اس میں

۱۔ یہ راہنمائی ہر قوم تک پہنچ چکی ہو۔ اور

۲۔ اس قوم میں اس پیغام کے سمجھنے اور غور

اسے سمجھنے کی صلاحیت ہو

کرنے کی صلاحیت ہو۔

۳۔ جن قوموں تک یہ پیغام نہ پہنچے ان کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور بن قوموں میں اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، انہیں مرفوع التکلم سمجھا جائے گا۔ قرآن کریم نے ہر دو نکات کی وضاحت کر دی ہے۔ پہلے تبلیغ رسالت (پیغاماتِ خداوندی کے پہنچانے) کی مشق کر لیجئے۔ (ہم چند ایک مثالوں تک اکتفا کریں گے) پہلے اس دنیا میں تباہ ہونے والی قوموں کو لیجئے۔ فرمایا:

سب تک ہدایت پہنچا دی گئی تھی | ۱۔ یہ ظلم ہوتا اگر خدا کسی قوم کو تباہ کر دیتا تو آئنا کی طرح اسے اس کا پتہ ہی نہ ہوتا کہ سلامتی کی راہ کونسی ہے، اور تباہی کا راستہ

کونسا۔ (۱۳۴)؛ (۱۳۵)؛ (۱۳۶)؛ (۱۳۷)؛ (۱۳۸)؛ (۱۳۹)۔ اس کے لئے بالعموم یہ طریق اختیار کیا جاتا تھا کہ اس قوم کے مرکزی مقام میں رسول بھیج دیا جاتا اور وہ وہاں سے پیغاماتِ خداوندی کو عام کرتا۔ (۱۴۰)

۲۔ یہ اس لئے کہ کوئی قوم یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری طرف تو کوئی نذیر و بشیر آیا ہی نہیں تھا۔ (۱۴۱)۔ رسول اللہ کو حضور کی اولیں مخاطب قوم کی طرف اسی اتمامِ حجت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ (۱۴۲)۔ لیکن وہ اس پر بھی مخالفت پر آئے (۱۴۳)۔ ۳۔ ایک قوم صحیح راہ پر چلنے کے بعد پھر غلط راستہ اختیار کرے تو اس پر بھی کشادگی راہ بند نہیں کی جاتی۔ تاوقتیکہ اسے آگاہ نہ کر دیا جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ (۱۴۴)

یہ تو دنیاوی زندگی کے متعلق تھا۔ اخروی زندگی کے متعلق قرآن کریم مختلف تفصیل تخیلی انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

۱۔ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری قوم نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا۔ (۱۴۵)۔ ۲۔ خود ان مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ تم نے رسولوں کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا۔ (۱۴۶)۔ ۳۔ جہنم کا دار و عدان سے کہے گا کہ کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے۔

(۱۴۷)؛ (۱۴۸)

۴۔ اہل جہنم اپنے عذاب کی ذمہ داری ایک دوسرے کے سر پر دھریں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اس بے معنی جھگڑے سے کیا حاصل؟ تم سب کو وارننگ دی گئی تھی کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (۱۴۹)۔ قبل اس کے کہ ہم اس دوسرے مکتہ تک پہنچیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب دے دیا جائے جو آپ کے دل میں اٹھ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ لوگوں تک پیغاماتِ خداوندی پہنچانے کے لئے خدا نے رسولوں کا

ختم نبوت کے بعد تبلیغ ہدایت کا ذمہ | سلسلہ شروع کیا۔ لیکن یہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد تبلیغ رسالت

کی شکل کیا ہوگی؟ اس کا جواب خدا نے خود ہی دے دیا۔

اس نے کہا کہ رسول خداؐ کی کتاب دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ خدا کی آخری کتاب (قرآن مجید) اپنی مکمل اور محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب رہا اس کی تبلیغ کا فریضہ، سوائے امت محمدیہ کے پروکرو دیا۔ فرمایا:

ثُمَّ أَوْسَرْنَا لِلَّذِينَ اتَّخَذُوا الْإِسْلَامَ دِينًا (۳۵)

”رسول کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنادیا جنہیں ہم نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا تھا۔“ لہذا

ختم نبوت کے بعد قرآن کریم کے اقوام عالم تک پہنچانے کا فریضہ امت مسلمہ (ہم مسلمانوں) نے ادا کرنا تھا۔ لیکن، اور یہ لیکن بڑا اہم ہے، جس قوم نے خود ہی قرآن کو چھوڑ دیا ہو وہ اسے دوسروں تک کیا پہنچائے گی؟ لہذا ہم دوسرے جہم کے مجرم ہیں۔ ایک خود ترک قرآن کے، اور دوسرے اسے اقوام عالم تک پہنچانے کے فریضہ کی عدم ادائیگی کے۔ اور اس دوسرے جہم کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔

(ضمناً) یہ الگ بات ہے کہ قرآن (لفظوں تک ہی سہی) کا لسانی تقاضوں کی رو سے دیگر اقوام تک پہنچ رہا ہے اور ان کے ارباب فکر و دانش اس پر غور و فکر بھی کر رہے ہیں۔



سمجھنے کی صلاحیت | اب آئیے دوسرے نکتہ کی طرف۔ یعنی یہ کہ تبلیغی ان قوموں کی آتی ہے جن تک خدا کی راہنمائی پہنچ چکی ہو اور وہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے وہ اصولی طور پر کہتا ہے کہ اہل جہنم وہ ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے جو کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ جو دل (یا دماغ) رکھتے ہیں لیکن اس سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ (۱۶/۹) یعنی اہل جہنم وہ لوگ نہیں جن میں دیکھنے، سُننے، سمجھنے کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ یہ وہ ہیں کہ ان میں صلاحیت تو ہے اس سے کام نہیں لیتے اور غلط راستے کو نہیں چھوڑتے۔

۲۔ وہ صلاحیتوں کے باوجود راستہ کیوں نہیں چھوڑتے؟ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پرندہ پڑتی ہے اور

ان کے جذبات ان پر غالب آجاتے ہیں۔ (۱۶/۲۴)

۳۔ اقوام سابقہ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایک لفظ میں ساری بڑی بات ٹھادی جب کہا کَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹)۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔
ان مقامات (اور ان جیسے کئی دیگر مقامات) سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ پیغاماتِ خداوندی اپنی کی رہنمائی کر سکتے ہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔



ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے محبت کا اتمام ہو چکا ہے (یعنی انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی جو ذمہ داری اس نے اپنے اور پلی تھی وہ ادا ہو جاتی ہے) اگر ان لوگوں تک جو اس پیغام کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ پیغام پہنچ جائے۔

یہاں وہ اعتراض سامنے آتا ہے جو قریب قریب ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ جن لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا ہی نہیں۔ یا جو اسے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، انہیں سزا کیوں دی جائے۔

یہ اعتراض اس بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ذہن میں خدا کی طرف سے سزا کا وہی تصور ہوتا ہے جو دنیاوی عدالتوں کی طرف سے مجرموں کو ملتا ہے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی سے ”سزا اور جزا“ کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اسے آپ انڈکس میں دیکھئے۔ اس مقام پر ہم اسے ایک مثال کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی گاؤں میں سکول نہیں۔ یا سکول ہے تو کسی بچے کا باپ اسے سکول بھیجتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں وہ بچہ علم سے محروم رہ جائے گا۔ علم سے محرومی بہت بڑی ”سزا“ ہے جسے وہ بچہ ساری عمر بھگتے گا۔ لیکن اس بنا پر وہ بچہ اس کا ذمہ دار نہیں تھا، آپ اسے علم سے محرومی کے نقصانات سے بچا نہیں سکتے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس گاؤں میں مدرسہ نہیں کھولا تھا۔ یا اس بچے کا باپ جس نے اسے سکول نہیں بھیجا تھا، اس جرم کی سزا پائیں گے لیکن ان کی سزا سے بھی بچہ علم کی فیوض سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گا۔

یہ ہے مثال ان کی (۱) جن تک پیغاماتِ خداوندی نہیں پہنچ پائے یا جن میں ان کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ نیز (۲) ان کی جہنموں نے ان پیغامات کو ان لوگوں تک نہیں پہنچایا، یا انہوں نے ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو بار آور نہیں ہونے دیا۔ اول الذکر پیغاماتِ خداوندی کے فیوض و برکات سے محروم رہ جائیں گے۔ اور آخر الذکر کو دوہری سزا ملے گی۔
اس کے بعد بتایا کہ اس امر کی شہادت کیا ہوتی تھی کہ رسول جس پیغام کو خدا کی طرف سے کہہ کر پیش کرتے تھے، وہ فی الواقعہ منزل من اللہ ہوتا تھا۔ فرمایا۔

لَٰكِن اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِۦ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِيدًا ۝۱۶۶ (۴)

۴
۱۶۶

وحی کی شہادت

”اب وہی دین، علم و بصیرت کی بنیادوں پر، تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس پر خود خدا کی شہادت موجود ہے۔ اور اس کی کائناتی قوتوں کی شہادت چوپکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کائنات میں ہر کام قانون کے مطابق ہوتا ہے اور قانون ہی کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اور وہ بنیادی شہادت، جس کے بعد کسی خارجی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، خود اس قانون خداوندی کی داخلی شہادت ہے یہ اپنے نتائج سے بتا دے گا کہ میں اسی خدا کا قانون ہوں جس کا قانون ساری کائنات میں جاری و ساری ہے (۴/۱۶۶) ان شہادتوں کی تشریح آیت (۳/۱۲) میں سابقہ صفحات میں گزری چکی ہے اس قسم کے محکم اور قابل اعتماد شہادات کے بعد بھی جو لوگ اس پیغام سے انکار کریں اور سرکشی کی راہ اختیار کریں، ان کے متعلق کہا:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۙ
بَعِيْدًا ۝۱۶۷ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرْ
لَهُمْ وَلَا لِيُهْدِيَهُمْ طَرِیْقًا ۙ اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ
فِیْهَا اَبَدًا ۙ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرًا ۝۱۶۸

۴
۱۶۷-۱۶۸

اس کے بعد کفر | اب ظاہر ہے کہ جو لوگ دین سے انکار کریں اور نظام خداوندی کے قیام میں جو رعبیت عامہ کی راہ ہے، سنگ گراں بن کر بیٹھ جائیں، تو ان سے بڑھ کر گمراہی اور کس کی ہو سکتی ہے؟

ان کے انکار اور سرکشی کی روش، سوائے اس کے کہ انہیں تباہیوں کے ابدی جہنم کی طرف سے جائے، اور کیا نتیجہ مرتب کرے گی؟ خدا کے قانون مکافات کی رو سے، انہیں اس تباہی سے کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت کی تصریحات بیان کرنے کے بعد کہا کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرّٰسُوْلُ بِالْحَقِّ ۚ مِنْ سَرِّبِكُمْ فَاٰمِنُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْمًا حَكِيْمًا ۝۱۶۹ (۴)

۴
۱۶۹

سوائے نوع انسان! یہ رسول تمہارے خدا کا قانون ربوبیت ہے کہ تمہاری طرف، حق و صداقت

نوع انسان کی طرف آخری رسول

کے ساتھ آگیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت پر یقین کر کے، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لو گے تو یہ تمہارے لئے اچھا ہوگا۔ اس سے یہ نظام جلدی متشکل ہو جائے گا اور تم اس کے ثمرات سے بہرہ یاب ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر تم نے اس سے انکار کر دیا اور اپنی روش پر چلتے رہے، تو پھر خدا کا کائناتی قانون، جو سراسر علم و حکمت پر مبنی ہے، اور جو ارض و سمائیں باری و ساری ہے، اپنے انداز اور اپنی رفتار کے مطابق، اُسے بند رہج آگے بڑھاتا جائے گا۔ خدا کا کائناتی قانون تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی رفتار، تمہارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک "دن" ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (۳۵)۔ بلکہ پچاس ہزار سال کا (نہ)۔

سابقہ رسول ایک ایک قریہ میں، ایک ایک قبیلہ یا قوم کی طرف آتے تھے۔ لیکن آخر میں ایک ایسا رسول بھی آگیا جو تمام نوع انسان کی طرف رسول تھا۔ اس رسول (علیہ السلام) نے اپنی حیات طیبہ میں اس پیغام خداوندی کو نسلی، قبائلی، وطنی، لسانی، حدود و قیود سے ماوراء، اپنے دور کے ذرائع ابلاغ کے مطابق تاجید امکان و درود و تک پہنچایا اور اس کے مطابق نظام قائم کر کے، دنیا کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ ممکن العمل بھی ہے اور اس قدر خوشگوار نتائج کا حامل بھی۔ حضور کے بعد (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ فریضہ امت محمدیہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُمت محمدیہ ہم مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ جو قوم بھی اس پیغام کی صداقت کو تسلیم کر کے اسے اپنائے گی اس کا شمار امت محمدیہ میں ہو جائے گا۔ یعنی اس اُمت میں جسے کتاب خداوندی کا وارث قرار دیا گیا تھا۔

لیکن اس قوم کو راہ حیات کی ایک ایسی خطرناک گھاٹی سے آگاہ کیا گیا جو اکثر اُمتیں سابقہ کے لئے باعث لغزش اور موجب تباہی ہوئی تھی۔ یہ مقام بڑا اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔ خطاب اہل کتاب سے ہے اور تنبیہ ہمارے لئے۔ فرمایا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلَّمْنَاهُ ۖ فَقَالُوا إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ إِنَّمَا الْخَيْرُ الْكُفْرُ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهُ وَاحِدٌ ۚ سُبْحَنَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۚ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

اور ظاہر ہوں گے۔ تم اس کے دائرے سے کہیں باہر نہیں جاسکتے۔ نہیں گھیر کر وہیں لایا جائے گا۔
ان آیات میں جو کچھ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اسے سورۃ آل عمران کی متعلقہ آیات کے سیاق و سباق
میں رکھ کر آسانی سمجھا جاسکتا ہے جس مقام کو ہم نے تباہ کن خطرناک گھائیٹ سے تعبیر کیا ہے وہ ہے غلو فی الدنیا۔ اور
یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے گہرے غور و فکر کا منتقاضی ہے۔

غلو فی الدنیا کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ ص ۱۹۳ (زیر آیت ۲۱) آغاز سخن کیا گیا تھا لیکن وہاں
اجبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو مقام الوہیت تک پہنچا دینے پر اکتفا کیا گیا تھا۔ رسولوں کے متعلق لکھا گیا تھا
کہ ”دنیا کے ہر اہل مذہب نے اپنے بانی مذہب کو کسی نہ کسی شکل میں فوق البشر قرار دے رکھا ہے“ اور حضور نبی اکرمؐ
کے متعلق اس اعلان کو پیش کیا گیا تھا۔ ”اِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوحٰی اِلَیَّ“ (۱۸) ”میں تمہارے ہی جیسا
ایک انسان ہوں فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے“ اس کے برعکس ہم نے جس طرح حضورؐ کو
مقام بشریت سے اٹھا کر مقام الوہیت تک پہنچا رکھا ہے، اس کے متعلق میں نے وہاں کچھ نہیں لکھا تھا۔ میں نے اس
موضوع پر تصوف سے متعلق اپنی حالیہ تصنیف کردہ کتاب میں شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ تفصیل وہاں ملے گی۔ یہ
موضوع بڑا اہم اور نازک ہے۔ اسے ضمنی طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں میں اس کی صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرنا
چاہتا ہوں۔

علامہ اقبال نے اپنے دور اول میں دو قطعہ بند شعر لکھے تھے۔ جب انہوں نے اپنا مجموعہ کلام (بانگ درا)
مرتب اور شائع کیا تو اس میں سے یہ اشعار حذف کر دئے۔ اس کے
معنی یہ ہیں کہ وہ خود ان اشعار کو اپنی طرف منسوب نہیں کرنا چاہتے تھے
لیکن ان کی وفات کے بعد ان اشعار کو کھو کھو کر نکالا گیا اور اب انہیں اپنے عقائد کی تائید میں بڑے دھڑلے
سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ (متروک) اشعار یہ ہیں۔

نحف میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے
جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں ہونے والے کو
میں بندہ اور کا ہوں، امت شاہِ ولایت ہوں
مجھے مذکور رکھ میں مستِ صبیائے محبت ہوں
ان (متروک) اشعار کو چھوڑیے۔ اس قسم کے اشعار آپ کو قوالی کی ہر محفل میں ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سنائی دیتے
اور ان پر، اربابِ معرفت و ہدایت دیکھائی دیں گے کہ:

وہی جو مستویٰ عرش سے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰؐ ہو کر

حتیٰ کہ

ہو الاول، ہو الآخر، ہو الظاہر ہو الباطن
 نہ ہو سکتے ہیں دو اول، نہ ہو سکتے ہیں دو آخر
 بکلی شئی علیہم، لوح محفوظ خدا تم ہو
 تم اول اور آخر۔ ابتدا تم، انتہا تم ہو
 (صدائق بخشش۔ مولانا احمد رضا بریلوی (مرحوم))

جب ان سے کہا جائے کہ یہ تو غلو ہے، جس سے خدا نے سختی سے منع کیا ہے، تو وہ جواب میں کہہ دیں گے کہ
 مجھے معذور رکھ میں مست صہبائے محبت ہوں۔ ان کوئی پرچھے کہ جب اہل کتاب (یا دیگر اہل مذہب) نے بانیان مذہب
 کو خدا، خدا کا اوتار، یا اس کا بیٹا قرار دیا تھا تو وہ محبت کی بنا پر تھا یا نفرت کی بنا پر! اگر ان کا برہنائے محبت و عقیدت،
 غلو کفر اور شرک ہے، تو ہمارا غلو کس طرح عین دین تسلیم کیا جاسکے گا۔

ہمیں اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہر شے کا اس کے صحیح مقام پر رہنا الحقی ہے۔ جس طرح اسے اس کے
 مقام سے نیچے گرا دینا غیر الحقی ہے اس طرح اسے اس کے مقام سے اونچالے جانا بھی غیر الحقی ہے۔ خدا، خدا ہے اور
 رسول، رسول۔ اور یہی خدا اور اس کے رسول کی صحیح تکریم و تعظیم اور یہی قرآن کی رو سے وہ ایمان ہے جس کے متعلق کہنا

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ
 وَيَزِيدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنَكَفُوا فَاسْتَكَفُوا
 فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا
 نَصِيرًا ۝ (۴۴-۴۳)

صحیح ایمان "جو لوگ خدا کو اپنا الہ اور اپنے آپ کو اس کا عہد و محکوم سمجھتے ہیں اور اس کے احکام و قوانین کے
 مطابق عمل کرتے ہیں، انہیں ان کے حسن عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔" بلکہ خدا کی سولت بخششوں

کی رو سے، ان کی توقعات اور اندازوں سے بھی زیادہ۔ لیکن جو لوگ خدا کا بندہ (محکوم) ہونے میں عار
 محسوس کریں گے اور اپنے آپ کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھیں گے کہ خدا کی اطاعت کی جائے، تو ان کی اس روش
 کے نتائج، درد انگیز تباہی کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گے۔ وہ بُری طرح برباد ہوں گے۔

اس وقت انہیں معلوم ہو گا کہ سب سے ذات خدا ہی کی ہے۔ سارا اقتدار اسی کے لئے ہے۔ اس نے

سوا کوئی چارہ سازا: رد و کار نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کا ایمان خدا کی اس کتاب کی صداقتوں پر یقین کامل رکھنے سے حاصل ہوتا ہے جس کی منسوخیات یہ ہیں کہ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن سِرِّكُمْ وَأُنْزِلْنَا إِلَيْكُمْ
نُورًا مُّبِينًا (۴۶)

اے نوع انسان! تمہارے پاس، تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، واضح دلائل آگئے ہیں۔
اس نے تمہاری طرف ایک ایسا ضابطہ ہدایت بھیج دیا ہے جو نور روشن ہے اور ہر چیز کو روشن کرتا ہے (روشنی
کا خاصہ ہے کہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی)۔ روشن چراغ کو
دوسرے دیئے کی روشنی سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف لے آتی
ہے۔ نیز وہ ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین کر دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہی کیفیت قرآن کی ہے)

یہ کتاب عظیم:

قرآن مجید کی خصوصیات

۱۔ تمام نوع انسان کے لئے جامع ہدایت ہے۔

۲۔ یہ دلائل و براہین پر مبنی ہے۔

۳۔ یہ روشنی ہے جو زندگی کی راہیں تابندہ کرتی چلی جاتی ہے۔

۴۔ یعنی مبین ہے۔ خود کبھی واضح ہے اور ہر معاملہ کو واضح کر دیتی ہے۔ جو لوگ دل و دماغ کے کامل اطمینان

کے بعد اس کی صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں:

قَامَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ
مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمًا (۴۷)

سو جو لوگ اللہ کے اس روشنی اور تابناک ضابطہ ہدایت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیں، اور
اس سے محکم طور پر وابستہ رہیں، تو خدا کا نظام ربوبیت، ان کی ذات کی نشوونما کا سامان ہم پہنچا دے گا اور
ان پر معاشی خوش حالیوں اور سہولتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور اس طرح وہ، اس سیدھی اور متوازن
راہ پر چل نکلیں گے جو انہیں بلا خوف و خطر خدا کی متعین کردہ منزل مقصود تک لے جائے گی۔
اور یہ منزل اس کے سوا کیا ہے کہ:

۱۔ تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری بن جائے۔ (۴۸)

۲۔ کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن نہ رہے۔ (۴۸)

نوع انسان کی منزل مقصود

۳۔ کوئی انسان نہ کسی انسان کا محکوم ہو۔ (۴۸)۔ نہ اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج۔ (۱۱۸-۱۱۹)

۴۔ تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پائیں۔ (۵/۳۳)

۵۔ تظام عدل و احسان اس درخشندگی سے قائم ہو کہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ (۳۹/۶۹)

۶۔ اور اس نور سے تمام افراد کی ذات کی صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو جائے کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں۔ (۸۴/۱۹)

اسی راہ کو خدا کی طرف سے جانے والی صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔
آپ دیکھئے۔ اس میں خالی ایمان و صداقتوں کو صحیح تسلیم کر لیتے، کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ اس کتاب کے ساتھ اعتصام بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اعتصام کے معنی کسی سہارے کو ایسی مضبوطی سے پکڑنے یا تھامنے کے ہیں کہ انسان گرنے سے محفوظ رہے۔ (۳۰-۳۱)۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا سِوَا الْوَحْدَةِ الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ۔ واضح کر دیا کہ سہارا صرف قرآن ہے اور اعتصام صرف اسی کا لازم ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور چیز کا نہیں۔ اس کو توجید کہا جاتا ہے۔

※

سورۃ النساء کے شروع میں وراثت سے متعلق تفصیلی احکام دیئے گئے تھے (۴/۱۱)۔ ان کی ایک ذیلی شق کا آخر میں اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلُّن مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِي ۚ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (۴/۱۲۷)

(اس سورۃ کے شروع میں وراثت کے قوانین بیان کئے گئے تھے، جن میں کلالہ یعنی لا ولد کا ذکر

بھی آیا تھا۔ وہاں اس لا ولد مرنے والے کا ذکر تھا جس کے ماں باپ اور بہن بھائی موجود ہوں) (۴/۱۱)۔ اسی ضمن میں یہ لوگ تم سے کچھ مزید دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ اس کے متعلق تمہیں خدا خود بتاتا ہے۔

اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔ تو اس کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی:

کلالہ کی وراثت ۱۔ اگر متوفی مرد ہو اور اس کی صرف ایک بہن ہو، تو ترکہ میں اس کا نصف حصہ ہوگا۔

- ۲۔ اگر نفیہ عورت ہو، تو اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا۔
- ۳۔ اگر ایک بہن کے بجائے دو بہنیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی حصہ ہوگا — دو سے زیادہ بہنوں کے لئے بھی یہی اصول ہوگا۔ (۴)
- ۴۔ اور اگر بھائی ہیں طے ہوں، تو ”ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ“ کا اصول کارفرما ہوگا۔ (۵)
- (یہ تقسیم فرضہ کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ ۴)
- اللہ تمہیں یہ احکام کھول کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو۔ اور اللہ ہر بات کا صیح صیح علم رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے احکام و قوانین علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔
- ”کلامہ“ کا ذکر سابقہ صفحات میں (قوانین وراثت کے ضمن میں) آچکا ہے۔

سُورَةُ النَّسَاءِ خَتَمَ

پانچواں باب

سُورَةُ الْمَائِدَةِ

کفر اور اسلام کا معیار

(آیت ۱ تا ۵)

۱	حرام و حلال کی بحث
۲	عدل و احسان
۳	دین کی تکمیل
۴	قوموں کی تباہی کی دو شرطیں
۵	اسلامی نظام کے قیام کا پروگرام
۶	انسانی جان کی قیمت
	(پہلا قتل)
۷	جرائم کی سزائیں
۸	کفر اور اسلام کا معیار — کتاب اللہ
۹	جہنم میں لیڈروں اور عوام کے مکالمات
۱۰	دین میں غلو
۱۱	نصف
۱۲	حج کا مقصد

شروع سورۃ المائدہ (پانچویں سورت)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ المائدہ کی پہلی آیت کا پہلا حصہ یوں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ**۔ عقود (العقود کی جمع ہے) اس کے بنیادی معنی مضبوطی سے گرہ باندھنے کے ہیں۔ **عَقَدَ الْعَهْدَ** ”اس نے عہد کو مضبوط کر دیا“ پھر اس کے معنی عہد و پیمان کے ہو گئے۔ یا ان ذمہ داریوں کے جو انسان نے اپنے اوپر سے رکھی ہوں۔ اس مفہوم کے لئے ”ایفائے عہد“ آیا ہے جو مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ (۱۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۶۵) لہذا **أَوْفُوا بِالْعُقُودِ** کا مفہوم یہ ہوگا کہ قوانین خداوندی کی رو سے جس قدر ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں، اور جنہیں پورا کرنے کا تم عہد کرتے ہو، انہیں بحسن و خوبی پورا کرو۔ ان پابندیوں میں پہلے حرام و حلال کا ذکر آیا ہے۔ جس کے لئے فرمایا: **أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُّمْ** ط (۵۷)۔ یعنی ”تمہارے لئے بہیمۃ الانعام حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کی حرمت کے متعلق الگ احکام دیئے گئے ہیں۔ اور اس استثناء کے ساتھ کہ جب تم حج کی تقریب پر حالت احرام میں ہو تو ان (حلال جانوروں) کا بھی شکار نہ کرو“ دوسری جگہ حید البر کی تخصیص سے بتا دیا کہ حالت احرام میں صرف خشکی کے جانوروں کے شکار کی ممانعت ہے۔ (۵۷)

قرآن کریم کے نظر پر حرام و حلال کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۱۴۱ پر دی گئی ہے اور حرام چیزوں کی فہرست اس کے ص ۱۴۲ پر۔ یہاں دو ایک نکات کی تشریح ضروری ہے۔

بہیمۃ الانعام:

۱۔ یہاں بہیمۃ الانعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ انعام کے عام معنی مال مویشی کے ہیں۔ عرب عام طور پر اس لفظ کو اونٹ، بکری اور گائے کے لئے بولے جاتے۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دنبہ کو بھی شامل کیا ہے۔ قرآن کریم نے اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری، چاروں کو اس میں شامل کیا ہے۔ (۵۷-۴-۵۸)۔ اس میں مختلف مقامات پر ان کاموں کی تفصیل دی گئی ہے

جو انعام سے لئے جاتے ہیں۔ اس تفصیل کو کائنات القرآن سے درج کیا جاتا ہے۔

سورہ فاطر میں اَنْعَام کو انسان اور دو آیت سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵)۔ اگرچہ دو آیت میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د - ب - ب)۔ لیکن یہاں دو آب کے معنی پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے لہذا، اَنْعَام سے مراد چارپائے ہوں گے۔

سورہ طہ میں ہے کہ نباتات سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے اَنْعَام کو بھی کھلاؤ۔ کُلُوا وَشَرَبُوا اَنْعَامَكُمْ (۲۰ نیز ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَنْعَام چرنے، چلنے والے جانور ہیں جنہیں تم چرا کر لاتے ہو۔ (۱۶)۔

سورہ نحل میں ہے کہ تم اَنْعَام کا دودھ پیتے ہو (۱۶)۔ سورہ المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور سواری بھی کرتے ہو (۲۳)۔ ان کی اونٹنیں کپڑے بناتے ہو (۱۶)۔ ان کی کھالوں کے خیمے بناتے ہو (۱۶)۔ ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو (۱۶)۔ ان میں خمولہ بھی ہیں اور فرس شام بھی (۶)۔ یعنی جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے کام آئیں۔ (دیکھئے عنوان ح - م - ل)۔ اور جو ان کاموں کے لئے چھوٹے، یعنی زمین گیر ہوں (دیکھئے عنوان ف - د - ش)۔ (۳۳) میں اَنْعَام کے متعلق ہے کہ تم ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو۔ سورہ یسین میں ان تمام فوائد کو اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ - وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمِنْهَا يَشَارِبُونَ (۳۶)۔ ان میں سے ان کے لئے سواری کا کام دینے والے ہیں۔ اور وہ بھی جنہیں یہ کھاتے ہیں۔

اور ان کے لئے ان میں (اور) بہت سی فائدہ کی چیزیں ہیں اور (پینے کا) دودھ بھی۔ اسی طرح سورہ مومن ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ لِكُلِّ شَيْءٍ مِّثْرًا ۚ وَلَکُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُورِکُمْ وَعَلِیْهَا وَعَلَى الْفُلْکِ تُحْمَلُونَ (۲۴)۔ اس میں بھی چوپایوں کے کھانے، ان سے سواری کا کام لینے، بوجھ لادنے اور دیگر فوائد کا ذکر ہے۔

سورہ نمل میں ان موشیوں کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں وہ لوگ (عرب) صبح و شام چرا کرتے تھے (۱۶)۔ اور بوجھ اٹھانے والوں کا ذکر الگ ہے (۱۶)۔ اور خیل (گھوڑے) بَعَال (خیر) اور حَمِیْر (گدھے) کے متعلق ہے لَتَزْكِبُوا عَنْهَا وَرِیْنَةً (۱۶)۔ وہ تمہارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور باعثِ زینت بھی ہیں۔ اسی طرح سورہ آل عمران میں اَلْخِیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ (۳۱) الگ الگ آیا ہے۔ یعنی پلے

ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی۔ سورۃ مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکُبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۴)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چارپائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو۔ اور بعض کو تم کھانے بھی ہو۔

ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اَلْاَنْعَامُ سے مراد چرنے چلنے والے مویشی ہیں۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے۔ سواری اور بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ کھانوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں۔ نیز یہ وجہ زینت بھی ہوتے ہیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ (یعنی اُس زمانے کے عرب اَلْاَنْعَامُ سے یہ کام لیا کرتے تھے)۔ اَلْاَنْعَامُ میں سے بجران کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، سب کھانے کے لئے حلال ہیں خنزیر چرٹے چلنے والا حیوان ہے اس لئے بَہِیْمَۃٌ اَلْاَنْعَامُ میں شامل ہے۔ لیکن یہ بر نصِ مرتع حرام ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے بَہِیْمَۃٌ اَلْاَنْعَامُ کہا ہے۔ بَہِیْمَۃ کے معنی ہیں وہ جو بول نہ سکے۔ گونگا۔ اُحِلَّتْ لَکُمْ بَہِیْمَۃٌ اَلْاَنْعَامِ کے یہ معنی نہیں کہ مویشیوں میں سے وہ حلال ہیں جو بول نہیں سکتے۔ مویشی تو سب بَہِیْمَۃ ہوتے ہیں۔ یہ لفظ و راص مویشیوں کی صفت ہے۔ یعنی مویشی جو بول نہیں سکتے۔ جیسے انگریزی زبان میں (DUMB CATTLE) کہا جاتا ہے۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے، تمام مویشی حلال ہیں۔ بجران کے جنہیں اس نے حرام قرار دے دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حرام چیزوں کی فہرست مطالب الفرقان جلد سوم۔ ص ۱۴۳ پر دی گئی ہے۔ مزید وضاحت آیت (۵) میں سامنے آئے گی۔

عالم اس کے فیصلے | آیت کے آخر میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِیْکُمْ مَا یُرِیْدُ (۵)۔ یعنی خدا جو چاہتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ مطالب الفرقان جلد اول۔ (ص ۲۴۲، ۲۴۳)

میں عالم امر اور عالم خالق پر بحث کرتے ہوئے بنایا گیا ہے کہ عالم امر میں ہر فیصلہ مشیتِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور عالم خلق میں ان قوانین کے مطابق جنہیں خدا نے متعین کیا ہے اور جن میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔ زیر نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ حلال اور حرام کا فیصلہ خدا کے عالم امر سے متعلق ہے اور خدا کے ارادہ پر مبنی۔ اس نے شہد کو شیرینی اور نمک کو مکین کیوں عطا کی ہے ہم نہیں کہہ سکتے۔ یعنی ہم اس ”کیوں“ کا جواب نہیں دے سکتے۔ البتہ ان کے مصالح کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان تشریحات کے بعد آیت (۵) کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اے جماعتِ مومنین! تم پر قانونِ خداوندی کی رو سے جتنی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور تم انہیں پورا کرنے کا عہد

کرتے ہو (اس لئے کہ یہ ایمان کا اولین تقاضا ہے) انہیں پورا کرو۔ (مثلاً) کھانے پینے کی چیزوں میں، بھڑان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہو (۵) تمام چرنے چکنے والے مویشی جلال ہیں۔ لیکن اگر تم حج میں ہو تو پھر ان کے شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ احکام خدا کے اس قانون کی رو سے دیئے گئے ہیں جسے وہ خود اپنے اختیار و ارادے سے متعین کرتا ہے۔

❦

اب ہم سورۃ مائدہ کی دوسری آیت کی طرف آتے ہیں اور اسے بھی جزو جزو پیش کرتے ہیں۔ فرمایا :-
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهَادَاتِ وَأَمْوَالًا لِّلْهَدْيِ وَلَا
الْقُلُوبِ (۵) - دین کے شعائر (محسوس علامات) اور ان کے احترام کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول۔
(۱۲۲) اور جلد سوم (۱۲۲) پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ اور "شَهْرُ الْحَجِّ" امر رحمت
کے مہینوں کے متعلق مطالب جلد سوم (۲۲۱-۲۲۲) (۲۸۱) پر۔

ہدی کی بابت مطالب جلد سوم (۲۳۴) میں بتایا گیا ہے کہ یہ وہ تحائف تھے جو حج کے اجتماع میں
شریک ہونے والوں کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ ان میں بیشتر جانور ہوتے تھے۔ اس نشان مہی کے لئے رکہ یہ
حاجیوں کے لئے تحائف ہیں) ان کے گھلے میں پٹہ سا باندھ دیا جاتا تھا۔ قَلَادَہ (قلادہ کی جمع)
انہی کو کہا جاتا تھا۔ اس طرح ان تحائف (اور جانور) کا شمار بھی شَعَائِرِ اللَّهِ میں ہو جاتا تھا۔
[ضَمْنَا تَقْبِيدَ كَالْفَتْحِ (قلادہ) سے آیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تقبید سے انسان پر کس قسم کی غلامی
وارد ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کے اندر کس میں تقبید کا عنوان دیکھئے]۔

زیر نظر آیت میں ان شعائر کے احترام کی بھی تائید کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ وَلَا آقَمِينَ الْبَيْتِ
الْحَرَامِ یعنی جو لوگ حج کی تقریب میں شرکت کے لئے جائیں ان کے احترام کی بھی۔ ان لوگوں کے متعلق کہا کہ
يُتَعَوَّنَ فَضْلًا مِّنْ رَبِّهِمْ وَبِضْوَانِنَا جِج کی تقریب میں شرکت کے مقصد کے متعلق کہا ہے کہ اس
معاشی فوائد بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مقصد صرف معاشی مفاد کا حصول نہیں۔ اصل غایت اپنی زندگی اور
نظام کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھنا ہے۔ (ان مفاہیم کے لئے اندر کس میں حج اور رضا جوئی باری تعالیٰ کے
عنوانات دیکھئے)۔

پہلے کہا تھا کہ حالت احرام میں شکار حرام ہے۔ اب کہا ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ تو پھر شکار

کر سکتے ہو۔ وَإِذَا اخْلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا (۵)۔

اس کے بعد آیت (۵) میں ایک ایسی بات آئی ہے جس کا، نظرِ ظاہر، سابقہ احکام سے کوئی تعلق بارِ بطن دکھائی نہیں دیتا، لیکن درحقیقت اس کا ان سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

حرام و حلال کا معاشرتی پہلو | حرام و حلال کا نظریہ تو مطالب الفرقان - جلد سوم (ص ۱۴) میں بیان ہو چکا ہے لیکن اس کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے جو بجائے خویش بڑا اہم ہے

آپ کو کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں سے عقائد کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس سے ان کے دل میں آپ کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات نہیں ابھرتے، لیکن حرام اور حلال کے اختلاف سے تعصب اور باہمی عداوت شدت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جس قدر فسادات برپا ہوئے ہیں ان کی بیشتر وجہ گائے کا ذبح ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی خنزیر کا نام لے دے تو ہمارا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ بعثت نبی اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں حلت و حرمت کا سوال بنیادی اختلاف اور تفریق کا موجب تھا۔ قرآن کریم نے ان بیشتر چیزوں کو حرام قرار دے دیا جن کے قریش عادی پہلے آرہے تھے۔ (۵)

یہودی اونٹ کو حرام سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے ہاں یہ حلال تھا۔ عیسائی خنزیر کو حلال قرار دیتے تھے حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے اسے قابلِ نفرت قرار دیا تھا، لیکن مسلمانوں کے ہاں وہ ایک ہی جانور تھا جسے قرآن نے نام لے کر حرام قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بحث و تمحیص رہتی ہوگی۔

دین کے اصولوں میں مفاہمت نہیں ہو سکتی | قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ یہ (غیر مسلم) کوشش کرتے تھے کہ حضورؐ کے ساتھ مفاہمت کی کوئی شکل پیدا

ہو جائے تو اس میں حرام و حلال کا سوال بھی (فطرۃ) سامنے آتا ہو گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا تھا کہ دین کے اصولوں میں ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور حلت و حرمت کا سوال دین کے اصولوں میں سے ہے۔ بایں ہمہ، ان لوگوں کو اس کی توقع ہوگی کہ شاید مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول - ص ۱۴)۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس باب میں قطعی احکام دے دیئے تو ان کی یہ امیدیں ختم ہو گئیں۔ وہ اس طرف سے قاطبۂ یایوس ہو گئے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اگلی ہی آیت (۵) میں، جس میں حرام چیزوں کی فہرست دی گئی ہے، یہ کہہ دیا کہ اَلْيَوْمَ يَكْفُرُ الْكَافِرُونَ اَمِنْ دِينِكُمْ۔ ”تمہارے مخالفین دین کے معاملہ میں اب تم سے قطعی طور پر یایوس ہو گئے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔ اب تمہارا دین

غلبہ تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ اس دو ٹوک اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی مخالفت میں شدت اختیار کر گئے۔ اسی کے پیش نظر جماعت مومنین سے کہا گیا کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِی مَہمیں ان سے خوفزدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ڈرنا ان سے نہیں چاہیئے۔ ڈرنا چاہیئے اس سے کہ کہیں قوانین خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

قریش کی طرف سے جماعت مومنین کی مخالفت شروع سے چلی آرہی تھی۔ اس باب میں وہ اس حد تک متشدد تھے کہ انہیں (مومنین کو) کبتہ تک بھی نہیں آنے دیتے تھے، حالانکہ ان کے ہی شعائر و قومی حصول کے مطابق بھی کبتہ کے دشمنوں سے بھی عدل | دروازے ہر عرب پر کھلے تھے۔ اس کے بعد یہ لوگ کھلی جنگ تک اتر آئے۔ یہی روش یہودیوں نے بھی اختیار کر لی۔

لیکن قرآن کریم کی کشادہ نگہی اور وسعت ظرف ملاحظہ ہو کہ وہ حلال و حلال سے متعلق آیات کے عین درمیان، جماعت مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۚ (۵/۲)۔ ”دیکھنا! کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے زیادتی کرنے لگ جاؤ۔ تم ایسا کبھی نہ کرنا۔ ان سے ہمیشہ عدل کرنا“ (۵/۲)۔

جنگ کے سلسلہ میں قرآنی احکامات سابقہ جلدوں میں آپکے ہیں (انڈکس ملاحظہ کیجئے)۔ قرآن کریم حدود سے تجاوز کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن حلال و حرام سے متعلق کے احکام کے درمیان، اس قسم کی تاکید قرآن کی دور نگہی اور وسعت قلب کی بین شہادت ہے۔

ان تصریحات کے بعد، سورۃ مائدہ کی (پوری) دوسری آیت اور اس کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشُّرَكَاءَ اِمْرًا وَلَا
الْمُذٰبِیْ وَلَا الْقُلَآئِدَ وَلَا اَمْمِیْنَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ اَمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ
سَّرٰیہُمْ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاَصْطَادُوْا ۚ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۚ وَتَعَاوَنُوْا عَلٰی
الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۚ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

۵/۲

اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو یاد رکھو کہ اگرچہ اصل شئے نظامِ خداوندی سے وابستگی اور اس کی اطاعت ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جو چیزیں اس نظام کی نمائندگی کے لئے بطور محسوس علامات مقرر کی جائیں، ان کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ اس لئے کہ ان کی بے حرمتی اس امر کی دلیل ہوگی کہ تمہارے دل میں نظامِ خداوندی کا احترام نہیں جس طرح کسی مملکت کے جھنڈے کا عدمِ احترام اس امر کی شہادت ہوتا ہے کہ اس شخص کے دل میں اس مملکت کا احترام نہیں)۔ نیز، جن مہینوں میں جنگ کا سلسلہ ملتوی کر کے امنِ عامہ کا اعلان کیا جاتا ہے، ان کی بھی بے حرمتی نہ کر د۔ نہ ہی ان تحالف اور جانوروں کی جو جگہ کے بین الاقوامی اجتماع کے لئے کیے جاتے ہیں یا ان لوگوں کی جو اس اجتماع میں شرکت کے لئے جائیں تاکہ دہاں ملت کے معاشی فوائد کے حصول، اور زندگی کو، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کرنے کی تدابیر سوچیں۔

اور جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ تو پھر شکار کر سکتے ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے مد مقابل وہ قوم ہے جس نے تمہیں سنت ایذا میں مبتلا کی ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں کہیں تک پہنچنے سے روک دیا تھا (۴۸)۔ اب تم ان پر غالب آگئے ہو تو دیکھنا! کہیں ان پر ظلم اور زیادتی نہ کرنے لگ جانا۔ یاد رکھو! کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے زیادتی کرو۔ تم ان سے ہمیشہ عدل کرو (۴۹)۔ اور ان تمام امور میں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی راہیں کشادہ کریں، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا موجب بنیں، ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ لیکن ان امور میں کبھی تعاون نہ کرو۔ جو انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا موجب ہوں، یا خدا کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کا باعث۔ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات، ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ اس کی گرفت بڑی سخت ہے اور وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

اس کے بعد آیت (۵) میں حرام چیزوں کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ یہ تفصیل مطالبِ جلد سوم (ص ۳۳) میں آچکی ہے لیکن چونکہ اس آیت میں کچھ اور اہم نکات بھی آگئے ہیں، اس لئے اسے بمعِ مفہوم درج فرمایا جاتا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا اٰهَلَ لِغَيْرِ اللّٰهِ
بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْقَةُ وَمَا اَكَلَ
السَّبْعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَاَوْسُجُ عَلٰى النَّصْبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ
ذٰلِكُمْ فِسْقٌ اَلْيَوْمَ يَجْزِي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ وَاَتَمَمْتُ

عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَخِيتُ لَكُمْ إِلَّا سَلَامَ دِينَا فَسِنْ اضْطَرَّ فِي
مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ إِلَّا تُجِبَ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۱۲۴) تم پر یہ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں :

- ۱۔ مُردار — اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو اپنی طبعی موت مر جائے اور وہ بھی جو کلا گھٹ کر مر جائے۔ چوٹ کھا کر مر جائے۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے۔ یا کسی جانور کا سینک لگ کر مر جائے۔ یا جسے دندوں نے پھاڑ کھایا ہو۔ اگر ان جانوروں کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا جائز ہے۔
- ۲۔ بہتا ہوا خون (۱۲۵) - ۳۔ لحم خنزیر (سور کا گوشت)۔

۴۔ — ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ نیز وہ جانور بھی حرام ہے جسے کسی استھان پر چڑھا دے کے طور پر ذبح کیا جائے۔ یعنی ان مقامات پر جو لوگوں نے نذر نیاز کے لئے مقرر رکھے ہوں۔

لیکن اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے — یہ نہیں کہ جان بوجھ کر منسوخ اشیاء کے کھانے کی طرف مائل ہو — تو وہ، بقدر ضرورت، ان حرام چیزوں کو بھی کھا سکتا ہے (۱۲۶)۔ قانون خداوندی میں، جو انسانوں کی حفاظت چاہتا ہے، خدا کی مہربانی سے اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تم قرعہ اندازی سے چیزوں کی تقسیم کیا کرو، یا فالیں نکالا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم صحیح راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاؤ گے۔ {متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے، قرآنی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے عقل و فکر کی رُو سے کرنے چاہئیں۔ قرعے ڈالنے اور فالیں نکالنے سے عقل و فکر کو ماؤف کر کے (CHANCE) کے مطابق فیصلے لئے جاتے ہیں۔ عقل کی رُو سے فیصلہ ہیں اگر اجتہاد غلطی ہو جائے تو اس پر بار و گر غور و فکر سے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جن تدابیر اور طرق میں عقل کو ماؤف کر دیا جائے، ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گنبد ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سر توہم پرستی میں بتایا ہے} تمہارے مخالفین، اس وقت تک اس اُمید میں تھے کہ تمہارے ساتھ شاید کوئی مفاہمت کی راہ نکل آئے (۱۲۷)۔ لیکن کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت، دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے، اس لئے اب یہ لوگ دین کے معاملہ میں تم سے مایوس ہو گئے ہیں، اور یقینی طور پر سمجھ چکے ہیں کہ یہ دین، ان سے کسی صورت میں مفاہمت نہیں کرے گا۔ لیکن تمہیں، ان سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم صرف اس سے ڈرو کہ کہیں

قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، کیونکہ اس کے نتائج فی الواقعہ ایسے تباہ کن ہوتے ہیں کہ انسان ان سے خائف ہو۔ تمہاری کمزوری کا ابتدائی دور ختم ہو جانے کے بعد، ہم نے تمہارے مخالفین پر تمہارے دینی غلبہ کو مکمل کر دیا ہے، اور اس طرح ہم نے تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کر دیا ہے جن کی تم آرزو کیا کرتے تھے۔ (۱)۔ اور تمہارے لئے اسلام کو بطورِ نظامِ زندگی تجویز کر دیا ہے جس کے ساتھ کسی اور نظامِ حیات کی مقابمت کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

یہ دین تمام نوعِ انسان کے لئے آخری، مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات ہے۔

قرعہ اندازی | ازلام کے متعلق مطالب۔ جلد سوم (ص ۳۲۴) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مراد قرعہ اندازی ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی اس جگہ بتائی جا چکی ہے۔ یہاں ایک نکتہ کا اضافہ ضروری ہے۔ قرعہ اندازی کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے لیکن ہمارے ہاں قرعہ اندازی۔ لائیاں۔ خالیں۔ استخارے عام ہوتے ہیں اور انہیں کوئی ممنوع نہیں سمجھتا۔ اس کی سند میں ایک حدیث لائی جاتی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ جب سفر پر تشریف لے جاتے تو اس بات کا فیصلہ کہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسے اپنے ہمراہ لے جائیں قرعہ کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ اس روایت کو صبیح قرار دینے والے اتنا نہیں سوچتے کہ، علاوہ اس کے کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اسے (معاذ اللہ) حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس سے حضورؐ کی خانگی زندگی کا کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے اس قسم کا نقشہ کہ ازواجِ مطہراتؓ کی یہ کیفیت تھی کہ حضورؐ اگر، بہ نفاضا لائے حالات، کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کا خود فیصلہ فرماتے تھے تو وہ (باقی) ازواجِ مطہراتؓ پر گراں گزرتا تھا، اور اس کے مقابلہ میں وہ ”اندھے اور گونگے پانڈے“ کے فیصلہ کو ترجیح دیتی تھیں (معاذ اللہ)۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت اس زمانے کی وضع کردہ ہے جب مسلمانوں کے گھروں کی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ میاں، بیوی میں سے کسی کا فیصلہ بطیب خاطر قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان میں باہمی ہم آہنگی نہیں رہی تھی۔ اور یہی کیفیت عام معاشرہ کی ہو چکی تھی کہ معاملات کا فیصلہ عقل و فکر کی رو سے کرنے کے بجائے، خالوں اور قرعوں کے فیصلوں کے تابع چلتے تھے۔ استبدادِ ملوکیت میں عقل و فکر کو اسی طرح ماؤف اور مفلوج کیا جاتا ہے۔ تقدیر کا عقیدہ بھی تو اسی زمانے کا وضع کردہ ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي وَسَخِيتُ لَكُمْ إِلَّا سُلَامًا دِيْنًا ط۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ اہمیت حجتہ الوداع کے موقع پر (۱۰؎ میں) نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضورؐ چند ماہ (قریب اسی دن) زندہ رہے۔ اس اعتبار سے اس آیت سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس میں تکمیل وحی کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ (اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ) سب سے آخر میں سورۃ توبہ نازل ہوئی تھی۔ (ضمناً نشان نزول اور زمانہ نزول آیات کی روایات بالعموم قابلِ اعتماد نہیں)۔ اگر یہ آیت، حجتہ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس سے اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے جسے ہم نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس سے مراد، دین کا غلبہ ہے جو حجتہ الوداع کے زمانہ میں تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔

اب آیت کے الفاظ کی طرف آئیے۔ اَلْيَوْمَ مَرِّیْ یَوْمَ سے مراد دن نہیں۔ اس سے مراد، زمانہ۔ دور۔ عہد، تاریخی مرحلہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ (دیکھیے۔ مطالب جلد اول۔ ص ۲۹) اور دین کے معانی میں غلبہ اور اقتدار بھی شامل ہیں (ایضاً)

اَكْمَلْتُ وَ اَتَمَمْتُ۔ بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں، لیکن دوسروں نے ان میں یہ کہہ کر فرق کیا ہے کہ اتمام، کسی چیز کی کمی پوری کرنے کو کہتے ہیں اور کمال، اس حد کو کہتے ہیں جس تک وہ اپنی نشوونما کے بعد پہنچ جائے۔ یا وہ اس مقصد کو پورا کر دے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (ک۔ م۔ ل کے مادہ میں) شدت اور قوت کا پہلو بھی مضمون ہے۔

جیسا کہ مطالب۔ جلد سوم (ص ۷۷ پر) بتایا جا چکا ہے، اصولی طور پر دین شروع سے ایک ہی چلا ہوا تھا۔ فرق اس کی جزئیات میں ہوتا تھا۔ چونکہ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب تھی جو تمام نوع انسان کے لئے ابدی ضابطہ حیات تھی، اس لئے خدا نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اس میں اس کی تکمیل ہو گئی اور یوں نعمتِ خداوندی اتمام تک پہنچ گئی۔

بعثت رسول اللہؐ کا مقصد یہ تھا کہ دینِ خداوندی، دیگر ادیان (نظامِ ہائے عالم) پر غالب آجائے یہ مقصد اُس زمانے کے حالات کے مطابق، حضورؐ کے آخری پیام میں، پوری قوت اور غلبہ کے ساتھ پورا ہو گیا۔ اس اعتبار سے بھی دین کی تکمیل ہو گئی۔ اور وحیِ خداوندی کے اتمام کے متعلق سورۃ الانعام میں کہہ دیا کہ تَحْسَبُ کَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا لَا مُبْدِلَ لِكَلِمَاتِهِ (۶/۱۱) کلماتِ خداوندی، صدق و عدل کے ساتھ اتمام تک پہنچ گئے۔ اب اس میں نہ کوئی کمی رہ گئی ہے، اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت۔ اس کے بعد

نبوت ختم ہو گئی۔

ان تصریحات سے آیت (۵) میں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ تکمیل دین کی حد آخر | اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ہدایت خداوندی قرآن میں تمام تک پہنچ گئی۔ صدر اول میں دین کی تکمیل (نعلہ و تمکن) بھی ہو گئی۔ اس کے بعد اس میں پیش کردہ نظام کو تمام نظام ہائے عالم پر غالب آنا ہے۔ (۹) اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا اسلامی مملکت کے ذریعے ممکن ہوگا جسے امت تشکیل کرے گی۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا وہ مقصد حاصل نہیں ہوگا جس کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا۔

✽

اب اگلی آیت کی طرف آئیے۔ اسے بھی مختلف ٹکڑوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أَحَلَّ لَهُمْ قُلْ أَحَلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ ۚ

۵
۴

(اے رسول!) یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ حلال چیزیں کون کون سی ہیں۔ ان سے کہو کہ جن چیزوں کو

حرام قرار دیا گیا ہے، انہیں چھوڑ کر باقی سب خوشگوار اور صاف ستھری چیزیں حلال ہیں۔

اس ایک آیت سے، قرآن کریم اور سابقہ مذاہب کی تعلیم کا فرق نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ آپ تو رات (بائیں)۔

عہد نامہ عتیق۔ کتاب اجابا باب ۷) دیکھئے۔ اس میں حرام چیزوں کی فہرست اس قدر طول طویل ہے کہ انسان کو حلال چیزوں کی تلاش کے لئے کاوش کرنی پڑتی ہے۔ یعنی اس میں آزادی کم ہے اور پابندیاں زیادہ۔ اس کے برعکس قرآن کریم کو دیکھئے۔

اس میں گفتنی کی چند چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد کہا کہ باقی سب چیزیں حلال پابندیاں کم۔ آزادی وسیع | ہیں۔ یعنی اس میں پابندیاں بہت کم اور آزادی کا میدان بڑا وسیع ہے۔

اس وسیع میدان میں صرف طیب کی تخصیص ہے۔ حلال کے سابقہ طیب کی خصوصیت کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد

اول۔ (ص ۳۵)۔ اور جلد دوم۔ (ص ۲۸۳) دیکھئے۔

اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا | حلال جانوروں کے ذبیحہ کے متعلق ایک ضروری شرط یہ ہے کہ انہیں اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان۔ جلد سوم (ص ۱۴۴) پر گزر چکی ہے

اس میں البتہ ایک نکتہ کا اضافہ ضروری ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ (ا) جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے

اسے کھاؤ۔ (۱۱۹) اور (ا) جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے مت کھاؤ (۱۲۶)۔ آیت (۱۲۶) میں ہے کہ وَ مَا

لَكُمْ اَلَّا تَأْكُلُوْا مِمَّا ذُكِّرَ اَسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ... (۱۲۶)۔ یعنی جن حلال جانوروں کو ذبح کرتے

حلال و طیب

وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو، ان کا گوشت کھانے میں ہمیں ترو نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسے ہر جانور کا گوشت کھانا تم پر فرض ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ طیب (خوشگوار وغیرہ) ہوں۔ اگر وہ تمہارے لئے طیب نہیں تو انہیں مت کھاؤ۔ لیکن کسی غیر خوشگوار چیز کے نہ کھانے اور اسے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) ممنوع سمجھنے میں بڑا فرق ہے۔ بعثت نبی اکرم کے وقت جو غیر مسلم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، بیشتر چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ مذہب میں حرام اور ممنوع سمجھتے تھے لیکن جنہیں اسلام نے حلال قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے کھانے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہوگی۔ ان سے کہا کہ اگر تمہارا جی نہیں چاہتا تو انہیں بے شک نہ کھاؤ لیکن انہیں حرام اور ممنوع نہ سمجھو۔ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ مَعَكُمْ (۱۱۳)

لیکن آپ حرام و حلال کی اپنے ہاں کی مروجہ فہرستوں کو دیکھئے اور پھر ان فقہی بحثوں کو جو مختلف فرقوں میں چلی آ رہی ہیں چونکہ ہم ان چیزوں کو جو فتنہ کی فہرستوں میں درج ہیں صدیوں سے حرام سمجھتے چلے آ رہے ہیں اس لئے اب ان میں اور خدا کی عطا سے حرام کردہ میں کچھ فرق نہیں کیا جاتا، اور ان کے کھانے کے تصور تک سے ہماری طبیعت ابا کرتی ہے کیا یہ چیز اسی شق میں نہیں آ جاتی جو خدا نے کہا تھا کہ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَأْكُلُوْا مِمَّا ذُكِّرَ اَسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (۱۱۴)۔ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو تم ناجائز اور ممنوع کیوں ٹھہراتے ہو؟

جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے میں ایک اہم نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے۔ آپ روزِ مرہ کے عام کاموں میں مصروف ہیں کہ آپ کو یکایک کوئی خاص کام یاد آ جاتا ہے۔ اُس وقت آپ کی تمام توجہات دیگر امور سے ہٹ کر، اس خاص کام پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ ایک عابد مومن کو جب ایسے حالات میں کسی ایسے کام کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے جس کا منفعین اور خصوصی حکم خدا نے دیا ہو تو اس وقت اس کی زبان پر خدا کا نام آ جانا عین نفسیاتی تقاضا ہوتا ہے حلال جانور کا ذبح کرنا ارشادِ خداوندی کی تعمیل ہے۔ اس وقت تمام توجہات کا اس طرف مرکوز ہو جانا اور زبان پر اسم اللہ کا آ جانا، اس امر کی شہادت ہے کہ یہ سب کچھ احکامِ خداوندی کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔ انسانی توجہات کا اس طرح اس نکتہ پر مرکوز ہو جانا اسوہ ابراہیمی کی یاد دلاتا ہے جب انہوں نے باطل کے تمام خداؤں سے منہ موڑ کر کہا تھا کہ اِنِّیْ وَجْهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۱۱۵)۔ میں اپنی تمام توجہات کا مرکز اسی ذاتِ بے ہمتا اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہوں۔ یہ میرا دلوں کے تیسرے ہے۔

ذبح کرتے وقت، بِسْمِ اللّٰہ کے ساتھ اَللّٰہ اَکْبَرُ بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کا تعین قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن ایسے وقت، خدا کی کبریائی کا اعتراف و اعلان جو معنوی حقیقت اور نفسیاتی اہمیت رکھتا ہے اسے ہم مطالب الفرقان - جلد سوم ص ۲۲ (زیر آیت ۲۱) بیان کیا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔



آیت (۵) کا اگلا حصہ یہ ہے:

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۚ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۵) ۱۰

اس آیت کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو، کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے۔ اور اللہ کا نام لو اس پر۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن)

اس ترجمہ کی رو سے کہا یہ گیا ہے کہ شکاری کتوں کو تم اس طرح شکار کرنا سکھاؤ جس طرح تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔ اس سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کسی انسان کو یہ نہیں سکھایا کہ جانوروں کو شکار کے لئے کس طرح سدھانا چاہئے؟ پھر یہ کیسے کہدیا کہ جس طرح خدا نے تمہیں سکھایا ہے، اس طرح تم انہیں سدھاؤ۔

خدا اس قسم کی باتوں کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے، اس کی تشریح، مطالب الفرقان - جلد اول - (ص ۱۸۴ پر) کر دی گئی ہے۔ وہاں اس آیت (۵) کا یہ حصہ بھی آگیا ہے۔ نیز مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۲۲) پر ان مقامات کو دیکھ لیجئے۔ بات واضح ہو جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا اہم ہے اس لئے اس تشریح کو غور سے دیکھئے۔

۱۔ مَا عَلَّمَكُمُ اللّٰہ کے لفظی معنی ہیں اس (علم) کی رو سے جسے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔ اللہ کے سکھانے سے مطلب ہے وہ فطری طریقہ جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے لکھئے (۲/۲۲) : (۲/۲۸۲) : (۵-۹۶)۔

انکی آیت ہے -

الْيَوْمَ احِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ ط وَطَعَامُ الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ز وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اتَّيْتُمُوهُنَّ اَجُورَهُنَّ مُحْصَيْنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّعِدِي اِخْدَانٍ ط وَ مَنْ يَكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ ز وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ؕ (۵)

تم نے غور کیا کہ حلت و حرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خود ساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآنی دور میں، چند چیزوں کو حرام قرار دے کر، باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دے دی گئیں۔ اس سے کس قدر میدان وسیع ہو گیا؟

نیز اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے اور وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔ کھانے پینے سے آگے بڑھ کر، ازدواجی زندگی کی طرف آؤ تو تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، عقد نکاح میں لانے کے لئے جائز ہیں۔ جب تم ان کے مہر ادا کر دو۔ بشرطیکہ اس سے مقصد ازدواجی زندگی کی پابندیاں پوری کرتی ہوں، نہ محض جنسی جذبہ کی تسکین (خواہ اس کے لئے رسمی طور پر "نکاح" کی شرط بھی کیوں نہ پوری کر لی جائے) یا ان تعلقات کو پوشیدہ رکھا جائے۔ دونوں شکلیں ناجائز ہیں۔ جائز صورت یہی ہے کہ باقاعدہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لئے نکاح کیا جائے اور اس سے عائد ہونے والی تمام ذمہ داریوں کو پورا کیا جائے (۵)۔

یہ ہیں وہ پابندیاں جن کی نگہداشت ہر ایمان والے کے لئے ضروری ہے۔ سو جو شخص ان پابندیوں کو توڑ کر عملاً اپنے ایمان سے انکار کر دے تو اس کے دوسرے اعمال بھی وہ نتائج نہیں پیدا کر سکیں گے جو اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ دین ایک مکی نظام زندگی کا نام ہے جس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض باتوں کو مان لیا جائے اور بعض سے

ملہ واضح رہے کہ یہ صحت اجازت ہے جسے اسلامی مملکت، اپنی اور ملی مفاد و مصالح کی خاطر، عند الضرورت، وقتی طور پر معطل بھی کر سکتی ہے۔ وہ اسے منسوخ تو نہیں کر سکتی، لیکن وقتی طور پر اسے ساقط العمل کر سکتی ہے، جیسے (مثلاً) بیفہ وغیرہ کے (دوں میں) بعض پیوٹل کھانے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔

انکار کر دیا جائے (۲/۸۵)۔ ایسی روش سے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ انسان کو کچھ پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہو جائیں، لیکن انجام کار اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اہل کتاب کے ہاں کے کھانے کے متعلق، مطالب الفرقان۔ جلد سوم (ص ۱۴۵) اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے متعلق اسی جلد کے (ص ۲۴۲) پر وضاحت کر دی گئی ہے۔ آیت کے باقی حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق عائلی قوانین سے ہے۔ ان قوانین کو بڑی وضاحت سے مطالب جلد سوم (ص ۳۳۶-۳۴۲) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس میں (ص ۳۴۲) پر آیت (۲/۶۶) کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے آیت زیر نظر (۵/۵) کے الفاظ۔ ”مُحْصِنَاتٍ غَيْرُ مُسَافِحَاتٍ“ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مُحْصِنَاتٍ (مادہ ح۔ ص۔ ن) کے معنی ہوتے ہیں، بہادینار۔ زنا میں مادہ تولید کو بہادیا جاتا ہے اور نکاح میں اسے، بیوی کے رحم میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ (دیکھئے جلد سوم۔ ص ۲۴۶)۔ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کا مقصد جب ”مادہ تولید کو بہادینا“ رہ جائے، تو اس سے قوم کی حالت کیا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ دانش وران مغرب کی اس آہ و پیکار سے لگائیے، جو ان اقوام کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی بے راہ روی کے احساس سے ان کے لبوں پر بے ساختہ آہی ہے۔ وہ آہ و پیکار وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخُسْرَانِ کی محسوس شہادت ہے۔



شروع سورہ سے، حرام و حلال اور عائلی زندگی سے متعلق احکام چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اگلی آیت میں، وضو سے متعلق تفصیل دی گئی ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ
إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۖ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرَضًا
أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ
فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَ
أَيْدِيكُمْ مِنْهُ ۚ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ
يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ۝ (۵/۶)

اس نظام کے قیام کے لئے جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہائیں، اجتماعات صلوٰۃ نہایت

ضروری ہیں۔ جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو (یعنی عزم صلوٰۃ کرو) تو تم اپنا منہ، اور اپنے ہاتھ کہنیزوں تک دھو لیا کرو۔ اور اپنا سر پونچھ لیا کرو۔ اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔ اور (جیسا کہ (۳۴) میں بتایا جا چکا ہے) اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نہا دھو کر) پاک صاف ہو جایا کرو (اور پھر اجتماع صلوٰۃ میں شریک ہو)۔ اور اگر تم مریض ہو (اور پانی سے تکلیف پہنچے) کا احتمال ہو (۳۵) یا حالت سفر میں ہو، یا جائے ضرورت سے فارغ ہو کر آئے ہو، یا عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور پانی نہیں ملتا۔ تو ان حالات میں، وضو کرنے کے بجائے تیمم کر لیا کرو۔ یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور منہ ہاتھ ویسے پونچھ لئے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قانون یہ نہیں چاہتا کہ تم پر خواہ مخواہ سنگی عائد کر دے۔ وہ فقط اتنا چاہتا ہے کہ تم پاک صاف رہو۔ اس طرح وہ تمہیں ایک پاکیزہ اور شائستہ جماعت بنا کر، تم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج مرتب کر سکیں۔

(اس کے ساتھ آیت (۳۴) ملانے سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے)

آپ اندکس میں صلوٰۃ اور نماز کے عنوانات دیکھئے۔ وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ نظام صلوٰۃ کے اصولی حکم کے علاوہ، قرآن کریم میں نماز کے اجتماعات کی تاکید بھی آئی ہے۔ لیکن اس تاکید کے باوجود قرآن مجید میں نماز کی جزئیات نہیں دی گئیں۔ یہ جزئیات احادیث اور فقہ کی رو سے متعین ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ کی نماز الگ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نماز کی جزئیات تو قرآن میں نہیں آئیں لیکن وضو کے متعلق اس قدر شرح حکم دیا گیا ہے۔ (وضو کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا۔ ویسے اس کے معنی روشن ہونے کے ہیں)۔

اوپر کہا گیا ہے کہ نماز کی جزئیات میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے اور اس میں شیعہ اور سنہیوں میں اختلاف ہے۔ شیعہ حضرات پاؤں نہیں دھوتے۔ ان پر مسح کرتے

ہیں۔ سنہی حضرات پاؤں دھوتے ہیں۔ آپ قیفاً حیران ہوں گے کہ ایسے واضح حکم کی موجودگی میں یہ اختلاف کیسا؟ بار کیوں میں گئے بغیر، اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ اس آیت میں اَرْجُلُكُمْ (ل کے زیر کے ساتھ) آیا ہے اور جس سیاق میں یہ اس آیت میں آیا ہے گرامر کی رو سے اس کے معنی "پاؤں دھونے" کے ہوں گے۔ اگر یہ اَرْجُلُكُمْ (ل کے زیر کے ساتھ) ہوتا تو پھر معنی، مسح کرنے کے ہوتے۔

اس پر آپ پوچھیں گے کہ جب قرآن مجید میں اَرْجُلُكُمْ (ل کے زیر کے ساتھ) ہے تو پھر مسح کرنے کی بات کہاں سے آگئی؟ آپ مطالب جلد سوم، کا ص ۱۷۷ نکالئے۔ اس میں آپ کے سامنے "اختلاف قرأت"

کا نظریہ (یا عقیدہ) آئے گا جس کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں، ”یوں بھی نازل ہوئی تھیں اور یوں بھی“ اس عقیدہ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ زیر نظر آیت (۵) میں **اَسْرَجْلِكُمْ** کے زبر کے ساتھ بھی نازل ہوا تھا اور اس کے زبر کے ساتھ بھی۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ

اختلاف قرآن کا عقیدہ

سنی حضرات اسے ل کے زبر کے ساتھ پڑھتے ہوں گے اس لئے وہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ دھوئے ہیں اور شیعہ حضرات اسے ل کے زبر کے ساتھ پڑھتے ہوں گے اس لئے وہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں۔ مودودی مرحوم سنی تھے۔ لیکن دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ پاؤں دھونے اور ان پر مسح کرنے میں سے کونسا طریق قرآن کے مطابق ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے قرآن مجید کی آیت (۵) درج کی اور پھر کہا:

اس میں لفظ **اَسْرَجْلِكُمْ** کی دو قرائیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر حفص، کسائی اور یعقوب کی قرات **اَسْرَجْلِكُمْ** (مفتوح لام) ہے

مودودی مرحوم کا مسلک

اور ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرات **اَسْرَجْلِكُمْ** (بکسر لام) ان میں سے کسی قرات کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں ٹیپہ کر نحو یوں نے اپنے اپنے فہم اور منشا کے مطابق الفاظ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں۔ بلکہ یہ دونوں قراتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرات اختیار کی جائے تو **اَسْرَجْلِكُمْ** کا تعلق **فَاغْسِلُوْا** سے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں۔ ”اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک“ اور اگر دوسری قرات قبول کی جائے تو اس کا تعلق **اُحْسِنُوْا** پر **وَسِکُّم** سے قائم ہوتا ہے۔ اور معنی یہ نکلتے ہیں۔ ”اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک“ یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قراتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہو جاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قراتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں۔ کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جاسکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعد زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفیدہ مطلب نہیں۔ کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل کو دیکھا جائے۔

اور اس کے بعد لکھا۔

قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور

کون سا ہو سکتا ہے۔ (نزہان القرآن بابت فروری ۱۹۵۹ء)

قطع نظر اس کے کہ شیعہ حضرات اسی ”معتبر ذریعہ“ کی رو سے پاؤں پر مسح کرتے ہیں اور سنی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اسی ”معتبر ذریعہ“ کی رو سے پاؤں دھوتے ہیں۔ مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ قرآنی آیت کی دونوں قرائیں متواتر ہیں اور ایسی مستند کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (مودودی مرحوم کے ارشاد کے مطابق) قرآن کریم کی یہ آیت، اس جگہ کے آل کے زبر کے ساتھ بھی نازل ہوئی تھی اور زبر کے ساتھ بھی۔ اور دونوں کا یہ اختلاف اس قدر اہم ہے کہ ایک قرائت کی رو سے پاؤں دھونے کا حکم ملتا ہے اور دوسری قرائت کی رو سے پاؤں پر مسح کرنے کا۔ اور اس طرح ”قرآن کے الفاظ سے بات واضح نہیں ہوتی“

آپ سوچئے کہ اس کے بعد قرآن مجید کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے، اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پرے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس دعویٰ کی حقیقت کیارہ جاتی ہے؟ — اور اس کے بعد سوچئے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوتا ہے، جو متضاد احکام نازل کر دیتا ہے؟ اور اگر خدا نے اس آیت کو ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا — یعنی آل کے زبر یا زبر کے ساتھ — تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ نے (معاذ اللہ) کسی کو آل کے زبر کے ساتھ بتا دیا اور کسی کو زبر کے ساتھ۔ اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسول کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہیں تو پھر فرمائیے کہ دو قرائیں کس طرح وجود میں آئیں؟ آگے چل کر مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر محسوس

ہوتا ہے۔ (ایضاً) (یعنی آل کے زبر والی آیت کے مطابق)

لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد آل کے زبر والی قرائت کا کیا بنے گا جو اسی طرح متواتر اور مستند ہے جس کے آل کے زبر والی قرائت!

آپ نے غور فرمایا کہ وضو میں ”پاؤں دھونے“ اور ”مسح کرنے“ کے اختلاف کا سرچشمہ کیا ہے؟ قرآن کریم میں اختلاف قرائت کا عقیدہ جسے آج تک سب مانتے چلے آ رہے ہیں! اس موضوع پر کتاب ”مقام حدیث“ (شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام) میں بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

۵۔ من از ہیگانگاں ہرگز نناغم کہ با من ہرچہ کرد، آل آشنا کرد

تیسیم آیت میں دو الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ۱۔ تیسیم (مادہ ی۔ م۔ م۔) اس کے معنی کسی کام کا قصد یا ارادہ کرنا ہیں۔ اس سے اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی یہ وضو تو نہیں جو صرف پانی سے ہو سکتا ہے، لیکن

اس سے انسان کے اس ارادے کا اظہار ہو جاتا ہے کہ وہ نماز کی تیاری کر رہا ہے۔ علم النفس کی رو سے، نیت یا ارادے کے اظہار کا انسان کے جذبات و احساسات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم، محسوس افعال میں مضمحل نفسیاتی محرکات کو کس جنس و خوبی سے بیان کر جاتا ہے؟ (تیسیم کا ضمنی ذکر آیت (۳۳) میں بھی آچکا ہے)

مسح دوسرا لفظ مسح ہے۔ اَلْمَسْحُ (مادہ م۔ س۔ ح) کے معنی کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینے کے بھی ہیں، اور اس آلائش کو ہاتھ پھیر کر پانی کے ساتھ دھونے کے بھی۔ چونکہ

آیت (۵) میں مسح کا حکم، پانی کی جگہ آیا ہے، اس لئے اس کے معنی ہوں گے، آلائش کو پاک اور صاف مٹی سے صاف کر لینا اور ہاتھ اور منہ کو پونچھ لینا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس میں پانی نہ ہونے کی صورت میں خشک صفائی کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور نماز کی تیاری کا نفسیاتی پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے۔

❦

اگلی آیت ہے۔

وَ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ ۖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللَّهَ ۚ اِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ

الصُّدُورِ ۝ (۵)

تم اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ خدا نے اس قسم کا ضابطہ حیات دے کر تم پر کس طرح اپنی نعمتوں کو عام کر دیا ہے۔ لیکن یہ نعمتیں یونہی نہیں مل جائیں گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اس عہد و پیمان کو یاد رکھو جو تم نے خدا سے پختہ طور پر کر رکھا ہے (۹)۔ وہ عہد جس کی رو سے تمہارا فریضہ ہے کہ تم نظام خداوندی کے احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ اور اپنی زندگی کو قوانینِ اِطہیہ سے ہم آہنگ رکھو۔ نہ صرف ظاہر اعمال کو، بلکہ اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور دلی خیالات تک کو بھی۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات، دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی علم رکھتا ہے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت (راہنمائی) اور اس کے احکامات کو اس کی نعمتیں کہہ کر پکارا ہے۔ چونکہ اس ہدایت اور ان احکامات سے مقصد، انسانی زندگی کی خوشگواہی اور کامرانی ہے اور اس کی صلاحیتوں کی برومندی ہے، اور یہ خدا کی طرف سے بلائزد و معاد ضہ عطا ہوتی ہیں، اس لئے یہ اس کی طرف سے فی الواقعہ انعامات ہیں۔

اس میں دوسری بات ”سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا“ کی ہے۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ (مطالب الفرقان - جلد سوم - ص ۴۹)۔ علاوہ دیگر نکات، اس میں یہ نقطہ بھی پوشیدہ ہے کہ اطاعت کسی

زندہ شخصیت کی طرف سے صادر شدہ احکام کی جائے گی۔ یعنی اسلام میں، اطاعت تو خدا کی کتاب کی ہوگی لیکن یہ اطاعت ہوگی اس نظام کی و ساطت سے جو انسانوں کے

ہاتھوں مشکل ہوگا اور اس میں احکامات بہر حال کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر ہونگے۔ یہ وجہ ہے جو ”سمع اور اطاعت“ اکٹھے آئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا ذریعہ رسول کی اطاعت قرار دیا جو

اس کی (خدا کی) کتاب کے احکام محسوس اتھارٹی کی شکل میں نافذ کرتا تھا۔ اور رسول اللہ کی وفات کے بعد، یہ اطاعت اس نظام کی ہوگی جو قرآنی احکامات کی محسوس طریق سے اطاعت کرائے گا۔ مجرد کتاب میں ”سمع“ کی شرط پوری

نہیں ہوتی۔ نہ ہی پرستش میں یہ شرط پوری ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے ”خدا کی پرستش“ کا تصور بھی صحیح نہیں۔ خدا کی اطاعت کی جاتی ہے، نہ کہ پرستش۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے)

قرآن کریم میں ”سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا“ کے الفاظ جمع کے صیغے میں آئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اطاعت خداوندی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے۔ یعنی اپنی آزاد مملکت میں جس میں کتاب اللہ کی عملی حکمرانی ہو اور تمام

امت اجتماعی طور پر اس کی اطاعت گزار اور فرمان پذیر ہو۔ آیت کے اخیر میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلَیْہِمْ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ خداوندوں کے اندر گزرنے والے

خیالات تک سے بھی واقف ہے۔ اس کا تعلق بھی ”اطاعت“ کے ساتھ بڑا گہرا ہے۔ اسلامی نظام میں احکام و قوانین، کی اطاعت نہ میکانیکی طور پر کی جاتی ہے نہ مجبوراً۔ یہ دل کی رضامندی

سے کی جاتی ہے۔ طاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا وسیع ہو جانا۔ اس اعتبار سے اطاعت کے معنی ہونگے، دل کی کشاد اور پسندیدگی سے فرائض منصبی کی ادائیگی اور احکام خداوندی کی تعمیل کرنا۔ اطاع النفل کے

معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں یعنی اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑے گا۔ وہ کسی کی جھولی میں گرنے

کے لئے خود ہی آمادہ ہیں۔

اس سے اطاعت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی بطیب خاطر، دل کی پوری پوری رضامندی سے احکام خداوندی کی اطاعت کرنا۔ اگر اس میں دل کی رضامندی شامل نہیں، تو اسے اطاعت نہیں کہا جائے گا۔ مرتے بھرتے، مجبوراً احکام و قوانین کی فرمانبرداری کہا جائے گا۔ اس سے قانون کا منشا تو پورا ہو جائے گا، منشاءِ خداوندی پورا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہا کہ ”ہماری نگاہ تمہارے دلوں پر ہوتی ہے کہ تم ہمارے احکام کی اطاعت بطیب خاطر کرتے ہو یا کوہٹا“



عدل کی تاکید

قرآنی نظام کے مقاصد اور مطامح کی فہرست تو طویل ہے لیکن قرآنی کریم نے اس کے نقطہٴ ماسکہ کو ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اور وہ ہے عدل۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل کے تصور میں اس قدر وسعت ہے کہ (یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ) خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا، سب اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس پر بڑا زور دیتا ہے۔ یہ ایک خاص ذہنیت (ATTITUDE OF MIND) کا نام ہے جس کا مظاہرہ زندگی کے ہر گوشے میں ہوتا ہے۔ عدالتی یا قانونی عدل اس کا ایک سٹمبا ہو گا گوشہ ہے (دیکھئے اندکس) آیت (۵/۲۴) میں کہا گیا تھا کہ دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی، حدودِ عدل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ اب

ص۔ یاد ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۖ اعْدِلُوا قِف
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ زَوَالَتْ قَوْلُ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (۵/۲۴)

اس نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (۵/۲۴)۔ اس حد تک محافظ و نگران کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو (۵/۲۴)۔ ہمیشہ عدل کرو۔ اور دوست، دشمن، ہر ایک سے عدل کرو۔ یہ روش تمہیں اس معیارِ زندگی کے قریب تر لے آئے گی جس تک تمہیں خدا لانا چاہئے ہے۔ اس لئے ہمیشہ اس روش کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون مکافات تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

عدلیت (انجیل) کی تعلیم تھی ”دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کرو“ دشمن کے ساتھ محبت، ایک ناممکن العمل نفسیاتی تقاضا ہے، جو نہ کبھی

پورا ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے جو اب خود عیسائی دانشور بھی اسے ناممکن قرار دے رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کے بجائے کہا کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ یہ ممکن العمل ہے اور ایسا زریں اصول کہ اگر افراد اور اقوام اس پر عمل کرنے لگ جائیں، تو نوع انسان کی بیشتر مشکلات حل ہو جائیں۔ لیکن ہم دوسروں کی کیا بات کریں۔ یہ جنس تو خود ہمارے ہاں بھی نایاب ہے۔ بلکہ (اگر برا نہ مانیں تو) ہماری حالت ان اقوام سے بھی گئی گزری ہے۔

جب جماعت مومنین اس انسانیت ساز اصول پر عمل پیرا ہوگی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ فرمایا:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

اور یہ بھی یاد رکھو! خدا کا یہ اہل قانون ہے کہ جو لوگ بھی اس ضابطہ حیات کی صداقت پر یقین رکھ کر، اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں گے، اور پھر اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو زندگی کے خطرات سے ان کی حفاظت ہوگی اور ان کی محنت کے نتائج نہایت عظیم الشان ہوں گے۔

مغفرت (یعنی خطرات سے حفاظت) زندگی کا منفی پہلو ہے۔ مثبت نتیجہ ”اجر عظیم“ ہے۔

اس کے برعکس:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

ان کے برعکس جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کریں گے اور اس کے قوانین کی تکریب کریں گے، تو ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ وہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائیں گے اور ان کی نشوونما رک جائے گی۔

کفر تو یہ ہے کہ ان احکام و اقدار کی صداقت سے یکسر انکار کر دیا جائے۔ اور تکذیب یہ ہے کہ زبان سے ان کا اقرار کرتے رہیں لیکن اپنے عمل سے انہیں جھٹلاتے رہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے انڈکس میں عنوان ”تکذیب“)۔ جہیم کے معنی مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۲۷ پر دیکھیے۔

اس مغفرت (خطرات سے حفاظت) کے سلسلہ میں ان سے کہا گیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هُمْ قَوْمٌ اٰتٍ يَبْسُطُونَ إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

اس ضابطہ ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے، خطرات سے کس طرح حفاظت مل جاتی ہے، اس کا مشاہدہ تم خود کر چکے

ہو۔ تمہارے مخالفین تپتے کرچکے تھے کہ تم پر دست درازی کریں، لیکن اس نظام نے اُن کے ہاتھوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اُنہیں روک دیا۔ لہٰذا تم اس غلابطہ قوانین کی نگہداشت کرو اور اس کی حکمت پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنے نصب العین کی صداقت اور قانون کی حکمت پر مکمل اعتماد ہو۔

اس میں دشمنوں کی طرف سے کسی خاص تصادم و تراحم یا جنگ کی طرف اشارہ معلوم نہیں ہوتا۔ ان کی مسلسل دست درازیوں سے محفوظ رکھنے کی نعمت خداوندی کی یاد دہانی مقصود ہے۔ اور یہ نتیجہ تقویٰ اور توکل کا۔ تقویٰ کا مفہوم مطالب الفرقان۔ جلد اول (ص ۵۷) پر آچکا ہے اور توکل کا زیر نظر جلد میں، آیت (۳۳) کے تحت۔



جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد، یعنی اقوام سابقہ کے احوال اور کوائف، اور ان کے انجام و عواقب کو پیش کرتا ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے عنوان تاریخ) اور اس سلسلہ میں داستان بنی اسرائیل کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے (انڈکس میں دیکھئے عنوان بنی اسرائیل)۔ یہاں اسی سلسلہ میں کہا۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَ ۖ بَلَّغُوا آيَاتِي ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ ۖ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ (۵)

اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ تو یہ نظام ہی کوئی نیا نظام ہے اور نہ ہی یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ، جو اس کے متعلق شبہ لاحق ہو جائے کہ ممکن ہے کہ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو۔ یہ نظام اقوام سابقہ کو بھی دیا جاتا رہا، اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس کے نتائج کیا نکلے۔ اس میں بنی اسرائیل کی تاریخی شہادت نمایاں طور پر تمہارے سامنے ہے۔ ان سے بھی اس نظام کے قیام کا عہد لیا گیا تھا۔ اُن کے بارہ قبائل تھے اور تنظیم کی غرض سے ہر قبیلہ کا ایک نقیب تھا جو ان کے حالات سے باخبر رہتا، اور ان کی نگہبانی کرتا تھا۔ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر تم نے نظام صلوٰۃ کو قائم رکھا، نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے رہے، ہماری طرف سے بھیجے ہوئے پیغامبروں کی بات کو سچا ماننے رہے، اُن کے مشن اور پروگرام کی تعظیم کرتے ہوئے اُن کے رفیق اور مددگار بنے اور نوع انسان کی

مرفہ حالی کے لئے اپنا مال و دولت نظام خداوندی کو دیتے رہے کہ وہ تمہیں اس کے بدلے میں اس سے بھی زیادہ کچھ دے، تو ہماری نائید و نصرت تمہیں نصیب ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جائیں گی اور تمہیں خوشحالی، آسودگی اور خوشگواہی کی ایسی جنت نصیب ہو جائے گی جس کی شادابی اور تازگی کبھی مڑ جائے گی نہیں۔ اس طرح تمہارا دیا ہوا مال و دولت سوگنا اور ہوا گنا ہو کر تمہیں واپس مل جائے گا (۲/۲۶۱)۔

لیکن جو اس کے بعد، اس روش سے انکار اور سرکشی اختیار کر کے، اپنی خود ساختہ روش پر چل نکلے گا، تو زندگی کی ہموار راہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی اور وہ اپنی منزل مقصود سے بہت دور جا پڑے گا۔ قوموں کی کامیابی اور ناکامی کا یہی اصول ہے۔

میشاق بنی اسرائیل کا ذکر مطالب الفرقان - جلد دوم (ص ۱۷۹) پر آچکا ہے، اور داستان بنی اسرائیل اُس جلد کے صفحہ ۱۷۱ سے شروع ہوتی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ سینا کی وادیوں میں اس قوم کو (غالباً انتظامی سہولت کی غرض سے) بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہاں کہا کہ ان پر بارہ نقیب مقرر کر دیئے گئے تھے۔ یعنی ہر گروہ پر ایک نقیب۔ عمومی طور پر تو اس سے مراد ان کے نگران اور محافظ ہوں گے لیکن معنوی طور پر اس کا مقصد

بارہ نقیب ذرا وسیع نظر آتا ہے۔ نقیب کے (مادہ ن - ق - ب) کے معنی ہوتے ہیں سورخ کرنا، چھید کرنا اور اس کا مفہوم ہوتا ہے پوری پوری چھان بین سے کسی کے احوال و کوائف معلوم کرنا۔ اس سے مترشح ہو جاتا ہے کہ وہ منظمین (INTELLIGENCE SERVICE) کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے جو اس قوم کی (بالخصوص اُس زمانے کی) حالت میں از بس ضروری تھا۔

صلوٰۃ و زکوٰۃ و قرض حسنہ کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ یہ دین کے بنیادی اصول اور نظام خداوندی کے ستون تھے اس لئے ان کا حکم ہر رسول اور ان کی امت کو دیا گیا تھا۔ اسی کی تاکید بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی۔ اس آیت میں ایک بات تو (نظر بظاہر) ضحکنا ہی گئی ہے لیکن اس کی اہمیت غور و فکر کی مقتضی ہے۔ ان سے کہا یہ گیا ہے کہ اِنِّیْ مَعَکُمْ۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں“ لیکن خدا کی یہ معیت جن شرائط سے مشروط ان کا ذکر اس کے ساتھ ہی کر دیا گیا۔

لَئِنْ..... (اور پر مفہوم میں دیکھئے)۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی معیت کن شرائط کے پورا کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کی تشریح اگلی آیت میں کر دی گئی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّثْلًا قَهُمْ لَعَنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَٰسِيَةً

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ لَوْ تَسُوا أَحْطَاءَ مَا ذَكَرُوا بِهِ
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَأَعْفُ عَنْهُمْ
وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

چنانچہ جب تک بنی اسرائیل اس روش پر قائم رہے، انہیں اقوام عالم میں نہایت ممتاز مقام حاصل رہا (۲/۱۲۰)۔ لیکن جب انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا تو وہ ان خوشگوار یوں سے محروم ہو گئے، اور ان کے وہ قلوب جن سے وہ بیت عامہ کے چشمے پھوٹتے تھے، یکسر پتھر بن گئے (۲/۱۲۰ ز ۵۴/۱۴ ز ۷۶/۲۶)۔ چونکہ وہ ضابطہ قوانین جو انہیں وحی کے ذریعہ دیا گیا تھا، ان کی مفاد پرستیوں کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس میں ہر پھر کرنا شروع کر دیا جس جگہ پر ایسا نہ کر سکے، اس پر ویسے ہی عمل کرنا چھوڑ دیا نہ پر لوگ، بجز محدودے چند، اب تک یہی کچھ کرتے ہیں اور انہیں ان کی خیانتوں کا پتہ بھی چلتا رہتا ہے۔

جن لوگوں کی حالت یہاں تک پہنچ چکی ہو، ان سے الجھنا یہاں تک ہے۔ اس لئے تم ان سے دامن بچاتے ہوئے اپنے پروگرام کے مطابق آگے بڑھتے جاؤ یہی تمہارے لئے حسن کارنامہ روش ہے، اور یہی روش قانونِ خداوند کی روش سے پسندیدہ ہے (۱۵/۸ ز ۲۳/۱۲ ز ۷۶/۲۶)۔

آیت کے معنی مندرجہ بالا مفہوم سے واضح ہیں۔ اور جب اسے داستانِ بنی اسرائیل کے مناظر میں دیکھا جائے تو بات واضح تر ہو جاتی ہے۔

حضراتِ انبیاء کرام کا فریضہ دین کی تبلیغ ہوتا تھا یعنی خدا کے احکام اور پیغامات کو لوگوں تک پہنچانا، اور انہیں اس کی دعوت دینا کہ وہ انہیں قبول کر کے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ ان کے مخالفین ان کی مخالفت کرتے تھے اور اس کشمکش میں آخر الامر وہ مقام آجاتا تھا جہاں ان سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اس کی آخری منزل کے لئے جامع اصطلاح ہجرت ہے، اگرچہ اسے دیگر الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہاں ”فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ“ کہا گیا ہے۔ اس مرحلہ کنارہ کشی کی تفصیل مطالب الفرقان - جلد سوم - (ص ۷۵) پر ملے گی۔

کنارہ کشی | لیکن اس کنارہ کشی میں بھی دو انداز خصوصی ہیں۔ ایک یہ کہ ”وَ اِهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا“ (۳/۱۰۳) اور ”فَاَصْفَحْ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ“ (۱۵/۸)۔ ان سے الگ بھی ہو تو نہایت حسن کارنامہ انداز

سے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے بعد بھی جہاں تک ممکن ہو انہیں زندگی کے خطرات سے آگاہ کرتے رہو۔ وَذَكِّرْ

بِهِ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۶)۔ ان کے سامنے قرآنی تعلیم پیش کرنے رہو اور یہ ہزار

غلط کوشش اور غلط کار سہی۔ اس کے باوجود انہیں قرآنی روشنی سے محروم نہیں رکھا جانا چاہیے۔ مزید تفصیل کے لئے

مطالب الفرقان - جلد دوم (ص ۴۳۵)۔ مخالفین سے قطع علائق کے باوجود اس قسم کی کشادہ نگہی، تعلیم خداوندی ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ تحریف کی جس شکل کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کی وضاحت آیت (۴۳) کے تحت ملے گی۔

یہ تو رہا یہودیوں کے ساتھ میثاق اور ان کی طرف سے نقص عہد۔ عیسائیوں کے متعلق کہا:

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرُكَ إِنَّا نُمِثُّكَ هُمْ فَتَسْأَلُ حَنَلًا
مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ مَّا غَرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعِدَّةَ وَالْبَغْنَاءَ إِلَى يَوْمِ
الْقِيَامَةِ وَكَانُوا يَتَّبِعُونَ ۝

۵
۱۴

یہ تو یہودیوں کا حال ہے۔ باقی رہے وہ جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ تو ان سے بھی ہم نے اسی قسم کا عہد دیا تھا، لیکن انہوں نے بھی ہمارے ضابطہ قوانین سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور اس کے ایک معتد بہ حصہ کو چھوٹیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وعدت پارہ پارہ ہو گئی۔ وہ فرقوں میں بٹ گئے اور (جیسا کہ فرقہ پرستی میں ہوتا ہے) ان میں باہمی عداوت اور کینے کی آگ بھڑک اٹھی جو ہمیشہ تک رہے گی۔ (کیونکہ نہ ان کے فرقے ٹھیک گئے، نہ باہمی عداوت ختم ہو گئی)۔ لیکن اب جو نظام خداوندی قائم ہو رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس خود ساختہ روش کو یہ آسمانی راہنمائی ہمہ کریش کرتے تھے، اس کی حقیقت کیا تھی۔

نصاریٰ کے میثاق کا قرآن میں بالتفصیل ذکر نہیں آیا لیکن آیت (۳۴) میں اہل کتاب کے میثاق کا جو اجتماعی ذکر آیا ہے اس میں نصاریٰ خود بخود آجاتے ہیں۔ اور (۳۵) میں انبیاء کرام کے میثاق کا جو ذکر آیا ہے تو اس میں ان کی آمین بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں آیات (علی الترتیب تیسرے اور چوتھے باب میں) آپ کی ہیں۔ (ضمناً) آیت (۳۳) میں انبیاء کے میثاق کا ذکر ہے تو اس میں اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ میثاق (عہد) حضور نبی اکرم سے بھی دیا گیا تھا۔ اس میثاق کی تفصیل تو طویل ہو سکتی ہے لیکن اس کی اصل بنیاد یہ تھی کہ اُن اَقْبَمُوا
الَّذِينَ وَلَا تَفَرَّقُوا فِیْهِ (۴۲)۔ وہ، دین (نظام) خداوندی کو متشکل کریں اور فرقہ پیدا نہ ہونے دیں۔ آپ

فرقہ بندی

کہ ان میں فرقے پیدا ہو گئے۔ (فرقہ بندی توحید کی ضد اور شرک ہے) (۳۱)۔ آیات (۴۲-۱۳) میں بھی تفرقہ کو شرک کہا گیا ہے۔ (انڈکس میں تفرقہ اور فرقہ کے عنوانات دیکھئے)

سلسلہ استدلال و ہدایت خداوندی کا پروگرام یہ تھا کہ ایک رسول آتا اور خدا کی صحیح تعلیم لوگوں تک پہنچا دیتا۔

اس کے بعد اس کی امت اس (سچی) تعلیم میں خرابیاں پیدا کر دیتی تو دوسرا رسول آکر اسے پھر خالص کر دیتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اس کی آخری کڑی، حضور نبی اکرم کی بعثت سے سامنے آگئی اور اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب کو

دعوت دی گئی کہ وہ اس رسول کی پیش فرمودہ تعلیم کو قبول کر لیں۔ اس ضمن میں حضور کے مخاطب اہل کتاب سے کہا، (جن کا ذکر سابقہ آیات میں آ رہا تھا) کہ

يَا هَلْ الْكِتَابُ قَدْ جَاءَكُمْ سِرُّوْنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا
مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ
جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝

ان اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہہ دو کہ تمہاری طرف خدا کا رسول آ گیا ہے جو بہت سی ایسی باتوں کو ظاہر کر دیتا ہے جنہیں تم کتاب خداوندی میں سے چھپاتے رہے ہو۔ اور بہت سی باتوں سے جن کی چنداں اہمیت نہیں، درگزر کر دیتا ہے۔ تم پر زندگی کی راہیں تاریک ہو چکی تھیں۔ ایسے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی۔ یعنی ایک کھلا ہوا، واضح ضابطہ قوانین۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم وحی خداوندی میں سے چھپاتے رہے ہو، ان میں سے اکثر امور کو قرآن میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور بعض امور سے صرف نظر کر لیا گیا ہے، تو اس فرق کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ (جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے) دین کے اصول تمام انبیاء کو یکساں دیئے گئے تھے۔ اور بعض وقتی احکام تھے جن کا تعلق اُس رسول کی مخاطب قوم یا اس زمانے کے حالات سے تھا۔ ان احکام کا ابدی طور پر باقی رکھنا مقصود نہ تھا۔ بنا بریں بعد میں آنے والے رسول کی وحی میں اصول دین تو علیٰ حالہ رکھے جاتے تھے اور وقتی اور منگامی احکام کو یا تو منسوخ کر دیا جاتا تھا یا تبدیل۔ (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ)۔ جن امور کو قرآن میں ظاہر نہیں کیا گیا تھا ان کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

قرآن کریم کی خصوصیات کے متعلق اندکس میں قرآن کا عنوان دیکھئے، نیز ظلمات اور نور کے عنوانات۔ اس کے بعد ہے۔

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمُ
مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ۝

اس (ضابطہ قوانین) کے ذریعے، اللہ تعالیٰ ہر اس قوم کو، جو اپنی زندگی کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے، سلامتی کے راستے دکھاتا ہے، اور انہیں ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر، زندگی کی جگہگاتی روشنی میں لے آتا ہے۔

اور اپنے قانون کے مطابق سیدھے اور توازن بدوش راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے تاکہ وہ رواں دواں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

ہدایت صرف قرآن کے ذریعہ مل سکتی ہے | اس آیت میں قرآن مجید کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے **يَهْدِيْ بِهٖ اِلٰهٖ**۔ خدا اس کے

ذریعے ہدایت (راہ نمائی) دیتا ہے۔ یعنی ہدایت خداوندی صرف قرآن کی رو سے مل سکتی ہے۔ اس راہ نمائی کے ساتھ کچھ اور ملا دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ **وَلَا يَشْرُوكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا (۲۹)**۔ (انڈکس میں عنوان شرک دیکھیے)۔
سبیل السلام اور صراط مستقیم کے تعلق کے بابت، مطالب، جلد اول، (ص ۷۷) ملاحظہ فرمائیے۔



ازال بعد ان چند اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں ان اہل کتاب نے مسخ کر کے، ان کی جگہ باطل عقائد وضع کر لئے تھے۔ ان میں عیسائیوں کا، (الوہیت حضرت عیسیٰ کا عقیدہ تھا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يَّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمُّهُ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّاللّٰهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقْ مَا يَشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۵
۱۷

یاد رکھیے! منزل مقصود تک پہنچانے والی شاہراہ اعظم تو ایک ہی ہے جسے صراط مستقیم کہتے ہیں، لیکن بہت سے چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو مختلف سمتوں سے آکر اس میں مل جاتے ہیں۔ انہیں سبیل (جمع کے سیغے میں) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ دیں گے نظام کی اصل بنیاد وہ غیر متبدل اصول و قوانین ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں، لیکن ان پر چلنے کے عملی طریقے زمانے کے تغاظوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ عملی طریقے، اسلامی نظام مملکت، اجتہادی طور پر تبیین کرتا ہے۔

یہیں وہ سبیل جن کی طرف (۲۹) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تم میں سے نصاریٰ کا کفر تو بالکل واضح ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا خود مسیح ابن مریم کی شکل میں دنیا میں آگیا۔ اسے رسول! ان سے کہو کہ اگر اللہ اس کا ارادہ کرتا تو مسیح اور اس کی والدہ تو ایک طرف، کرہ ارض پر جو کچھ ہے، ان سب کو ہلاک کر دے تو کسے اتنی قوت حاصل ہوتی کہ وہ

اس کا ہاتھ روک دیتا؟ یاد رکھو! کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان سب پر خدا کا اور صرف خدا کا اقتدار و اختیار ہے۔ ہر شے کی تخلیق اُس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتی ہے اور ہر شے پر

اُسی کا کنٹرول ہے۔ اس لئے کوئی انسان، خدا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی خدا، انسانی پیکر اختیار کر کے دنیا میں آیا کرتا ہے۔
عیسائیوں کے باطل عقائد کے متعلق مطالب الفرقان - جلد دوم - میں لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے اندکس عنوان ”عسلی“)۔ اور زیر نظر جلد کے دوسرے باب میں بھی جو سابقہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اس میں کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا زَوَالٍ ۝

ان یہود و نصاریٰ دونوں کا دعویٰ ہے کہ ہم خدا کے محبوب اور اس کی چہیتی اولاد ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر ایسا ہی ہے تو خدا تمہیں تمہارے جرموں کی سزا کیوں دیتا رہتا ہے (جس کے تذکرے سے تمہاری کتابیں بھری پڑی ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بھی (اور انسانوں کی طرح) خدا کے پیدا کردہ انسان ہو، اور جزا و سزا کا جو قانون دوسروں پر عادی ہے، اسی کا اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے چہیتے اور کسی کے سوتیلے ہونے کا سوال ہی نہیں جو قوم بھی، قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہے گی۔ جو ان کے خلاف چلے گی، تباہ و برباد ہو جائے گی۔ دونوں راستے کھلے ہیں۔ جو سارا راستہ جس کا جی چاہے اختیار کر لے یہ کچھ اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کی رو سے کائنات کا ایسا عظیم القدر سلسلہ اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے، اور اس کا ہر قدم اُس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔
نجات کے متعلق یہودیوں کے باطل عقائد پر، مطالب الفرقان - جلد دوم - (ص ۲۲۹) تفصیلی بحث ہو چکی ہے وہاں زیر نظر آیت کا بھی ضمنی تذکرہ آگیا ہے۔ اور عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کے متعلق اسی کتاب (ص ۲۳۹) پر بنا بریں زیر نظر آیت کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ - قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ - تو یہ، ان کے دعویٰ کی تردید کے لئے ایک مزید دلیل ہے۔ یہودی اس کے قائل تھے کہ ان سے حکومت چسپں گئی۔ دولت و ثروت سے محرومی ہو گئی۔ عورت اور وقار نہ رہا۔ حتیٰ کہ ان کے لئے دنیا میں کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہ رہا۔ ان کے مقامات مقدسہ تک غیروں کے تسلط میں چلے گئے۔ چنانچہ وہ اس انتظار میں تھے (اور اب بھی ہیں) کہ ایک آنے والا آئے گا اور انہیں اس عذاب سے نجات دلائے گا۔

پھر عذاب کیوں؟ قرآن کریم نے ان سے کہا کہ (آخرت کی بات تو چھوڑو۔ یہ بناؤ کہ) اگر تم واقعی خدا کی چاہتی
اولاد ہو، تو وہ تمہیں دنیا میں ذلیل اور خوار کیوں کر رہا ہے؟ کوئی شخص اپنی اولاد کو ذلتوں
اور سوائیوں کے عذاب میں کبھی مبتلا نہیں کرتا، تمہاری دنیاوی حالت تمہارے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ تم خدا کی چاہتی
اولاد ہو۔

ہم (مسلمانوں کا) یہ عقیدہ تو نہیں کہ ہم خدا کی چاہتی اولاد ہیں۔ لیکن اس کا تو ہم بھی بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ
ہماری حالت ہم اس کے محبوب کی امت ہیں، اور اس سے یہ منتظر کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کبھی آتش دوزخ
میں نہیں جھونکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو دلیل یہودیوں کے خلاف دی ہے وہی ہم پر بھی
صادق آتی ہے کہ اگر ہم واقعی "اس کے محبوب کی امت ہیں" تو ہم دنیا میں اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ یہ بھی اسی کا
ارشاد ہے کہ مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۶)۔ یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا
ہوگا، جو قوم دنیا میں ذلیل و خوار ہے، وہ آخرت میں معزز اور مقرب کیسے بن سکے گی؟ (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم
ص ۱۱۱-۱۱۲۔ انڈکس میں عنوان۔ دنیا عنوان شفاعت)

ان کے باطل عقیدہ کی تردید کے بعد کہا کہ اب یہ رسول آیا ہے جو وحی کی صحیح اور سچی تعلیم پیش کرے گا۔
يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ
الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ
بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

اے اہل کتاب! یہ ہمارا رسول تمہارے پاس اس وقت آیا ہے جب سابقہ رسولوں کی دعوت کی گرمجوشی دہمی پڑ چکی تھی۔
وہ ان تمام حقائق کو پھر سے واضح کر رہا ہے جنہیں تم ضائع کر چکے تھے۔ یہ اس لئے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی ایسا
پیغامبر نہ آیا جو ہمیں بتاتا کہ زندگی کی خوشگواریاں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں اور غلط راستے پر چلنے کا انجام کیا ہوتا ہے
یہ رسول، اسی فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے آیا ہے، اور خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق آیا ہے۔

فترة اس میں کہا کہ یہ رسول "عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ" آیا ہے، فترۃ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز
کی شدت کا مدھم ہو جانا۔ حرارت میں کمی واقعہ ہو جانا۔ ایک رسول کے بعد دوسرا رسول اس وقت آیا کہتا
تھا جب سابقہ رسول کی آوروہ تعلیم اس کے امتیوں کی خطا کاریوں کی وجہ سے ماند پڑ جاتی تھی۔ اس کی تعلیم میں وہ گرمجوشی
اور حرارت باقی نہیں رہتی تھی۔ حضور نبی اکرمؐ کی بعثت نے ان عروق مردہ میں پھر سے خون زندگی دوڑا دیا۔ نبی اکرمؐ کے بعد

کسی اور رسول کے آنے کی ضرورت اس لئے باقی نہ رہی کہ آپ کا آوردہ پیغام قرآن کریم کی ذہن میں محفوظ ہے۔ جب کوئی قوم چاہے، اس کے ذریعے اپنی زندگی میں حرارت پیدا کر سکتی ہے۔

اس کے بعد اس آیت میں ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ فرمایا کہ اس رسول کو اس لئے بھی بھیجا جا رہا ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم غلط راستے پر جا رہے تھے تو کوئی ایسا بھی تو نہ آیا جو ہمیں اس سے متنبہ کرنا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو یہ تمہیں تباہیوں کے جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ اگر ایسا آگاہ کرنے والا آجاتا تو ہم صحیح راستہ اختیار کر لیتے۔

یہ اعتراض بڑا وزنی ہے۔ انسان حق اور باطل غلط اور صحیح میں امتیاز اپنی عقل کی رُو سے کر

قوموں کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا

نہیں ملتا۔ یہ صرف وحی کی رُو سے ممکن ہے۔ اگر کسی قوم کے سامنے وحی (سرکسے ہو ہی نہ) یا اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہے، اور صحیح راستہ کا کوئی نشان نہ ملے، تو انہیں تباہ اور ہلاک کر دینا، انصاف سے بعید ہو گا۔ یہ ظلم ہو گا۔ اس موضوع پر ہم سابقہ باب میں (ذریعہ آیت ۱۶۵) گفتگو کر چکے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس نکتہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا دہرا دینا نامناسب نہ ہو گا۔ بالخصوص اس لئے کہ اس سے کچھ اہم نتائج بھی مستنبط ہوئے ہیں جن کا وہاں ذکر نہیں آیا تھا۔

قرآن کریم نے واقع طور پر کہہ دیا کہ

(۱) خدا کسی قوم کو تباہ نہیں کرتا، تاوقتیکہ اُسے بتا نہ دیا جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا۔ رسول

اسی مقصد کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور

(۱۱) اس قوم کی ذہنی سطح ایسی ہو کہ وہ سمجھانے پر، غلط اور صحیح کا فرق سمجھ سکے۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات

صحیح اور غلط راستے میں تمیز کر دی جائے

میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا

۱۔ ہم کسی قوم کو تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ ہم اس کی طرف اپنا رسول نہ بھیج دیں۔ (۱۵۱/۱۶۸)۔ یہ رسول

اس ملک کے مرکزی مقام (فی احمد) میں آتا تھا۔ (۲۸/۲۹)

۲۔ مکاناتِ عمل کے وقت ان رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا

(۱۵۱/۱۶۸)۔ خود اس قوم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے رسول کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا (۲۸/۲۹)۔

۳۔ جہنم کے داروغے، اہل جہنم سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے جو تم گمراہ رہے؟

وہ کہیں گے کہ وہ آئے تو تھے (لیکن ہم نے ان کی بات نہیں مانی تھی)۔ (۱۵۱/۱۶۸)۔ اگر ہم ان کی سنسنے اور عقل و فکر سے کام

لیتے تو جہنم میں کیوں پہنچتے (۶۷)۔

۴۔ رسول اللہ سے فرمایا کہ آپ کی اولیں مخاطب وہ قوم ہے جس کی طرف اس سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا (۳۶)۔

(۳۲) ذ (۲۸)۔ تاکہ یہ لوگ ایسا نہ کہہ سکیں کہ اگر ہماری طرف رسول آتا تو ہم صحیح راستہ اختیار کر لیتے (۲۸) ذ (۱۹)۔
[نیز دیکھئے (۱۱۵) ذ (۹) (۳۰) ذ (۳۵) (۳۶) ذ (۳۵)]

اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہو | دوسری بات یہ کہ اس قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ جہنم میں وہی لوگ جائیں گے جنہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہ حاصل

ہو لیکن وہ ان سے کام نہ لیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے رسولوں کے پیغام کی مخالفت کرتے جائیں۔ (۳۶)۔ عآء اور قوم کے متعلق کہا کہ وہ اس لئے تباہ نہیں ہوئے کہ وہ پیغاماتِ خداوندی کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹)۔ وہ صاحب فکر و نظر تھے۔ اور باب بصیرت تھے۔ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔ لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال رکھے تھے کہ ان کی سمجھ سوچ کی صلاحیت ان کے کسی کام نہ آئی۔ (۳۶)۔ جیسا کہ اوپر بھی کہا جا چکا ہے، سورۃ ملک میں ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ تم جہنم میں کیوں داخل کر دیئے گئے۔ وہ کہیں گے کہ ”اگر ہم عقل و فکر سے کام لیتے تو اہل جہنم میں سے کیوں ہوتے؟“ (۶۷)

اس سے جرم و سزا کے متعلق ایک عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس قانون سے لوگوں کو پہلے آگاہ نہ کیا گیا ہو اس کی خلاف ورزی مستوجب سزا نہیں قرار پا سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ جن میں سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو (مثلاً مجنون یا بچے) انہیں مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس ضمنی نکتہ کے چند سابقہ مضمون کے تسلسل میں یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کہ تنذیر اسی کے لئے

مفید اور کارگر ہو سکتی ہے جو ”زندہ“ ہو، ایک لفظ میں بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا کہ رسول کی دعوت سے وہی قوم مستفید ہو سکتی ہے ”جو زندہ ہو“۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۲)۔ ”تو انہی لوگوں کو زندگی کے خطر

سے آگاہ کر سکتا ہے جو زندہ ہوں اور ان میں زندہ رہنے کی رفق اور آرزو

ہو“ جو قوم مر چکی ہو اور اس کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہ ہو اسے

قوم کا زندہ ہونا ضروری ہے

تیری دعوت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ برستان میں وعظ کئے جانے سے کیا حاصل! اِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتٰی۔

(۲۷)۔ تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں (اقبال)
 آیت ۲ میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے لیکن یہاں اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن نے ”زمینِ مردہ“ سے تشبیہ دی ہے۔ بارش تو ہر زمین پر برستی ہے لیکن فصل اُسی زمین سے پیدا ہوتی ہے جس میں روئیدگی کی صلاحیت ہو۔ جو زمین اس صلاحیت کو کھو کر مستقل بنجر ہو جائے، اسے بارش کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْزِلَتْ تِهْمَةٌ أَمْ لَمْ تُنْزِلْ لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲)

زندگی اور موت کا قرآنی مفہوم | زندہ سے مراد سانس لینے والے، اور مردہ سے مراد طبعی طور پر مرجانے والے نہیں طبعیات کی رو سے حیات اور موت کی

تعریف اور ہے۔ اقدارِ خداوندی کی رو سے کچھ اور۔ وہ چلتے پھرتے، زندہ انسانوں سے کہتا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذْ دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۱۱۴)۔ اے جماعتِ مومنین! تم خدا اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو۔ اُس رسول کی دعوت پر جو تمہیں اس پروگرام کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں۔ اس طرح تو حیوان بھی زندہ رہتے ہیں۔ زندگی انسانی سطح پر زندہ رہنے کا نام ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

کھول کر کیا بیان کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
 عشق ہے مرگِ با شرف۔ مرگ، حیاتِ بے شرف
 (اقبال)

”حیاتِ بے شرف“ موت ہے۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی ہے۔ یہ کفر ہے (۴/۱۶)۔

اسلامی نظام کس طرح قائم ہوتا ہے | آج (۱۹۵۸ء) میں ہمارے ہاں تمام ”انشورانِ قوم“ اس سعیِ لاحاصل میں غلطاں و پچان ہیں کہ معلوم کیا جائے کہ

”اسلامی نظام“ کس طرح قائم ہو گا۔ یہ تجنیسِ عرصہ سے چل رہی ہیں اور حالت یہ ہے کہ ——— طور کو سمجھا رہے ہیں اور سزا ملتا نہیں۔ قرآن کریم نے اس پروگرام کو چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے جس کی رو سے اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے:

أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ... (۶/۱۲)

ذرا سوچ کر کیا وہ جو مردہ تھا۔ پھر اسے ہم نے زندہ کیا۔ اور اس کے ہاتھ میں شمع قرآنی دی (کہ وہ اپنے راستے کو بھی

روشن کرے اور عالمگیر انسانیت کی بھی راہ نمائی کرے۔ کیا ایسی قوم اس قوم جیسی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہی ہو اور ان تاریکیوں سے نکلنا ہی نہ چاہے

اس آیت جلیلہ میں اس پروگرام کو واضح کر دیا ہے جس کے مطابق قرآنی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اور جسے حضور نبی اکرمؐ نے قائم کر کے دکھا دیا۔

آپ نبی اکرمؐ کے اختیار فرمودہ پروگرام پر نگاہ ڈالیے۔ آپؐ کی بعثت کے وقت آپؐ کی مخاطب قوم زندہ نہیں، مردہ تھی۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے سامنے اقدار خداوندی نہیں تھیں حضورؐ نے اپنی حیات رسالت کا پچاس فی صد سے بھی زیادہ حصہ (تینیں برس میں سے تیرہ برس) ان مردہ انسانوں کو زندہ انسانوں کی صف میں لانے کے لئے صرف فرمایا۔ آپؐ نے اس (قدیم) معاشرہ میں اسلامی نظام کی بات ہی نہیں کی۔ آپؐ نے اپنی مکی زندگی میں، نہ اسلامی آئین مرتب فرمایا۔ نہ اسلامی قوانین حکومت مدون کئے، جالانکہ اسلامی نظام کا قیام آپؐ کی رسالت کی غایت اور آپؐ کے مشن کا منتہی تھا۔ آپؐ نے پہلے وہ افراد تیار کئے جن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم ہونا تھا۔ آپؐ نے ”عمر بن خطاب“ کو، اس کی (قدیم) سطح پر رہتے ہوئے، فاروق اعظمؓ نہیں بنایا تھا۔ آپؐ نے پہلے اسے دعائیں مانگ مانگ کر، مردوں کی بستی سے نکالا، کیونکہ آپؐ نے دیکھ لیا تھا کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے بعد قرآنی تعلیم و تربیت سے، (عمر بن خطابؓ اور ان جیسے دیگر افراد) کے تہکدہ دل و دماغ کو نام سابقہ معتقدات و نظریات سے پاک و صاف کیا۔ (یہ حصہ لا تھا) اور اس کے بعد، اس خالی گھر میں ”اللہ کو بسایا“ (یہ حصہ لا تھا)۔ یہ تھا اس پروگرام کا مرحلہ اول۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپؐ اپنا جہاں پیدا کرے

حضور نبی اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے المیزان کہہ کر پکارا تھا۔ میزان اس کا رواں سالاد کو کہتے ہیں جو بہترین افراد کا رواں کا انتخاب کرے حضورؐ کی مکی زندگی، ان افراد کا رواں کی تیاری میں گزری۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اس دور میں آپؐ نے اسلامی مملکت اور اس کے تفصیلات کے متعلق کوئی تفصیلات طے نہیں فرمائیں حالانکہ آپؐ کی تمام سعی و کاوش کا منتہی وہی تھا۔ اس وقت آپؐ نے ساری توجہ اپنے رفقاء کے کار کی تعمیر کی طرف مرکوز رکھی، کہ یہی منزل تک پہنچنے کا صحیح پروگرام تھا (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں):

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم؛
کہ گفتہ اند، نخستین رفیق، بعد طریق

ان رفقاء کے ہاتھ میں جب قرآن دیا تو پھر نہ اسلامی نظام و مملکت کے قیام میں کوئی دقت پیش آئی، نہ طریق انتخاب و مشاورت کی کوئی بحث اُٹھی۔

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی قوم کے خارجی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کے افراد میں نفسیاتی تبدیلی نہ آچکی ہو۔ حضورؐ کے تعمیر کردہ معاشرہ کے افراد میں کس قسم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی آچکی تھی، اُسے قرآن کریم نے بڑے بسیط انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ **فَلَا وَرَیْلَکَ لَا یُؤْمِنُونَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شِئْتُمْ بِیْنَهُمْ**۔ (۴/۵۹)۔ ”اے رسول! تیرا رب اس پر شاہد ہے۔ اس کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے تمام اخلاقی معاملات میں تمہیں اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) مقرر نہ کریں“ یہاں تک کسی نفسیاتی تغیر کی ضرورت نہیں۔ ایسا کچھ ہر حکومت قانون کی رُو سے کر سکتی ہے۔ یعنی اخلاقی معاملات کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ نفسیاتی تغیر کی بات آگے آتی ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اخلاقی معاملات تیرے پاس لائیں۔ تو فیصلہ دے تو ان کی کیفیت یہ ہو کہ **تَحَدُّ وَلَا تَجِدُ وَا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضٰیْتَ**۔ ”یہ تیرے فیصلے کے خلاف، دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی اور گرائی محسوس نہ کریں“ یہ بات داخلی تبدیلی (نفسیاتی تغیر) کے بغیر ممکن نہیں۔ (۴/۵۹)

یہ تھے وہ افراد جنہیں اس عظیم ذمہ داری (قیام نظام اسلامی) کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ان کی قلبی کیفیت اس قسم کی کیوں ہو کئی تھی؟ بات واضح ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اپنے تمام اخلاقی معاملات کے تصفیہ کے لئے حضورؐ کی طرف رجوع کریں، تو دوسری طرف حضورؐ سے فرمایا کہ **فَاُحْکِمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاَہُمْ**۔ (۵/۶۴)۔ ”تم ان کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔ اور اس میں کسی کے جذبات کی رعایت نہ کرو“

یعنی فیصلے اس کتاب اللہ کے مطابق جس کی صداقت پر ان کا ایمان ہے اور فیصلہ دینے والا وہ جس کی پاکیزگی سیرت ان کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور اسے بھی یہ ناکید کہ فیصلہ دینے میں، نہ اپنے نہ کسی اور کے جذبات سے متاثر ہو۔ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام قائم ہوا تھا۔

یہیں سے ایک قدم آگے بڑھ جائیے تاکہ اس اہم سوال کا جواب بھی لگے ہاتھوں مل جائے جس کا تعلق نظام معاشرت سے ہے۔ سربراہ مملکت اور ان افراد معاشرہ کے باہمی تعلق کی بابت ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر اُس کے کسی فیصلہ کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی کبیدگی یا گرائی پیدا ہو جائے تو یہ اپنے آپ کو مومن نہیں

مشاورت

تصور کر سکتے۔ لیکن اسی سربراہ مملکت کو حکم دیا جاتا ہے کہ **وَأَشَاوِرْكَ فِي الْأَمْرِ** (۳۱)۔ ”امور مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو“ اور اس مشورہ میں انہیں اس قدر آزادی رائے حاصل تھی کہ وہ حضورؐ کی پیش کردہ تجاویز کی مخالفت کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔ اور حضورؐ کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کی رائے زیادہ صائب ہوتی، تو آپؐ اپنی تجویز میں اس کے مطابق تبدیلی فرما دیتے۔ اور جب کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ ہو جاتا تو پھر اس فیصلہ کی تعمیل میں کسی کے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس نظام میں نہ حکم دینے والے کی طرف سے کسی قسم کے جبر کا امکان تھا، نہ حکم ماننے والوں کے دل میں کسی قسم کی مجبوری کا احساس۔ یہ ہے اسلامی نظام کی وہ انفرادیت جس کی مثال دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔ انسانی نظام خارج سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام دل کی گہرائیوں سے ابھر کر باہر آتا ہے۔ چونکہ یہاں مشاورت کا ذکر آگیا ہے اس لئے ایک لطیف نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ مشاورت کا حکم رسول اللہؐ کو بھی دیا گیا ہے **وَأَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** اور جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ **وَأَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (۴۲)۔ الامر کے معنی نظام مملکت کے ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ وہی ہیں لیکن ان کی ترتیب میں جو (غیر محسوس سا) فرق ہے اس سے ایک عظیم حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ امور مملکت میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہؐ مملکت قائم کچے تھے اور اس مملکت کے سربراہ آپؐ خود تھے۔ آپؐ کی یہ سربراہی امت کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ حضورؐ منصب رسالت کی حیثیت سے سربراہ مملکت تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعد صورت یہ نہیں تھی۔ اس وقت خود مملکت، یعنی سربراہ مملکت بھی امت کے مشورہ سے منتخب ہوتا تھا۔ امرہم شوریٰ بینہم سے ہی مراد ہے ”امرہم“ میں سربراہ مملکت کے انتخاب سے مراد ہے کہ جملہ امور مملکت تک شامل ہیں جو امت کے مشورہ سے طے پائیں گے۔ یہ مفہوم ہے ان مختصر سے تین لفظوں کا کہ امرہم شوریٰ بینہم۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا خلافت الا بمشاورۃ (اکثر اعمال)۔ جو مملکت مشاورت کے بغیر قائم ہو وہ خلافت (اسلامی مملکت) نہیں ہو سکتی وہ ملوکیت ہوگی۔



رسولؐ اس طرح ایک مردہ قوم کو زندگی عطا کر کے، اسے قیام نظام خداوندی کے لئے تیار کرتا تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى..... (۲۶)۔ ”مجھے بتاؤ کہ مردوں کو زندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے“ تو اس سے یہی مراد تھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۵۸)۔ آیت (۲۶)۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید قوم حضرت موسیٰؑ کی داستان کو بار بار سامنے لاتا ہے۔ فرمایا۔
 وَادُّ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ
 فِيْكُمْ اَنْبِيَاءً وَجَعَلَ لَكُم مَّلُوْكَاً وَ اَلَكُمْ مَّا لَمْ يُوْتِ
 اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ذرا ان یہود کا حال دیکھئے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم خدا کی جیتی اولاد ہیں۔ ان سے ان کے پیغمبر موسیٰؑ نے کہا کہ تم، ان انعامات خداوندی کو ہمیشہ پیش نظر رکھو جن کی رو سے، اُس نے تم میں انبیاء پیدا کئے۔ اور تمہیں صاحب اقتدار و مملکت بنایا۔ اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو اس زمانے میں کسی اور قوم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

داستان بنی اسرائیل کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ اندکس سے حوالے مل جائیں گے۔ اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ ”وَ جَعَلَ لَكُم مَّلُوْكَاً“، تو ملوک سے مراد اصطلاحی ملوکیت (بادشاہت نہیں) اس سے مراد مملکت کا اقتدار ہے۔ (۲۸-۲۷)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب جلد دوم ص ۲۷ (۱۶۶)

ان احکامات خداوندی کی یاد دہانی کے بعد کہا کہ خدا کی طرف سے انہیں یہ کچھ عطا ہوا، اور ان کی یہ حالت تھی کہ ان میں ہمت اور استقلال قطعاً نہیں رہا تھا۔ (مطالب جلد دوم ص ۲۷)۔ اس کی شہادت میں اس نے سورۃ بقرہ میں ”طاعات اور جالوت“ کے معرکہ کا قصہ بیان کیا ہے۔ (دیکھئے مطالب جلد سوم ص ۲۲۶-۲۱۸)۔ اب وہ اس واقعہ کو سامنے لایا ہے جس کی رو سے اُن سے ”ارض مقدس“ پر قبضہ کر لینے کے لئے کہا گیا تھا۔

اسے آیات (۲۴-۲۱) میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات، معدان کے تناظر کے مطالب الفرقان جلد دوم ص ۲۹۴-۹۵ پر گزر چکی ہیں اس لئے ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ تجدید یادداشت کے لئے ان کا مفہوم درج ذیل کر دیا جاتا ہے:

ان انعامات خداوندی کی یاد تازہ کرانے کے بعد اُن سے کہا کہ تم اٹھو، اور فلسطین کی اس بابرکت زمین میں فاتح و

منصور داخل ہو جاؤ۔ جسے اللہ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ تم آگے بڑھو اور اس ملک پر قابض ہو جاؤ۔ دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دشمن کو دیکھ کر میدان سے پیٹھ دکھا کر، بھاگ نکلو۔ اگر ایسا کرو گے تو سخت نقصان اٹھاؤ گے (۲۵) (۲۴)۔

اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اے موسیٰؑ! اس ملک میں تو بڑے بڑے زبردست لوگ بستے ہیں۔ جب تک یہ اس ملک سے نہ نکل جائیں، ہم وہاں قدم نہیں رکھنے کے۔ اگر یہ وہاں سے نکل جائیں، تو پھر ہم بڑے شوق سے وہاں

چلے جائیں گے۔ (۲۴۶)

یہ جواب ساری کی ساری قوم کی طرف سے تھا، مجرّم و آدمیوں کے، جو اُن جیسے نہیں تھے، اور جو خدا کے قانون سے اس قسم کا مذاق کہنے سے خوف کھاتے تھے۔ اُنہیں خدا نے حقیقت یعنی کی نعمت سے لواڑا تھا۔ یہ دونوں، خود موسیٰ اور ہارونؑ تھے۔ اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اس قدر بزدل کیوں بن رہے ہو؟ ایک دفعہ ہلہ بول کر شہر کے دروازے میں دروازہ گھس جاؤ۔ پھر دیکھو، تم کس طرح ان پر غالب نہیں آ جاتے؟ جن لوگوں کا اللہ پر ایمان ہو، وہ اس طرح ہمت نہیں ہارا کرتے۔ وہ اللہ کے قانون کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ بزدلی تو عدم یقین اور تذبذب سے پیدا ہوتی ہے (۲۴۷)

لیکن اُن پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ اسے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم کبھی نہیں آگے بڑھنے کے۔ تمہیں اگر اللہ کے قانون اور نصرت پر ایسا ہی بھروسہ ہے، تو تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کو۔ ہم یہاں بیٹھے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں۔ (جب تم غالب آ جاؤ تو ہمیں آواز دے لینا۔ ہم فوراً پہنچ جائیں گے)

(۲۴۸)

اس پر موسیٰؑ نے تنگ آ کر کہا کہ اے میرے پروردگار! خود دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کیا کچھ کر رہے ہیں! میرا اب ان پر کوئی بس نہیں۔ میرا اختیار تو سمٹ سٹا کر، خود میری ذات تک یا زیادہ سے زیادہ اپنے بھائی تک رہ گیا ہے۔ اب ہم ہیں اور اس قسم کی بے راہ رو قوم ہیں، تو ہی کوئی فیصلہ کر دے کہ ان کے متعلق ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ (۲۴۹)

چنانچہ خدا نے فیصلہ دے۔ اور فیصلہ یہ تھا کہ وہ لوگ، اس سرزمین سے، جسے اُن کے نام لکھ دیا گیا تھا، چالیس سال تک محروم کر دیئے گئے۔ اور وہ اس بیابان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ سرگرداں و پریشان۔ تباہ حال و خستہ خراب۔

یقیناً ان کی یہ حالت موسیٰؑ جیسے مشفق داعی انقلاب کے لئے بڑی تاسف انگیز تھی (اور ہر نبی کی یہی کیفیت ہوتی ہے)۔ (۱۸/۴ ز ۲۴/۳ ز ۲۵/۸)۔ لیکن ہم نے اسے کہہ دیا کہ اس قسم کی بے راہ رو قوم کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

اس لئے تم ان کی حالت پر افسردہ خاطر مت ہو۔ جو اپنے آپ کو خود تباہی میں ڈالے، اُسے کون بچا سکتا ہے؟

یہ ہے خدا کی چہیتی اولاد ہونے کی مدعی قوم کا ماضی !



اس کے بعد قرآن کریم نے دو آدمیوں (بنی آدم) کے باہمی معاملہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اس نے ان آیات کے مفہوم میں بیان کر دیا ہے۔ پہلے آپ آیت (۵/۲۴) اور اس کا مفہوم دیکھ لیجئے۔

وَإِثْلُ عَلَيْهِمْ نَبَا ابْنِ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتَقَبَّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ط قَالَ لَا قُتْلَكَ ط قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝

(یہودیوں کی نافرمانیاں اور مرکشیاں زمانہ حضرت موسیٰؑ) تک ہی محدود نہ تھیں۔ اس کے بعد بھی وہ یہی کچھ کرتے رہے۔ ان کا آخری مجرم، حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے درپے ہونا تھا۔ ان کے ان پیغم جرائم کی وجہ سے، خدا نے اُن سے، اپنی عنایات، ایک ایک کر کے چھین لیں، اور ان (عنایات) کا رخ ان کے بھائی (اسماعیلؑ) کی شاخ کی طرف پھیر دیا۔ اب بھائے اس کے کہ وہ یہ سمجھتے کہ اُن کی یہ محرومی ان کی انہیں کہ تو قوں کا نتیجہ ہے، وہ اٹھا حسد کرنے لگ گئے اور اس داعی الی الحقؑ کے درپے آزار ہو گئے (جبرئیل اسماعیلؑ میں سے ہے)۔ ان سے کہو کہ یہ تو اُن دو فرزندِ آدمؑ کے قصے کی سی بات ہو گئی رہن کا ذکر خود تمہارے ہاں تورات میں موجود ہے، لیکن جس میں تم نے بہت سی رنگ آمیزیاں کر رکھی ہیں۔ اس لئے میں تمہیں ٹھیک ٹھیک بتاتا ہوں کہ بات کیا ہوئی تھی۔

ان دونوں بھائیوں نے (اپنے خیال کے مطابق) خدا کے ہاں مقرب بننے کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ اُن میں سے (اُن کے عقیدہ کے مطابق) ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس پر، اُس دوسرے کو غصہ آگیا اور اپنے بھائی سے لسنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اُس نے کہا کہ اللہ متقیوں کی پیش کش قبول کیا کرتا ہے۔ اس لئے اگر میری قربانی قبول ہو گئی ہے تو اس میں تمہارے لئے غصہ کی کون سی بات ہے، اور میرا کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قتل کرنے کے درپے ہو رہے ہو ؟ (۵/۲۴)

ہمارے ہاں چونکہ آدم سے مراد پہلا انسان اور حضرت آدمؑ "لیا جاتا ہے اس لئے اس آیت میں آدمؑ کے

دو بیٹوں سے مراد، حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے لیا جاتا ہے۔ تورات میں ان کا نام ہابیل اور قابیل آیا ہے۔ ہماری کتب تاریخ اور تفسیر میں انہیں ہابیل اور قابیل کہہ کر پکارا گیا ہے

ہمارے مؤرخین تاریخ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے کرتے ہیں اور افسانہ درافسانہ سب رطب ویاس لکھتے

چلے جاتے ہیں اور کبھی نہیں بتاتے کہ اس کے لئے ان کا ماخذ (SOURCE) کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہمارے یہ تاریخ کس حد تک قابل اعتماد قرار پا سکتی ہے!

”آدم“ کے متعلق آپ مطالب۔ جلد دوم باب اول و دوم میں دیکھ چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے مراد ”آدمی“ ہے۔ اور بنی آدم سے مراد نوع انسان۔ اس بنا پر آیت زیر نظر میں ابْنِ آدَمَ سے مراد، آدم نامی کسی خاص شخص کے دو بیٹے نہیں بلکہ محض دو آدمی ہیں۔ قرآن نے پس اتنا ہی کہا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا نام بھی نہیں دیا۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے یا محض تمثیلی بیان، اس کا بھی بالتفصیل کوئی ذکر نہیں۔ قرآن کریم نے اسے جس مقصد کے لئے بیان کیا ہے وہ آیت (۵/۲۷) سے واضح ہو جاتا ہے۔

یہ تو رہی ان دو لڑکوں کی بات۔ اب ان میں ایک کے قتل کے واقعہ کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں ہماری کتب تفسیر میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے نگاہیں نیچی کر کے لکھنا پڑتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا جا چکا ہے) تفسیر ابن کثیرؒ ہاں بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے۔

”خدا فرماتا ہے۔ اے بنی انہیں حضرت آدمؑ کے دونوں کا صحیح صحیح بے کم و کاست قصہ سنا دو۔ ان دونوں کا نام

ہابیل و قابیل تھا۔ ضروری ہے کہ چونکہ اُس وقت دنیا کی ابتدائی حالت تھی اس لئے

تفسیری افسانہ طرازیوں | یوں ہوتا تھا کہ حضرت آدمؑ کے ہاں ایک حمل سے لڑکا لڑکی ہوتے تھے، پھر دوسرے حمل میں بھی اسی طرح۔ تو اس حمل کا لڑکا اور دوسرے حمل کی لڑکی ان دونوں کا نکاح کر دیا جاتا تھا۔ ہابیل کی بہن تو خوبصورت نہ تھی اور قابیل کی بہن خوبصورت تھی۔ تو قابیل نے چاہا کہ اپنی ہی بہن نکاح کرے۔ حضرت آدمؑ نے اسے منع کیا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ تم دونوں خدا کے نام پر کچھ نکالو جس کی خیریت قبول ہو جائے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ ہابیل کی خیریت قبول ہو گئی۔ پھر وہ ہوا جس کا بیان قرآن کی ان آیتوں میں ہے۔ ”مفسرین کی اقوال سنئے“۔

حضرت آدمؑ کی علیٰ اولاد کے نکاح کا قاعدہ جو اوپر مذکور ہوا بیان فرمانے کے بعد مروی ہے کہ بڑا بھائی قابیل

کھینٹی باڑی کرتا تھا اور ہابیل جانوروں والا تھا۔ قابیل کی بہن بہ نسبت ہابیل کی بہن کے خوب رو تھی۔ جب ہابیل کا پیغام اس

سے ہوا تو قابیل نے انکار کر دیا اور اپنا نکاح اس سے کرنا چاہا۔ حضرت آدمؑ نے اس سے روکا۔ اب ان دونوں نے خیریت

نکالی کہ جس کی قبول ہو جائے وہ نکاح کا زیادہ حقدار ہے۔ حضرت آدمؑ اس وقت کے پہلے گئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا۔ زمین پر جو میرا گھر ہے اسے جانتے ہو؟ آپ نے کہا نہیں۔ حکم ہوا کہ میں ہے۔ تم

وہیں جاؤ۔ حضرت آدمؑ نے آسمان سے کہا کہ میرے بچوں کی تو حفاظت کرے گا؟ اس نے انکار کیا۔ زمین سے کہا وہ بھی

انکاری ہو گئی۔ پیادوں سے کہا انہوں نے بھی انکار کیا۔ قابیل سے کہا اس نے کہا ہاں میں محافظ ہوں۔ آپ جانیے۔ اگر بلا حفظ فرمائیں گے اور خوش ہوں گے۔ اب ہابیل ایک خوبصورت مولا تازہ بھیر نام خدا پر فرج کیا اور بڑے بھائی نے اپنی کھیتی کا حصہ اللہ نکالا آگ آئی اور ہابیل کی نذر تو جلا گئی جو اس زمانہ میں قبولیت کی علامت تھی اور قابیل کی نذر قبول نہ ہوئی اس کی کھیتی یونہی رہ گئی اس نے راہ اللہ کرنے کے بعد اس میں سے اچھی اچھی بالیں توڑ کر کھالی نکلیں۔ چونکہ قابیل اب مایوس ہو چکا تھا کہ اس کے نکاح میں اس کی بہن نہیں آنے کی اس لئے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کی قربانی قبول فرمایا کرتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہی بھیر جنت میں پتارا اور یہی وہ بھیر ہے جسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بچے کے بد سے فرج کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ہابیل نے اپنے جانوروں میں سے بہترین اور مرغوب و محبوب جانور خدا کے نام قربان کیا اور خوشی کے ساتھ۔ برخلاف اس کے قابیل نے اپنی کھیتی میں نہایت ردی اور واہی چیز اور وہ بھی مرے جی سے خدا کے نام نکالی تھی۔ ہابیل نمودی اور طاقتوری میں بھی قابیل سے زیادہ تھا۔ تاہم خدا کے خوف کی وجہ سے اس نے اپنے بھائی کی ظلم و زیارتی عدلی اور ہاتھ نہ اٹھایا۔ بڑے بھائی کی قربانی قبول نہ ہوئی اور حضرت آدمؑ نے اس سے کہا تو اس نے کہا کہ آپ چونکہ ہابیل کو چاہتے ہیں اس کے لئے دعا کی تو اس کی قبول ہو گئی۔ اب اس نے ٹھان لی کہ میں اس کا سنٹے ہی کو اکھاڑ ڈالوں۔ موقع کا منتظر تھا ایک روز اتفاقاً حضرت ہابیل کے آنے میں دیر لگ گئی تو انہیں بلائے کے لئے حضرت آدمؑ نے قابیل کو بھیجا۔ یہ ایک چھری اپنے ساتھ چھپا کر چلا راستے میں ہی دونوں بھائیوں کی ملاقات ہو گئی تو اس نے کہا کہ میں تو تجھے مار ڈالوں گا کیونکہ تیری قربانی قبول ہوئی اور میری نہ ہوئی۔ اس پر ہابیل نے کہا کہ میں نے بہترین اور عمدہ محبوب اور مرغوب چیز اللہ کے نام نکالی اور تو نے ردی کھدی واہی چیز نکالی اللہ تعالیٰ امتیقوں ہی کی نیکی قبول کرتا ہے۔ اس پر وہ بگڑا اور چھری بھونک دی۔

چونکہ اب تک زمین پر کوئی قتل نہیں ہوا تھا تو قابیل اپنے بھائی کو گرا کو کبھی اس کی آنکھیں بند کرتا کبھی اسے تھپڑ اور گھونسنے مارا۔ یہ دیکھ کر ابلیس لعین اس کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ پتھر لے کر اس کا سر کچل ڈال جب اس نے کچل ڈالا تو لعین دوڑتا ہوا آیا حضرت حواؑ کے پاس آیا اور کہا قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ انہوں نے پوچھا قتل کیسا ہوتا ہے؟ کہا، اب نہ وہ کھانا پیتا ہے نہ بولنا چاہتا ہے نہ ہلکا جلتا ہے۔ کہا، شاید موت آگئی۔ اس نے کہا، ہاں وہی موت۔ اب تو مائی صاحبہ چھینے چلانے لگیں اتنے میں حضرت آدمؑ آئے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ لیکن یہ جواب نہ دے سکیں۔ آپ نے دوبارہ دریافت فرمایا لیکن فرط غم و رنج کی وجہ سے ان کی زبان نہ اٹھی تو کہا تو اچھا۔ تو اور تیری بیٹیاں ہائے دئے میں ہی رہیں گی اور میں اور میرے بیٹے اس سے بری ہیں۔

یہ تو متفقین تھے۔ ہمارے ہاں متاخرین بھی اسی ڈگر پر چلتے ہیں۔ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ کا شمار بڑے بلند پایہ

ہمارے زمانے کے علماء

علماء میں ہوتا ہے۔ اور اسی زمرہ میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا شمار بھی قرآن کریم کا ترجمہ شیخ الہندؒ کا ہے اور اس کی تفسیری حواشی مولانا عثمانیؒ کے۔ ان میں بھی آدمؑ کے بیٹوں کے نکاح کے سلسلہ میں یہی کچھ کہا گیا ہے۔ ان حضرات کو بھائی بہنوں کے نکاح کے سلسلہ میں جو الجھن پیش آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے آدمؑ اور اس کی بیوی (حوا) کو پہلا انسانی جوڑا قرار دیا۔ اس جوڑے کے جنسی اختلاط سے آگے نچے پتھیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے، ان میں ہر لڑکی، لڑکوں کی حقیقی بہن تھی اور ہر لڑکا، لڑکیوں کا بھائی۔ شریعت کی رو سے، بہن بھائی کا نکاح ہو نہیں سکتا۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ نسل انسانی کا سلسلہ آگے کس طرح چلے؟ اس کے لئے کہا گیا کہ آدمؑ اور حوا کے ہر حمل میں ایک لڑکا پیدا ہوتا تھا اور ایک لڑکی۔ ایک حمل میں پیدا ہونے والے لڑکے کا نکاح دوسرے حمل میں پیدا ہونے والی لڑکی سے کر دیا جاتا تھا۔ (یہ گویا بھائی بہن نہیں رہتے تھے!)

یہ الجھن کیوں؟ آپ نے غور فرمایا کہ تمام الجھنیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ آدمؑ اور حوا کو پہلا انسانی جوڑا فرض کر لیا گیا۔ اگر یہ حضرات قرآن کریم تک محدود رہتے اور روایات میں نہ الجھتے تو نہ اس قسم کی کوئی الجھن پیدا ہوتی، نہ اسے حل کرنے کے لئے دوران کار کاوشیں کوئی پڑتیں۔

بہر حال انہوں نے پہلے ہابیل اور قابیل کی الجھن پیدا کی۔ پھر بائبل و تورات کا اضافہ تراشا۔ (حالانکہ قرآن کریم نے لیا کہیں نہیں کہا)۔ اور کہا کہ بہشت میں پہلے گناہ کی ذمہ دار بھی عورت تھی۔ اور دنیا میں پہلے انسانی قتل کی ذمہ دار بھی عورت۔ آدھے چارہی عورت!

قرآن کریم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کیا منت تھی جو انہوں نے مانی تھی۔ کیا نذر تھی جو انہوں نے پیش کی تھی۔ یہ اس زلزلے کی بات نظر آتی ہے جب نذر نیاز کی قبولیت یا عدم قبولیت کے معیار، مذہبی پروہتوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس کے لئے کسی اور سند یا اتھارٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے ایک سے کہہ دیا ہو گا کہ تمہاری نذر قبول ہو گئی ہے۔ دوسرے کی نہیں ہوئی۔ اور اس سے ان کی باہمی مخالفت شروع ہو گئی۔

جس بھائی کو قتل کئے جانے کی دھمکی دی گئی تھی اس نے کہا:

لَعْنُ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسٍ بِكَ يَدِي إِلَيْكَ
لَا قُتْلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ إِنِّي أُرِيدُ
أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذَلِكَ

جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝

بایں ہر، اگر تم دھاندلی سے میرے خلاف دست درازی کرو گے تو ہمیں (اپنی مدافعت تو کروں گا، لیکن) تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں تو خدا کے رب العلمین کے قانون مکافات سے ڈرتا ہوں کہ ناحق کسی کو قتل کر دوں۔ (۵/۳۰)

میں چاہتا ہوں کہ زیادتی ہو تو تمہاری طرف سے ہو، میری طرف سے نہ ہو۔ اور اگر میری اس مدافعت میں تمہیں کچھ نقصان پہنچ جائے تو میرے اس گناہ کا بار بھی تمہاری گردن پر ہو۔ اس طرح تمہارے ذمے دو جرم ہو جائیں گے۔ میرے قتل (یا اس کے ارادے) کا جرم، اور میری طرف سے تمہیں جو نقصان پہنچے، اس کا جرم۔ اس قسم کے مجرم کی سزا جہنم کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے (۵/۳۱)۔

اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

۵
۳۰

لیکن اُس نے غصے میں ایک نہ سنی۔ عذبات سے مغلوب ہو کر بھائی کو قتل کر دیا، اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ (عذبات سے مغلوب ہو جانے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)۔

قبل اس کے کہ ہم اس آیت کا اپنا مفہوم بیان کریں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کے متعلق کیا سمجھتا ہے۔ اس مفروضہ کے تحت کہ یہ دنیا میں سب سے پہلا قتل (بلکہ سب سے پہلا موت کا واقعہ) تھا، انہوں نے یہ سوچا کہ قاتل نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ اس لاش کو کیا کرے؟ ابن کثیر میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ

جب مار ڈالا تو اب یہ معلوم نہ تھا کہ کیا کرے اور لاش کو کس طرح چھپائے؟ تو اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے

لاش کا کیا کیا جائے؟ | وہ دونوں بھی آپس میں بھائی بھائی تھے۔ یہ اس کے سامنے لڑنے لگے یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ پھر ایک گھڑھا کھود کر اس میں اس کی لاش

رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ دیکھ کر قابیل کی سمجھ میں بھی یہ ترکیب آگئی اور اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے نزدیک، جو کچھ اسلاف نے کہہ دیا ہے، وہ حرفِ آخر ہے۔ اس کے خلاف کچھ کہنا تو ایک طرف، اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے متاخرین نے بھی اپنی تفسیروں اور ترجموں میں یہی کچھ لکھ دیا ہے۔

جب قرآن کریم نے خود کوئی تفصیلی نہیں دی تو ہم اس کے متعلق اپنے قیاس ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ متقدمین کی دشواری لفظ (سَوَاعِدَ) سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس کے معنی "لاش کے لئے" یہ ٹھیک ہے کہ اس کے معنی لاش کے بھی ہوتے ہیں لیکن یہ وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے معانی ہر بری بات۔ ہر معیوب حرکت۔ ہر وہ قول اور فعل کے ہیں جس کے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو۔ (حسنات کے مقابلہ میں، سیئات اس کی جمع ہے جس کے معنی برائیاں اور ناہمواریاں ہیں)۔ آیت میں "فَأَصْبَحَ مِنَ التَّائِبِينَ" (۵) سے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے کئے پر بڑا نادام تھا۔ اس قیاس کے تحت میں نے اس کا حسبِ مفہوم پایا ہے۔

فَبَعَثَ اللَّهُ غُرًّا بَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِثُ
سَوَاعِدَ أَخِيهِ ط قَالَ يُوَالِيْتِي أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرِّ
فَأُوَارِثُ سَوَاعِدَ أَخِي ۖ فَأَصْبَحَ مِنَ التَّائِبِينَ ۝

۵
۳۱

اس نے جو ش غصب میں بھائی کو قتل تو کر دیا لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہ میں نے کیا کر دیا؟ وہ اس حالت میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتفاق سے سامنے ایک کوادیکھا جو زمین کو کرید رہا تھا۔ وہ اپنے کئے پر نادام تو پہلے ہی ہو رہا تھا کہ کوسے کی اس حرکت سے اس کا خیال اس طرف منتقل ہو گیا کہ کواد مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے (بفرض محال) اپنے بھائی میں کوئی بُرائی دیکھی بھی تھی تو اس پر یوں مغلوب الغضب ہونے کی بجائے اسے چھپانے (پر وہ پوشش) کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس پر اس نے اپنے آپ کو کوسا، اور جی میں کہا کہ کس قدر باعثِ افسوس ہے یہ امر کہ مجھ میں ایک جانور ختنی سمجھ بھی نہ ہوئی!

چنانچہ ان خیالات سے وہ اپنے دل میں بہت نادام ہوا۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ یہ کوئی (سچ) کا واقعہ نہ ہو بلکہ زندگی کے ایک اصول کے سمجھانے کے لئے مثالی انداز اختیار کیا گیا ہو۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ میرے اس قیاس کی تائید میں ایک حدیث بھی ہے جسے خود ابن کثیر نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ یہ واقعہ بطور ایک مثال کے ہے۔ تم اس میں سے اچھائی لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔ (ابن کثیر۔ چھٹا پارہ۔ سورہ مائدہ۔ ۵)

اس تفسیر کے مترجم مولانا محمد جونا گڑھی (مرحوم) نے اعتراف کیا ہے کہ

دلائل لے کر آتے رہے، اور انہی باتوں کو دہراتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، ان کی اکثریت کا یہ عالم رہا ہے۔
(اور اب تک ہے) کہ وہ حدود شکنی اور زیادتی کرتے رہے۔

یہ آیت، انسانی زندگی کی قدر و قیمت، اور انسانی جان کی حرمت اور عظمت کے متعلق ایک عظیم، بلند اور عالمگیر اصول پیش کرتی ہے جسے ہر لوگ عدلیہ

کے درو دیار پر سورج کی کرنوں میں نقوش کرنا چاہیئے۔ انسانی زندگی کے احترام اور قتل ناحق اور بالحق کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم۔ (ص ۱۷۸) دیکھئے۔ قتل بالحق کے معنی ہیں، قوانین خداوندی کے مطابق، عدل کا تقاضا پورا کرنے کے لئے سزائے موت۔ قرآن کریم نے اس کی تفصیل مختلف مقامات پر دی ہے۔ جب قرآن نے ہر

نئی آدم رانسان کو واجب الکفریم (بجائے) اور ہر انسانی جان کو قابل احترام قرار دیا ہے، تو (قانون خداوندی کے خلاف) کسی جان کا تلف کر دینا، سنگین ترین جرم ہے۔ اور کسی جان کو بچا لینا عظیم ترین عملِ حسنہ۔
”فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ“ کی تشریح اگلی آیت میں کر دی گئی ہے۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيُهُمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ (۳۳)

اُن کی اس مفسدانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اب جب کہ اس ملک میں نظامِ عدل و احسان قائم ہو چکا ہے جس میں انہیں ہر طرح کا آرام اور امن حاصل ہے، بجائے اس کے کہ یہ اطمینان سے بیٹھیں، یہ بدستور تخریبی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ عدل و آئین پر مبنی نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہے۔ اس باب میں ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کریں، یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں، تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ یا سولی چڑھا دیا جائے یا مخالف سمت سے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے (یا نظر بند کر دیا جائے اور عام مراعات سے محروم کر دیا جائے) — غرضیکہ جرم

کی نوعیت، اور ملک کے حالات کے پیش نظر جو سزا مناسب سمجھی جائے، دی جائے۔ یہ سزا ان کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی۔ باقی رہی آخرت، سو وہاں بھی ان کے لئے سخت تباہی ہوگی۔ اس لئے کہ اس جرم کا ایک اثر تو سوسائٹی کے نظام پر پڑتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے سزا ضروری ہے۔ اور دوسرا اثر خود مجرم کی اپنی ذات پر پڑتا ہے (۳۳)۔ اس کا نتیجہ اس ذات کا ضعف و انتشار ہے جو حیاتِ اخروی میں تباہی کا موجب ہے۔

اس آیت میں، ”يُحَايِرُ بُونَ اللَّهِ وَرَسُولَهُ“ کے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم ”نظامِ خداوندی“ یا گیا ہے۔ اس ضمن میں تفصیلی بحث، اسی جلد کے چوتھے باب میں، آیات (۵۸-۵۹) - (صفحات ۳۶-۳۷ پر) گزر چکی ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ ”اللہ اور رسول“ کی قرآنی اصطلاح کا یہ مفہوم میری اختراع نہیں۔ متقدمین اور متاخرین سب اس سے یہی مفہوم لیتے ہیں۔ اس مقام پر اس کی مختصر سی مزید وضاحت ضروری ہے۔ جب میں نے یہ مفہوم پیش کیا تو ہماری مذہبی پیشوائیت نے طوفان برپا کر دیا کہ یہ شخص اطاعتِ رسول کا منکر اور سنتِ رسول اللہ کا منحرف ہے۔ یہ طوفان اس حد تک بڑھایا گیا کہ قریب ایک ہزار ”علماء“ کی طرف سے میرے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ لیکن دیکھئے کہ اس باب میں خود یہ حضرات کیا کہتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر ”تفہیم القرآن“ میں اس آیت (۵۸) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ) میں، زمین سے مراد وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔۔۔۔۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی اور دہشتی کی حد تک ہو، یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی نامرد نظام کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔

(تفہیم القرآن - جلد اول - ص ۴۵ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک بات یہ حضرات کہیں تو عین مطابق اسلام، اور وہی بات ایسا شخص کہے جس کی مخالفت مقصود ہو تو وہ کفر، اور بے دینی! ان حضرات کی طرف سے کفر کے فتوے اس طرح صادر ہوتے ہیں:

اس آیت میں ”خدا اور رسول کے خلاف جنگ“ سے مراد تو اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ باقی رہا

”فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ“ تو اس میں ہر قسم کی قانون شکنی کی منظم سازشیں اور وارداتیں آ جاتی ہیں۔ (مرید تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان فساد دیکھئے)۔

اس آیت میں ان جرائم کی جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں، ان کے متعلق، ذرا آگے چل کر، آیت (۵۸) کے تحت بات کی جائے گی جہاں چوری کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں جس عفو، مغفرت اور رحمت کا ذکر آیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ دین میں سزا کا جذبہ محرکہ انتقام جوئی نہیں۔ اصلاح ہے۔ فرمایا:

الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرَ عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
[۵۸] غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

لیکن جو لوگ اس روش سے از خود باز آجائیں، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ، تو اس حقیقت کو فراموش نہ کرو۔ کہ قانون خداوندی کی رو سے ایسے لوگ سزا سے بھی محفوظ رکھے جاسکتے اور انہیں عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جاسکتا۔

نظام عدل و حکومت میں یہ اصول بڑا اہم ہے۔ یہی وہ گوشے ہیں جہاں اسلامی نظام منفرد حیثیت اختیار کر لیتا اور انسانی نظاموں سے متمیز اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

قانون کا تقاضا تو یہی ہے کہ مغلوب ہونے سے پہلے تائب ہو جانے والوں کو معاف کر دیا جائے۔ لیکن عفو کریمانہ اور بذل رحمانہ کا تقاضا کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ قریش مکہ نے بیس اکیس سال تک مسلسل حضورؐ کی شدید ترین مخالفت کی۔ آپؐ اور جماعت مومنین کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ سات برس تک متعدد دلائل بھی لڑیں۔ اس کے بعد وہ فتح مکہ کے دن مغلوب و مفتوح، پابجوالاں اور گردن نہادہ حضورؐ کے سامنے۔ قانون کا تقاضا تھا کہ انہیں سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ آپؐ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ بھی ادا شناس تھے۔ پکار اٹھے کہ وہی جو ایک شریف اور شریف زادہ کیا کرتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ ۖ إِذْ هَبُوا أَنْتُمْ اِطْلِقَا ۖ

تم سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ جاؤ۔ تم سب آزاد ہو۔

اتنا ہی نہیں۔ ان لوگوں نے مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ وقت تھا کہ کم از کم ان مکانات کو مہاجرین کو

واپس دلایا جائے۔ لیکن حضورؐ نے ہاجرین سے کہا کہ تم اپنی ملوکات سے دستبردار ہو جاؤ اور یہ مکانات انہی کے پاس رہنے دو!

بدلیا جاتا تو چند نفوس ختم ہو جاتے۔ عفو کریمانہ سے کام لیا تو وہی قریش کے افراد نہیں۔ قیامت ان کی نسلیں بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔

قرآن کریم نے ”مَا قَدْ سَلَفَ“ (جو کچھ پہلے ہو چکا) سے درگزر کرنے کی جو تعلیم دی ہے وہ اس کی کشادہ ظرفی کی زندہ شہادت ہے۔ اس کے ضابطہ قانون میں

انتقام نہیں۔ اصلاح

عدل کا مقصد انتقام جوئی نہیں، اصلاح ہے۔ اور جس قدر اصلاح کشادہ ظرفی اور وسعت قلب سے ہو سکتی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔



سرکشوں اور قانون شکنوں کے متعلق گفتگو کرنے کے فوری بعد، جماعت مومنین سے کہا گیا کہ تم اس باب میں

بڑی احتیاط برتنا۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا
فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

۵
۳۵

اے جماعت مومنین! دیکھنا کہیں تم نظام خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کر لینا۔ تمہارا فریضہ جیات یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس میں بلند ترین مقام اور مرتبہ حاصل کرنے کی تڑپ اپنے دل میں پیدا کرو۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے پوری پوری جدوجہد کرو۔ اس سے تم اس مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔

(”ضابطہ پہنچنے کے لئے انسانوں کو ”وسیلہ“ بنانے کا تصور غلط ہے۔ $\frac{2}{184}$ و $\frac{14}{52}$)!

آیت کا مفہوم تو واضح ہے لیکن اس کے ایک لفظ (وسیلہ) کے غلط مفہوم نے دین کی پوری کی پوری عمارت کو کس طرح منہدم کر کے رکھ دیا ہے! اسے مطالب الفرقان جلد سوم۔ (ص ۴۴۸ پر) بیان کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر آیت بھی وہاں درج ہے۔



جماعت مومنین کو اس تاکید کے بعد کہ وہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کریں، ان قوانین کی مخالفت کرنے

والوں کے متعلق کہا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ
 مَعَهُ لَيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَا تُقْبَلُ
 مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرِجُوا مِنَ
 النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝

۵
۳۷-۳۶

جو لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے، انہیں، آنے والے انقلاب میں، دردناک مراحل کر رہے گی۔ اگر ان کے پاس دنیا بھر کے خزانے اور ان کی مثل اور بھی ہوں اور وہ چاہیں کہ انہیں بطور فدیہ دے کر، اس تباہی اور بربادی سے بچ جائیں، تو ایسا ہونا ناممکن ہو گا۔ (کوئی شخص اپنے سرمایہ کے ذور پر، ان تباہیوں سے نہیں بچ سکتا جو ان لوگوں پر آتی ہیں جو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے نظام کے راستے میں روک بن کر بیٹھ جائیں)۔

اُس وقت ان کی وہ دولت جسے وہ نوع انسان کی خوش حالی کے لئے تقسیم نہیں کرتے تھے، ان کے لئے جہنم کا ایندھن بن جائے گی۔ (۳۵-۳۴)۔ اور یہ آگ ان کے دلوں کے اندر بھڑک رہی ہوگی (۱۰۴-۱۰۳)۔ اُس وقت وہ ہزار چاہیں کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے، ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ عذاب ان کے سر پر مسلط رہے گا۔ (۵۷)

یہاں کہا کہ یہ دولت تمہارے کام نہیں آئے گی، تو اس کے بعد جرم سرقہ (چوری) اور اس کی سزا کا ذکر کر کے بتایا کہ معاشرہ میں اس قسم کی بد نظمی بھی مطلوب نہیں کہ جو کسی کے جیب میں آئے اٹھا کر یا چیرا کر لے جائے۔ معاشرہ کا نظم و ضبط نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کہا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا
 كَسَبَانَا لَا مِنَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ
 مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
 رَحِيمٌ ۝ (۳۹-۳۸)

۵
۳۸-۳۷

عکس میں بغاوت میں بغاوت پھیلانے اور فساد برپا کرنے کے بعد، بڑا فتنہ چوری کا جرم ہے جس سے معاشرہ میں امن اور سکون باقی نہیں رہتا۔ چور، مرد ہو یا عورت، مجرم ہونے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اس لئے ان کی سزا میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس کے لئے ایسا طریق اختیار کرنا چاہیئے جس سے خود چور کے ہاتھ چوری

کرنے سے رک جائیں اور دوسروں کے لئے بھی، قانونِ خداوندی کی رو سے روک بن جائے۔ یعنی وہ مجرم کیلئے موجب اصلاح (CURATIVE) ہو اور دوسروں کے لئے مجرم سے اجتناب کا باعث (PREVENTIVE) لیکن اگر یہ دیکھو کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، اور یہ مجرم ہو رہا ہے، تو اس کی انتہائی سزا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ بہر حال، مقصد اس مجرم کی روک تھام ہے۔ خواہ غلبہ اور قوت سے ہو، خواہ حسن تدبیر سے۔ (عَنْزِیْرُ حَکِیْمٌ) میں دونوں باتیں آجاتی ہیں

جب ملک میں قرآن کا وہ معاشی نظام رائج ہو جس میں کسی شخص کی ضروریات زندگی رُک کی نہیں رہتیں، کیونکہ اُن کا پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتا ہے، تو جو شخص پھر بھی چوری کرتا ہے، وہ بڑے سنگین مجرم کا مرتکب ہوتا ہے) (۵/۳۸)

مقصد چونکہ مجرم کی روک تھام ہے، اس لئے جو شخص ارتکابِ جرم کے بعد اپنے لئے پرنام ہو، اور اپنی اصلاح کر لینے کا یقین دلائے تو قانونِ خداوندی میں اس کے لئے معافی کی نگاش رکھ دی گئی ہے۔ ایسے شخص کو سزا سے بھی محفوظ رکھا جائے گا۔ اور عام سہولتوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (۵/۳۹)

قرآن کریم کی رو سے مجرم اور سزا کے فلسفہ اور عدلی تفصیل کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ (ص ۱۴۱) پر بحث ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ حسب ذیل امور مزید قابلِ غور ہیں:

۱۔ قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا خود تجویز کی ہے، وہ حسب ذیل ہیں:-

جرائم اور ان کی سزائیں | ۱۔ جرم قتل۔ قصاص (۲/۱۷۸-۱۷۹) مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۱۴۸۔
قتل عمد قتل خطا۔ (۲/۹۳-۹۴)۔ زیر نظر جلد۔ چوتھا باب۔ (ص ۳۹۴-۳۹۵)

۲۔ بغاوت اور فساد (۵/۳۳)۔ سابقہ صفحات۔

۳۔ سرقہ۔ (۵/۳۸-۳۹) زیر نظر

۴۔ زنا۔ (۲۴/۲)۔ (اپنے مقام پر آئے گا)

۵۔ مبادیاتِ زنا۔ (۴/۱۵)۔ زیر نظر جلد۔ چوتھا باب۔ (ص ۳۱)

۶۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔ (۲۳/۶۱-۶۲)۔

۷۔ تہمت تراشی۔ (۲۴/۵-۶)

فقہ کی دوسے، قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے، اور جو سزائیں فقہ نے تجویز کی ہیں، انہیں تعزیرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلامی مملکت ”حدود“ کے متعلق ضروری شرائط تعین کرے گی، اور اپنے زمانہ اور معاشرہ کے حالات کے مطابق تعزیرات بھی وہی مقرر کرے گی۔ کسی زمانہ کی اسلامی مملکت کی مقرر کردہ شرائط یا تعزیرات آنے والی حکومت پر (BINDING) نہیں ہو سکتیں۔ ابدیت صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہے۔ انسانوں کے وضع یا مرتب کردہ قوانین کو نہیں۔ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ انہیں غیر متبدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔ قرآن کی مقرر کردہ سزاؤں (بلکہ احکام) کے متعلق اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی نظام میں نافذ ہونے کے لئے ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ یا نظام کے لئے نہیں۔ اگر ان سزاؤں کو غیر اسلامی معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو یہ (غیر مسلموں کے الفاظ میں) وحشیانہ نظر آئیں گی اور ممکن العمل بھی نہیں ہوں گی۔ اسی کا نہایت تلخ اور افسوسناک تجربہ ملک پاکستان میں کیا جا چکا ہے۔ اوائل ۱۹۷۹ء میں، حدود کے نام سے کچھ قوانین نافذ کئے گئے۔ اول تو وہ قوانین، قرآن کے مطابق نہیں تھے۔ وہ فقہی قوانین تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان پر عمل ہی نہ ہو سکا۔ اور غیر مسلموں (بلکہ خود ہماری اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ) کے دل میں یہ تاثر راسخ ہو گیا کہ اسلامی سزائیں وحشتناک بھی ہیں اور ناممکن العمل بھی۔ اس سے اسلام، دنیا میں جس قدر بدنام ہوا، ظاہر ہے غیر اسلامی معاشرہ میں (وہ خواہ مسلمان نام رکھنے والی قوم پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو) اسلامی قوانین (FIT IN) نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی غیر اسلامی مملکت میں ان قوانین کو اپنایا بھی جائے تو، انہیں اسلامی قوانین کہہ کر نہیں پکارنا چاہیے۔ اس مملکت کے قوانین کہنا چاہیے۔ اس سے اسلام بدنام نہیں ہوگا۔ اگر بھارت کی حکومت اپنے ہاں شراب کو ممنوع قرار دے دے تو اسے اسلامی قانون نہیں کہا جائے گا نہ وہ اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد، جرم سرقہ کی سزا کی طرف آئیے۔ آیت میں ”قطع ید“ آیا ہے جس کے عام معنی ”ہاتھ کاٹ دینا“ لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی ہر حالت میں یہ نہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لغت کی دوسے دیکھ لیا جائے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ میں نے اپنی لغات میں (مادہ - ق - ط - ع - کے تحت) جو کچھ لکھا ہے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے :

قطع ید کے معنی | قَطَعَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے قَطَعَ اللَّحْمَ۔ گوشت کاٹنا۔

اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِيلَ۔ ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا۔ قَطَعَ لِسَانَهُ۔ کسی پر احسان کر کے اس کی زبان بند کر دینے کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يُوْصَلَ رِجْلًا میں، یہی معنوی القطار مراد ہے۔ یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملائے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ نوبع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

قَطَعَ خَصْمَهُ بِالْحَجَّةِ۔ اس نے دلائل و براہین سے فریقِ مقابل کو لاجواب کر دیا۔ قَطَعَ رَحِمَهُ قَطِيعَةً۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے۔ چنانچہ اُقْطِلُوْا عَنَّا اس چیز کو کہتے ہیں جو قطعِ تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس)۔ قَطَعَ عُنُقَ دَابَّةٍ کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا۔ بلکہ مجازاً اس کے) معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا۔ قُطِعَتْ لِسَانُهُ، کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ قُطِعَتْ يَدُهُ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ بیکار ہو گیا۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قُطِعْنَ أَيْدِيَهُنَّ (۱۲) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر الگ کر کے پھینک دیئے۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رُک گئے۔ (یا فوط حیرت میں انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے)۔ اسی طرح قُطَّاعُ الطَّرِيقِ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے (قوم لوط کے ضمن میں) اِسے قَطَعَ السَّبِيلِ کہا ہے (۲۹)۔ یا اس آیت میں تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ کے معنی ہیں خلاف وضعِ فطری سے افزائشِ نسل انسانی کے راستے بند کر دینا۔ قُطِعَ بَدَنُ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی۔ وہ مایوس ہو گیا۔

قَطَعَ مِنَ اللَّيْلِ۔ سے مراد رات کا حصہ ہے جو شروعِ رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں (دیکھئے ۱۱)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے۔

قُطِعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی ناامید ہو گیا اور عاجز رہ گیا۔ قَطَعَ الْأَمْرَ کے معنی ہیں کسی بات کی آخری فیصلہ کرنا۔

۱۔ تاج۔ ۲۔ غزوہ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو پالیس اونٹ دیئے۔ وہ بہت غصہ ہوا اور ایک قصبہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپؐ نے فرمایا جادو اور جس طرح ہو میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہؓ گئے اور وہ جتنے میں راضی ہوا اُسے دے کر راضی کر لیا۔ یہ تھا مطلب قطعِ لسان کا۔

اسی سے آیت (۲۴) میں ہے مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا - میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں
 سورۃ المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَا قُطِعُوا أَيْدِيَهُمْ جِسْمِ كَيْفَ مَعْنَى عام طور پر یہ لے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر انکے دو۔ لیکن لفظ قُطِعُوا اور قُطِعَ يَدُ کے مذکورہ صدر معانی کے پیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کر جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی ماندہ کڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے "جَنَاحَ بَعَا كَسْبًا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ (۵۸)۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانونِ خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک ہے۔ (نِكَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن - ک - ل)۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ اس لئے کہ اس سے آگے فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ (۵۸)۔ اور جو مجرم ارتکابِ جرم کے بعد شیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اسے قانونِ خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی پیشینانی اور اصلاح کرنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی۔ لیکن اگر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اسے معافی مل جانے سے کیا حاصل ہو گا؟ اور اگر اُبْدِی کے معنی اختیار اور مقدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی - د - ی) تو قطعِ بید کے معنی ہوں گے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے۔ اس میں چوری کے علاوہ ہر قسم کی خیانت بھی آجاتی ہے۔

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد تائب ہو جائے اور اپنی اصلاح کا عزم کر لے، اسے معاف کر دیا جائے تو اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس جرم کی انتہائی سزا (اگر دی جانی بھی مقصود ہو۔ یعنی ہاتھ کاٹ دینا) تو وہ عادی مجرم کے لئے ہوگی۔ اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا
 لِدُنُوبِهِمْ تَفٍّ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ تَتَّ وَلَسَّمْ يُصِرُّوا عَلَى
 مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۳۵)

اگر ان سے کبھی (غلطی سے) کہنی معیوب حرکت سرزد ہو جاتی ہے، یا وہ

اپنے آپ پر (یا ایک دوسرے پر) زیادتی کر بیٹھتے ہیں، تو اُس پر جان

یہ عادی مجرم کی سزا ہے

بوجہ کر، اہل راہ نہیں کرتے، بلکہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے آتے ہیں، اور اُس کے مطابق، اپنی اصلاح

کر کے، اپنی غلطی کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان طلب کر لیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غلط

اقدامات کے مضرتوں سے، قانون خداوندی کے علاوہ، اور کہاں سے حفاظت مل سکتی ہے؟
جو عادی مجرم نہ ہوں ان کے متعلق کہا ہے۔ اُولَٰئِكَ جَزَاءُ هُمْ مَغْفِرَةٌ مِّن سَرِّبِهِمْ...
(۳۴) ”انہیں معافی مل سکتی ہے“

لیکن اس باب میں اول اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس جرم کا ارتکاب اسلامی معاشرہ میں ہو۔ جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہو، جس میں کوئی فرد اپنی (اور اپنی اولاد کی) ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا، کیونکہ ان کا پورا کرنا صرف اسلامی معاشرہ میں

سنگین جرم کا مرتکب ہونا ہے اور سخت سزا کا مستحق۔ لیکن جب معاشرہ کی حالت یہ نہ ہو، تو پھر چوری ایسا سنگین جرم قرار نہیں پاسکتی۔ اس کی تائید میں صدر اول کی تاریخ میں نظائر ملتے ہیں مثلاً
۱۔ روایات میں کہ حضورؐ نے چوری کے جرم کی سزا کے طور پر مجرم کے ہاتھ

نہیں کاٹے۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں یہاں تک آیا ہے کہ ایک مجرم نے چار مرتبہ ارتکاب جرم کیا لیکن حضورؐ نے درگزر فرمایا۔ نظر آتا ہے کہ حضورؐ نے یہ فیصلے بہ تقاضائے حالات کئے ہونگے۔
۲۔ عہد فاروقی میں (حضرت) عاصم بن ابی بلتعہؓ کے غلاموں کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ عاصم ہم سے کام سنت لیتا ہے۔ لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپؐ نے ان غلاموں کو تو معاف کر دیا۔ اور عاصم کو بلا کر کہا کہ چاہیے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا تمہیں دی جائے کیونکہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں، تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کئے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔
(شاہکار رسالت، ص ۲۵)

لے ظہور اسلام کے بعد ان (سابقہ) غلاموں کی پوزیشن لازموں کی سی ہو گئی تھی لیکن تاریخ میں انہیں غلام کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔

۳۔ اسی قسم کے فیصلوں کی روشنی میں بعض فقہاء (TURISTS) نے قوانین وضع کئے تھے کہ اضطراری (مجبوری) کی حالت میں، چوری مستوجب سزا نہیں ہوتی۔ (مثلاً) امام ابن حزمؒ (وفات ۴۵۶ھ) اندلس کے مشہور محدث اور فقیہ ہیں اور الحلیؒ ان کی بڑی مستند کتاب۔ اس میں وہ پہلے لکھتے ہیں کہ:

امام ابن حزم کا مسلک

فقہاء کا قول ہے کہ اگر کوئی پیاسا ہے اور اسے موت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں پانی چاہے چھین کر پی لے، اگرچہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔
فقہاء کے اسی فیصلے سے استنباط کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:
پھر اس میں کیا فرق ہے کہ پیاس کی وجہ سے موت سے بچنے کے لئے جنگ کو جائز قرار دیا جائے، اور بھوک اور عریانی کے سبب موت سے بچنے کے لئے جنگ سے منع کیا جائے، حالانکہ ذمیت دونوں کی ایک جیسی ہے۔
اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ:

مضطر (یعنی جو بھوک، پیاس کی وجہ سے مجبور ہو جائے) کو مقاتلہ کا حق حاصل ہے اور مقاتلہ میں اگر وہ مارا جائے تو حق روکنے والے پر اس کا خون بہا لازم آجائے گا۔ لیکن اگر وہ روکنے والا مارا جائے تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی اس لئے کہ کسی کے حق کو روکنے والا حقیقت بفاوت کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ (شاہکار رسالت - ص ۳۶)

ان کی دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں حرام چیزوں تک کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ (۵۱)۔ تاکہ اس سے مضطر کی جان بچ جائے۔ سو، اگر ایسے حالات میں حرام تک کھانے کی اجازت ہے، تو چوری کے جان بچا لینا جرم کیسے قرار دیا جائے؟ ہم فقہاء کے ان فیصلوں پر حاکم نہیں کرنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ حالات سے مشروط ہیں اور صرف اسلامی معاشرہ میں نافذ کی جاسکتی ہیں۔ اگر غیر اسلامی معاشرہ میں قانون کے ڈنڈے سے اس قسم کی واردات کو روکنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے معاشرہ میں انار کی پھیل جائے حضور نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں اس طرف بڑا لطیف اشارہ پایا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

کشتی والوں کی مثال

کچھ لوگ ایک سفر میں کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے کچھ نچلے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔

اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر، اس سے باز رکھا جائے

تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر پانی دسے دبا تو سب بچ جائیں گے۔

(ترمذی - جلد دوم - البواب فتن)

جرائم کو روکنے کا روکنے یہ صحیح طریقہ ہے۔ سزا کا سوال اس وقت پیدا ہو گا جب کشتی میں نیچے والے، پانی مل جانے کے باوجود کشتی میں جمید کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت ان کے ہاتھ روکنے کو کون ظلم اور زیادتی سے تعبیر کرے گا؟ آیت (۳۸) میں نَكَالًا مِنَ اللَّهِ سے مراد ایسی تدابیر ہیں جو ارتکاب جرم میں روک بن جائیں۔ اور آیت کے آخر میں ”عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا علاج قوت (عزیز) ہی نہیں۔ حکمت (حکیم) بھی ہے۔ اور اپنے کئے پر نادم ہو جانے والے کے لئے غفور اور رحیم بھی۔ واضح رہے کہ آیات کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات آتی ہیں، وہ (معاذ اللہ) شر کی ردیف اور کافیہ نہیں ہوتیں۔ ان میں اہم نکات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لہذا قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے معاشرہ یا نظام کو اسلامی بنائیے اور پھر اس میں تعزیری احکام نافذ کیجیے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں تعزیری احکام کی تنفیذ سیکور ازم ہوگی خواہ وہ احکام اسلامی احکام کے مشابہ بھی کیوں نہ ہوں۔



ہم نے آیت (۳۸) کے ضمن میں کہا تھا کہ اس کی تشریح آیت (۳۸) کے تابع سامنے آجائے گی۔ گزشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اطلاق جرم بغاوت اور فسادِ دینی الارض پر بھی ہوتا ہے اس میں بلکہ چار متبادل سزاؤں کا ذکر ہے۔ قتل۔ تعصیب۔ قطع دست و پا اور قید یا جلا وطنی۔ متبادل سزاؤں سے مراد یہ ہے کہ جس قسم کے حالات ہوں، عدالت (یا اسلامی نظام) اس قسم کی سزا نافذ کر سکتا ہے۔ حالات تو ایک طرف، قرآن کریم تو سزا تجویز کرتے وقت، ملزم کی ذہنی کیفیت، تعلیم، تربیت، تمدنی حالات کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اس نے آزاد عورتوں کے جرم زنا کی سزا ”سوکوڑے“ تجویز کی ہے (۲۴) یکس لونڈیوں کی سزا اس سے نصف مقرر کی گئی ہے (۲۵)۔ اور اگر (بفرض محال) نبی کی بیویوں (یا اہل خانہ) سے اس جرم کا ارتکاب ہو تو اس کی سزا گنتی (۳۳)۔ قرآنی سزاؤں کے متعلق گفتگو کرتے وقت، ان تمام امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(ضمناً) جرم بغاوت کی سزا میں قید یا جلا وطنی بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر بغاوت جیسے سنگین جرم کی سزا بہر حال ”ہاتھ پاؤں کاٹ دینا“ نہیں۔ بعض حالات میں قید کی سزا بھی کافی سمجھی جاسکتی ہے، تو چوری کے جرم کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جائے کہ اس کی سزا، قطعید کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتی۔ ان امور کے فیصلے اسلامی مملکت کی صوابدید پر چھوڑے جاتے ہیں کہ قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، حالات کے مطابق، قوانین وضع کرے۔

”سرقہ“ کی قانونی تعریف (DEFINITION) بھی وہی متعین کرے گی۔ یعنی کوئی واردات قانون کی رو سے کب سرقہ کہلائے گی۔ قرآن نے اسے بھی غیر متعین رکھا ہے۔

اہم نے اوپر کہا ہے کہ جرم سرقہ سے متعلق آیت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ایسے اقدامات سے مقصود، قوت اور غلبہ کی نمود نہیں، اس کا ایک اہم گوشہ حکمت

انسداد جرائم میں حکمت

بھی ہے۔ اس کی وضاحت قرآن کریم نے نہایت بلیغ انداز میں کر دی جہاں کہا کہ :

۵
۳۱. اَلَمْ تَعْلَمَ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طِيعِذِبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

یاد رکھو! مجرم کو سزا دے کر خدا اپنی قوت و جبروت کا سکہ دلوں پر بٹھانا نہیں چاہتا۔ اُس کی قوت اور اقتدار کی زندہ شہادت تو یہ پوری کارکردہ کائنات ہے جو اُس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سرگرم عمل ہے۔ تعزیری قانون سے مقصد یہ ہے کہ جو شخص ارتکابِ جرم سے خود اپنے آپ کو سزا کا مستوجب قرار دے لے اُسے اُس کے کئے کا بدلہ مل جائے۔ جو امن پسند ہونے کی ضمانت دے دے، اُس کی حفاظت کر دی جائے۔ نظامِ خداوندی میں (خواہ وہ خارجی کائنات میں ہو یا انسانوں کی دنیا میں) ہر عمل ایک خاص پیمانے کے مطابق نتیجہ مرتب کرتا ہے

جس پر خدا کو پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ (۵)

”يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ“ کے مفہوم کے لئے اندکس میں تقدیر کا عنوان

دیکھئے۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم کو سزا خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ سابقہ آیت میں ”جَزَاءُ عَمَلِكُمْ“ سے یہ واضح کر دیا کہ ایسا کچھ مجرم کے ارتکابِ جرم کا نتیجہ ہوگا۔



ان احکام کے بعد قرآن کریم اُس موضوع کی طرف لوٹ گیا جو پہلے چلا آ رہا تھا۔ یعنی یہودیوں کی منافقانہ

سازشیں۔ فرمایا :

۵
۳۱. يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ سَمِعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمْعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۚ لَمْ يَأْتُوْكَ بِحَرٍّ فَوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيتُمْ هٰذَا

فَخَذُوهُ وَإِنْ لَّمْ تَوْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ط وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ
تَمْلِكَ لَهُ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا ط أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ
يُطَهِّرْ قُلُوبَهُمْ ط لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ط وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۵)

ان فتنی احکام کے بعد اسے رسول! پھر اسی موضوع کی طرف آؤ جس کا ذکر پہلے کیا جا رہا تھا۔ یعنی منافقین اور یہود کی تخریبی ذہنیت کی طرف۔ منافقین زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، لیکن وہ دل سے مومن نہیں ہوتے یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ وہ تمہاری مجلسوں میں آتے ہیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ جو کچھ یہاں بیان کیا جاتا ہے دل گئے کانوں سے سن رہے ہیں، لیکن درحقیقت وہ جھوٹ موٹ کے کان لگائے رہتے ہیں۔ ان کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ ان کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہاں سے اٹھ کر اپنے ان ساتھیوں کے پاس جائیں جو یہاں نہیں آتے، اور جو کچھ یہاں سنا ہو، اس میں جھوٹ سچ ملا کر، اور بات کو کچھ سے کچھ بنا کر، انہیں سنائیں۔ اس کے بعد، یہ ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر رسول وہی باتیں کہے جو ہم نے تم سے بیان کی ہیں تو اسکی بات مانو۔ اور اگر اس کے خلاف کچھ کہے تو اسے ہرگز قبول نہ کرو۔ ان دونوں گروہوں کی یہ حالت ہے کہ بظاہر دیکھنے والا یہ سمجھے گا کہ ان کی رغبت ایمان کی طرف ہے، لیکن درحقیقت یہ کفر کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ ان کی تو یہ حالت ہے اور تم (اے رسول!) اس غم میں گھلے جا رہے ہو کہ یہ تباہ اور برباد نہ ہو جائیں (۱۶) ذ ۲۶ (۲۵)۔ تم سوچو کہ جو شخص خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق خود اپنی پیدا کردہ مصیبت میں مبتلا رہنا چاہیے تم، اس قانون کے علی الرغم اس کے لئے کیا کر سکتے ہو؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کے دل اس قسم کے خیالات سے، پاک اور صاف نہیں ہو سکتے۔ وہ ان خیالات کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لئے اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی کا عذاب ہے اور آخرت میں بھی سخت مصیبت کا سامنا۔

یہاں جو رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کی اس قسم کی حرکات سے تم افسردہ خاطر نہ ہو جانا، تو اس سے حضور کو کسی قسم کی تسلی دینا مقصود نہیں تھا کہ آپ هجومِ مخالفت سے تنگ آکر کہیں اپنا مشن نہ چھوڑ بیٹھیں قطعاً یہ مقصود نہیں تھا۔ رسول کسی حالت میں بھی اپنا مشن نہیں چھوڑا کرتے تھے۔

بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضور بڑے رفیق القلب تھے (۳۱) (۱۵۸)۔

آپ دلیگیر نہ ہوں | آپ دیکھتے تھے کہ خدائی راہنمائی کی مخالفت کرنے والے، اپنی غلط روش سے تباہی اور بربادی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس احساس سے کہ یہ لوگ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں، ایک مشفق طبیب کی طرح آپ بڑے دلیگیر ہوتے تھے۔ [دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص ۳۳۴ (۳۵)] ایسے مقامات پر آپ سے یہ کہا جاتا تھا کہ آپ کا فریضہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ انہیں زبردستی راہِ راست پر چلا دینا نہیں۔ اگر یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تو آپ اس قدر غمزدہ کیوں ہوتے ہیں۔ آیت میں خود یہ الفاظ کہ ”الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ“ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان لوگوں کا تباہی کے راستے پر اندھا دھند چلے جانا، حضور کے لئے وجہِ مخمردنی اور باعثِ افسردگی ہوتا تھا۔

منافقت کفر ہے | اس آیت میں کفر کی ایسی شکل سامنے لائی گئی ہے جو خود ہمارے لئے بڑی غور طلب ہے۔ وہ شکل یہ ہے کہ زبان سے ایمان کا اقرار کرنا لیکن دل اس کی صداقت کو تسلیم نہ کرنا۔ غور کیجئے کہ ہم مسلمانوں کی بعینہ یہی حالت نہیں؟ ایمان تو دل اور زبان کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اور اس ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم زبان سے کہیں ہمارے اعمال، ہماری زندگی اس کی شہادت دے۔ یعنی ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہو۔ اگر ایسا نہیں تو یہ منافقت ہے جسے قرآن نے کفر کہہ کر پکارا ہے۔ (انڈکس میں عنوان منافقت دیکھئے)۔ قرآن کریم نے تو ان اعراب (بدوؤں) سے کہہ دیا تھا جو تازہ تازہ ایمان لائے تھے تم یہ نہ کہو کہ اَمَنَّا (ہم ایمان لے آئے ہیں)۔ تم مردست یہی کہو کہ ہم نے اس نظام کی بڑائی تسلیم کر لی ہے۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (۴۹)۔ ایمان ابھی تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ جب وہ تمہارے دل میں جا گریں ہو جائے گا، تب اپنے آپ کو مومن کہنا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایمان کا ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُترنا تو کجا، ہم رسماً بھی ایمان نہیں لائے۔ ہم محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مسلمان رہا ایمان والے) کہلاتے ہیں۔

اس آیت میں تحریف کی جو شکل سامنے لائی گئی ہے، وہ بھی غور طلب ہے۔ کہا گیا ہے کہ ”يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ“ یہ الفاظ (۲۴) میں بھی آئے ہیں اور (۵) میں بھی۔ یہود وغیرہ اپنی کتابوں میں جس قسم کی تحریف کیا کرتے تھے اس کی ایک شکل تو یہ تھی کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۲) تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب۔ جلد دوم۔ ص ۱۸۳)۔

تحریف کی ایک اور شکل

یعنی وہ اپنی آسمانی کتاب کے الفاظ ہی بدل ڈالتے تھے۔ اسی کی دوسری شکل یہ تھی کہ کتاب کا مفہوم بدل دیتے تھے۔ الفاظ اپنا صحیح مفہوم اسی صورت میں ادا کرتے ہیں جب انہیں ان کے اصلی مقام (CONTEXT) میں رکھ کر اس کا مطلب سمجھا جائے۔ اگر انہیں اس (CONTEXT) سے الگ کر دیا جائے تو عبارت کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ یہ تحریف کی نہایت خطرناک شکل اور فریب کا بدترین حربہ ہے۔ الفاظ بدل دیئے جائیں تو تحریف ظاہر ہو جاتی ہے لیکن اگر الفاظ اسی طرح رہنے دیئے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے تو اس تحریف کو مشکل پکڑا جاسکتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متن قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود دیا۔ اس لئے اس میں لفظی تحریف تو ممکن نہیں تھی۔ لیکن الفاظ قرآن کو ان کے ضیع سے ہٹا کر جو تفسیریں مرتب ہوئیں، ان سے قرآن کا مفہوم ہی بدل گیا۔ ہمارے ہاں کی عام تفسیروں کی یہی کیفیت ہے۔ قرآن کریم نے تعریف آیات سے اپنا مفہوم خود واضح کیا ہے۔ قرآنی الفاظ اور آیات کا جو مفہوم اس طرح متعین کیا جائے گا وہی قرآن کے مطابق ہوگا۔ (میں نے مفہوم القرآن اور اپنی دیگر تصانیف میں قرآنی مفہوم کے سمجھنے اور سمجھانے کا یہی طریق اختیار کیا ہے) اس کے بعد کہا۔

سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَلُونَ لِلسُّحْتِ ط فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ج وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَفْعَلُوا شَيْئًا ط وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ (۵۴)

اُن کا جرم بھی تو کچھ کم نہیں۔ یہ لوگ تیری باتیں سننے کے لئے آتے ہی اس لئے ہیں کہ ان میں جھوٹ ملا کر باہر بیان کریں اور اس قسم کی غلط بیانیوں سے، دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھاتے رہیں۔ (یہ ان کے مذہبی پیشواؤں کا حال ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ یہ، اپنے ہم مذہبوں کے معاملات کے فیصلے، اپنی شریعت کے مطابق کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ دیکھیں کہ کس معاملے میں ان کی شریعت کا حکم سخت ہے، تو یہ، فریق متعلقہ سے کچھ لے لو اگر اس سے کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنا مقدمہ مسلمانوں کی عدالت میں لے جاؤ۔ وہاں سے فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا)۔

لہذا، اگر یہ لوگ تیرے پاس اپنے مقدمات لے کر آئیں تو تجھ پر اس کی کوئی پابندی نہیں کہ تو ضرور ان کا مقدمہ منے۔ تمہارا جی چاہے تو ان کا مقدمہ من لو یا ان سے کہہ دو کہ جن معاملات میں تمہارے مذہبی پیشوا

فیصلہ دینے کے مجاز ہیں (جیسا کہ اسلامی مملکت میں شخصی معاملات میں، غیر مسلموں کو اختیار دے دیا جاتا ہے) اُن میں ان سے فیصلہ کراؤ۔ ایسا کہنے میں کوئی ہرج اور نقصان کی بات نہیں۔ لیکن جب ان کا مقدمہ سُنو تو (جیسا کہ تمہارے ہاں مسلمہ اصول ہے) ان کا فیصلہ عدل و انصاف سے کرو۔ اس لئے کہ عدل و انصاف سے کام لینے والے ہی خدا کے ہاں پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔

یہودیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”اَكْلُوْنَ لِلسُّحْتِ“ (نیز ۵۳/۶۲)۔ سُّحْتِ یوں تو ہر ناجائز، حرام کمائی کو کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا ہے۔ یہودی من حیث القوم سود خوار تھے سرمایہ داری ان کا مسلک تھا۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ عوام کی کمائی باطل طریق سے کھا جاتے تھے۔ (۹۴/۹)۔ باطل کے معنی ہیں تخریبی کام، برعکس حق کے جو تعمیری کاموں کی بنیاد ہوتا ہے۔ سُّحْتِ کے سلسلے میں، ”اَسْرَضُ سُّحْتًا“ اس زمین

سُحْتِ حرام ہے

کو کہتے تھے جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ سرمایہ دار ہوں یا مذہبی پیشوائیت، ان کے کاروبار حیات میں پیداؤش (PRODUCTION) کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ محنت کی کمائی جس سے کچھ پیدا ہوتا ہے، دوسرے کرتے ہیں، اور سرمایہ دار اور مذہبی پیشوائیت، کچھ پیدا کئے بغیر ان لوگوں کی محنت کی کمائی کھا جاتے ہیں۔ یہ ہے سُّحْتِ جسے قرآن کریم نے رزقِ حرام قرار دیا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان (یہودیوں) کے پاس اپنی (مبینہ) آسمانی کتاب (تورات) موجود ہے۔ انہیں اپنے معاملات کا فیصلہ اس کے مطابق کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ تورات کا فیصلہ ان کے خلاف جاتا ہے یا انہیں قابل قبول نہیں، تو یہ اس کے فیصلہ کے لئے رسول اللہ کے پاس آ جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہوتا ہے اسلام میں فیصلوں کا ضابطہ صرف خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے اس کے

خارج از قرآن انتخابی کے فیصلے

فیصلے سخت ہوں یا نرم، کسی کے لئے خوش آئند ہوں یا ناپسند۔ مسلمان کو انہیں قبول کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے ایک اور راستہ تلاش کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے معاملات کے فیصلے قرآن کی رو سے نہیں، روایات اور فقہ کی رو سے ہوں گے۔ (دیکھئے مطالب - جلد سوم - ص ۱۲۵)۔ پھر فقہ میں بھی بیآسانی پیدا کر دی ہے کہ اگر کسی ایک مقام کی فقہ کا فیصلہ سخت، فلبذہ، ناقابل قبول ہو، تو کسی دوسرے

امام کی فقہ کا فیصلہ حاصل کر لینا چاہیے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہم کس طرح قدم بقدم، سابقہ اہل کتاب کے رشتوں پر چل رہے ہیں۔



انگلی آیت میں کہا کہ :

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوكُنَا وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمٌ
اللَّهُ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ طَوْماً أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝

(۵/۴۳)

ذرا سوچ کر جیب ان کے پاس تورات موجود ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس میں احکام خداوندی درج ہیں۔ تو اسے چھوڑ کر، اپنے مقدمات تیرے پاس کیوں لے کر آتے ہیں، بات صاف ہے کہ ان لوگوں کا ایمان کسی چیز پر بھی نہیں۔ ان کا ایمان مصلحت بینی اور مفاد پرستی پر ہے۔ جب دیکھا کہ تورات کا حکم ان کے منشاء کے مطابق ہے، اس پر عمل کرتے رہے۔ جس معاملے میں اسے اپنے خلاف پایا، اسے منہ موڑ کر تمہاری طرف رخ کر دیا۔

تورات کی تاریخ، مطالب۔ جلد دوم (صفحہ ۸۴) بیان کی جا چکی ہے۔ اس سے (اور قرآن کریم کی شہادت کی رو سے) یہ واضح ہے کہ یہودیوں کے پاس وہ کتابیں جو ان کے انبیاء کرام کے تحت نازل ہوئی تھیں، اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھیں۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ ”فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ“ تو یہ یہودیوں کے خلاف ایک قسم کی تعریف ہے یعنی ان سے جب کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لاؤ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ جب خود ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے تو ہمیں کسی دوسری کتاب پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر تمہارے پاس فی الواقعہ احکام خداوندی موجود ہیں تو تم اپنے معاملات کے فیصلوں کے لئے اس رسول کے پاس کیوں آتے ہو جس کی رسالت کو تم تسلیم نہیں کرتے؟ یہ دین نہیں۔ مصلحت بینی ہے۔ منافقت ہے۔

اصلی تورات میں واقعی احکام خداوندی تھے۔ اس میں نور بھی تھا اور ہدایت بھی۔ انبیاء بنی اسرائیل اور ان کے متبع، یہودیوں کے علماء اور مشائخ اسی کے مطابق معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يُحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ
الَّذِينَ اسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا

(۵/۴۴)

اَسْتَحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شٰهَدًا ؕ فَلَا تَخْشَوْنَ
النَّاسَ وَ اَخْشَوْنَ اللّٰهَ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ
بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

دینی (یعنی قانونِ خداوندی) کی سرگزشت یہ ہے کہ ہم نے تورات نازل کی (جو ان مختلف صحف کا مجموعہ ہے جو انبیاء بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے) (۹۰-۸۷)۔ اس میں (ہر آسمانی کتاب کی طرح) صیح راستے کی طرف راہنمائی اور روشنی تھی۔ ان کے انبیاء جو سب کے سب مسلم تھے (یعنی قانونِ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے والے) ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ، جو اپنے آپ کو یہودی کہتے تھے (حالانکہ انہیں بھی اپنے آپ کو مسلم ہی کہنا چاہیے تھا) اسی ”نورِ ہدایت“ کے مطابق کرتے تھے۔ اور ان کے علماء و مشائخ (نبی صحف کے مطابق احکام دیتے تھے جو ان کے انبیاء کی طرف نازل کئے گئے تھے اور جن کا انہیں (علماء و مشائخ کو) محافظ ٹھہرایا گیا تھا۔ اور وہ ان کے نگہبان بننے کے مدعی بھی تھے۔ ان سے خاص طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ تمام امور کے فیصلے انہی ضوابط کے مطابق کیا کرو اور لوگوں سے مت ڈرو، ڈرو صرف قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے اور قانونِ فروشی کی دکان مت لگا بیٹھو۔ یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا مدعی بھی کیوں نہ ہو۔ کافر و مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے، اور حکومت بھی وہی اسلامی کہلا سکتی ہے جو اپنا تمام کاروبار کتابِ خداوندی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے۔ (۲۶-۲۷)

اس میں دو تین نکات غور طلب ہیں۔ یہودیوں نے جس قدر حضور کی مخالفت کی اور جس قدر نکالیت پہنچائیں، قرآنی تصریحات اس پر شاہد ہیں۔ مدینہ میں مسلسل منافقانہ جدوجہد کے بعد، خیبر وغیرہ کی لڑائیوں تک نوبت پہنچ گئی۔ لیکن جب ان کی کتاب کا ذکر آیا تو قرآن نے انتہائی وسعت قلب اور کشادگی نگاہ سے، اس کا ذکر بھی انہی تحسین آفرین الفاظ میں کیا جن الفاظ سے خود قرآن کا تعارف کرایا تھا۔ ————— فِيْهَا هٰدًى وَ نُوْرٌ —————

لیکن من حیث الکل یہ خصوصیات حقیقی اور اصلی تورات کی تھیں۔ جو تورات، نزولِ قرآن کے وقت ان کے پاس تھی اسے قرآن کریم نے محرف قرار دیا ہے۔ (دیکھئے مطالب - جلد دوم - ص ۸۳-۸۴) اس محرف تورات میں بھی بہر حال کچھ ایسے احکام موجود تھے جو غیر محرف تھے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ (جیسا کہ مطالب - جلد دوم - ص ۲۶۵ میں) بیان کیا جا چکا ہے، مرزا غلام احمد کے

متبعین اپنے بانی مذہب کے باطل دعویٰ ثبوت کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے ہیں کہ نبی بلا کتاب آتا ہے اور (برزعم خویش) اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل، تورات کی رو سے احکام نافذ کیا کرتے تھے (۵۴)۔ اس کے معنی (بقول ان کے) یہ ہیں کہ ان انبیاء کو الگ الگ کتابیں نہیں دی گئی تھیں۔ وہ اسی کتاب کی شریعت نافذ کرتے تھے جو حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔

یہ ان کی بنیادی غلط فہمی یا مغالطہ آفرینی ہے۔ جیسا کہ تورات کی تاریخ میں

”احمدیوں کی مغالطہ آفرینی“

بتایا جا چکا ہے (دیکھئے مطالب - جلد دوم ص ۱۸۴)۔ تورات اس کتاب کا نام نہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام کتابوں کا جو حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک کے انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں۔ آپ مروجہ بائبل کو دیکھئے۔ اس میں عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) میں ان تمام انبیاء کی کتابیں شامل ہیں۔ اسی بائبل (عہد نامہ عتیق) کو تورات کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لہذا قرآن مجید کی اس آیت (۵۴) کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی اپنی کتابوں کے مطابق شریعت نافذ کرتے تھے۔ ان کتابوں کے مجموعہ کو بائبل (عہد نامہ عتیق) یا تورات کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں آیا کہ تورات حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ تورات میں صحیفہ موسیٰؑ (۵۳) بھی شامل ہیں اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے بھی۔

اس کے بعد وہ اعلانِ عظیم آتا ہے جو دین کی اصل اور بنیاد ہے۔ آج ہمارے ہاں (پاکستان میں) اسلامی مملکت۔ اسلامی مملکت۔ اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین وغیرہ اصطلاحات کا بڑا چرچا ہے۔ چرچا تو ان کا اس قدر ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اسلامی کہنے کسے ہیں اور اسلامی اور غیر اسلامی میں خط امتیاز کیا ہے۔ یعنی جب کسی بات کے متعلق کہا جائے کہ وہ اسلامی ہے تو یہ کیسے معلوم اور متعین کیا جائے کہ وہ فی الواقعہ اسلامی ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اور کفر میں حد تفریق کیا ہے؟

یہاں تو کوئی نہیں بتاتا۔ لیکن قرآن کریم نے ایک آیت کے چند لفظوں میں ساری بات واضح کر دی جب کہا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝

جو لوگ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

۵
۴۴

یعنی کفر اور اسلام میں حد فاصل خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے یہی واحد معیار ہے جس کی رو سے متعین کیا جاسکتا ہے کہ فلاں مملکت۔ حکومت۔

کفر اور اسلام میں حد فاصل

نظام۔ قانون۔ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اگر وہ قرآن کے مطابق ہو تو اسلامی ہے۔ اگر قرآن سے ٹکراتا ہے تو غیر اسلامی

(کافران) ہے۔ یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ نے معیار صرف کتاب اللہ کو قرار دیا ہے۔ خارج از قرآن کسی چیز کو نہیں۔ اس کی وضاحت مطالب الفرقان - جلد سوم - صفحہ ۱ پر کی جا چکی ہے۔ ایک نظر دیکھ لیجئے۔

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ ”اسلامی - اسلامی“ کے اس قدر چرچا کرنے کے باوجود، یہ کیوں نہیں بتایا جاتا کہ اسلامی کسے کہتے ہیں؟ اس لئے کہ صدر اول کے بعد سے آج تک، قرآن کریم کو کبھی اور کہیں بھی حکم نہیں تسلیم کیا گیا۔ اسلامی اور غیر اسلامی کے معیار غیر از قرآن عناصر (روایات اور فقہ) کو قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر، ہماری تاریخ میں (صدر اول کے بعد) نہ کہیں اسلامی مملکت قائم ہوئی ہے نہ اسلامی احکام نافذ۔ اسلامی مملکت وہی قرار پائے گی جس میں تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کی رو سے ہونگے۔ خالص کتاب اللہ کی رو سے۔

آیت (۵۴) میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اگلی آیت (۵۵) میں کہا گیا ہے کہ وہ ظالم ہیں اور آیت (۵۶) میں یہ کہ وہ لوگ فاسق ہیں۔ لہذا، جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں اور کافر ہیں۔

خود فریبی میں مبتلا یا مغالطہ آفرینی کے مرکب حضرات، عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ یہ آیات سابقہ اہل کتاب سے متعلق ہیں۔ ہم سے نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین، اصولی طور پر شروع سے غیر تک ایک ہی رہا ہے۔ (مطالب الفرقان - جلد سوم - صفحہ ۱) اور دین کا اصل الاصول، خدا کی حاکمیت ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، اس کی کتاب کی حکمرانی ہے۔ آپ سارے قرآن میں دیکھئے (بالخصوص سورۃ صود) ہر رسول کی دعوت کا آغاز اس اعلانِ عظیم سے ہوتا تھا کہ یَقُوْماً اَعْبُدُوْا اللّٰهَ - (۱۱۱)۔ محکومیت صرف خدا کی جائز ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ لہذا، یہ اصول کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں، اس کا اطلاق ہر رسول، اس کی کتاب اور اس کی امت پر یکساں ہوتا ہے۔ اور ہم پر بالخصوص اس لئے کہ قرآن کو تمام کتب سابقہ کی حقیقی تعلیم کا مہمبین کہا گیا ہے (۵۴) اور رسول اللہ سے فرمایا گیا ہے کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵۵)۔

”تم ان کے معاملات کے فیصلے مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (کتاب اللہ) کے مطابق کرو۔“ لہذا یہ اصول ضمناً اور یقیناً ہم پر بھی عائد ہوتا ہے کہ (بلکہ اب تو عائد ہی ہم پر ہوتا ہے کہ دیگر اہل مذاہب کے پاس) ”مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ اس کی حقیقی شکل میں موجود ہی نہیں)۔ جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توریت - انجیل وغیرہ نہیں کہا۔ ”مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ کہا ہے۔ ان کا ”مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ ان کی کتابیں نہیں۔ ہمارا ”مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ“ قرآن مجید ہے۔

اس کے بعد تورات کے قانون قصاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ
وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ
قِصَاصٌ ۖ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۖ وَمَنْ لَّمْ يُحْكَمْ
بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

انہی صفحے میں ہم نے انہیں حکم دے رکھا تھا جس شخص نے کسی کو (ناخن) قتل کر دیا، اس کی سزا موت ہوگی
جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ ناک کا بدلہ ناک۔ کان کا بدلہ کان۔ دانت کا بدلہ دانت۔ یعنی صرف
مجرم قتل ہی مستوجب سزا نہیں۔ کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے گی۔ اور سزا جرم کے
مطابق ہوگی۔ لیکن اگر مستغنیث، مجرم کو خود معاف کر دے، تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی۔
یہ تھا وہ قانون قصاص جو ان کی کتابوں میں ان کے لئے دیا گیا تھا۔ انہیں اسی کے مطابق فیصلے کرنے
چاہئیں تھے، اس لئے کہ جو شخص اس ضابطہ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرتے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو
یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ”آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان۔“ تو یہ حکم یہودیوں کے لئے تھا (کَتَبْنَا عَلَيْهِمْ) سے
یہ واضح ہے۔ امت مسلمہ کے لئے نہیں، کیونکہ قرآن کریم نے جو قصاص کا حکم دیا ہے وہ اٹلافت جان تک محدود ہے
(دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۱۶)۔ زخموں کے قصاص کا معاملہ اسلامی حکومت پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ حالات
کے مطابق قوانین خود وضع کرے۔ اس سلسلہ میں عنوان ”ناسخ و منسوخ“ دیکھئے۔ (بالخصوص مطالب الفرقان
جلد اول۔ ص ۱۲۵)۔

﴿

یہاں تک بات یہودیوں سے متعلق تھی۔ اس کے بعد وہ عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا، اور کم و بیش وہی کچھ

ان سے کہا جو یہودیوں سے کہا گیا تھا۔ فرمایا:

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ الْآيَاتِ ۚ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۚ وَمُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ ۚ وَهُدًى وَنُورٌ ۚ وَلِلْمُتَّقِينَ ۝

۵
۴۶-۴۷

وَلِيَحْكُمَ أَهْلُ الْأَنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ط وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ
بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (۴۷-۴۸)

پھر انہی انبیاء سابقہ کے نقش قدم پر، ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔ اس کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیف میں سے یہودیوں کے پاس رہ گیا تھا، اسے سچا ثابت کرو کھائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے، ہم نے اسے انجیل دی جس میں، صحیف سابقہ کی طرح، نور اور ہدایت تھی، اور جو ان صحیف کی حقیقی تعلیم کو سچ کر دکھانے والی تھی۔ اس میں، ان لوگوں کے لئے جو زندگی کے خطرات سے بچنا چاہتے تھے، سامان ہدایت و مرعفت تھا۔

(۴۷)

ہم نے اہل انجیل سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے معاملات کا فیصلہ اس کے مطابق کریں جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو ان کا شمار فاسقین میں ہوتا ہے یعنی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لینے والے۔ (۴۸)

انجیل کی تاریخ اس کتاب کے دوسرے باب میں گزر چکی ہے۔ مصدق کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص ۱۸ دیکھئے۔

ان انبیاء گزشتہ اور کتب سابقہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ
وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ فَاحِشًا بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ
مِنْهَا جَا ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ
فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ط إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۴۹)

اب ان تمام کتب سابقہ کے بعد (جب وہ اپنی اصلی حالت پر نہ رہیں اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آگیا کہ تمام نوع انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات دے دیا جائے جو ہمیشہ تک ان کی رہنمائی کرے) ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ ان تمام وعدوں اور وعظوں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو کتب سابقہ میں کئے گئے تھے۔ اور اس اصولی تعلیم کی جامع

اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی، اور جس کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔

یہ ہے اس کتابِ عظیم کی پوزیشن۔ لہذا اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو۔ اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد، لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو۔ اس مقام پر ممکن ہے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خدا نے تمام انسانوں کے لئے شروع سے اخیر تک اصولاً ایک ہی ضابطہ عیادت تجویز کیا تھا، تو ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا کہ تمام لوگ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہتے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ انسانوں کو، حیوانوں اور پتھروں کی طرح، مجبور پیدا کر دیتا اور وہ، اس کی طرف سے مقرر کردہ روش پر طوعاً و کرہاً چلتے رہتے۔ لیکن اس کے قانونِ مشیت کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا کہ وہ جو سارا سہی پاسے اختیار کر لے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم، تم میں سے ہر ایک کو، اس کے اپنے اختیار کردہ منہاج اور طریقے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سب کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ انسان کا اختیار و ارادہ ہی ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ وہ نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں، اور اس طرح خود ان کی ذات میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

لیکن انسان کے اختیار و ارادہ کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ غلط راستے پر چلتا رہے گا۔ غلط راستوں پر چلنے کے تباہ کن نتائج (جنہیں زمانے کے تقاضے کہہ کر پکارا جاتا ہے) اور وحیِ خداوندی سے متاثر فضا سے رفتہ رفتہ، بتدریج صحیح راستے کی طرف لئے چلے جائیں گے، اور یوں لوگوں کی خود ساختہ، مختلف روشیں، زندگی کی صحیح شاہراہ میں آکر ملتی جائیں گی۔

{ یہ طریق کار (جسے عقل کا تجرباتی طریق کہتے ہیں) بہت طویل طویل ہوتا ہے اور اس طرح انسان کو صحیح راستے تک پہنچنے کے لئے بڑی بڑی بازگاہ مصیبتوں اور جگہ پاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان چاہتا ہے کہ ان تباہیوں اور بربادیوں میں سے گزرے بغیر، بخیر و خوبی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو اس کا طریق یہ ہے کہ وحیِ خداوندی کا اتباع کرے اور اپنے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کرے۔ }

قرآن مہین ہے | اس آیت میں قرآن مجید کی ایک صفت صہیمن بتائی گئی ہے۔ اس کے معنی ہیں اس قسم کی حفاظت اور نگرانی جس طرح پرندے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر

اپنے پر پھیلادیتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ دین کی جس قدر صداقتیں سابقہ انبیاء کرام کی وساطت سے دی جاتی رہی تھیں لیکن وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں، وہ قرآن میں پہنچ کر بالکل محفوظ ہو گئی ہیں۔ قرآن ان کا مہیمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ایک صفت بھی السہیمن بتائی ہے (۵۹)۔ یعنی جملہ کائنات کا محافظ اور نگران۔ واضح رہے کہ قرآن کریم میں السہیمن کے ابدی قوانین و اصول ہی جمع اور محفوظ کئے گئے ہیں۔ اُمم سابقہ کو دیئے گئے جزئی احکام نہیں کیونکہ ان کا ابدی طور پر غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔

﴿

آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً“ یعنی اگر خدا کی مشیت میں ایسا ہوتا تو وہ انسانوں کو، حیوانوں اور پتھروں کی طرح مجبور پیدا کر دیتا۔ پھر وہ باہمی اختلاف کو ہی نہ سکتے۔ لیکن اس نے اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ اس موضوع کی تشریح کے لئے انڈکس میں عنوان تقدیر دیکھئے۔ بالخصوص مطالب الفرقان۔ جلد اول ضا جس میں اسی موضوع کی ثبات کی تشریح کی گئی ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ جو واقعات قوانین خداوندی کی رو سے انسانوں کے ہاتھوں سرزد ہوتے ہیں انہیں بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے (دیکھئے جلد اول - ص ۱۸۷)۔ اس سے آیت زیر نظر کے اس حصہ کی وضاحت ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاہُ“ یعنی یہ مختلف راستے لوگوں نے خدا کے اس قانون کی رو سے اختیار کر رکھے ہیں جس کے مطابق اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اور دین میں کسی قسم کے جبر کو روا نہیں رکھا۔

جیسا کہ ابھی سامنے آئے گا اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقہ کو الدین کے اصول دیئے تھے اور وہ حکام بھی جو ان انبیاء کے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق تھے۔ دین کے اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنے کے لئے تھے لیکن یہ جوئی احکام وقتی اور ہنگامی تھے (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ)۔ لیکن یہ وقتی احکام خدا نے دئے ہوں یا لوگوں نے خود وضع کئے ہوں، بہر حال وقتی تھے۔ غیر متبدل صرف الدین کے اصول تھے۔ قرآن میں جو کہہ دیا گیا ہے وہ ابدی اور غیر متبدل ہے۔

اس آیت میں لفظ شریعت (شُرْعَةً) پہلی مرتبہ آیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں اس لفظ کو خاصی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا مفہوم تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ لغات القرآن میں اس کی پوری تفصیل مذکور ہے۔ مناسب ہو گا اس کو یہاں دہرا دیا جائے تاکہ بات

شریعت کے معنی

بالکل واضح ہو جائے۔

الشَّرِيعَةُ۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو، کھلا ہو اور سطح زمین پر جاری ہو۔ یعنی اسے حاصل کرنے کے لئے کسی رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعت نہیں بلکہ کسْرَع کہلائے گا۔ اسی سے الشَّرِيعُ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں۔ الشَّرِيعُ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کھلا ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعَ کے معنی ظہر ہیں۔ یعنی ظاہر ہو گیا۔ کھل گیا۔ شَرَعَتِ الرِّمَاحُ کے معنی ہیں نیزے سیدھے کئے گئے۔ الشَّرِيعُ الشَّيْءُ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا۔ الشَّرِيعُ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں۔ الشَّرِيعَةُ۔ دروازے کی چوٹ کو بھی کہتے ہیں۔ الشَّرِيعَةُ وَالشَّرِيعَةُ۔ سیدھا اور واضح راستہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا۔ یعنی اس طرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آجائے۔

سورۃ شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ (۲۲)۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی

(الدِّينُ) یا قانونِ حیات کو نایاں اور واضح کیا ہے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ

مِّنَ الْأُمْرِ (۲۵)۔ پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ) یا شَرِيعَةٍ مِنَ الْأُمْرِ سے مفہوم خود الدین ہے

یعنی خدا کا متعین کردہ رستہ۔ سورۃ امدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی

ہے جو ان حقائق کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی

محافظ ہے۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ما اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق فیصلہ کر۔ اور جب تمہارے پاس حق

آچکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو۔ اس کے بعد ہے لَکِّلْ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرُعًا

وَمِنْهَا جَا (۵۸)۔ اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا

(تھا)۔ یہاں شُرُعۃ کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو

یکساں طور پر دئے گئے تھے (۲۲)۔ یہاں سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے

سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔ قرآن کریم کا

کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں۔ اس مفہوم کی تائید سورۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُوَ نَاسِكُوهُ فَلَا يَنَازِعُكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲) ”ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں“

اس آیت (لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُوَ نَاسِكُوهُ) کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر خبر نہیں کرتے جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دے دینا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔ اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (۵۸)۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم سب کو ایک اُمت بنا دیتا۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا۔ اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ شریعت سے مراد، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر اُمت کے لئے چلنا ضروری ہے۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دئے ہیں۔ یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کیلئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمت اپنے اپنے لئے جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشورہ سے خود مرتب کرے گی۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہیں گے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہوتے رہیں گے۔ ان احکام کو اگر شریعت کہا جائے گا تو یہ شریعت بدلتی رہے گی اور اصول شریعت غیر متبدل رہیں گے۔

الشَّرِيعَةُ کے ان معانی کو سامنے لائیے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ ان معانی کے لحاظ سے الشَّرِيعَةُ (یعنی الدین کے غیر متبدل اصولوں کی

روشنی میں، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہیے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو۔ ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں۔ جس تک ہر ایک کی رسانی ہو۔ جو مسلسل آ رہا ہو۔ بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو۔ لہذا شریعت وہ ہوگی جس میں جوہر، قنطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی یو پیدا ہو جائے گی۔ وہ زندگی بخش نہیں رہے گی۔

شریعت کا قرآنی مفہوم آپ کے سامنے آ گیا۔ اس کی روشنی میں سوچئے کہ ہمارے ہاں جو فقہ کے قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے، وہ اس مفہوم کے کس قدر خلاف ہے۔ فقہ کے قوانین صدیوں پہلے، بعض انسانوں (فقہاء) نے مرتب کئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانے کے حالات کے مطابق ہوں جس میں انہیں مدون کیا گیا تھا۔ لیکن وہ ابدی طور پر دین تو نہیں قرار پا سکتے۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتا رہنا چاہئے۔ اگر وہ جامد اور غیر متغیر ہوں تو انہیں ”شریعت“ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ شریعت تو آپ رواں کو کہا جاتا ہے۔ ساکن اور جامد پانی کو نہیں۔ اس اعتبار سے قوانین شریعت، خواہ وہ اقوام سابقہ کے ہوں یا خود ہمارے، ناقابل تغیر نہیں ہو سکتے۔ اقوام سابقہ کی شریعتوں کو قرآن کریم نے آکر بدل دیا۔ ہمارے قوانین شریعت کو وقتاً فوقتاً اسلامی مملکت نے بدلتا تھا۔ ان قوانین کو جو جامد اور غیر متغیر قرار دیدیا گیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہاں اسلامی مملکت (یا قرآنی نظام) باقی نہ رہا۔ اس سے الدین کی جوئے رواں جو ہڑبن کر رہ گئی۔ اس کی حرکت متبدل بہ سکون ہو گئی۔ زمانہ بدلتا گیا اور امت ایک مقام پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جامد، غیر متحرک، تقلید کی زنجیروں میں پکڑی ہوئی۔

ان تمام مضمرات کا علاج قرآنی نظام (یا مملکت) کا قیام ہے۔ لیکن قوانین فقہ و روایات کو غیر متبدل قرار دینے والے اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے ہمیشہ ہی کیا ہے۔ اور وہ یہی کچھ کرتی رہے گی۔ یُضَدُّوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ - (۹/۳۳)۔ خدا کے تجویز کردہ راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ۔

منہاج کا مفہوم | دوسرا لفظ منہاج ہے۔ معنی تو اس کے بھی واضح راستے کے ہیں لیکن اس میں طریقہ کا مفہوم زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم احکام شریعت

پر عمل پیرا ہونے کا طریق ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں اسی مقام پر آیا ہے۔ بہر حال، الدین کے جزئی قوانین ہوں (جنہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا) یا ان پر عمل کرنے کے طریق، یہ سب قابل تغیر و تبدل ہیں۔ یہ سب قوانین شریعت کس طرح مدون ہوں گے | قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی طرف سے

وضع اور مدون کئے جائیں گے۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ قرآن کی سند نہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلامی نہیں کہلا سکتے، یہ شرک قرار دیا جائے گا۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے

إِمْ لَّهُمْ شُرَکُوهُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّینِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ط
(۲۲/۳۱)

کیا انہوں نے خدا کے ایسے شریک بنا رکھے ہیں جو ان کے لئے شریعت کے ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جن کی کوئی سند کتاب اللہ سے نہیں مل سکتی۔

ایسے قوانین وضع کرنا جن کی تائید کتاب اللہ سے نہ ہوتی ہو، شرک ہے ایسے قوانین وضع کرنے والے خدا کے ہمسرہ اور ان پر عمل کرنے والے مشرک۔ اس سے فرق پیدا ہوتے ہیں جنہیں قرآن نے بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے۔

(۳۰-۳۱) - فرق بندی میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وَاِذَا ذُکِّرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْتَارَتْ قُلُوبُ

الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُکِّرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

(۳۹/۲۵) - ”جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، خدا کے واحد کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل سکر

جاتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں“ (نیز دیکھیے ۳۴/۱۲، ۳۵/۱۲)۔

جب یہ قوانین اسلامی حکومت کی طرف سے مرتب اور نافذ ہوں گے تو ان کا اطلاق تمام امت پر یکساں ہوگا۔

اس لئے امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوگا۔ جب یہ افراد (فقہاء) کی طرف سے مدون ہوں گے تو ان کا اطلاق صرف

ان کی فقہ کے متبعین پر ہو سکے گا۔ اس طرح امت میں مختلف فرقے پیدا ہونگے اور مستحکم رہیں گے۔

آیت (۵/۲۸) میں ہے: ”اِلَی اللّٰهِ مَوْجِعُکُمْ جَمِیْعًا“ اس کے صحیح مفہوم کے لئے اندکس میں

”راجعون“ کا عنوان دیکھیے۔



اس کے بعد پھر اس اصولی تعلیم کی تاکید کر دی کہ تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہونے چاہئیں۔

وَ اِنْ اٰحٰکُم بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اٰهَآءَ هُمْ وَاٰخِذٌ

ہُمْ اَنْ یَّفْتَنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْکَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاَعْلَمُ

اَنْہَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یَّصِیْبَہُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِہُمْ ط وَاِنْ کَثِیْرٌ مِّنَ

النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝

۵
۴۹

لہذا، اسے رسول، تم ان لوگوں کے فیصلے، اس کتاب کے مطابق کرو جسے خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اور اس میں لوگوں کے ذاتی مفاد اور خواہشات کی قطعاً رعایت نہ کرو۔ اس کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کے مفاد اور میلانات ایسی صورت پیدا کر دیں کہ تمہارا نظام، اس ضابطہ حیات سے جسے خدا نے نازل کیا ہے، ادھر ادھر ہو جائے۔ خواہ ذرا سا بھی کیوں نہ ہو۔ ایسا بالکل نہ ہونے دینا۔

اگر یہ لوگ، جن کے سامنے اپنی مفاد پرستیوں کے سوا کچھ نہیں، اس نظام سے روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ ان کے جرائم ان پر تباہیاں لانے والے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ چاہتے ہی یہ ہیں کہ صحیح راستے سے منہ موڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں۔

تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق | آیت (۵۱) میں کہا گیا تھا کہ کفر اور اسلام میں خط امتیاز، کتاب اللہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے کہ اسلام اور

عہد جاہلیت میں یہی حد فاصل اور نقطہ امتیاز ہے۔ فرمایا:

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ
يُوقِنُونَ ۝

(اور) اس طرح پھر اس نظام جاہلیت کو اختیار کریں جس پر وہ، قرآن سے پہلے، قائم تھے۔ لیکن جو لوگ اس نظام خداوندی کی صداقت اور محکمیت پر یقین رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نوع انسان کے لئے، ضابطہ خداوندی سے بہتر اور کوئی ضابطہ نہیں ہو سکتا۔

❦

اہل کتاب کے سابقہ الدین کے اصولی اختلافات کی وضاحت کے بعد، پھر جماعت مومنین سے تاکید کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔ ایک ولی اور ہم رازی صرف اُن کے ساتھ ہو سکتی ہے جو ایڈیالوجی (دین) میں مشترک ہوں۔ یہی قرآن کی رو سے، تشکیل قومیت کی بنیاد ہے۔ اس لئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

اے جماعت مومنین! تمہارے سامنے یہود اور نصاریٰ کی حقیقت بھی آگئی، اور یہ بھی کہ تم کس نظام کے قیام

کے لئے کھڑے کئے گئے ہو تم دیکھتے ہو کہ ان کے مطیع نگاہ اور تمہارے مقصد زندگی میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔

لہذا تم بھی انہیں اپنا دوست اور چارہ ساز نہ بنانا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ باہمی، ایک دوسرے کے دوست اور چارہ

ساز بن جائیں، لیکن تمہارے دلی دوست کبھی نہیں ہو سکتے ($\frac{۳}{۴}$ ، $\frac{۳}{۱۱۷}$)۔

کفار (غیر مسلموں) کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول ص ۵۱ دیکھئے۔ نیز

اسی جلد کے سابقہ ابواب میں سورۃ آل عمران اور سورۃ النساء کی متعلقہ آیات جن کا حوالہ فہرست میں ملے گا۔

اس کے بعد کہا۔

فَتَرَا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى

أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِ ۵

فِيُصِيبُكُمْ عَلَى مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَذِيرٌ ۝

اس وضاحت کے بعد بھی تم میں سے جو شخص انہیں اپنا رفیق اور دوست بنائے گا تو اس کا شمار انہی میں ہو گا۔ اس لئے

کہ جو لوگوں دیدہ دانستہ غلط راستے اختیار کر لیں، وہ صحیح راستے پر کیسے ہو سکتے ہیں؟

جن لوگوں کے دل میں منافقت کامر عن ہے، تو دیکھئے گا کہ وہ ان رہبر و نصاریٰ کی دوستی کی طرف کیسے دوڑ

کر جاتے ہیں، اور اس کے لئے وجہ جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ان کی دوستداری چھوڑ دی تو ہم کسی مصیبت

کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔ تم ان کی باتیں سنئے رہو۔ وہ وقت دور نہیں کہ تمہیں ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل ہو جائے

اور اس طرح تم پر کشادگی راہیں کھل جائیں۔ یا خدا کی طرف سے کوئی اور بات واقع ہو جائے۔ اس وقت وہ تمام باتیں

جنہیں یہ اس وقت اپنے دل میں چھپاتے ہیں، ابھر کر سامنے آجائیں گی اور انہیں اپنی حرکات پر سخت شرمندہ ہونا

پڑے گا۔

اس کے تسلسل میں کہا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ

أَنَّهُمْ لَسَعَاكُمْ طَعْنَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَسِرِينَ ۝

اس وقت جماعت مومنین کے افراد کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو خدا کی سخت قسمیں کھا کھا کر کرتے تھے کہ ہم

تمہارے ساتھ ہیں۔

ان (منافقین) کی تمام کوششیں غارت ہو جائیں گی اور یہ انجام کار سخت نقصان میں رہیں گے۔ منافقت کا

بیشیہی انجام ہوتا ہے۔

اس کے بعد جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي
اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى
الْكُفَرِيِّنَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ط
ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے نظامِ خداوندی سے پھر جائے، (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ کا کیا بگاڑ گا) اللہ اُن کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شے کے مقابلہ میں نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے یعنی اُس کی اطاعت کریں گے، اور اُن کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی اُنہیں عزیز رکھے گا، یعنی ان کی حقانیت کرے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے ریشم کی طرح نرم اور شاخ ثمر دار کی طرح خمیدہ ہوں گے، لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلے میں فولاد کی طرح سخت (۵۴)۔ وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے۔ اور کسی کے طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔ یہ نوازشاتِ خداوندی کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو قوم بھی انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہئے، اُسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ خدا کے ہاں نہ تو گروہ بندانہ نگ نظری ہے، اور نہ ہی انعام کی اندھا دھند تقسیم۔

انڈکس میں ارتداد اور مرتد کے عنوانات دیکھئے۔ نیز ”استبدال اور اختلافِ قومی“

ارتداد اور مرتد کے معنی

مطالب الفرقان جلد سوم (ص ۲۸۵) پر خود یہ آیت (۵۴) آپ کی ہے۔ اور اسی سلسلہ کی متعدد دیگر آیات۔ مرتد کی سزا کے متعلق جلد سوم۔ (ص ۲۸۷) دیکھئے۔ اس مقام پر اہل حق پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ”مرتد کی سزا قتل“ کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ عہدِ صدیقیؑ میں ”مرتدین“ کے خلاف جہاد کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار نہیں کر لیا تھا۔ یہ وہ قبائل تھے جنہوں نے حکومت کے خلاف

مالعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد

بغاوت کی تھی اور مدینہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں ان کے خلاف جہاد کیا گیا تھا۔ ان کا جرم بغاوت تھا، نہ کہ تبدیلیِ مذہب۔ وہ مسلمان تھے اور مسلمان رہنا چاہتے تھے۔ ان کی اس بغاوت کی تفصیل تاریخ کی تمام کتابوں میں ملتی ہے

بالخصوص دیکھئے مصری مؤرخ، محمد حسین میکمل (دوم) کی عہد صدیقی کی تاریخ (ابوبکرؓ)۔ (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام۔ بابت نمبر ۱۹۸۰ء)۔

زیر نظر آیت میں جماعتِ مومنین کی جو صفات اور خصوصیات گنائی گئی ہیں، انہیں پیش نظر رکھیے اور پھر اپنی حالت پر غور کیجئے اور سوچئے کہ ہمارا مقام کیا ہے؟ اس سلسلہ میں انڈکس میں مومن اور مومنین کے عنوانات دیکھئے۔ لیکن اس آئینے میں جو اپنی شکل نظر آئے اس سے (اس حبشی کی طرح) آئینے کو نہ توڑ ڈالئے۔ آئینہ ہمیشہ سچ بتاتا ہے۔ سچ سنئے اور سچ دیکھئے کی جرات پیدا کیجئے۔

اس کے مثبت پہلو کو سامنے لاتے ہوئے فرمایا:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ سَارِعُونَ ۝

۵۵

یاد رکھو! تمہارا رفیق اور چارہ سارہ ساز صرف یہ نظامِ خداوندی ہے۔ جو

رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔ نیز تمہاری اپنی جماعت کے لوگ جو اس کی

اُمتِ مسلمہ کے دوست

صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اقامتِ صلوٰۃ اور اتیانے زکوٰۃ کے عظیم فریضہ کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتے

ہیں۔ اور ہمیشہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

صلوٰۃ۔ زکوٰۃ اور رکوع کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔

یہی جماعت ”حزب اللہ“ کہلاتی ہے۔

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ
الْغَالِبُونَ ۝

۵۶

سو جو لوگ بھی خدا کے نظام کو، جو اس کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے، نیز اپنے ان رفقاء کو جو اس نظام کی صداقت کو

اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، اپنا دوست اور چارہ ساز سمجھیں، تو ان کا شمار ”خدا کی پارٹی“ میں ہو جائیگا

اور ”خدا کی پارٹی“ ہی آخر الامر غالب آئے گی۔

”حزب اللہ“ اور ”حزب الشیطان“ کے لئے انڈکس دیکھئے۔

پہلے کہا تھا کہ کفار اہل کتاب کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اب ان کی خباثت جس کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔

فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا إِدِينَكُمْ هُزُورًا
وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَفَّارَ
أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِذَا نَادَيْتُمُ إِلَى
الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَاهُنَا ۚ وَالْعِبَادُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ۝

اے ایمان والو! اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہوں یا کفار۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق سمجھ رکھا ہے، اور اس کی تحقیر و تذلیل کے لئے اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ تم مومن ہو تو ہمیشہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ دین کے مخالفین سے تمہارا کیا واسطہ؟ (۵۷-۵۸) ۝ ان کی ذمات کا تو یہ عالم ہے کہ جب تم اجتماعِ صلوٰۃ کے لئے لوگوں کو آواز دیتے ہو، تو یہ اُس کی بھی ہنسی اڑاتے اور مذاق کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے در نہ اس حقیقت کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ جو اجتماعات، نوج انسان کی صلاح اور بہبود کے لئے منعقد ہوں، ان کے انعقاد میں خود انہی کا فائدہ ہے۔ ان کا مذاق اڑانا خود اپنا مذاق اڑانا ہے۔

واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مراد نہیں کہ کفار اور اہل کتاب میں سے جو لوگ تمہارے دین کے ساتھ مذاق کرتے

ہوں، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو ایسا نہ کرتے ہوں انہیں بیشک دوست بناؤ۔ ایسا سمجھنا قرآن کے تمام مقامات کے خلاف ہوگا

جو تمہارے دین سے تمسخر کریں

جن میں بلا مشروط کہا گیا ہے کہ کفار اور اہل کتاب سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ کرو۔ آیات (۵۷-۵۸) تو ابھی ابھی گزر چکی ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ عربی زبان میں اس قسم کا مِصْنُ، بعضی کے لئے ہی نہیں آتا۔ یعنی ”میں سے“ کے لئے ہی نہیں۔ تبئیں کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی ان کی کسی اہم خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے۔ یہ چیز کہ فلاں مقام پر مِصْنُ کے کیا معنی لئے جائینگے قرآن کریم کے دیگر متعلقہ مقامات کی روشنی میں متعین کی جائے گی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ (۹۳-۹۰)۔ نیز سابقہ صفحات میں آیت (۱۰۳-۱۰۲)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جو لوگ تمہارے دین (دینکم) سے تمسخر کریں، اس کا مذاق اڑائیں، ان سے قطع تعلق کرو۔ یہاں تک تو ہر اہل مذہب کریں گے۔ وہ کونسا مذہب ہے جس کے پیروان لوگوں کو اپنا دوست بنالیں جو ان کے مذہب کا تمسخر اڑائیں؟ کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن قرآن کریم اس سے

ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَحَتَّىٰ كَـذَّبُوا بِآيَاتِنَا“ غَرَّتْهُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا.... (۲۷ : ۲۸) ”جو لوگ اپنے دین کو کھیل تماشا سمجھ لیں، ان سے بھی قطع تعلق

کر لو“ اس ارشاد میں ایک عظیم حقیقت پنہاں ہے۔ اور اس حقیقت کی وضاحت آیت کے اگلے لفظوں نے کر دی ہے۔

انسانی دنیا میں دو تصوراتِ حیات ہیں۔ ایک تصور کو آپ ”مذہبی تصور“ کہہ لیجئے اور دوسرے کو ”دنیاوی تصور“۔ مذہب میں (خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو) اقدار یا اخلاقیات کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ وہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے ہیں اور اس میں (غلط یا صحیح) گناہ اور ثواب۔ جائز اور ناجائز۔ اچھے اور برے۔ نیکی اور بدی کا تصور بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور یہ ہے کہ زندگی کا مقصد مفاد و خوش حاصل کرنا ہے خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ اسے مادہ پرستی (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہاجاتا ہے۔ اس میں اقدار یا جائز ناجائز کا تصور سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ یہ مطلب ہے۔ ”غَرَّتْهُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا“ سے (تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان ”دنیا“ دیکھیے)۔ جو لوگ اس تصورِ حیات کے قائل ہوں وہ نفسِ مذہب (یعنی ہر مذہب کا خواہ اپنا ہو یا دوسروں کا بلکہ مذہبی تصورات) کا مذاق اڑائیگے۔ اسے (SERIOUSLY) لیں گے ہی نہیں۔

یورپ میں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں جو مادیت کی لہر اٹھی اس نے ساری دنیا کو متاثر کر دیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مادی تصوراتِ حیات عام ہو گیا اور اس کے عام ہونے سے مذہب (RELIGION) کے خلاف بغاوت اور استہزا بھی عام ہو گیا۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کی نئی نسل بھی اس سے متاثر ہو گئی اور ان کے ہاں مذہب کا مذاق اڑانا (گویا) فیشن میں داخل ہو گیا۔ بایں کہئے کہ ماڈرن بننے کی نشانی قرار پا گیا۔ ان نوجوانوں سے عام طور پر سیر واسطہ بنتا ہے۔ کیونکہ میرے پیغام اور (قرآنی) فکر کا اولیٰ مخاطب طبقہ یہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ نوجوان، مغرب سے اٹھی ہوئی لہر سے متاثر ہو کر مذہب کا مذاق نہیں اڑاتے، بلکہ اس مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں جو ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ مذہب جو عقل کا دشمن اور علم کا حریف ہے اور فساد

نگاریوں اور توہم پرستیوں کا مجموعہ۔

میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو ”چھوڑ دینے“ (وَذَرِ الَّذِينَ) سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جسے آیت (۲۷ : ۲۸)

میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس مجلس میں اس قسم کا استہزاء ہوتا ہو وہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ۔ (تفصیل سابقہ باب میں گزر چکی ہے) میں نے یہ مفہوم اس لئے لیا ہے کہ (۱/۲) میں (وَذَرِ السَّيِّئِينَ...) کے بعد کہا ہے وَذَرِ السَّيِّئِينَ اَنْ تَبْسُلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ..... ان کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کرتے رہو تاکہ کوئی شخص قرآنی تعلیم سے محروم نہ رہ جانے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے۔

میرا تجربہ اس باب میں بڑا کامیاب رہا ہے۔ میں ان نوجوانوں کو (جن کی طرف اُد پر اشارہ کیا گیا ہے) جھڑکتا، ڈانٹتا نہیں، انہیں اپنے قریب لاتا ہوں اور علم و بصیرت کی روشنی میں قرآنی اقدار ان کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ نوجوان، نہ صرف یہ کہ اپنی سابقہ روش کو چھوڑ دیتے ہیں، بلکہ اسلام کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ قرآنی تاکید کا مقصد یہ ہے کہ تم ان میں بیٹھو گے تو خطرہ ہے کہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔ (اِنَّكُمْ اِذَا قُتِلْتُمْ - ۱۱۱)۔ وہاں سے اٹھ کر چلے آؤ گے تو ایک تو تم خود اس خطرہ سے محفوظ ہو جاؤ گے اور دوسرے، انہیں اس کا احساس ہو گا کہ ان سے مذموم حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ وہاں سے تو اٹھ کر چلے آؤ لیکن قطع علاق کی ایسی شکل اختیار نہ کرو کہ وہ تمہاری بات تک مٹنے کے روادار نہ رہیں۔ اس صورت میں تم ان کے سامنے قرآنی تعلیم پیش کیسے کر سکو گے؟ غور فرمائیے کہ قرآن کریم کی ہدایت میں کس قدر حکمت مضمون ہوئی ہے؟

آیت (۱۱۵) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جو دین کی دعوت، اور اس کے اجتماعات کے لئے پکار (اذان) کا بھی مذاق اڑاتے ہیں تو یہ اندھے تعصب کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ عقل و فکر سے **دین کا نظام تو خود ان کے فائدے کے لئے ہے** | کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دین کا نظام تو خود ان کے فائدہ کے لئے

ہے کیونکہ وہ ربوبیت عالمی کا نظام ہے۔ ان کی اس مخالفت کو اس مثال کی رو سے سمجھئے کہ اگر کسی گاؤں میں سکول یا ہسپتال کھولنے کی تجویز ہو، اور وہاں کی غیر مسلم آبادی اس تجویز کی اس لئے مخالفت کریں کہ تجویز مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے، تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ یہ لوگ عقل کے اندھے ہیں۔ خود اپنے فائدے کی بھی نہیں سوچتے۔ (پاکل کہتے ہی اسے ہی جسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہ ہو)۔ صلوٰۃ کے اجتماعات تو چھوڑے پیمانے پر ہوتے ہیں۔ اس نظام کے سب سے بڑے اجتماع (ج) کے متعلق کہا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو دعوت دو کہ وہ آئیں۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲)۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (مشاہدہ کر لیں) کہ یہ نظام ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے؟ تفصیل کے لئے انڈکس میں عنوان ”ج“ دیکھئے۔

لیکن اس باب میں قصور خود ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے اسلام کو کبھی اس شکل میں پیش ہی نہیں کیا کہ یہ اس کی غایت مقصود اور منتہی (بلا فترتی مذہب و ملت) تمام نوع انسان کی بہود ہے۔ ہم نے دنیا کو رب العالمین کا مفہوم ہی نہیں سمجھایا۔ جس سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے۔ نہ ہی ”رب الناس“ کا مفہوم جس پر اس کتاب عظیم کا اختتام ہوتا ہے۔ (استہزاء کے متعلق مزید تفصیل۔ مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ ص ۲۴ پر دیکھئے)۔



بات اہل کتاب کی طرف سے، مخالفت اور استہزاء سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تُنْقِبُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِن قَبْلُ ۖ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ ۝

۵۹

اہل کتاب سے پوچھو کہ تم ہم سے کس بات پر بگڑتے ہو اور ہمیں کون سے جرم کی سزا دینا چاہتے ہو؟ ہمارا ”جرم“ اس کے سوا کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو خدا نے ہماری طرف نازل کیا ہے، اور ان تمام قوانین پر جو اس سے پہلے (خود تمہاری طرف) نازل ہوئے تھے، لیکن تم میں سے اکثر نے اس راہ کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لی تھیں۔

تو کیا تم ہم سے اس بات پر بگڑتے ہو کہ ہم نے خدا کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے جو ان سے کہا گیا ہے کہ ہم تو تمہاری مقدس کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں (یعنی یہ ایمان کہ یہ اپنے اپنے وقت پر تمہارے انبیاء پر نازل ہوئی تھیں) اس لئے ظاہر ہے کہ تم ہمارے خلاف جو رویہ جی چاہے اختیار کرو، ہم تمہارے استہزاء کے جواب میں ”تمہارے انبیاء اور تمہاری کتابوں“ کے خلاف گستاخی اور بے حرمتی کا ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔

اس کے بعد ان سے کہ حق و صداقت کے خلاف تمہاری اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا، اسے کان کھول کر سن لو۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَلِكَ مَشُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ ط مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ يُرَوِّعُونَ الطَّاغُوتَ ۖ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝

۶۰

ان سے کہو کہ تم، ہمارے خلاف، ہزار جذباتِ عناد و عداوت اپنے دل میں رکھو، اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ انجام اسی کا خراب ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ زندگی

کی سعادتوں اور خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان کی انسانی صلاحیتیں تحلیل کر رکھ جاتی ہیں۔ ان سے کہو کہ تم تو خود اپنی تاریخ میں دیکھ چکے ہو کہ احکام سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کا کیا حشر ہوا تھا؟ ان میں انسانیت کا شاہد ایک باقی نہیں رہا تھا۔ ان کی سیرت بدترین حیوانوں جیسی ہو گئی تھی (۲/۲۵)۔ ان پر ذلت اور محکوم کی ماد پڑی (۲/۲۶) اور محکوم بھی کس کی؟ ان کی جن کی سرکشی اور تمرد کی کوئی حد نہ تھی!

یہ ہیں وہ لوگ جو صحیح راستے سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور آخر الامر اس مقام تک جا پہنچتے ہیں جو انسان کے لئے بدترین مقام ہو سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کے بند اور خنزیر بن جانے کے متعلق سبت کا عنوان دیکھئے جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۳۳) پر دی گئی۔ وہیں زیر نظر آیت بھی درج ہے۔ اور لعنت۔ غضب۔ طاغوت کے لئے انڈکس دیکھئے یہاں یہ نکتہ بار و گریہ قابل غور ہے کہ جب کسی قوم کی ذہنیت بگڑتی ہے تو سب سے الم انگیز اور رسوا کن عذاب جس میں وہ مبتلا ہو جاتی ہے، یہ ہوتا ہے کہ مستبد اور سرکش قوتیں انہیں اپنا محکوم بنا لیتی ہیں (اسے ذلت اور مسکنت کے عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ واضح رہے کہ ”طاغوت“ کے لئے، مستبد اور سرکش قوتوں کے الفاظ بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ خدا کے سوا کسی (انسان) کی بھی حکومت ہو، وہ ”طاغوت کی عبدیت“ (انسانوں کی حکومت) ہے اور حکومت کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کی بھی ہو، وہ قوت اور استبداد کے بل بوتے پر ہی قائم ہو سکتی، اور قائم رہتی ہے۔

اسی پستی ذہنیت اور انسانوں کی ذلت آمیز محکومیت کا نتیجہ تھا کہ منافقت ان کی زندگی کا معمول بن چکی تھی۔ ونائت اور منافقت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ فرمایا کہ ان کی حالت یہ ہے کہ:

وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا بِالْكَفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ
وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ○

اس ذہنیت کی وجہ سے ان کی اب تک یہ حالت ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ — حالانکہ جب یہ آئے تھے تو اس وقت بھی ان کے دلوں میں کفر بھرا ہوا تھا اور حیب کئے ہیں تب بھی اپنے ساتھ کفر ہی لے کر گئے ہیں، ایمان لے کر نہیں گئے۔ — ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں رہی کہ کھلے بندوں کہیں کہ ہم تمہاری روش اختیار نہیں کر سکتے۔ حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی اس قسم کی فریب کارانہ حرکات سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ یہ اپنے دل میں چھپاتے ہیں خدا کو اس کا پورا پورا علم ہے۔

منافقت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لہذا اس آیت کے سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔
اس کے بعد ہے۔

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْأَثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَكُلُّهُمْ
السَّخْتُ طَلَبُ نَسْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۶۳) لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّ
نِيُونُ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمْ الْأَثْمَ وَالْكُلْهَمُ السَّخْتُ طَلَبُ نَسْ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ (۶۴)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ جرم و سرکشی اور حرام خوری میں سب سے تیز ہیں — کیا ہی بُرے ہیں یہ کام

جنہیں یہ لوگ (دن رات) کرتے رہتے ہیں۔ (۶۳)

اور تماشایہ کر ان کے علماء اور مشائخ بھی انہیں ان جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ انہوں نے بھی مذہب

کو کاروبار بنا رکھا ہے — کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار! (۶۴)

اثم۔ عدوان اور سخت پہلے اچکے ہیں۔

یہاں تک یہودیوں کی عام قوم کا ذکر تھا۔ اس کے بعد ان کے علماء اور مشائخ کا تذکرہ آتا ہے۔ اجبار، ان کی شریعت

کے علماء تھے اور ربانی یا دہبان، ان کی طریقت (تصوف) کے مشائخ۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ

قوم کو ان جرائم کے ارتکاب سے روکتے۔ لیکن انہوں نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی

کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا۔ اس کے بجائے وہ کرتے کیا تھے، اسے قرآن نے ایک

اجبار و رہبان کا کردار

لفظ یَصْنَعُونَ میں سما کر رکھ دیا ہے۔ صنم کے بنیادی معنی کو تو کسی چیز کو نہایت عمدگی سے بنانے کے ہیں لیکن جب لفظ

مذہب معنی میں استعمال ہوا (جیسا کہ یہاں لَبَسَ سے واضح ہے) تو اس کا مفہوم ہمارے ہاں کے مروجہ الفاظ مصنوعی اور

صنعت (کاروبار) تو پھر اس کے ترجمہ "کاری گری" سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ ان پیشوایان مذہب کا فریضہ یہ تھا کہ وہ

دین کی اصل و غایت کو قوم کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ ان جرائم سے باز رہتے۔ انہوں نے اس کی جگہ، مصنوعی (خود ساختہ)

رسوم و شعائر کا نام دین رکھ کر قوم کو اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ وہ منشائے خداوندی کو پورا کر رہے ہیں۔ اور مقصد اس سے اپنی

صنعت (انڈسٹری) کو چمکانا تھا۔

آپ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے پیران طریقت اور ارباب شریعت کے کاروبار کو کس طرح ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا ہے

یہ حضرات جہاں بھی، اور جس مذہب میں بھی ہوں، ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ مصنوعی رسوم کر دین بنانا اور اس سے اپنے مفاد

حاصل کرنا۔ ان کا اکتساب رزق کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہوتا۔ مذہب ہی ان کا پیشہ (PROFESSION) ہوتا ہے۔

ذکر چلا آ رہا تھا یہودیوں کی طرف سے استہزاء کا۔ اس کی ایک اور مثال سامنے لائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں دیکھئے۔
 انفاق فی سبیل اللہ کی کس قدر اور کس کثرت سے تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ اسے ”خدا کو قرض دینا“ کہا گیا ہے۔ نگاہ میں کبھی نہ ہوتو
 اس قسم کے احکام یا اصطلاحات کے صحیح مفہوم کا سمجھ لینا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن یہودیوں کی جس پست ذہنیت کا بار بار ذکر کیا
 گیا ہے (اور تاریخ اس پر شاہد ہے) اس کی وجہ سے وہ اس پر بھی مذاق کرتے اور کہتے کہ

وَقَالَتِ الْيَهُودُ بِيَدِ اللَّهِ مَغْلُوبَةٌ ۖ غَلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلَعْنُوا إِبْرَاهِيمَ ۖ قَالُوا مَا
 بَلُيَدُهُمْ مُبْسُوطَةٌ لَّا يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۖ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَا أُنْزِلَ
 إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ وَالْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ
 إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْعِمْرَانِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۖ وَيَسْعَوْنَ
 فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۖ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝

جب ہم جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ نظام خداوندی کے قیام کے لئے مال و دولت صرف کرو تو یہ (یہود) اس کا
 مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا ان کے خدا کو دیکھو۔ جو ان سے کہتا ہے کہ ہماری راہ میں خرچ کرو۔ ہمیں قرضہ دے کیا اس خدا
 کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جو وہ انسانوں سے خرچ کرنے کو کہتا ہے اور ان سے قرض مانگتا ہے؟
 حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ خود بنجیل بن چکے ہیں، فلاح انسانیت کے کاموں میں کچھ خرچ نہیں کرتے، جس کا نتیجہ
 یہ ہے کہ یہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے رہتے ہیں۔
 ان سے کہو کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں۔۔۔۔۔۔ اس کے دونوں ہاتھ کھلے اور کشادہ ہیں۔ وہ اپنے قافلوں
 مشیت کے مطابق اپنے خزانوں کے منہ کھلے رکھتا ہے۔ (لیکن اس کے انفاق کا انداز اپنا ہے۔ وہ اس کے لئے
 ایک جماعت تیار کرتا ہے جو اس کے پروگرام کو پورا کرتی ہے۔) (۹/۱۱۱ د ۳۶)۔

تم نے دیکھا کہ خدا کے وہی احکام، جن سے ایمان والوں کے جذبات اطاعت ابھرتے اور بڑھتے ہیں، کس
 طرح، ان لوگوں کی سرکشی اور انکار کے جذبات کو بھڑکانے کا موجب بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ ہے انداز نگاہ کا
 فرق اور نفسیاتی تبدیلی کا اثر! ان کی اس ذہنیت اور مذہب کا رد و باریا یعنی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ان میں باہمی بغض و
 عداوت پیدا ہو چکی ہے۔۔۔۔۔۔ نیز اپنی ذہنیت بدلیں گے، نہ بغض و عداوت کے جذبات مٹیں گے۔۔۔۔۔۔
 ان کی حالت یہ ہے کہ یہ جہاں رہیں گے، ملک میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ انہوں نے کئی
 مرتبہ جنگ کی آگ بھڑکانے کی بھی کوشش کی لیکن اللہ نے (دوسری جماعتوں کے ذریعہ سے روک تھام کر کے

(۲۲) اسے بجا دیا۔ اس لئے کہ اللہ فساد انگیزی اور خوریزی کو پسند نہیں کرتا۔

آیت میں کَيْفَ يَشَاءُ سے بات واضح کر دی۔ یعنی کرنے کو تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا کہ براہ راست اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتا۔ لیکن اس کا اندازہ در طریق اس سے مختلف ہے۔ (کَيْفَ يَشَاءُ) انسانوں کی دنیا میں وہ اپنی ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں پوری کیا کرتا ہے۔ اس لئے انسانوں کے معاشی مسائل کا حل اس نظام کی رو سے ہو گا جو قوانین خداوندی کی رو سے قائم ہو گا۔ اس وقت جس اتفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی جا رہی ہے وہ اس نظام کے قیام کے لئے ہے۔ اور یہاں پر قرآن کریم کی کشادہ نگہی کا ایک اور فردوس بدمان منظر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہودیوں نے نبی اکرمؐ اور آپ کے مشن کی مخالفت کی انتہا کر دی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا رد عمل یہی ہوتا کہ ایسے دنی الطبع دشمنوں پر کامرانی اور شاورمائی کی راہ کبھی کشادہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن خدا نے رب العالمین کی طرف سے اس قسم کا انتقامی رد عمل نہیں ہوا۔ فرمایا کہ انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے یہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے گئے اگر یہ اس راستے کو چھوڑ کر اب بھی صحیح راستہ اختیار کر لیں تو زندگی کی خوشگوار یوں سے اس طرح بہرہ یاب ہو جائیں گے جیسے تم بہرہ یاب ہو۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَا دُخِلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝

لیکن اس کے باوجود ہم نے ان پر سعادت و برکات کے دروازے بند نہیں کئے۔ اگر یہ لوگ (قرآن پر ایمان لے آتے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہتے، تو ہم ان کی (خود پیدا کردہ) ناہمواریوں کو دور کر دیتے اور انہیں بھی زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگوار یوں سے نوازتے۔

اگر یہ پہلے بھی ذلت اور پستی کے عذاب میں ماخوذ ہوئے تھے، تو اس لئے نہیں کہ ہماری طرف سے ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی ہوئی تھی۔ یہ اس لئے ہوا تھا کہ انہوں نے وحی کا متعین کردہ راستہ چھوڑ دیا تھا۔
وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكْلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ط مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ ط وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۝

جب یہ لوگ پہلے بھی زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم کئے گئے تھے تو اس کی وجہ کوئی ذاتی غنا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے قوانین خداوندی کا اتباع چھوڑ دیا تھا۔ اگر یہ تورات و انجیل کی حقیقی تعلیم پر کار بند رہتے

توان پر آسمان و زمیں کی برکات کے دروازے کھل جاتے اور ہر مقام سے رزق کے چشمے ابلتے چلے آتے۔
(یٰس، ۶۶)۔ لیکن انہوں نے بجز معدودے چند جنہوں نے میانہ روی اختیار کی، اپنے لئے بری بری
راہیں تلاش کر لیں اور سخت معیوب حرکات شروع کر دیں۔

اب پھر ان کے لئے بار آفرینی کا موقع آیا تھا۔ اگر یہ اس ضابطہ ہدایت (قرآن) پر کار بند ہو جاتے تو پھر
انہی برکات سے بہرہ یاب ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

اس بنا پر حضورؐ سے کہا گیا کہ آپ، بلا امتیاز اور بلا تخصیص و تفریق پیغاماتِ خداوندی کو غام کرتے جائیں۔ انہیں
علیٰ قدر وسعت ہر ایک تک پہنچاتے جائیں۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ط وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ط وَاللَّهُ يُعَذِّبُكَ مِنَ النَّاسِ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝

تبلغ رسالت
ہاں ہمد، اے رسول! تم اس ضابطہ ہدایت کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا
ہے، تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو، تاکہ کوئی شخص صحیح راہنمائی نہ پہنچنے کی
وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے (یٰس، ۶۶)۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے (یٰس، ۶۶)۔ اگر تم نے ایسا نہ
کیا تو یہ فریضہ رسالت کی عدم ادائیگی ہوگی۔ تم ان لوگوں کی مخالفت کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے
مشن کو مخالفین کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھے گا (یٰس، ۶۶)۔

تم اس حقیقت کو بھی یاد رکھو کہ تمہارے ذمے اس پیغام کو پہنچا دینا ہے۔ تم اس کے مکلف نہیں۔ کہ لوگ
اُسے بالضرورت قبول بھی کر لیں۔ (۲۴۲، ۱۹۹، ۲۶، ۲۸)۔ جو لوگ اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم نے
کسی کی بات ماننی ہی نہیں، خواہ وہ کیسی ہی حق و صداقت اور علم و بصیرت پر مبنی کیوں نہ ہو، تو ایسے لوگ کبھی
راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ (یٰس، ۶۶)۔

مندرجہ بالا مفہوم میں جن آیات کے حوالے دیئے گئے ہیں، انہیں آپ دیکھ لیں گے تو مزید تشریح کی ضرورت
نہیں رہے گی۔ رسول اللہؐ کے بعد قرآن مجید کی تبلیغ امت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے آسمان سے کسی مامور بن اللہ
کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے اس فریضہ کی ادائیگی میں تغافل برتا تو ہم بھی عذاب
میں مبتلا ہیں اور باقی اقوامِ عالم بھی زندگی کی کشمکش میں مبتلا۔ جو قوم بھی قرآن کو اپنا

راہنما بنا کر اسے دوسروں تک پہنچائے گی، وہی فریضہ تبلیغ رسالت ادا کرے گی۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ **وَاللّٰهُ يَعْصِيكَ مِنَ النَّاسِ** ط تو اس کی تشریح کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۰۱) آیت ۲۲ دیکھیے۔ اس کے بعد پھر ان (اہل کتاب) سے کہا کہ تمہاری تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تم نے وحی کی رو سے دی گئی ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اب وہی ہدایت (جو تمہارے پاس اس کی اصلی شکل میں موجود نہیں) اس قرآن میں جامع طور پر دے دی گئی ہے۔ اس کا اتباع کر دگے تو زندگی کی خوشگوار یوں سے منتفع ہو جاؤ گے۔

**قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ
وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ سَرِّبِكُمْ وَلَٰيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا
أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ
الْكَافِرِينَ ۝**

۵
۴۸

ان اہل کتاب سے کہہ دو کہ یہی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرنے اور اس طرح خود بھی دھوکے میں رہنے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جب تک تم تورات و انجیل کی حقیقی تعلیم پر جواب اس ضابطہء خداوندی میں محفوظ کر دی گئی ہے، قائم نہیں ہو جاتے۔ تمہاری کوئی بات قابل اعتناء نہیں سمجھی جاسکتی۔

لیکن تم دیکھو گے کہ قرآن کی طرف دعوت ان لوگوں کے جذبات سرکشی اور عداوت کو اور تیز کر دے گی سو تم ان کی تباہی پر نأسف نہ کرو۔ اس لئے کہ انہوں نے دیدہ و انداز اپنی تباہی کو اپنے ہاتھوں خرید رکھا ہے۔ اس سے انہیں کون بچا سکتا ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ **فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ**، تو اس کی تشریح کے لئے اگلے صفحات دیکھیے۔ اس کے بعد پھر اس اسیل عظیم کا اعلان کہ دین کے دروازے ہر قوم اور ملت کے لئے یکساں کھلے ہیں۔

**إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالتَّمُزِيُّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝**

۵
۴۹

تم ان سے برابر کہتے جاؤ کہ اسلام کے دروازے ہر قوم اور ملت کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ صابی ہوں یا وہ لوگ جو کسی رسمی گروہ میں داخل ہوئے بغیر، ویسے ہی خدا کو ماننے والے ہیں۔ یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے۔ غرضیکہ کوئی بھی ہو خدا کے اقتدار

اعلیٰ زندگی کے تسلسل اور اس کے قانون مکافات پر اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن میں بتایا گیا ہے۔
 (۲/۳۳۱) اور اس کے دئے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرائے تو انہیں کسی قسم کا خوف و خطر
 اور حزن و ملال نہیں ہوگا۔ وہ انتہائی اطمینان اور امن کی زندگی بسر کریں گے۔ (۲/۳۳۱)۔
 یہ آیت، انہی الفاظ میں (۲/۳۳۱) میں آچکی ہے۔ اس کی تفسیر، مطالب الفرقان جلد اول (صفحہ ۹۴-۸۱) اور
 جلد دوم (صفحہ ۳۰۵-۳۰۶) آیت (۲/۳۳۱) پر دیکھیے۔

صائبین

صائبین کا لفظ یہاں بھی آیا ہے اور اس سے پہلے (۲/۳۳۱) میں۔ اور اس کے بعد (۲/۳۳۱) میں بھی آئے گا۔ سورہ تہ
 اور سورہ مائدہ (زیر نظر آیت میں) یہ، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ہم اور سورہ حج میں یہود۔ نصاریٰ اور
 مجوس کے ساتھ۔

صائبی مذہب بڑا قدیم ہے۔ عیسائیت سے بھی پہلے کا۔ اس لئے صائبین کی تاریخ زیادہ تر قیاسات پر مبنی ہے
 اہل کے اعتبار سے اس کا تعلق یونانی تصوف سے ہے۔ یونانی لفظ ناسٹک (Gnostics) کے معنی عرفان (معرفت)
 کے ہیں۔ اس فلسفہ کے ماننے والے ناسٹک کہلاتے تھے۔ اس نے یہودیت پر بھی اپنا اثر ڈالا اور عیسائیت پر بھی
 اس کے پیر مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک گروہ صائبین کے نام سے منسوب ہے۔ یہ اپنے آپ کو
 مندع (MANDAENS) بھی کہتے ہیں۔ اس کے معنی بھی عرفان اور نجات کے ہیں۔ ان کا اصلی وطن فلسطین تھا۔ بعد
 میں یہ وہاں سے نقل مکان کر کے وادی دجلہ و فرات میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی کتابوں میں لفظ "باردنا" اکثر آتا ہے
 جس کی اصل اردن ہے۔ معنی اس کے صاف و شفاف جاری پانی کے ہیں۔ ان کے مذہب کی بنیادی رسم ہتھمہ ہے جو جاری
 پانی کے سوا کسی پانی سے ادا نہیں ہو سکتی۔

فلسطین سے ان کا ایک گروہ وان کی طرف چلا گیا لیکن یہ بعد محض مکانی نہ رہا۔ ان میں عقائد کا بھی اس قدر اختلاف
 ہو گیا کہ مندعانی اور وانی دو مستقل فرقے بن گئے۔ مندعانیوں میں ان کے اصلی عقائد کے کچھ کچھ نقوش باقی رہے لیکن وانیوں
 نے دیگر مذاہب سے اس قدر زیادہ اثرات لئے کہ یہ ایک الگ سا مذہب بن گیا۔ مکرانیوں کی سندارہ پرستی۔
 بابلیوں کے طلسمی عقائد، جھار پھونک وغیرہ۔ قرآن کریم میں جن صائبین کا ذکر آیا ہے (معلوم ہوتا ہے کہ وہ) مندعانی ہیں۔
 زمانہ نزول قرآن کے عرب ان سے واقف تھے۔ آج کل یہ عراق۔ کویت اور بصرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی بہت سی

مقدس کتابیں ہیں جن میں سے کتاب گینزا (GANZA) مفصل بھی اور مشہور بھی۔ لاطینی اور جرمنی زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے قائل ہیں۔ عبادات میں نماز کو اولیت حاصل ہے۔ نمازیں وقتوں کی ہے۔ طلوع آفتاب سے پہلے۔ زوال آفتاب کے بعد۔ اور غروب آفتاب کے بعد۔ نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ غسل۔ وضو وغیرہ کو ان کے ہاں خاص اہمیت حاصل ہے۔ نماز ان کی قیام اور رکوع تک محدود ہے۔ سجدہ نہیں کرتے۔

لغت عربی میں صابی کا مادہ (ص۔ ب۔ ا) ہے جس کے معنی ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا ہے چونکہ ان لوگوں نے یہودیت سے نکل کر الگ دین اختیار کر لیا تھا اس لئے عرب انہیں صابی کہتے تھے۔ عرب انہیں "منقلہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ نہانے۔ دھونے میں بڑی شدت برتتے تھے۔

بیشنگز کے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجز اینڈ اینٹس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت الکیسانی (ELKESAITES) فرقہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہوا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہوا (مزید تفصیل کے لئے میری لغات القرآن میں مادہ (ص۔ ب۔ ا) دیکھئے۔

﴿

اسکے بعد یہودیوں کو اس عہد کی یاد دلائی گئی ہے جو ان سے (ان انبیاء کی وساطت سے) لیا جاتا تھا:

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَآسَرْنَا إِلَيْهِمْ سُرًسُلًا طُكَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ﴿٥﴾

یہی پیغام تھا جو ہم نے مختلف پیغمبروں کی معرفت، بنی اسرائیل کی طرف بھی بھیجا تھا اور ان سے اس پر قائم رہنے کا عہد لیا تھا۔ لیکن ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جب کسی رسول نے ایسی بات کہی جو ان کے رجحان کے خلاف جاتی تھی۔ اور اس لئے انہیں ناپسند تھی، تو یہ وہیں اکڑ جاتے۔ پھر ان رسولوں میں سے بعض کی تکذیب کرتے اور بعض کو قتل بھی کر دیتے (۵/۲۶)

(اس کی تشریح اسی جلد میں صفحہ ۴۴۴ پر کی جا چکی ہے)۔ قتلِ انبیاء کے لئے مطالب جلد دوم صفحہ

۳۰۰ آیت ۲۶ دیکھئے۔

اور یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ انہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رہا تھا۔

وَحَسِبُوا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةً فَاعْمُوا وَصَوُّوا ثَمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
ثُمَّ غَشَّوْا وَصَوُّوا كَثِيْرًا مِنْهُمْ وَاللّٰهُ يُمَيِّزُ كَيْمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

۵
۴۱

انہوں نے اپنے دل میں سمجھ رکھا تھا کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کون باز پرس کرنے والا ہے۔ اور کون ہمیں تکلیف پہنچا سکتا ہے؟ اس تکبر اور نخوت کا نتیجہ تھا کہ یہ بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے (شدت جذبات میں ہوتا ہی ایسا ہے)۔ لیکن اس کے باوجود قانونِ خداوندی نے انہیں ہلکت دی اور جب انہوں نے اپنی روش بدل لی تو پھر زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد پھر ان کی وہی حالت ہو گئی اور انہوں نے پھر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیر لیں اور صداقت کی آواز کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے۔ اور خدا کا قانونِ مکافات برابر دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

بینو

یہودیوں کے بعد روئے سخن عیسائیوں کی طرف منعطف ہوا، اور انہیں بتایا گیا کہ ان کی گمراہی کی وجہ وہ غلط عقائد ہیں جو انہوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ (حضرت مریم) کے متعلق وضع اور اختیار کر رکھے ہیں۔ یہاں ان میں سے نین بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ یعنی الوہیت مسیح، تثلیث اور الوہیتِ حضرت مریم۔ یہ آیات اور ان کا مفہوم درج ذیل ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يَبْنٰى اِسْرَءٰىلَ اَعْبُدُوْا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا وَاوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

۵
۴۲

انہی اہل کتاب کا ایک گروہ (نصارى) یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مسیحؑ

ابنِ مریم، خدا ہے۔ یہ صریحاً کفر ہے۔ مسیحؑ نے اپنی قوم، بنی اسرائیل سے وہی کچھ کہا تھا جو دوسرے انبیاء کہتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ کہ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ وہ تمہارا پروردگار بھی ہے اور میرا بھی۔ جو شخص اللہ کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک کر لیتا ہے اس پر جنت حرام ہو جاتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ انسانوں کو خدا کا درجہ

دے دیا جائے۔ ایسے لوگوں کا کوئی سماجی ونام نہی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمِمَّنْ إِلَهٌ إِلَّا إِلَهُ
وَاحِدٌ وَإِنْ لَّمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لَهُ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

یہ کہہ دیں گے کہ ہم اکیلے مسیحؑ کو خدا نہیں مانتے۔ ہم باپ بیٹا۔ روح القدس تینوں کے مجموعہ کو خدا تسلیم کرتے
ہیں۔ اس لئے ہم خدا کے خدا ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ ان سے کہو کہ یہ کون سا توحید کا عقیدہ ہے؟ یہ
بھی کھلا ہوا کفر ہے۔ یاد رکھو خدا نے واحد کے علاوہ اور کوئی اللہ نہیں۔ نہ ہی اس کی شان الوہیت میں
کوئی اور شریک ہے۔

اگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنے ان باطل عقاید سے باز نہیں آئیں گے تو اس کفر کا نتیجہ الم انگیز عذاب کے
سوا اور کیا ہو گا؟ (۴۵)۔

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ ان عقاید کو چھوڑ کر خدا کی کتاب، قرآن کی طرف نہیں آنا چاہتے، جہاں
سے انہیں، اپنے سابقہ غلط عقاید کے مہرّت رسا نتائج سے حفاظت بھی مل جائے گی اور ان کی ذات
کی نشوونما کا سامان بھی۔

کیا یہ خدا سے اپنی حفاظت بھی طلب نہیں کرنا چاہتے؟

اس کے بعد عقیدہ الوہیت کی تردید ان الفاظ میں کی گئی ہے:

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ
وَإُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَعْلى الطَّعَامِ ۖ أَنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ
الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظِرْ أَنْ يَكُونُوا

مسیحؑ ابن مریم کا بیٹا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر ہو کر رہے ہیں۔ اور اس کی والدہ
ایک راستباز، سچی عورت تھی۔ وہ دونوں انسان تھے اور عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے ان کے
خدا ہونے کے خلاف یہی دلیل کافی ہے)

دیکھو! ہم کس طرح نکھار اور ابھار کربات واضح کر رہے ہیں اور یہ کس طرح اپنے انہی باطل عقائد کی طرف اُٹے پھر رہے ہیں۔

عیسائیوں کے ان عقاید کا ذکر زیر نظر جلد کے دوسرے باب میں کیا جا چکا ہے۔ ابن اللہ کے عقیدہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۴۳ آیت ۲/۳۸) دیکھئے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی الوہیت کے خلاف ایک دلیل (آیت ۵/۱۱۶) میں بھی پیش کی گئی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۸۱)۔ اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبانی اس کی تردید ذرا آگے چل کر آیت (۵/۱۱۶) کے تحت ملے گی۔

اس کے بعد ایک ایسی حقیقت سامنے لائی گئی ہے جس سے ہر غیر اللہ کی الوہیت کا تصور جڑ بنیاد سے کٹ

جاتا ہے۔ فرمایا:

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا
وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ان سے کہو کہ کیا تم خدا سے دوسرے ہی، ان ہستیوں کو اپنا اللہ (صاحب اقتدار خدا) تسلیم کر لیتے ہو جنہیں نہ تمہارے نفع کا اختیار ہے نہ نقصان کا۔ ان کے برعکس خدا وہ ہے جو سب کچھ سننے والا، اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس آیت میں ایک بڑا اہم، اصولی اور بنیادی سوال سامنے آتا ہے۔ یعنی نفع اور نقصان کا سوال حلیہ منفعت اور دفع مضرت وہ جذبات ہیں جو انسانی عمل کے محرکات بنتے ہیں یعنی انسان وہ کام کرتا ہے جس میں اسے فائدہ متوقع ہو اور ان امور سے بچتا ہے جن کے متعلق اسے خیال ہو کہ وہ مضرت رسان ہیں (یعنی وہ اسے نقصان پہنچا دینگے) آپ نے عام لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ ”وہ تو پاگل ہے، اسے اپنے

جلب منفعت و دفع مضرت

نفع نقصان کا بھی خیال نہیں“ یعنی ہوشمند وہ ہے جسے اپنے نفع نقصان کا خیال ہو۔ جسے اس کا خیال نہ ہو، وہ پاگل ہے۔ بادی تدبیر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان ڈرتا اس سے ہے، جس سے اُسے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اور جاتا اس کی طرف یا جھکتا اس کے سامنے ہے جس سے کسی منفعت کی توقع ہو۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور کریں۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ جہاں بھی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے آگے جھکا ہے، اُس کا محرک یہی جذبہ تھا۔ وہ ارباب اقتدار ہوں یا اعیان مذہب (ارباب شریعت ہوں یا اصحاب طریقت) انسانوں کے سامنے ہی نہیں۔ لوگوں نے اپنے تخیل اور واہمہ سے جن موہوم قوتوں کو نفع

نقصان پہنچانے کا مقصد سمجھا، ان کے سامنے بھی اس جذبہ کے تحت جھکے۔ دیوی دیوتا، بھوت پریت، یا مذہبی پیشوا اور مدعیانِ روحانیت وغیرہ۔ انسان نے ہر چوکھٹ اور ہر آستانے پر اس جذبہ کے تحت مرجھایا۔

قرآن نے آکر اس جذبہ محرک کی جڑ کاٹ کر رکھ دی، اور اس طرح انسان کو صحیح شرفِ انسانیت اور آزادی سے متعارف کرایا، اور اسے سراونچا کر کے چلنے کے قابل بنایا۔

قرآن کریم نے نفع اور نقصان کو دو ہی شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک انسانی ذات (نفس یا خودی) کا نفع اور نقصان، اور دوسرا اس کی طبعی زندگی کا نفع اور نقصان۔ جیسا کہ مطالب الفرقان۔ جلد اول (صفحہ ۲۵۰) آیت ۲۴ پر لکھا جا چکا ہے حقیقی نفع اور نقصان وہی ہے جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے، کیونکہ انسانی ذات ہی درحقیقت اصل حیات ہے۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ انسانی ذات کو انسان خود ہی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کا کچھ نقصان کر سکتا ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے

انسانی ذات کا نفع نقصان | ارشاد خداوندی ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَفْزَحْكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ** (۵۴)۔ اے جماعتِ مومنین! تم اپنی ذات کی حفاظت کا خیال رکھو۔ یا درکھو، اگر تم سیدھے راستہ پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستوں پر چلنے والے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اُن کی دترس تمہاری ذات تک ہے ہی نہیں۔ اس کا تعلق خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے۔ وہیں سے یہ فیصلہ ہوگا کہ تم نے کوئی ایسا کام کئے تھے جو تمہاری ذات کے لئے منفعت بخش تھے اور کون سے ایسے جو اس کے لئے مضر تھے۔ یہ اس آیت کا سٹا ہوا مفہوم ہے۔

طبعی زندگی کا نفع نقصان | جہاں تک انسان کی طبعی زندگی کے نفع نقصان کا تعلق ہے، قرآن کریم سب سے پہلے انسانی ذہن کو ان توہم پرستیوں سے آزاد کرتا ہے

جن کی بنا پر وہ موہوم قوتوں کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھتا ہے۔ ”موہوم“ کے معنی یہ ہیں کہ جس شے (یا ہستی) میں کوئی قوت فی الحقیقت نہ ہو، اپنے ذہن میں خیال کر لینا کہ اس میں وہ قوت موجود ہے۔ دیوی دیوتا۔ مٹی اور پتھر کی مورتیاں۔ ان سے آگے بڑھتے تو پیر فقیر، صوفیاء، ادویاء۔ حتیٰ کہ اُن کے مراد اور آستانے سب انہی موہوم

توہم پرستی | قوتوں کے پیکر ہیں۔ یعنی ان میں اس قسم کی کوئی قوت درحقیقت نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن کی عقیدتیں انہیں ان قوتوں کا حامل سمجھ لیتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ لا الہ الا اللہ ان تمام قوتوں کا

خاتمہ کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات میں صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات ہے، اور کسی میں نفع نقصان پہنچانے کا اقتدار نہیں۔ سارا قرآن اسی اصل الاصول کی تفسیر ہے۔ **وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ**

ہم ط..... (۲۵)۔ (نیز ۶/۲۱، ۱۰/۱۸، ۲۱/۶۶، ۲۲/۱۲)۔ یہ لوگ ان کی معبودیت اختیار

کرتے ہیں جنہیں ان کو نفع نقصان پہنچانے کا کوئی اقتدار نہیں، دوسروں کو نفع نقصان پہنچانا تو ایک طرف، ان (دو) یوں

دیتاؤں۔ بتوں۔ قبروں) کو تو خود اپنے آپ کو نفع

پیر فقیر۔ اولیاء اللہ کسی میں یہ قدرت نہیں | نقصان پہنچانے کا بھی اختیار نہیں۔ (۲۵)۔

انسانوں کی دنیا میں قرآن کریم کی ایک جامع اصلاح ”أُولِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ“ ہے جنہیں لوگ، کسی نہج سے

بھی حاجت روا سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی اُس نے برملا کہہ دیا کہ تمہیں تو ایک طرف، وہ خود اپنے لئے بھی (قانونِ

خداوندی کے خلاف) نفع نقصان پہنچانے کا اقتدار نہیں رکھتے: قُلْ أَفَاتُخَذُ تَحَمُّنًا دُونَهُ أُولِيَاءَ

لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ط..... (۱۳)۔ اسے رسول! ان سے کہو کہ کیا تم، خدا کو چھوڑ

کر، ان ”اولیاء“ کو حاجت روا سمجھتے ہو جنہیں اپنے آپ کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں، جہاں عقیدت

و احترام میں حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم سے بلذاور کون سی ہستی ہو سکتی ہے؟ آپ کی زبان مبارک سے یہ

اعلان کر دیا کہ قُلْ لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط..... (۱۸، ۱۹)۔

”ان سے کہہ دو کہ قانونِ خداوندی کے علی الرغم، میں خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی قسم کے نفع نقصان کا اختیار

نہیں رکھتا“ اور جب اپنے لئے بھی اس کا اختیار نہیں رکھتا، تو تمہارے لئے کیا اختیار رکھوں گا؟ (۲۱)۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین نافذ کر رکھے ہیں۔ ان کے مطابق چلنے سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی خلاف ورزی سے

نقصان۔ یہ قوانین اُل ہیں اور انہیں بدلنے کا کسی کو اختیار و اقتدار نہیں۔ (۳۸، ۱۱)۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے

ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق چلتے ہیں تو تندرست رہتے اور (مریض ہونے کی صورت میں) شفا یاب

ہو جاتے ہیں۔

انسانوں کے ہاتھوں نقصان | اب رہے وہ نقصانات جو ہمیں خود انسانوں کے ہاتھوں اٹھانے

پڑتے ہیں، تو اس باب میں بھی قرآن کریم ہمیں بڑا بلند اصول عطا کرتا

ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں نقصان اٹھانے میں بھی تمہاری اپنی غلطی یا کمزوری کا دخل ہوتا ہے۔ لوگ

دھوکہ دے جاتے ہیں جس کی وجہ سے تمہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کا ایک قول بڑا بیغ ہے

کسی نے کہا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ آپؐ نے کہا کہ بات پوری کہو۔ مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور یہ، درحقیقت، تفسیر بھی خدا کے اس ارشاد کی جس کی رو سے اُس نے کہا تھا: **يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا حَتّٰى يَخْذَعُوْنَ اِلَآئِهَا نَفْسُهُمْ وَمَا يَسْعُرُوْنَ** (۲/۱۰۵) ”یہ لوگ خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ انہیں دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ درحقیقت خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اسے سمجھتے نہیں“ خدا تو بہر حال نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور مومنین وہ ہوتے ہیں جو (علیٰ حد بشریت) صفاتِ خداوندی اپنے اندر منعکس کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کی بھی کیفیت مومن نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے | یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں، نہ دھوکا کھاتے ہیں (بجز اس کے کہ کوئی تھوڑے سے وقت کے لئے منافقت کے پردے میں انہیں دھوکا دے جائے)

اب، انسانوں کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے نقصان اٹھانے کی ایک ہی شکل رہ گئی۔ اور وہ ہے مستبد حکمرانوں کی طرف سے محکوموں کو اذیت رسانی جس کی دنیا میں روش عام ہے۔ اس باب میں قرآن کریم **مُتَّبِعِ حُكَّامَ كِي طَرَفٍ سَے مَضَرَات** | ایک ایسی عمیق اور حیات آور حقیقت سامنے لاتا ہے جس پر غور کرنے سے انسانوں پر پڑے ہوئے پردے

اُٹھ جاتے ہیں۔ اس حقیقت کے بیان کرنے کا اس کا انداز بھی بڑا محاکاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہنم میں حکمرانوں اور محکوموں۔ لیڈروں اور ان کے پیچھے چلنے والے عوام میں باہمی مکالمات ہونگے۔ وہ ایک دوسرے کو مطعون کرینگے کہ ان کی وجہ سے وہ بھی گمراہ ہوئے اور جہنم میں پہنچے ہیں۔ (ان مقامات کی تفصیل میری کتاب ”جہان فردا“ میں ملے گی۔ آیات قرآنی کے حوالوں کے لئے دیکھئے $\frac{۱۷}{۲۱}$ ، $\frac{۳۴}{۳۲}$ ، $\frac{۴۰}{۴۸-۴۷}$ ، $\frac{۲۳}{۶۷}$ ، $\frac{۳۷}{۶۹-۶۷}$ ، $\frac{۲۸}{۶۷}$)۔ ان مکالمات میں سے ایک مقالہ کو قرآن خاص طور پر نمایاں کر کے سامنے لایا ہے۔ کمزور اور ناتواں

جہنم میں عوام اور لیڈروں کے مقامات | محکوم و مقہور لوگ، خدا سے عرض کریں گے کہ ان مستبد حکمرانوں اور لیڈروں کو دو ہزار عذاب دیجئے۔ یہ خود

بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ نظرِ ظاہر اُن کا اعتراض بڑا زنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہاں تو معاملہ خدائے بصیر و حکیم سے ہوگا۔ جواب ملے گا کہ اگر انہیں دو ہزار عذاب ملے گا تو تمہیں بھی دو ہزار عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کے پاس وہ کونسی قوت تھی جس سے مستبد اور ظالم بن گئے تھے۔ یہ سادی قوت خود تمہاری عطا کردہ تھی۔ یہ

تمہارا ضعف، ناتوانی، کمزوری، دوں بہتی، بزدلی تھی جس کی وجہ سے ان کی جراتیں بیباک سے بیباک تر ہوتی گئیں۔ اگر تم صاحبِ قوت و عمل اور اربابِ عزم و ہمت ہوتے تو ان کی کیا مجال تھی جو یہ تم پر (یا دوسرے انسانوں پر) ظلم و زیادتی کرتے۔ ان کے ظلم و استبداد کے خالق تم ہو۔ ان کی خدائی کی حقیقت اس سے زیادہ کیا تھی کہ۔

اِسْخٰدا تَسْجِدُوْا لِّہٖ کَرُوْی خَدٰسْت تَمٰی کَیْہِ اَنْدَر قِیَامِ اَیْ فَنٰسْت (اقبال)

تم ان کے حضور سجدے میں گرے رہے، تو یہ مسندِ خداوندی پر سرفراز رہے۔ تم اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تو یہ اس مسند سے خود بخود نیچے گر پڑتے۔ جو قویں، مستبد حکمرانوں کے سامنے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اُن (حکمرانوں) کی ہستی، غبارِ راہ کی طرح فضا میں گم ہو جاتی ہے اور تاریخ میں صرف اُن کے مظالم کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اُن کی خدائی، محکموں کی غلامانہ روش کی رہیں منت ہوتی ہے۔

گمراہ کو تاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سٹٹے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اِنْ خَفٰی کِی رُوْشِی مِی غُوْر کِیجئے قرآن کریم کی اس تعریض پر کہ — اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا (۵۷)



بندوں کو اس طرح خدا بنالینے کا راز قرآن مجید نے اگلی آیت میں، ایک لفظ میں، بیان کر دیا۔
 ۵۷
 ۷۷
 قُلْ یٰۤاَہْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا
 اَہْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ
 السَّبِیْلِ ۝

ان سے کہو کہ اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو (مبالغہ) نہ کرو۔ ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر رکھو۔ اس سے آگے نہ بڑھاؤ۔ خدا کو خدا مانو۔ رسول کو رسول۔ اور اُن لوگوں کے جذبات و تصورات کے پیچھے نہ لگو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے ساتھ اور بہت سوں کو گمراہ کر دیا۔ یہ سب سیدھے راستے سے بھٹک کر کہیں سے کہیں چلے گئے۔

یاد رکھو! انبیاء کی نبوت سے انکار بھی گمراہی نہیں۔ انہیں، ان کے مقام سے آگے بڑھا دینا بھی گمراہی ہے اور سخت گمراہی۔

دین میں غلو | ”غلو فی الدین“ کے متعلق مطالب جلد دوم (صفحہ ۱۹۳ آیت ۲) پر تفصیل سے

لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا اضافہ ضروری ہے کہ جس طرح ہم، مذہب کے دیگر معاملات میں اہل کتاب سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے، غلو فی الدین میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ قرآن کریم نے حضور نبی اکرم کی بشریت کو بار بار اس لئے دہرایا تھا کہ آپ کو فوق البشر نہ سمجھ لیا جائے۔ اسلامی نظام میں اس کا اس قدر اہتمام کیا گیا کہ

کلمہ شہادت میں حضور کی رسالت پر ایمان کے ساتھ ہی، آپ کی
عبدیت کو بھی جزو ایمان بنا دیا۔ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا

رَسُولُ اللّٰهِ كِي شَانِ اَقْدَسُ مِنْ غُلُو

عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ۔ اور دن میں کم از کم پانچ مرتبہ دنیا کے گوشے گوشے، اور کونے کونے (ہر مسجد) سے،
آواز بلند (اذان میں) اس کا اعلان ضروری قرار دیا۔ لیکن ہم زبان سے اس (قرار و اعلان کے باوجود بڑے فخر اور مباہات
سے پکارتے ہیں کہ

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اگر کسی نے اس پر لب کشائی کی جرات کی تو جواب میں کہہ دیا

مجھے معذور رکھ، میں مسرت صبیائے محبت ہوں

(جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم نے بالفاظ صریح کہہ دیا کہ حضور کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ آپ کا
معجزہ کتاب اللہ اور آپ کی سیرت مقدسہ ہے۔ لیکن ہم نے سینکڑوں معجزات وضع کئے اور انہیں حضور کی طرف

منسوب کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) کو بے مثل و بے نظیر قرار دیا تھا۔ عقیدہ

معجزات

یہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ کے اقوال۔ (احادیث) قرآن کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے

ہاں عمل بھی اسی عقیدہ کے مطابق ہو رہا ہے۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۷۹ آیت ۲/۱۸۱)۔

یہ عقیدہ، احادیث منسوب الی الرسول تک ہی محدود نہیں رہا۔ آگے بڑھتے تو فقہاء کے مدوں

احادیث

کردہ قوانین (فقہ) کے متعلق بھی یہی عقیدہ اختیار کیا گیا۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے پیشوا اور

مسلم امام، ابوالحسن عبداللہ الکرخی کا قول ہے:

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ فقہ حنفیہ) ہیں، وہ بات و ماوّل ہے یا منسوخ

فقہ

اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ بھی ماقول یا منسوخ ہے (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ محمد انصاری مرحوم۔ اردو ترجمہ

نٹایع کردہ دارالمصنفین۔ عظیم گڑھ صفحہ ۴۲۱)

۱۔ یہ موضوع سابقہ باب (آیت ۲/۱۸۱ کے تحت) بھی آچکا ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے اس کا کچھ حقہ بیان بار دیگر پیش کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے ہاں جو قوانین شریعت مروج چلے آ رہے ہیں، وہ قرآن کریم کے نہیں، فقہ کے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر دیشتر قرآن کے خلاف ہیں۔

پیر اور مرشد

یہاں تک تو ادبِ شریعت کی بات تھی۔ اہل طریقت (پیروں اور مرشدوں) کی طرف آئیے، تو وہاں جس انداز کا غلو ملتا ہے، اس کا اندازہ ان حضرات کی مجلسوں، عرسوں اور قوالیوں سے لگ سکتا ہے۔ عام مشہور ہے کہ پیراں فی پرند۔ مریداں پر اند۔ ”پیر خود نہیں اڑتے۔ ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں۔“ اس سلسلہ میں ایک لطیف یاد آگیا ہے تو وہ لطیف ہی، لیکن ”مریداں پر اند“ کی بڑی دلنشین شہادت ہے۔ دو مرید اپنے پیروں کی عظمت اور بزرگی کے متعلق ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ میرا پیر غوث ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا پیر قطب ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیرا بدل ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا پیر پیغمبر ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیر خدا ہے اس کے بعد کوئی مقام ہی باقی نہیں تھا اس لئے دو مرید شکست کھا گیا شکست کھا کر وہ بھاگا بھاگا اس مرید کے پیر کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کو کچھ علم ہے کہ آپ کا فلاں مرید کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ”میرا پیر خدا ہے“ کیا یہ سچ ہے؟ پیر صاحب نے کہا کہ تو بہ۔ تو بہ۔ معاذ اللہ۔ میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔

وہ فخر سے گردن اٹھائے پہلے مرید کے پاس آیا، اور کہا کہ تمہارا پیر کہتا ہے کہ میں خدا نہیں ہوں، میرا مرید غلط کہتا ہے یہ سن کر اس مرید نے طیش میں آ کر کہا کہ

آں بچہ سگ چرمی داند۔ او خدا ہست

(اُس سگ بچہ کو کیا معلوم ہے! وہ خدا ہے)

اس طرح مرید پیروں کو اڑاتے ہیں، اور ان کے پیر بھی جانتے بوجھتے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ان کی خانقاہوں اور مزاروں کے ساتھ ان سب کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ مسئلہ سارا معاشی ہوتا ہے۔ ہر مذکدار اپنے مال کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہے۔ غلو سے مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

حکایتِ قدآں یار دل نواز کنم بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنم

دین یہ ہے کہ خدا کو خدا کے مقام پر رکھو۔ رسول کو مقامِ رسالت پر، اور انسانوں کو مقامِ انسانیت پر۔

لہٰذا میں نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے، اپنی نئی تصنیف — تصوف کی حقیقت — میں بحث کی ہے۔ امید ہے وہ کتاب، اس جلد کی طباعت کے وقت تک شائع ہو چکی ہوگی۔

سلاطین کے حق میں غلو

مذہب سے بہت کرسیاست کی طرف آئیے تو ہمارے ہاں ملوکیت (موروثی بادشاہت) کو نخل اسلام کی جڑ کاٹ دینے والا نظریہ اور ادارہ قرار دیا جاتا ہے۔ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے اور عملاً حالت یہ ہے کہ صدر اول کے بعد آج تک (ہر زمانے اور ہر ملک میں) ہمارے ہاں ملوکیت ہی ہیچ حکومت چلی آرہی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ائمہ اور اکابر دین ان بادشاہوں کو سلطان ظل اللہ علی الارض کے مقام سے نوازتے اور محراب و منبر سے ان کی مملکت کے استحکام و استیفاء کی دعائیں مانگتے تھے (اور اب بھی مانگتے ہیں) آپ نے کبھی ہمارے اس تضاد عمل پر بھی غور فرمایا ہے کہ یزید کی اس لئے مذمت کی جاتی ہے کہ اس نے بادشاہت کو ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ یزید کے بعد اس وقت تک جب قدر مسلمان سلاطین گزرے ہیں (اور ہیں) ان سب نے اسی طرح بادشاہت کی تھی (اور کی ہے) جس طرح یزید نے۔ یزید متفقہ طور پر قابل مذمت اور بے سلاطین متفقہ طور پر مستحقِ حمد و ستائش۔ ان سلاطین کو جن حقوق کا اہل قرار دیا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

۱۔ ایبانی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبد الملک کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ بادشاہ قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے
(تاریخ ایبانی۔ ص ۲۳۷ بحوالہ "امام بو حنیفہ کی سیاسی زندگی")

از مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) صفحہ ۳۵)

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بادشاہ وقت سے ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور ہو، تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ (احکام القرآن۔ ج ۲ ص ۳۲ بحوالہ بالا صفحہ ۳۵)

۳۔ فقہ حنفی نے اس باب میں ذرا سی نرمی برتی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ امیر (سربراہ مملکت) قتل کے سوا جو جرم

بھی کرے تو اس پر حد نہیں۔ (ہدایہ اولین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

یہ مقام عطا کیا ان حضرات نے ان بادشاہوں کو جن کا وجود ہی سرے سے خلاف قرآن تھا یعنی غلو کی انتہا یہ تھی کہ پہلے ان بادشاہوں کو ظل اللہ (خدا کا سایہ) قرار دیا اور پھر مواخذہ خداوندی کے سلسلہ میں انہیں حضور رسالتاً سے بھی بلند مقام عطا کر دیا حضور کے متعلق قرآن مجید میں ہے: (قُلْ) اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصِیْتُ سَارِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۱۱)۔ "ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ مجھے اس کا خوف لاحق رہتا ہے"

یہ ہے اس قوم کا مشرب اور مسلک جسے متنبہ کیا گیا تھا کہ تم اہل کتاب کی طرح دین میں غلو نہ کرنا۔

خدا ایسے سخت جان ریا رباؤں کہ افتاد است از ہام بلند سے (اقبال)

یہودیوں کے اس قسم کے اعتقادات اور جرائم تھے جن کی بنا پر ان کے مختلف انبیاء نے انہیں ملعون قرار دیا تھا۔

لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ط ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝

بنی اسرائیل کے گمراہ کن عقائد اور نبیاء کن روش کے متعلق جو کچھ اس وقت کہا جا رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ لوگ اس سے قبل، اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر خود اپنے دو برگزیدہ پیغمبروں، داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی زبان سے بھی ملعون قرار دیئے گئے تھے۔ یعنی انہوں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ان کی اس غلط روش کی وجہ سے ان سے نوازشات خداوندی چھینی جا رہی ہیں۔

جرائم عام ہو چکے تھے | پہلے کہا گیا تھا کہ ان کے مذہبی پیشوا ان جرائم کے ارتکاب سے روکتے
ٹوکتے نہیں تھے (۵۹)۔ اب کہا کہ یہ جرائم اس قوم میں اس قدر عام ہو گئے
تھے کہ کوئی انہیں قابلِ مذمت سمجھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی ایک دوسرے کو روکتا ٹوکتا نہیں تھا۔ سب اس رویے
پہ چلے جاتے تھے۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ط لَيْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝
اُس وقت ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ ان کے معاشرہ میں برائیاں عام ہو چکی تھیں اور ایک دوسرے کو
روکتے ٹوکتے بھی نہیں تھے۔

صدیوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے حق و باطل دونوں ہوں، تو یہ حق کی مخالفت کریں گے۔
اور باطل کی حمایت، کیونکہ حق انہیں ان کی مفاد پرستیوں سے روکے گا۔

قَتَلُوا كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ط لَيْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ
خَالِدُونَ ۝ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا
اتَّخَذُوا هُمُ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَسِقُونَ ۝

اور اب تک اُن کی یہ حالت ہے کہ یہ اُن لوگوں سے اپنا یا رانہ کاٹھتے ہیں جو دین خداوندی کے منکر اور مخالفت میں -

کتنا برا ہے یہ سالہ جسے یہ اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے تیار کر رہے ہیں! خدا کے قانون سے اس طرح سرکشی برتنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ یہ ذلت و رسوائی کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ (۵/۸۲)

جن کفار سے یہ اس وقت یوں دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں، اگر وہ اللہ پر اور اس نبی پر جو کچھ اس پر نازل کیا گیا ہے، اس پر ایمان لے آتے، تو یہ کبھی انہیں اپنا دوست نہ بناتے۔ لہذا ان کفار کے ساتھ ان کی دوستی محض اس لئے ہے کہ وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ ان کی دوستی کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ وہ اگر آج اسلام کی دشمنی چھوڑ دیں، تو یہ ان سے دوستی چھوڑ دیں۔

اُن میں سے اکثریت سیدھی راہ کو چھوڑ چکی ہے۔



ظہور اسلام کے وقت، حضورؐ کی اولین مخاطب جماعتیں تین تھیں۔ مشرکین عرب (بالخصوص قریش مکہ)۔ یہودی اور عیسائی۔ مشرکین عرب، آخر دم تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ تاٰنکہ فتح مکہ کے بعد اُن کی قوت ٹوٹ گئی تو مخالفت ختم ہوئی۔ مدینہ میں یہودی صاحب اثر و اقتدار تھے، انہوں نے بھی مسلمانوں کی سخت مخالفت کی تاٰنکہ انہیں وہاں سے نکالنا پڑا۔ لیکن عیسائیوں کی حالت ان سے قدرے مختلف تھی۔

ان پر ہنوز سیاست کا اثر غالب نہیں تھا۔ ایک تو عیسائیت کی تعلیم ہی ترک دینا اور منکسر المرحی کی تھی۔ دوسرے مدینہ میں اُن کا خاص اثر بھی نہیں تھا۔ وہ ایک صلح پسند اقلیت کی طرح رہتے تھے۔ اُن کے علماء اپنا زیادہ تر وقت علمی مصروفیتوں میں گزارتے تھے، اور اُن کے مشائخ تصوف کی ریاضتوں میں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کی مخالفت میں زیادہ نمایاں حصہ نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر فرمایا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا
وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرُكَ
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَبْسِييُونَ وَرُءُفَانَا وَآلَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ

۵/۸۲

اے رسول! تم یہود اور مشرکین (عرب) کو جماعتِ مومنین کے شدید ترین دشمن پاؤ گے۔ ان کے برعکس جو

لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، تو دیکھئے گا کہ وہ تمہاری جماعت کے ساتھ تعلقات والبتہ کرنے میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں منکسر المزاج عالم اور تبارک الدنیارہب ہیں۔ جن کی طبیعت میں تکبر اور سرکشی نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ من حیثیت الجماعت یہ بھی نظام خداوندی کے دشمن ہیں۔ اس لئے دوسروں کے تعلقات ان سے بھی جائز نہیں (۵/۵۱)



”شروع ساتواں پارہ“

ان میں سے بعض نے اسلام قبول بھی کر لیا تھا۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ
مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ سَنُؤْتِيكَ
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ
الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يَدْخُلَنَا سَنَامَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ۝ فَأَتَاهُمُ
اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَ
ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝

۵
۸۳-۸۵

یہی وجہ ہے کہ جب وہ قرآن کریم کی آیات سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان آیات میں انہیں حقیقت بے نقاب نظر آتی ہے اور وہ اسے فوراً پہچان لیتے ہیں۔ اور پکار اٹھتے ہیں کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اس پر ایمان لاتے ہیں سو تو ہمارا شمار بھی اس جماعت میں کرے جو حق کی نگہبان اور نوح انسان کے اعمال کی نگہبان ہے (۲/۲۳۳)، (۵/۵۱)

وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے کے بعد کونسی بات باقی رہ جاتی ہے کہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر ایمان نہ لے آئیں جو سراسر حق و صداقت ہے، اور اس بات کی آرزو نہ کریں کہ ہمارا پروردگار ہمیں صالحین کے زمرے میں شامل کرے (۵/۵۱)

یہ لوگ اس طرح جماعت مومنین میں شامل ہو گئے اور اپنے حسن کارنامہ عمل کی وجہ سے زندگی کی ان خوشگوازیوں

سے بہرہ یاب ہو گئے جن پر کبھی افرودگی نہیں آ سکتی۔ یہ ان کے ایمان و عمل کا بدلہ ہے۔ (۵/۸۵)۔
ان کے برعکس:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝
ان کے برعکس جو لوگ اس صداقت سے انکار کرتے ہیں اور ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ تو یہ لوگ زندگی کی
ارتقاء فی منزل میں آگے نہیں جا سکیں گے۔ ان کے لئے شادابیوں کی جنت کے بجائے تباہیوں کا جہنم ہے۔

سابقہ آیات میں عیسائیوں کے رُحبان کا ذکر تھا، جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ بڑے رقیق القلب اور منکسر المزاج
تھے۔ ان میں سے بعض اسلام بھی لے آئے تھے۔ ان راہبوں کی تعریف کرنے کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ان کی
ایک بنیادی غلطی کی طرف توجہ دلا کر، جماعتِ مومنین کو اس سے متنبہ کیا۔
رُحبان کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ ان کے ہاں کے صوفیاء تھے۔ تارک الدنیا۔ زندگی کی ہر خوشگوار شے کو حرام
قرار دینے اور اس مسلک کو قربِ خداوندی کا موجب سمجھنے والے۔ قرآن کریم نے ان اس باطل مسلک کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے اُمتِ مسلمہ سے کہا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرُّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝

ان عیسائی راہبوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے زندگی کی خوش گوار چیزوں کو جنہیں خدا نے حلال قرار دیا تھا مسلک
خاتعابیت کی بنا پر اپنے اوپر حرام قرار دے لیا۔ — یعنی یہودی اگر افراط کی طرف چلے گئے اور حرام خور
نہک اُتر آئے تو یہ عیسائی راہب (تفریط کی طرف چلے گئے اور انہوں نے حلال و طیب چیزوں کو بھی اپنے
اوپر حرام قرار دے لیا — وہ بھی غلط تھا یہ بھی غلط۔

اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا کہ جن خوش گوار چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ انہیں اپنے اوپر
حرام قرار دے لو۔ (۲۶) نہ ہی یہ کہ جن چیزوں پر اس نے پابندیاں عائد کی ہیں تم ان پابندیوں کو توڑنے لگ
جاؤ۔ حد سے گزرنا، یعنی افراط و تفریط۔ دونوں اطراف میں بُرا ہوتا ہے۔ (۵/۲۶)
حق کی راہ یہ ہے کہ تم قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے زندگی کی خوش گوار چیزوں سے

ہم دیاب ہو، اور اس طرح، جو کچھ اللہ نے سامانِ رزق عطا کیا ہے اسے حلال و طیب طریق سے کھاؤ پیو۔
اور یوں اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ جس پر تم ایمان لائے ہو۔ (۵۸)

حلال کو حرام مت قرار دو | دنیا کے ہر مذہب میں زور اس پر دیا جاتا ہے کہ حرام کے قریب تک نہ جاؤ لیکن یہ خصوصیت قرآن کو حاصل ہے جس نے اس کے ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا ہے کہ حلال کو حرام مت قرار دو۔ اس سے اس نے تصدّف کے مشرب اور مسلک کی بڑا کاٹ کر رکھ دی جڑا اور حلال کے متعلق تفصیلی بحث، مطالب الفرقان جلد سوم میں گزر چکی ہے۔ (انڈکس سے حوالے دیکھ لیں)۔ اس کے علاوہ، حلال کو حرام قرار دینے کے خلاف، اسی جلد (چہارم) کے دوسرے باب میں، آیات (۴۳-۴۴) کے تحت اور زیر نظر باب کے ابتدا میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جن چیزوں کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، ان کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار دینے، حتیٰ کہ خود اپنے لئے بھی ”حرام“ ٹھہرانے کا حق یا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ یہ قرآنی تعلیم کی بڑی نمایاں انفرادیت ہے۔ (مزید تفصیل انڈکس میں تصدّف کے عنوان کے تحت دیکھئے)

۵۸

بعض لوگ غصے میں (یا جہالت کی وجہ سے) قسم کھا جاتے ہیں کہ میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا اور اس طرح بھی حلال کو حرام کر لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی ایسی حماقت کر بیٹھے تو اس سے باز رہنا ہی ہو سکتی ہے۔
لَا يُؤْخَذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فَإِيْمَانُكُمْ وَلَٰكِنْ يُّؤْخَذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْإِيْمَانَ ۖ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِيْنٍ مِّنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ إِيْمَانِكُمْ إِذْ أَحْلَفْتُمْ ۚ وَاحْفَظُوا إِيْمَانَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

۵
۸۹

لغو قسموں کا کفارہ | اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اس لئے اب اس قسم کو کس طرح توڑیں؟ تو یاد رکھو۔ لغو اور بھل قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا (۶۲۵)۔ باقی رہیں وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد و ارادہ سے نہایت

محکم طور پر کھائی ہوں، تو انہیں بھی توڑا جاسکتا ہے، لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا ویسا ہی بنوا چاہیے۔ جیسا تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا۔ یا کسی غلام (گردن) کا آزاد کرانا۔ لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو۔ مثلاً کوئی محتاج یا غلام موجود نہ ہو) تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری ان (غلط) قسموں کا جو تم نے بالارادہ کھائی ہوں۔ لیکن جو قسمیں قوانین خداوندی کے خلاف نہ ہوں، ان کی پاسداری نہایت ضروری ہے (خواہ وہ عہد و سرود کے ساتھ کیا گیا ہو یا خود اپنے ساتھ)۔

اس طرح، اللہ اپنے قوانین و احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ قسموں کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۳۸۲ - آیات ۲۵-۲۲) میں بحث ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ آیات (۹۳-۹۲) کی تشریح اور مندرجہ بالا آیات ملانے سے، موضوع مکمل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اور امور کا ذکر ہے جن سے اجتناب لازمی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا

۹۰-۹۱

يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝

(قسموں پر قائم رہنا اس امر کی شہادت ہے کہ تمہارا عزم و ارادہ محکم ہے۔ تمہاری قوت ارادی اور قوت فیصلہ بہت مضبوط ہے۔ اس سے سیرت میں خپلی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، ہر وہ کام جس سے عقل و فکر ماؤف ہو جاتا

اور بہت پست، اور عزم و ارادہ کمزور ہو جائے اس قابل ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ مثلاً خمر۔ میسرہ انصاف۔ ازلام (جن کا ذکر ۲/۲۱۹، ۵/۴ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی

ہے اور انسان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں (۱۱/۱۱) اور جذبات سرکش و بیباک ہو جاتے ہیں۔ لہذا تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روٹا بن کر نہ آگ جائیں۔ (۵/۵)

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اتر آئے تو یہ چیزیں

(انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی، اور قوانین خداوندی کو پیش نظر رکھنے اور نظامِ مصلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔

کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں آؤ گے؟ (۹۱)

خمر-میسرہ۔ انصاب اور ازلام کے متعلق مطالب جلد سوم (آیت ۲/۲۱۹ صفحہ ۳۱۶) میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اور زیرِ نظر جلد میں آیت (۹۱) میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت (۹۱)۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۱۶ میں بھی آچکی ہے) اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے بعد فرمایا،

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا
[۵/۹۲] اَتَمَاعِلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَّغُ الْمُبِينُ ۝

تمہارے لئے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ تم اس نظام کی اطاعت کرو جو قوانین خداوندی کے مطابق اس کے رسول کے ہاتھوں تشکیل ہوا ہے اور ہر اس کام سے بچو جو اس نظام کے ضعف کا باعث ہو۔ لیکن اگر تم یہ سب سمجھ لینے کے بعد بھی مگریر کی راہیں نکالو اور اس سے منہ موڑ لو، تو اس کا خمیازہ تم خود بھگتو گے۔ ہمارے رسول کے ذمے اتنا ہی ہے کہ وہ تم تک ہمارے قوانین و احکام واضح طور پر پہنچا دے۔ یہ تمہارے اختیار کی بات ہے کہ تم ان پر عمل کر دیا۔ ان کی خلاف ورزی کرو (تم جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے)

قرآن مجید، انسانی آزادی پر ناروا پابندیاں عائد کرنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ ان پابندیوں کو اٹھانے اور ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ دنیا میں مذاہب اور ان کی شریعتوں نے انسانوں کو عکڑ رکھا تھا۔ ان کے راستے میں قدم قدم پر "شریعت" کا حکم آجاتا تھا۔ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ یہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ بیٹھ کر کھاؤ، کھڑے ہو کر نہ کھاؤ۔ ہاتھ سے کھاؤ، چھری کانٹے سے نہ کھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے کہا کہ جن چیزوں اور باتوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، پابندی صرف ان کی

کوئی بیجا جکڑ بندی نہیں

ہے۔ زندگی کے باقی معاملات میں انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی سہولت کے لئے جس طرح جی چاہے رہے ہے۔ کھائے پیئے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا:

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا
[۵/۹۳] إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ
اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور خدا کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پر وگرام پر عمل پیرا ہو رہے ہیں، ان پر کھانے پینے کے معاملہ میں کوئی بندش نہیں (کہ یوں کھائیں اور یوں رکھائیں) بشرطیکہ وہ ان چیزوں سے بچیں جن سے انہیں روک دیا گیا ہے۔ اور اس طرح اپنے ایمان و کردار کا عملی ثبوت دیں۔ اس کے بعد، جن اور بانوں سے روکا جائے، ان سے بھی بچیں اور یوں اپنے ایمان کا عملی ثبوت دیتے جائیں۔ قابلِ اقتساب باتوں سے رکتے جائیں اور حسن کارنامہ طور پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ یاد رکھو! کامیابی و کامرانی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ انسان تخریبی (منفی) امور سے بچے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تعمیری (مثبت) کاموں میں حصہ لے۔ یہی انداز زندگی قانونِ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

پابندی صرف حدود اللہ کی ہے | یہ معاشرتی امور ہیں جن میں دین مداخلت نہیں کرتا بجز اس مقام کے جہاں انسان کا کوئی اقدام، خدا کی متعین کردہ حدود سے ٹکرائے۔ ان حدود سے بچتے۔ ہوئے زندگی آزادانہ گزارے۔ (کھانے پینے کے معاملات میں آیت (۲۴/۶۱) ملاحظہ کیجئے۔



شکار پر پابندی | شکار کے معاملہ میں ایک پابندی (آیت ۵۴) عائد کی گئی تھی کہ حالتِ احرام میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے۔ ذیل کی تین آیتوں میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ چونکہ موضوع ایک ہی ہے، اس لئے ہم ان ہر سہ آیات اور ان کے مفہوم کو یکجا بیان کرتے ہیں۔ فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَبَّوْا كُمْ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالَهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَا حُكْمُ اللَّهِ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝**

اس قسم کی پابندیاں عائد کرنے سے مقصد، خود تمہاری ذات میں استحکام اور ثبات پیدا کرنا ہے۔ (مثلاً) ذرا تعصیر میں لاؤ اس منظر کو کہ تم حرمِ کعبہ کے اندر ہو اور شکار تمہارے ہاتھ کے نیچے، یا نیزے کی زد کے اندر آچکا ہے۔ اب ایک طرف یہ شکار ہے جو تمہارے ہاتھ میں آیا ہو ہے۔ دوسری طرف خدا کا حکم ہے کہ حرم کے اندر شکار نہیں پکڑا جائے گا

پیچھے ایسی قوت نہ ہو جو اس سزا کو عمل میں لاسکے تو وہ قانون اور عظیم بن کر رہ جاتا ہے۔ لہذا نظام خداوندی میں، قانون شکنی کی سزا بھی ہے اور ایسی قوت بھی جو اس سزا کو نافذ کر سکے۔

أَحْلَلْ لَكُمْ صَيْدَ الْبَحْرِ وَطَعَامَهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَاسَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

۵۶

یہ پابندی، کہ حدودِ حرم کے اندر شکار کرنا حرام ہے، خشکی کے جانوروں تک محدود ہے۔ جہاں تک پانی کے جانوروں کا تعلق ہے، اُن کا کھانا جائز ہے۔ — خواہ انہیں تم خود شکار کرو، یا انہیں پانی اچھال کر خشکی پر پھینک دے، یا پانی کے پیچھے ہٹ جانے سے وہ خشک ہو کر رہ جائیں — یہ تمہارے لئے اور اہل تافہ کے لئے سامانِ زیست ہے۔ سو تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، جس کی خاطر تم، ہر طرف سے کھینچ کر، اس مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔

ماسلف کا مؤاخذہ نہیں | آیات کا مفہوم تو واضح ہے، لیکن دو ایک نکات تشریح طلب ہیں۔ آیت (۹۵) میں کہا ہے عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ط جو پہلے

ہو چکا، سو ہو چکا۔ یہ قرآن کریم کے نظامِ عدل کا بنیادی اصول ہے کہ قانون کا اطلاق اُس کے اجرا کی تاریخ سے ہوگا۔ کسی سابقہ تاریخ سے نہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا اُس کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ اصول اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے (ملاحظہ ہوں آیات (۲۵۰)، (۲۳۲-۲۳۳))۔ اور اس کے بعد بھی آئے گا۔

انتقام | دوسری بات یہ کہ یہاں خدا کے لئے ”ذُو انتقام“ آیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم اس جلد کے بابِ اول میں، زیرِ آیت (۳۱) آچکا ہے۔ اسے دیکھ لینا ضروری ہے، کیونکہ لفظ انتقام جو مفہوم ہمارے ہاں مروج ہے، اُس کی رو سے خدا کے متعلق بڑا غلط اور گمراہ کن تصور قائم ہو جاتا ہے۔

طعامہ کا مفہوم | تیسری بات یہ کہ آیت (۹۶) میں صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ کو حلال بتایا گیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”پانی کے جانوروں کا شکار کرنا اور اُن کا کھانا“ لیکن حلال جانوروں کا شکار تو کیا ہی جاتا ہے کھانے کے لئے۔ اس لئے جب شکار حلال ہوگا تو اُس کا کھانا بھی حلال ہوگا۔ طعامہ کا مفہوم غور طلب ہے۔ سمندر کے جانور دو طرح ہا تھا آسکتے ہیں۔

ایک تو اس طرح کہ انہیں شکار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی جانور کو، پانی اچھال کر خشکی پر پھینک دے اور

لوگ اسے اٹھالیں۔ عرب، اس طرح ہاتھ آجانے والے جانور کو طَعَامُ الْبَحَرِ کہتے تھے۔ یعنی وہ جانور جسے سمندر کھانے کے لئے از خود دیدے۔ قرآن کی اس تفریح میں ایک نکتہ نہاں ہے۔ اس نے، حالتِ احرام میں، خشکی کے شکار کو ممنوع قرار دیا تھا اور سمندر کے شکار کو جائز۔ اگر سمندر کسی جانور کو از خود خشکی پر پھینک دے تو سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ کیا اس کا شمار خشکی کے شکار میں ہوگا؟ قرآن نے اس کی وضاحت کر دی کہ اس کا کھانا بھی حلال ہے۔ آیت (۵/۹۷) کے اخیر میں ”إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ“ آیا ہے۔ یعنی اجتماعِ اُمت۔ اس سے خیال کعبہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے (بالخصوص اس لئے کہ سابقہ آیات میں حالتِ احرام میں کچھ پابندیوں کا ذکر تھا)۔ اس لئے اگلی آیت میں فرمایا:

جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قَلِيماً لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذَلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السُّبُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

۵
۹۷-۹۸

یہ مرکز کعبہ ہے۔ یعنی وہ واجب الاضرام مقام جس کی مرکزیت سے مقصود یہ ہے کہ تمام نوری انسان اپنے پاؤں

کعبہ کا مقام اور حج کا مقصد

پر گھڑا ہو لے کے قابل ہو جائے اور کوئی فرد یا قوم، کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔ یہ مقام اجتماع۔ اور وہ جہیز جن میں جنگ کی ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ لوگ امن و سلامتی سے یہاں جمع ہو سکیں۔ اور وہ تحائف اور جانور جو اس اجتماع کی ضروریات کے لئے بھیجے یا لائے جائیں۔ یہ سب اسی عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یعنی عالمگیر انسانیت کو اپنے پاؤں پر گھڑے ہو جانے کے قابل بنا دیا۔ یہ باتیں تمہیں اس لئے بتائی جا رہی ہیں۔ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ جس طرح خدا کائنات کے تقاضوں سے واقف ہے اور وہ، بغیر کسی خارجی سہارے کے، اس حسن و خوبی سے چل رہی ہے، اسی طرح وہ نوری انسان کے تقاضوں سے بھی واقف ہے اور چاہتا ہے کہ اس اجتماعی زندگی کا توازن بھی اسی طرح ٹھیک ٹھیک قائم رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس کا ہمہ گیر قانون، تمام اشیائے کائنات اور عالم انسانیت کی ضروریات، مصالح

اور تقاضوں سے باخبر ہے۔ (۵/۹۷)

موجودہ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے گی، اُس کے لئے حفاظت اور پرورش کے تمام سامان مہیا ہو جائیں گے۔ اور جو اس کے خلاف جائے گی، اُسے سخت عواقب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس آیت کی وضاحت کے لئے اندکس میں عنوانات، کعبہ، حج، قربانی دیکھئے۔ وہیں ہڈی اور قلابد کا مفہوم بھی سامنے آجائے گا۔ یعنی وہ تحائف حج کے اجتماع میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھیجے جائیں، خواہ وہ جانوروں کی شکل میں ہوں اور خواہ دیگر اشیاء خورد و نوش یا مستعملہ کی شکل میں۔

حرام و حلال میں تفریق کے بعد کہا کہ رسولؐ کا ذمہ ان احکاماتِ خداوندی کو تم تک پہنچا دینا تھا۔ اور اس نے ایسا کر دیا۔ اس کے بعد اُن پر عمل کرنا، نہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے۔ تمہیں زبردستی راہِ راست پر چلانا رسولؐ کے ذمہ نہیں۔ (دیکھئے مطالب جلد اول صفحہ ۴۳)

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ۝

۵
۹۹

ان عواقب سے بچنے کا یہ طریقہ نہیں کہ تم زبان سے ان قوانین کی صداقت کا اقرار کرو اور دل میں ان کی خلاف ورزی کی آرزوئیں بیدار رکھو۔ بالکل نہیں۔ خدا کا قانون مکافاتِ تمہارے ظاہر و باطن دونوں پر پوری پوری نگاہ رکھتا ہے۔

باقی رہا یہ ہمارا رسولؐ۔ سو اسی کے ذمے اس پیغام کا تم تک پہنچا دینا ہے۔ اس کی اطاعت یا خلاف ورزی کرنا تمہارے اپنے اختیار و ارادہ کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم اپنی روش کے ذمہ دار آپ قرار پاتے ہو۔

آیت کے آخری الفاظ غور طلب ہیں۔ احکام کی تعمیل بھی دو طرح ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کی محض رسمی میکانگی، پابندی یا قانون کے ڈر سے مجبوراً پابندی۔ اس طرح کے تعمیلی احکام کا انسان کی نفسیات پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور دوسری، دل کی کامل رضامندی کے ساتھ (بطیب

دل کی رضامندی سے اطاعت

خاطر) اُن کی ادائیگی۔ اس سے انسان کی داخلی دنیا میں تبدیلی

واقع ہو جاتی ہے۔ اور یہی دین کا مقصود ہے۔ رسولؐ تو صرف یہی دیکھ سکتا ہے کہ تم ان احکام کی پابندی کرتے ہو یا نہیں۔ لیکن خدا کی نگاہ اس پر بھی ہوتی ہے کہ تم یہ تعمیل احکام کس طرح کرتے ہو، محض رسماً یا قانون کے ڈر سے مجبوراً۔ یا دل کی رضامندی سے۔

اس کے بعد انسان کی ایک دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا اور کہا کہ ہر چند یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے جائز اور ناجائز، حلال اور حرام، کو الگ الگ کر کے بتا دیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ دونوں کبھی ایک جیسے

خبیث کی کثرت

نہیں ہو سکتے، لیکن غلط معاشرہ میں ناجائز کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ عقل خود دین سے اس قریب میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اگر یہ چیزیں ایسی ہی نقصان دہ ہیں تو لوگوں کی

اس قدر اکثریت ان کی گرویدہ کیوں ہو جاتی۔ اس سے اس کے دل میں ان چیزوں کی کشش (TEMPTATION) پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خطرناک گھاٹی میں سے محفوظ گزر جانا بڑی عزیمت چاہتا ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

زندگی کی دو ہی روشیں ہیں — ایک طیب ہے، دوسری خبیث۔ تم ان میں سے جو روش چاہو اختیار کرو لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولو کہ وہ روش جو زندگی کے خوشگوار تعمیری پہلوؤں کو ابھارے اور اس کے ثمرات نوع انسان کے لئے نشوونما کا باعث ہوں۔ یہی وہ روش ہے جسے ہم نے طیب کہہ کر پکارا ہے۔ اور وہ روش جو ناخوشگوار، تخریبی نتائج پیدا کرے اور اس سے نوع انسان کی نشوونما رک جائے (اسے خبیث سے تعبیر کیا گیا ہے) یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ خواہ یہ بات تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ دنیا میں بالعموم دور دورہ اس دوسری روش کا رہا ہے اور یہی ہر جگہ چھائی ہوئی ہے (یہ چیز اس روش کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ انسان کی کوتاہ نگہی ہے جو اسے اس بنا پر صحیح قرار دیتا ہے کہ عام چلن اسی کا ہے)

لہذا، اگر تم عقل و شعور رکھتے ہو اور کوتاہ نگہی اور بے بصری سے کام نہیں لینے تو تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی سے تم کامیاب زندگی بسر کر سکو گے۔

خبیث اور طیب، قرآن کی دو کثیر الاستعمال اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم کسی ایک مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر وہ شے یا عمل جسے قرآن جائز قرار دے، اور انفرادی طور پر وہ انسان کے مزاج اور ذوق کے لئے خوشگوار ہو، طیب ہے اور جو اس کی ضدیں ہو وہ خبیث۔ قرآن کی تعلیم کا مخلص یہ ہے کہ اس نے خبیث اور طیب کو الگ الگ کر کے بتا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا اعجاز بیان بھی ملاحظہ کیجئے۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ خبیث کی کثرت سے انسانی ذہن فریب کھا جاتا ہے اور اس کے جذبات (TEMPTATION) اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سطحی عقل (یعنی عقل خود دین) کے بجائے حقیقی عقل (عقل جہاں ہیں، یعنی وحی کی روشنی میں کام لینے والی عقل) سے کام لے اور اس کی احتیاط برتے کہ اس کے جذبات قوانین خداوندی پر غالب نہ آنے پائیں۔

یہی کامیابی کی راہ ہے۔



احکام قرآنی کی جزئیات

جب یہ کہا کہ خبیث اور طیب کو الگ کر کے بنا دیا گیا ہے، اور اس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے تو خدا نے خیر و عظیم کے سامنے فوراً وہ لوگ آگئے جو اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں دین کی تکمیل ہو گئی ہے تو (مثلاً) بناؤ کہ اس میں نماز کی رکعتوں کا کہاں ذکر ہے اور کہاں کہا گیا ہے کہ تم ہرن کا گوشت کھا سکتے ہو؟ یعنی ان کے نزدیک قرآن مجید کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں زندگی کی تمام جزئیات تک کے متعلق متعین احکام دیئے گئے ہوں۔

اس حقیقت کو بار بار بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے (بجز چند مستثنیات) زندگی سے متعلق دین کے اصول و اقدار دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ یہ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے، اور ان پر عمل سچا ہونے کے طریق، اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے گی۔ انہیں دین کے اصولوں کی جزئیات کہہ لیجئے۔ یہ جزئیات، بدلتی رہیں گی اور اصول اپنی جگہ اٹل رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے اس اصولی پروگرام کو، اپنی حکمت بالغہ کی رُو سے، خود وضع فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا کو یہ جزئیات بھی دینی چاہیئے تھیں لیکن وہ (معاذ اللہ) بھول گیا۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبَدَّلَ لَكُمْ
تَسْوُكُمْ؟ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدَّلَ
لَكُمْ طَعَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ - قَدْ سَأَلَهَا
قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝

۵
۱۰۱-۱۰۵

ہم نے ”طیب“ اور ”خبیث“ روشیں کہہ کر، عالمگیر اصول بیان کر دیئے ہیں۔ ان کی تفصیل نہیں دی۔ ان عالمگیر اصولوں کی روشنی میں تم خود متعین کر سکتے ہو کہ کون سے کام ”طیب“ کی شق میں آتے ہیں اور کون سے ”خبیث“ کے ضمن میں۔ زندگی کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں اور جن پیکروں میں وہ اصول کار فرما ہوتے ہیں، وہ بدلتے رہتے ہیں۔ انہی کو ان اصولوں کی جزئیات و تفصیل کہا جاتا ہے۔ ہم نے قرآن میں ”بالعموم“ اصول دیئے ہیں۔ (بجز مستثنیات) ان کی جزئیات نہیں دیں۔ (اصول یہ یاد رکھو کہ جو کچھ قرآن کے اندر دے دیا گیا ہے وہ

غیر متبدل ہے۔ جن اصولوں کی جزئیات قرآن میں نہیں دی گئیں انہیں تمہارا نظام مملکت باہمی مشاورت سے متعین کر سے گا۔ افراد کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح متعین کردہ جزئیات قابل تغیر و تبدل ہونگی ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج سے یہ دین ہمیشہ کے لئے قابل عمل اور کارفرما رہے گا)

لہذا جن امور کی تفصیل ہم نے نہیں دی، تم ان کے متعلق کوئد کرید کر نہ پوچھا کرو، کیونکہ اگر ہم نے ان تفصیل کو بھی متعین کر دیا تو وہ بھی غیر متبدل قرار پا جائیں گی اور جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ تو ان کا بنا ہنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے گا۔ اور اس طرح وہ تفصیل تم پر ناگوار گزریگی اور یہ ظاہر ہے کہ جب نزول وحی کا سلسلہ جاری ہے تو تمہارے اصرار پر ان امور کو ظاہر کر دیا جائے گا یہ ہر حال تم اس کا خاص خیال رکھو جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا ہے اس سے ہم درگزر کرتے ہیں۔ آئندہ کے لئے تم احتیاط برتو۔ خدا کے قانون میں سابقہ غلطیوں کی معافی اور چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر بردباری کی گنجائش ہے۔ (۱۱۱)

یہ جو تمہیں تنبیہ کی گئی ہے تو اس لئے کہ تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے تھے (۱۱۲)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اتنی قیود اور پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں جن کا بنا ہنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور وہ (ان جزئیات کی پابندی سے گھبرا کر اصل دین ہی سے منحرف ہو گئے۔ (۱۱۲)

اس اہم حقیقت کی وضاحت، مطالبہ۔ جلد دوم (صفحات ۴۳۵، ۳۱۷) پر کی گئی ہے، جہاں یہ آیات (۱۱۲-۱۱۱) بھی درج کی گئی ہیں۔ اسے ایک نظر بھر دیکھ لیجئے۔

اس اصل الاصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھئے کہ غیر متبدل دین تمام کا تمام قرآن مجید کے اندر ہے۔ جو اس کے اندر نہیں، وہ دین نہیں، دین پر عمل پیرا ہونے کے طور پر ہی ہیں جو قابل تغیر و تبدل ہیں۔

قرآن کریم نے کہا کہ جب یہودیوں نے دین کی جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دے لیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سرے سے، دین ہی سے منحرف ہو گئے۔ وجہ ظاہر ہے۔ وہ جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو ساتھ نہیں دیتی تھیں اور ان کے مذہبی پیشوا ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے سختی سے تقاضا کرتے تھے۔ چونکہ یہ ناممکن العمل تھا، اس لئے ان کی نئی نسلوں نے یہ سمجھ کر کہ دین کس زمانے میں تو ممکن العمل تھا۔ اب وہ ایسا نہیں رہا۔ اس لئے وہ دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔

جُزئیات کو غیر متبدل کہنے کا نتیجہ

اس کا تلخ ترین تجربہ ہم خود اپنے ہاں کر رہے ہیں۔ فقہی قوانین، دین پر عمل پیرا ہونے کی وہ جزئیات تھیں جو صدیوں پہلے کے

حالات کے مطابق فقہانے وضع اور مرتب کی تھیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے انہیں غیر متبدل قرار دے دیا۔ پہلے تو یہ چیز محض نظری تھی، اس لئے زیادہ مضر اثرات نمودار نہ ہوئے۔ لیکن اب (۱۹۸۰ء میں) جو ان جزئیات کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ ناممکن العمل ثابت ہوئے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے نوجوان اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اسلام کسی گزشتہ زمانے میں تو چل سکنے کے قابل تھا، لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی۔ چنانچہ انہوں نے اسے ”چھلا ہوا کارتوس“ قرار دے کر، متروک سمجھ لیا، اور اس طرح اصل دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ دین کو مذہب بنالینے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔



دین کی جُزئیات تلاش کرنے والوں کی ایک مثال اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ حضورؐ کی اولین مخاطب قوم عرب تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آپ دینِ کامل لے کر آئے ہیں، تو بتائیے کہ قرآن میں بحیرہ۔ سائبہ، وصیلہ اور حام کا ذکر کہاں ہے؟

ایک مثال | فرمایا کہ ان کے متعلق جو عقائد تمہارے ہاں مروج ہیں، وہ خدا کے بتائے ہوئے نہیں۔ خود تمہارے افرا کردہ ہیں۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بُحَيْرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَثُرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝

۵
۱۰۳

یاد رکھو! قانونِ خداوندی کی رو سے نہ بحیرہ کی کوئی اصل ہے نہ سائبہ کی۔ نہ وصیلہ کی نہ حام کی (یہ سب تو ہم پرستی کے عقائد ہیں) ان لوگوں نے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، ان عقائد کو خود وضع کر لیا ہے اور اس کے بعد انہیں خواہ مخواہ خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ لوگ اتنا بھی سمجھتے کہ اس قسم کی مضحکہ خیز اور احمقانہ عقائد اور رسومات کو دینِ خداوندی سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا! دینِ خداوندی تو کبیر علم و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔ (۵۳)

یہ ان لوگوں کی توہم پرستیوں کے مظاہر تھے۔ وہ اونٹنی یا بکری جو دس بچے جن چکی ہو، اس کا کان چیر کر بتوں کے نام پر

لے عرب جا رہے ہیں، بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے تھے (جیسے بندوڑ کے ہاں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) اور انہیں منبر کہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ اسی قسم کے مختلف جانوروں کے نام ہیں (تفصیل لغات القرآن میں دیکھئے)۔

چھوڑ دیتے تھے۔ اسے بجیرہ (سفقہ گوش) کہتے تھے۔ اسی طرح وہ بعض جانوروں کو ویسے ہی بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے (جیسے ہندو سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھائے پیئیں۔ اُن سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ انہیں سانبہ کہا جاتا تھا۔ (ماوہ - س - ی - ب)

وہ بکری جو چھ بطن میں دو دو مادہ پچھے دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ، تو وہ اس نر پچھے کو ذبح نہیں کرتے تھے اور عورتیں اس بکری کا دودھ نہیں پیتی تھیں۔ اس بکری کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اسے الوصلہ کہتے تھے۔ اور حاتم مودہ نراونٹ تھا جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ہو۔ وہ اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے، اور اس سے باربرداری کا کام نہیں لیتے تھے۔

قرآن کریم نے اُن کی ان توہم پرستیوں کی تردید میں دو باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی تھی۔ یہ عقائد اُن کے اپنے ذہن کے تراشیدہ تھے۔ اور دوسرے یہ کہ خدائی سند تو ایک طرف، اس جہالت کی تائید تو عقل انسانی بھی نہیں کرتی تھی۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جن عقائد و مسالک کے لئے نہ خدا کی سند موجود ہو، اور نہ وہ عقل و بصیرت کے معیار پر ہی پورے اُتریں، تو لوگ اُن کے ساتھ متمسک کس بنا پر رہتے ہیں؟ قرآن نے اس کا وہ جواب دیا جو ”مذہب“ کی اصل و اساس ہے، یعنی اسلاف کی تقلید:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۖ وَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

تقلید اسلاف | تو ہم پرستار نہ رسوم کو دین سمجھنے والوں کی حالت یہ ہے کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے، اور اس کے رسول کی طرف (جو اس کے مطابق ایک عملی نظام متشکل کر رہا ہے) تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے، وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ (بی۱۱)

(کس قدر احمقانہ ہے یہ جواب کہ جو کچھ ہمارے اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اُس کے پرکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم اسی پر آنکھیں بند کئے پلے جائیں گے خواہ) ان کے یہ اسلاف نہ علم و بصیرت رکھتے ہوں، اور نہ ہی خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ہوں۔

مسلب تقلید کی تباہ کاریوں کے متعلق اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں عنوان تقلید دیکھئے)۔
اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دوسروں کی غلط روش کی ترویج کرنے کے بعد، جماعتِ مومنین کے سامنے وہ اصول پیش کیا جو شاہراہِ حیات پر

روشنی کے مینار کا کام دے، یعنی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرَّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا
اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

اے ایمان والو! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ تمہاری ذات کی حفاظت

کی ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہے (تمہارے اسلاف پر نہیں)۔ ۲/۱۴ -

نہ ہی تمہیں اس سے ڈرنا چاہیے کہ اسلاف کی روش کی خلاف ورزی ہے، وہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچا دیں گے۔ بالکل نہیں
اگر تم سیدھے راستے پر چلتے جاؤ گے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اُن کے اور تمہارے سب کے اعمال خدا کے قانون
مکافاتِ عمل کے سامنے پیش ہوں گے اور وہیں سے یہ فیصلہ ہوگا کہ کس قسم کے اعمال کس قسم کے ہیں۔

[اس مقام پر ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ اگر تم صحیح راستے پر چلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے
والے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیں۔ لیکن یہ نقصان تمہارے طبعی جسم یا مادی اشیاء تک محدود ہوگا۔ تمہاری ذات کو کوئی نقصان
نہیں پہنچا سکے گا۔ اپنی ذات کو نفع یا نقصان پہنچانا خدا تعالیٰ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کسی دوسرے کی اُس تک رسائی
نہیں ہو سکتی۔ لہذا تم اپنی ذات کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھو۔ اس کی ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہے اور اس سے
تم کبھی بری الزمہ نہیں ہو سکتے۔ عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ]

یہ آیت اور اس سے متعلقہ آیات، سابقہ صفحات میں آیت (۵/۲۴) کی تشریح کے سلسلے میں بھی گزر چکی ہے۔ اسے

ایک نظر دوبارہ دیکھ لیجئے۔



پہلے بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم نے (بجز مستثنیات) دین کے اصول عطا کئے ہیں اُن کی تفصیلات اور جزئیات خود متعین

نہیں کیں۔ ان مستثنیات میں وصیت کے متعلق حکم بھی شامل ہے اس کی تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم صفحات

۱۸۴-۱۷۶ پر گزر چکی ہے اور آیات (۱۰۷-۱۰۶) بھی وہیں درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے یہاں دُھرانے کی ضرورت نہیں۔

آیت (۲/۱۴) وہاں نہیں آئی حالانکہ وہ بھی ان آیات کے تسلسل میں آتی ہے۔ اسے یہاں درج کر دیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يَّاتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَا اَوْ يَخَافُوْا اَنْ تَرَدَّ اَيْمَانُ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

۵
۱۰۸

(قانونِ خداوندی میں شہادت پر شہادت لینے کی گنجائش اس لئے رکھ دی گئی ہے کہ اس سے) اس امر کا امکان ہے کہ گواہ حقیقت کے مطابق شہادت دیں۔ کیونکہ انہیں اس کا خدشہ ہو گا کہ دوسرے گواہوں کی شہادت سے ان کی شہادت کی تردید ہو جائے گی۔ (اور اس طرح وہ مجرم بھی قرار پائیں گے اور معاشرہ میں ان کی بدنامی بھی ہوگی)

اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان باتوں کو دل کے کانوں سے سنو اگر تم اس راہ کو چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چل نکلتے، تو وہ راہ تمہیں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں لے جائے گی۔

❦

سابقہ صفحات میں (زیر آیت ۵/۴۸۳) بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کو اس کے اعمال کا مکلف (ذمہ دار) اسی صورت میں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ جب

(i) انہیں پہلے پیغاماتِ خداوندی سے آگاہ کروایا جائے۔ اور

(ii) ان میں ان پیغامات کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو۔

اس سلسلے میں آیت (۵/۱۰۹) کا وہاں بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ آیت درج ذیل کی جاتی ہے۔ اس کی تشریح آیت (۵/۱۰۹) کے ضمن میں سمجھ میں آجائے گی۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَا ذَا اٰجِبْتُمْ ۖ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا بِاٰنِكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۵

۵
۱۰۹

(یہ قوانین و ضوابط معاشرہ کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انسان کے تمام اعمال کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور انہی اثرات کے مطابق اس کا مستقبل تعمیر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہم جھوٹ بول کر عدالت کی نگہ احتساب سے بچ گئے، تو بس چھٹی پائی قطعاً نہیں۔ اس کا جو اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوا ہے، اس کا نتیجہ ہر حال سامنے آئے گا۔ اس زندگی میں نہیں تو اس کے بعد کی زندگی میں۔ جب اللہ تمام رسولوں سے پوچھے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کو کس طرح قبول کیا تھا — دل سے مانا تھا یا محض ظاہر واری سے — تو وہ کہیں گے کہ ہم تو نظر بظاہر ہی دیکھ سکتے تھے (کیونکہ عدالت اتنا ہی کر سکتی ہے) دلوں کی حالت کا علم تو تجھے (خدا) ہی (کو) ہو سکتا ہے۔

یہ آیت (گویا) تمہید تھی داستان حضرت عیسیٰؑ کی جن کا تذکرہ اگلی آیت میں سامنے آتا ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ
إِذْ أَيْدُتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ فَتُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ
عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ
الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِأَذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِأَذْنِي وَتُبْرِئُ
الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِأَذْنِي ۚ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِأَذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي
إِسْرَءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

اس باب میں اسے ہمارے رسول (عیسیٰؑ) کے متبعین کی حالت خاص اہمیت رکھتی ہے، اس لئے اسے خصوصیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے پہلے

کوائف حضرت عیسیٰؑ

اس پس منظر کو سامنے لاؤ، جب اللہ عیسیٰؑ ابن مریم سے کہے گا کہ میں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو جن نعمتوں سے نوازا تھا وہ تمہیں یاد ہوں گی۔ میں نے اُس وحی کے ذریعے تمہیں تائید و تقویت عطا کی تھی جو بلا آمیزش تم تک پہنچی تھی اور جس سے تمہاری دعوت انقلاب کو دُور دور تک پھیل جانا تھا۔ (۱/۲۷۸)۔ تم ابتدائی عمر میں بھی عمدہ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور پھر یہودیوں کی سازش کے علی الرغم، جو تمہیں مار دینا چاہتے تھے، پختہ عمر تک پہنچ کر بھی (۳/۱۶۸)۔ پھر میں نے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ یعنی تورات و انجیل کا علم دیا۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کی انقلابی قوت کی بنا پر، تم بنی اسرائیل سے کہتے تھے کہ میں تمہیں ایسی حیات نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر، فضا کی بلندیوں میں اُڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔

(۱/۲۷۹)

یہ آسمانی روشنی، تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی جس پر تر و تازگی کا نشان تک باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی، اور تمہاری وہ پست خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس بٹھکنے نہیں دیتا۔ مختصراً یہ کہ وہ ذلت و خواری کی موت جو اُس وقت تم پر چاروں طرف سے مسلط ہے ایک نئی زندگی

میں تبدیل ہو جائے گی۔ (۲/۸۸، ۳/۱۱۱، ۴/۱۲۳)

تم (اے عیسیٰؑ!) اس قوم کے لئے یہ کچھ کر رہے تھے اور وہ لوگ تمہاری جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ لیکن میں نے ان کی سازشوں کو ناکام بنا دیا اور انہوں نے ان حقائق سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات اور دیگر کوائف حیات اس جلد کے دوسرے باب میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت، آیت (۳/۱۳۰) کے ذیل میں آچکی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں آیات کے الفاظ بھی قریب قریب یکساں ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کی دست برد سے کیسے محفوظ رکھا گیا تھا اس کے متعلق بھی اسی باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا ذکر ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ امْتُوا بِرِيَّ وَبِرِسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝

حواری اور جب میں نے تمام حواریوں کو (انجیل میں بذریعہ وحی) حکم دیا تھا (جس طرح اب جماعت مومنین کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے) کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔ اس پر انہوں نے کہا تھا کہ ہم یمن لائے۔ تم گواہ رہنا کہ ہم نے قوانین خداوندی کے سامنے تسلیم خم کر دیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے کوائف اور ان کی بندی کو دار کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ ص ۲۹۶) نیز اس جلد کے باب دوم میں آیت (۳/۱۳۰) کے تحت۔ لہذا اس آیت میں جو ان کے ایمان لانے کا ذکر ہے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس میں ایک لفظ ایسا ہے جس کی نہ صرف وضاحت کی ضرورت ہے بلکہ اس کا غور سے سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور وہ لفظ ہے ”أَوْحَيْتُ“ (میں نے ان کی طرف وحی کی) وحی کے متعلق گزشتہ جلدوں میں مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے بکثرت لکھا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں بالخصوص عنوانات، وحی۔ کلام۔ کشف والہام۔ بنی۔ ہدایت وغیرہ دیکھئے) ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ:

وحی کا تفصیلی مفہوم ۱۔ وحی اس علم کا نام تھا جو حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف براہ راست ملتا تھا اس میں صاحب وحی کی اپنی فکر، خیالات، کسب و سنہر، کوشش، حتیٰ کہ ارادہ تک

کو بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ اس قسم کا علم حضرات انبیاء کرامؑ کے سوا کسی کو نہیں ملتا تھا اور ختم نبوت کے بعد اس کا سلسلہ ویسے ہی ختم ہو گیا۔

لیکن قرآن کریم کی اس قدر وضاحت و صراحت کے باوجود گمراہی پھیلانے والوں کو ابلہ فریبی اور مغالطہ آفرینی

کے ہزار بہانے مل جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وحی غیر از نبی کو بھی مل سکتی ہے۔ اور اس کی تائید میں خود قرآن مجید کی کچھ آیات پیش کر دیں۔ انہی میں ایک آیت یہ بھی ہے۔ (یعنی ۵۱) جس میں ”أَوْحَيْتُ“ کا لفظ حواریوں کے لئے آیا ہے۔ اس سے یہ حضرات یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری تو نبی نہ تھے۔ جب ان کی طرف وحی ہو سکتی تھی تو دیگر ”غیر از انبیاء“ کی طرف کیوں نہیں ہو سکتی؟ ان کی اس مغالطہ آفرینی کی تردید ہے جس کے لئے ہم نے کہا ہے کہ یہ مکتہ بڑا غور طلب ہے۔ لغت کی رو سے لفظ وحی کا کیا مفہوم ہے۔ اس کی تفصیل میری ”لغات القرآن“ میں ملے گی۔ اس تفصیل کا ملخص یہ ہے کہ عربی زبان میں:

(i) أَوْحَى کے معنی ہیں نہایت تیز اشارہ۔ یعنی کسی سے اشارۃً اور نہایت تیزی سے کچھ کہنا۔

(ii) اس کے معنی ہیں کتابت، یعنی کسی کو کچھ لکھ کر دینا۔

(iii) أَوْحَى کے معنی ہیں کسی کو حکم دینا۔ یا وہ بات جسے کسی تک پہنچا دیا جائے، اور اسے اس کا علم ہو جائے۔ خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو۔۔۔ مخفی طور پر یا ظاہر۔

(iv) أَوْحَى الیہ کے معنی ہیں کسی کی طرف اپنا پیغام بھجینا۔

ان معانی کی رو سے قرآن کریم نے اس فطری جبلت کو بھی وحی سے تعبیر کیا ہے جو اشیاء کائنات میں (انسان کے سوا دیگر اشیاء میں خواہ وہ جاندار ہوں یا غیر جاندار) ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے اور جس کے مطابق وہ مصروف عمل رہتی ہیں۔ (مثلاً) فلکیاتی کڑوں کے متعلق کیا: ”وَ أَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا“۔ (۴۱)۔ ”خدا نے ہر سماء (کڑ) کی طرف اپنا امر (حکم) وحی کر رکھا ہے۔ زمین کے متعلق ہے: ”إِنَّا سَرَّبْنَاكَ أَوْحَىٰ لَهَا“ (۹۹)۔ ”وہ ایسا اس لئے کرے گی کہ خدا نے اس کے متعلق اس کی طرف وحی کر رکھی ہے“۔ ”شہد کی مکہ کے متعلق ہے: ”وَ أَوْحَىٰ سَرَّبْنَاكَ إِلَى الثَّغْلِ“ (۱۶)۔ ”نیرے رب نے شہد کی مکہ کی طرف وحی کر رکھی ہے“۔ ان آیات میں وحی سے مراد وہ جبلت ہدایات ہیں جو ان اشیاء کے اندر رکھ دی گئی ہیں، اور جن کی رو سے، ہر ایک ”اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتے ہیں“۔ (۲۴)

۲۔ قرآن کریم میں ہے کہ ”وَ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ“۔ (۲۸، ۲۹)۔ ”ہم نے اُم موسیٰؑ کی طرف یہ حکم یا پیغام بھیجا کہ خطرہ لاحق ہو تو اس بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم کسی نبی کی معرفت بھیجا گیا ہوگا۔

۳۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق فرمایا کہ ”وَ إِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِثِ“۔ (۵۱)۔

انام راغب اور دیگر اباب لغت نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حکم ہے جو انہیں حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے دیا گیا

تھا جیسا کہ ہر امتی کو اس کے رسول کی وساطت سے احکام دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ اور ایک وجہ یہ ہے جو صرف حضراتِ انبیاء کرامؑ کی طرف بھیجی جاتی تھی۔ یہ قرآن کریم کی اہم اصطلاح ہے اور اسے کسی غیر از نبی کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ اس اصطلاح کا مفہوم ہے وہ علم جو خدا کی طرف حضراتِ انبیاء کرامؑ کو براہِ راست ملتا تھا۔ اگر کوئی شخص اب اس کا مدعی ہے کہ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم ملتا ہے، تو وہ یا تو فریب خوردہ ہے اور یا فریب کار۔ دونوں صورتوں میں اس کا دعویٰ نبوت کا ہے، جو باطل ہے اور کذب و افترا منی، خواہ وہ اسے وحی کہہ کر دیکارے، اور خواہ کشف و الہام یا مبشرات جیسے الفاظ کے پردوں میں لپیٹ کر پیش کرے خدا کی طرف سے براہِ راست علم، حضورِ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، اور طب وہ قرآن مجید کے اندر موجود اور محفوظ ہے۔ نہ وہ اپنی غیر محرف شکل میں، قرآن سے باہر کہیں ہے اور نہ ہی ختمِ نبوت کے بعد، قیامت تک کسی کو مل سکتا ہے۔ صوفیاء کے کشف و الہام کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ (اس سلسلہ میں انڈکس میں تصوف کا عنوان دیکھیے)۔

﴿

اس کے بعد آیات (۱۱۵-۱۱۲) میں "مَا يَدَّةً مِّنَ السَّمَاءِ" (آسمانی رزق) کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ مقام بھی بڑا اہم ہے، اور اس کے ساتھ بڑا نازک بھی ہے، اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے ہم پہلے ان آیات کو درج کرتے ہیں، پھر ان کے ترجمہ و تفسیر کو۔ اس کے بعد اس کے متعلق، جو کچھ روایات کی رو سے ہمارے

کتب تفسیر میں آیا ہے، اسے پیش کریں گے۔ اور آخر میں ان کا قرآنی مفہوم۔ پہلے یہ آیات دیکھیے:

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يُعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَّقْتَنَا وَنَكُونُ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۖ وَلَا دُفْنًا وَ أَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝

شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ نے ان آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

جب کہا تھا ربوں نے اسے عیسیٰؑ مریم کے بیٹے کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ امارے پر خوان بھرا ہوا آسمان سے،
بولادور اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے۔

۵
۱۱۲

بولے کیا ہم چاہتے ہیں کہ کھاویں اُس میں سے اور مطمئن ہو جاویں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے
سچ کہا اور رہیں ہم اُس پر گواہ۔

۵
۱۱۳

کہا عیسیٰؑ مریم کے بیٹے نے اسے اللہ رب ہمارے امارہ ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن عید ہے
ہماری پہلوں اور پھیلوں کے واسطے۔ اور نشانی ہو تیری طرف سے اور روزی دے ہم کو اور تو ہی ہے سب سے
بہتر روزی دینے والا۔

۵
۱۱۴

کہا اللہ نے میں بنے شک اُناروں کا وہ خوان تم پر پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں
اُس کو وہ عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دوں گا جہاں میں۔

۵
۱۱۵

اب ان کی تفسیر کی طرف آئیے۔ (جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے) تفسیر ابن کثیر کا شمار بڑی مشہور مستند اور قابل
اعتماد تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں آیات قرآنی کی تفسیر، روایات کی رو سے کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں، مندرجہ بالا
آیات کی تفسیریوں بیان کی گئی ہے:

حضرت عیسیٰؑ نے پہلے تو انہیں سمجھایا، لیکن اُن کی نیک نیتی کے اظہار پر خدائے تعالیٰ
سے وعاک۔ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، ساتھ ہی دھمکا بھی دیا۔ پھر فرشتوں کے ہاتھوں

آسمان سے خوانِ نعمت اُناراجس پر سات مچھلیاں تھیں، سات دہیاں تھیں۔ جہاں یہ تھے وہیں وہ اُن کے کھانے کو
رکھ گئے، سب بیٹھ گئے اور شکم سیر ہو کر اٹھے۔ ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ اس مائدہ آسمانی
میں گوشت روٹی اُترا تھا۔ حکم تھا کہ خیانت نہ کریں، کل کے لئے نہ لے جائیں۔ لیکن انہوں نے حکم کی خلاف ورزی
کی، بے ہی گئے اور چرا بھی لیا جس کی سزا میں وہ سوز، بند رہن گئے۔ حضرت عمارؓ فرماتے ہیں، اوس پر جنت کے میوے
تھے۔ آپ فرماتے ہیں، اگر وہ لوگ خیانت اور ذخیرہ نہ کرتے تو وہ خوان یوں ہی رہتا، لیکن شام ہونے سے پہلے ہی
انہوں نے چوریاں شروع کر دیں۔ پھر سخت عذاب کئے گئے۔ اسحق بن عبد اللہ فرماتے ہیں، جن لوگوں نے مائدہ
آسمانی میں سے چرایا، اُن کا خیال یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ختم ہو جائے اور کل کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ رہے
مجاہدؒ سے مروی ہے کہ جب وہ اُترتے اُن پر مائدہ اُترتا۔ عطیہ فرمانے ہیں کہ وہ تھی تو مچھلی لیکن اُس میں ذائقہ ہر چیز

کا تھا۔ وہ سب بن مہربان فرماتے ہیں ہر دن اس مائدہ پر آسمان سے میوے اترتے تھے۔ قسم قسم کی روٹیاں وہ کھاتے تھے، چار ہزار آدمی ایک وقت اس پر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر اللہ کی طرف سے غذا کی تبدیلی ہو جاتی۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر روٹیاں جو کی تھیں۔ سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں اس پر تمام چیزیں بغیر سوائے گوشت کے۔ عکرمہؓ فرماتے ہیں روٹی چانول کی تھی۔ حضرت وہبؓ فرماتے ہیں کہ ان کے اس سوال پر حضرت عیسیٰؑ بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ زمین کے رزق پر فساد کرو اور آسمانی دسترخوان نہ مانگو، اگر وہ اترتا تو چونکہ زبردست نشان ہوگا اگر ناقدری کی تو بڑی طرح پکڑے جاؤ گے۔ ثمودیوں کی ہلاکت کا باعث بھی یہی ہوا کہ انہوں نے اپنے نبی سے نشان طلب کیا تھا، لیکن حواریوں نے جناب عیسیٰؑ کی ایک نہ مانی اور اسرار کیا کہ نہیں آپ ضرور دعا کیجئے۔

مندرجہ بالا مچھلی کی مزید تفصیل یوں دی گئی ہے :-

اسی خوان کے اوپر ایک رومال تھا۔ جب رومال اٹھایا گیا تو سب نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی لمبی چوڑی اور موٹی بھنی ہوئی سالم مچھلی ہے جس کے اوپر چھلکا نہیں کانٹے ہیں۔ گھی اسی میں سے بہ رہا ہے۔ اس میں ہر قسم کی سبزیاں ہیں سوائے گندنا اور مولیٰ کے۔ اس کے سر کے پاس سرکہ رکھا ہے اور دم کے پاس نمک ہے۔ سبزیوں کے پاس پانچ روٹیاں ہیں..... (حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے مزید معجزہ کی درخواست کی تو) آپ نے مچھلی سے کہا کہ تو جیسے پہلے تھی ویسی ہی دوبارہ ہو جا اسی وقت اللہ کی قدرت سے وہ زندہ ہو گئی اور ہل چل کر چلنے پھرنے لگی اور انکھیں چمکنے لگ گئی۔ وید سے کھل گئے اور شیر کی طرح منہ بھاڑنے لگی۔ (اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے حکم سے وہ پھر ایسی ہو گئی اور) تیرہ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کر کھایا لیکن وہ کھانا مطلقاً کم نہ ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر۔ ساتواں پارہ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۲-۳۰)

ان آیات کا مروجہ ترجمہ اور تفسیر آپ نے دیکھ لی۔ اب آئیے قرآن کریم کی طرف۔ آیت (۱۱۳) کے دو الفاظ وہ کلید ہیں جو تفسیر کے تانوں کو نہایت عمدگی سے کھول دیتے ہیں۔ وہ الفاظ ہیں وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ۔ یعنی ان آیات میں خدا کی طرف سے رزق ملنے کی بات کی گئی ہے۔ اندکس میں، رزاقیت۔ رزق اور معاشی نظام کے عنوانات دیکھئے۔ بات سمجھ میں آجائے گی کہ

قرآنی مفہوم | ۱۔ جس رزق میں کسی انسان کو دوسرے انسان (یا انسانوں) کا دست نگر اور محتاج ہونا پڑے، وہ رزق باعث تذلیل انسانیت ہے، اور رزق حرام۔

۲۔ جو رزق اس نظام کی رو سے ملے جو تو انہیں خداوندی کی رو سے قائم ہوتا ہے، اس میں شرف و تکریم آدمیت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی۔ وہ رزق طیب، کریم اور حلال ہے۔

۳۔ حضراتِ انبیاء کرام، اسی قسم کے نظام قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ فراہمی رزق اس نظام کے بنیادی مقاصد میں سے تھا۔

قرآن کریم کے ان بنیادی حقائق کی روشنی میں ان آیات کے اسی مفہوم کو لیجئے جسے راقم الحروف نے ”مفہوم القرآن“ میں پیش کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

اُس کے بعد اُس جماعتِ مومنین نے اے عیسیٰ تم سے کہا تھا کہ کیا ہمارا نشوونما دینے والا ہماری اس آرزو کو پورا کر دے گا کہ ہم معاش کے لئے غیروں کے محتاج نہ رہیں اور ہمارے لئے سامانِ نشوونما خدا کے نظام ربوبیت سے ملا کر لے۔ یعنی معیشت کے موجودہ ”ارضی نظام“ کی جگہ ”سماوی نظام“ قائم ہو جائے۔ اس کے جواب میں تم نے اُن سے کہا تھا کہ جب تم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو اس کا وہ نظام قائم ہو جائے گا۔ جس میں رزق کی ذمہ داری خود نظام کے سر ہوگی۔ افراد پر نہیں ہوگی۔ (۵/۱۱۳)

اُنہوں نے کہا کہ ہماری تو دلی خواہش یہی ہے کہ ہم بلامنتِ غیر سے، نظام ربوبیت ہی سے رزق حاصل کویں تاکہ اس طرف سے ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے اور ہمیں یقین آجائے کہ جو کچھ تو ہم سے کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر شہادت دیں (۵/۱۱۳)

اس پر تم نے (اے عیسیٰ) ہمارے حضورِ التجا کی تھی۔ کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان، نظام ربوبیت کی رو سے عطا ہو جائے تاکہ یہ چیز اس جماعت کے السابقون الاولون (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) کے لئے بھی حشرِ مسرت کا موجب ہو، اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔ نیز یہ تیرے قانون کی صداقت کی عملی نشانی بن جائے۔ تو ہمیں اس طرح سامانِ زیست عطا فرما۔ اس لئے کہ جو رزق تیرے نظام کی رو سے ملے وہ اُس سے کہیں بہتر ہوتا ہے جو انسانوں کی وساطت سے حاصل ہو۔ انسانوں کے ہاتھ سے ملنے والے رزق سے تو پروا نہیں کرتا ہی آجاتی ہے۔ اس رزق سے تو موت اچھی ہے۔ (۵/۱۱۳)

(آیت ۵/۱۱۵) کا مفہوم بعد میں پیش کیا جائے گا۔

معاشی نظام | چونکہ حضراتِ انبیاء کرام کا مشن اس قسم کا معاشی نظام قائم کرنا ہوتا تھا (خواہ وہ ابتدائی دور میں اپنی جماعت تک محدود ہو، اور خواہ اپنی مملکت قائم ہو جانے کے بعد، عالمگیر ربوبیت کی شکل میں)۔ اس لئے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اس قسم کا نظام قائم کیا ہوگا۔ ویسے تو سابقہ انبیاء کرام میں سے

ہر ایک کی یہی کیفیت تھی، لیکن حضرت عیسیٰؑ کے صحیح کوائف حیات اور ان کے مشن کی تفصیل (مُجْرمان کے جو قرآن کریم میں آتی ہیں) کہیں نہیں ملتیں۔ جو کچھ وہاں ملتا ہے، وہ اُن کی شانِ نبوت کے خلاف ہے اور مقاصدِ رسالت کے بھی خلاف۔ بایں ہمہ، مُحرف ریکارڈ میں کچھ ایسے نشانات مل جاتے ہیں جن سے ترشح ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی جماعت میں نظامِ ربوبیت کی طرح ڈال دی تھی۔ اس کے متعلق (اسی جلد کے) باب دوم میں معاشی انقلاب کے عنوان کے تحت کچھ تصریحات پیش کر دی گئی ہیں۔

بَعْد کے معنی | ضمناً۔ (آیت ۵/۱۱۴) میں لفظ عید آیا ہے۔ عید کے لغوی معنی ہیں، وہ وقت جب خوشی (یا غم) لوٹ کر (بار بار) آئے۔ اصطلاحاً اسے بار بار آنے والے جشنِ مسرت کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اسی مقام پر آیا ہے (ہماری عیدوں کے متعلق قرآن میں نہیں آیا) اب آئیے آیت (۵/۱۱۵) کی طرف۔ اس نظام نے ”رزقِ کریم“ کا انتظام کر دیا۔ لیکن کہا یہ کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب تم جو جی چاہے کرو، یہ رزق اسی طرح سے ملتا رہے گا۔ یہ رزق تو اس نظام سے مشروط ہے۔ اور اس نظام کا قائم رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم نے اسے قائم رکھا تو رزق کا یہ چشمہ جاری رہے گا۔ اگر اس کی طرف سے تغافل برتنا یا اسے ترک ہی کر دیا، تو اتنا ہی نہیں کہ یہ رزق ملنا بند ہو جائے گا، تم روٹی کے لئے اس طرح غیروں کے محتاج ہو جاؤ گے کہ در در سے ٹکڑے مانگتے پھرو گے، اور زلت اور رسوائیاں سایہ کی طرح تمہارا پیچھا کریں گی۔ آیت (۵/۱۱۵) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے:

اس پر ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہارے رزق کا اسی طرح انتظام کر دیں گے۔ لیکن اپنے متبعین سے کہہ دو کہ اگر تم نے اس نظام کی صحیح صحیح قدر دانی نہ کی اور جن بنیادوں پر اسے قائم کیا گیا ہے، تم اُن سے پھر گئے، تو اس کی ایسی سزا ملے گی جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ ملی ہو۔ (۵/۱۱۵)

یہ عذاب کس طرح اور کس شکل میں آتا ہے، اس کے لئے ہمیں کسی دوسری قوم کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں

۱۔ حضرت عیسیٰؑ اور آپؐ کی جماعت کی زندگی کے جو بچے کچھے حالات تیارخ میں ملتے ہیں (جس میں خود انابت بھی شامل ہیں) اُن میں اس نظامِ معیشت کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ دیکھئے عہد نامہ جدید میں ”رسولوں کے اعمال“ باب نمبر ۲ آیات نمبر ۴۶-۴۷، باب نمبر ۴ آیات نمبر ۳۵-۳۶۔ رسول اللہؐ کے عہدِ مبارک میں یہ نظام ابھر کر سامنے آگیا تھا۔

یہ تو خود ہماری اپنی داستان ہے۔ اسلام کے صدرِ اول میں یہ نظام قائم ہوا، اور اس سے کس طرح رزقِ کریم چھو لیاں بھر بھر کر، ملا، تانچ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس نظام کو پس پشت ڈال دیا تو پھر جس دولت و خواری کے عذاب میں گرفتار ہو گئے، اس کے لئے کہیں باہر سے شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری حالت خود اس پر شاہد ہے۔



عیسائیوں کے باطل عقائد کی تردید | آیات (۲۵-۲۶) میں نصاریٰ کے اُن باطل عقائد کا ذکر

آیا تھا جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں وضع اور اختیار کر رکھے تھے۔ وہیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو کس طرح اس قسم کے عقائد سے مجتنب رہنے کی تاکید اور تنبیہ کی تھی۔ اس کو باندازِ دگر یہاں دھرایا گیا ہے جب کہا کہ

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ
الْمَلَكَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالِ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ
لِي بِحَقِّ ط إِنْ كُنْتُ قُنْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ط تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا
فِي نَفْسِكَ ط إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ (۱۱۶)

اس کے بعد خدا (اپنے رسول) عیسیٰؑ سے پوچھے گا کہ تمہارے بعد تمہارے نام لیواؤں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو معبود بنا کر، خدائی کا درجہ دے دیا تھا اور کہتے تھے کہ یہ خود تمہاری تعلیم تھی۔ کیا تم نے ان سے ایسا کہا تھا؟ (یہ تھی وہ بات جس کا ذکر ۱۱۶ میں آیا تھا اور جس کے لئے یہ پس منظر سامنے لایا گیا ہے)

وہ اس کے جواب میں کہے گا کہ تیری ذات اس سے بلند ہے کہ تیرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔ مجھے بھلا یہ کب زیب دیتا تھا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق حاصل نہیں تھا؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تجھ سے کیسے مخفی رہ سکتی تھی! یہ تو ہو سکتا ہے (اور امر واقعہ بھی یہی ہے) کہ جن باتوں کا علم تو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہے، وہ میرے (یا کسی اور کے) علم میں نہ آسکیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تیرے بندوں کے دل میں جو بات ہو، وہ تجھ سے پوشیدہ رہ جائے؟ تو، تو ہر مرتبہ راز اور مستقبل میں واقع ہونے والے حوادث تک سے واقف ہے۔ (اس لئے اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی

تو وہ تجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی؟ (۱۱۶)

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے، حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا:

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ
أَنْتَ الرَّاقِبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۱۱۴-۱۱۵)

میں نے ان سے وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ یعنی یہ کہ تم صرف اللہ کی عبادت اختیار کرو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور میرا بھی جب تک میں ان میں رہا۔ ان کا نگراں رہا (کہ وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں) لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی تو میری نگرانی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ — انہی کا کیا، تو تو کائنات کی ہر شے کا نگراں و نگہبان ہے!

دوسرے باب میں حیات و وفات حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، زیر نظر آیت اس کی مزید وضاحت کر رہی ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے دو ہی ادوار کا ذکر ہے۔ ”مَا دُمْتُ فِيهِمْ“ — جب تک میں ان میں تھا — یہ آپ کی دنیاوی زندگی تھی۔ ”فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي“ — اور وفات پا کر دُنیا سے چلے جانے کا دور۔ اس میں نہ آسمانوں پر زندہ رہتے کا ذکر ہے، نہ دوبارہ دنیا میں آنے کا ذکر۔ (ضمناً) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے سلسلہ میں بخاری کی جو (روضی) روایت نقل کی گئی تھی (دیکھئے دوسرا باب صفحہ ۱۲۳) اس میں جو الفاظ حضورؐ کی طرف منسوب کئے گئے تھے، وہ وہی ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ یعنی وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّاقِبَ عَلَيْهِمْ ط

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو باطل عقائد وضع کر رکھے تھے، وہ سب ”کفارہ“ تک پہنچنے کے ذرائع تھے۔ یعنی اس عقیدہ تک پہنچنے کے کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پر چڑھ کر اپنے امتیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اسی آیت میں (حضرت عیسیٰؑ کی زبانی) اس عقیدہ کی بھی تردید کر دی گئی۔ انہوں نے بدرگاہ باری تعالیٰ مزید عرض کیا کہ:

إِنْ تَعَذَّلْتُمْ عَنْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۱۱۸-۱۱۹)

انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا جرم، سزا کا مستوجب ہے تو انہیں

اُسے مجالِ سربانی کیسے ہو سکتی ہے ؟ وہ تو تیرے بندے ہیں۔ اور اگر وہ ایسا ہے کہ اُن کے دوسرے اعمال اُس کی تلافی کر سکتے ہیں، تو وہ سزا سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں فیصلہ تیرے قانونِ مکافات کی رو سے ہوگا جو سرتاسر حکمت پر مبنی ہے اور اس کے نفاذ کا تجھے پورا پورا اختیار حاصل ہے اپنے آپ کو میری طرف منسوب کرنا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا)

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صُدُقُهُمْ ط لَهُمْ جَنَّاتُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَ وَرَضُوا عَنْهُ ط ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۱۱۹)

اللہ کہے گا کہ یہ اعمال کے نتائج کے ظہور کا دن ہے۔ اس میں صرف اُن لوگوں کا ایمان اُنہیں فائدہ دے گا جو اپنے دعویٰ ایمان میں سچے تھے۔ یعنی انہوں نے اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھایا تھا۔ اُن کے لئے ایسی پربہارِ زندگی ہے جس کی شادایاں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گی۔ انہوں نے اپنے آپ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھا تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں اپنے ثمرات و برکات سے ہمکنار کر دیا۔ یہ یقیناً بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

یعنی افراد ہوں یا اقوام۔ ان کے فیصلے خدا کے قانونِ مکافات عمل کی رو سے ہوں گے اس میں نہ کسی کی سفارش (شفاعت) کا دخل ہوگا نہ کفارہ کا (وضاحت کے لئے اندکس کی رو سے متعلقہ عنوانات دیکھیے) اور یہ قانون اس خدا کا ہے جس کا اقتدار تمام کائنات کو محیط ہے۔

بَلَلَهُ مَلِكُ السَّلَوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ط وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۱۲۰)

یہ ہے خدا کا قانونِ مکافات جو کائنات کے گوشے گوشے میں جاری و ساری ہے اس لئے کہ تمام کائنات اقتدارِ خداوندی کے تابع ہے۔ اس پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

یوں رسولوں کی شہادت، ان کی غلط و متبعین کے خلاف جائے گی (۱۱۹) چہ جائیکہ وہ ان کی سفارش کریں، یا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن سکیں!

(اس آیت پر سورۃ المائدہ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ فلاح مدلل)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

انڈکس

مطالب الفرقان جلد چہارم

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدوں کا مشترکہ انڈکس، جلد سوم کے آخر میں چسپاں کیا گیا تھا۔ چوتھی جلد کا انڈکس درج ذیل ہے۔ اس جلد میں جہاں صرف لفظ انڈکس لکھا گیا ہے اس سے مراد، تیسری جلد کے آخر کا انڈکس ہے۔ اور انڈکس جلد چہارم سے مراد درج ذیل انڈکس ہے۔ جس موضوع کو بھی آپ نے انڈکس میں دیکھنا ہو، بہتر ہوگا کہ آپ دونوں انڈکس بیک نظر دیکھ لیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ موضوع ان ہر چار جلدوں میں کہاں کہاں آیا ہے۔ انڈکس میں بائیں جانب سورہ کا نمبر ہے اور دائیں جانب آیت کا نمبر۔ مثلاً (۳۸: ۴) سے مراد ہے چوتھی سورۃ کی اٹیسویں آیت۔ وقس علیٰ ہذا۔

۲۔ انڈکس کے حوالوں میں اگر کہیں غلطی نظر آئے تو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ اس کے لئے ہم شکر گزار ہوں گے۔

مضمون	صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت
الف آزادی کا عظیم منشور (کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں) ابو جہل کا نوحہ۔ ابن اللہ کا باطل عقیدہ۔ (عیسیٰ) ابن مریم کیوں کہا گیا۔ (عیسیٰ)	۱۶۳	۳: ۷۸	ابراہیمی ملت کا اتباع۔	۴۱۸	۴: ۱۲۵
			اجل کا مفہوم۔	۲۵۳	۳: ۱۴۴
			اجار و رخصان کی شان میں (ہمارا) غلو۔	۵۵۲	۵: ۷۷
			اجار و رخصان (بنی اسرائیل کے)	۵۳۷	۵: ۶۱
	۱۹۹	۳: ۱۲۰	عیسائیوں کے رامپ رقیق القلب تھے	۵۵۵	۵: ۷۸
	۵۹		احمدیوں کا غلط استدلال۔	۳۶۶	۴: ۶۹
	۹۶		اُحد (جنگ)۔	۲۳۰ } ۲۰۰ }	۳: ۱۶۴ } ۳: ۱۲۰ }

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۵	اُعد کی جنگ میں ملائکہ کی نصرت۔	۲۰۵	اُعد کی جنگ میں ملائکہ کی نصرت۔
۲۲۴	اقوام سابقہ کے انجام سے عبرت۔	۲۲۵	اقوام سابقہ کے انجام سے عبرت۔
۲۲۴	اقوام کے استبدال کا قانون۔	۵۰۱	اقوام کے استبدال کا قانون۔
۵۳۰	اقوام کی تباہی کی دو شرطیں :-	۳۰۱	اقوام کی تباہی کی دو شرطیں :-
۲۱۱	۱۔ اُن تک پیغام پہنچ چکا ہو اور	۲۰۳	۱۔ اُن تک پیغام پہنچ چکا ہو اور
۲۸۲	۲۔ اُن میں سمجھنے کی صلاحیت ہو۔	۲۳۱	۲۔ اُن میں سمجھنے کی صلاحیت ہو۔
۸۵		۵۳۰	
	اللہ اور رسول	۲۲۵	
۶۲	اللہ اور رسول کی اطاعت۔	۲۶۲	ازلام۔
۱۶۳	(حق حکومت رسول کو بھی حاصل نہیں)	۵۵۹	استہزا (آیات اللہ سے استہزا ہو تو وہاں سے)
۲۸۲	اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت	۵۳۶	دور چلے جاؤ
۳۳۷	رسول اللہ کی اطاعت کا غلط مفہوم	۱۸۴	اسلامی نظام کی وضاحت۔
۳۶۱	رسول کی اطاعت جس سے دل	۱۹۴	دین و دیکھئے قرآنی نظام)
۳۶۴	میں بھی گرا فی محسوس نہ ہو۔	۳۷۹	اسلامی نظام میں غیر مسلم شریک نہیں ہو سکتے۔
۵۰۰	اللہ اور رسول سے مراد اسلامی نظام۔	۳۷۹	اسلام۔ نماز روزے تک اسلام اور جہاد گریز
۳۸۲	اللہ اور رسول کی اطاعت سے انبیاء	۲۷۲	اسلامی نظام { اطاعت زندہ و متحرک کی
۳۶۶	صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت	۲۷۲	{ "سمعنا و اطعنا"
	حاصل ہوتی ہے۔	۲۸۶	اسلامی نظام قائم کرنے کا پروگرام۔
۲۳۲	اللہ اور رسول میں فرق کرنا۔	۵۱۸	الاسلام۔
۲۲۵	رسولوں میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔	۵۳۹	(اسلامی کسے کہا جائے گا)۔
۲۰	ام الکتاب۔	۱۸۳	اسلام کے دروازے سب کھلے کھلے ہیں۔
۲۲۰	امام ابو حنیفہ کا مسلک (حدیث)		اعتقاد کتاب اللہ ہی دین ہے۔

صفحہ	سورۃ	مضمون	صفحہ	سورۃ	مضمون
۵۵۹	۵: ۹۰	انصاف -	۴۰۲	۴: ۱۰۲	امانت صلوٰۃ سربراہ مملکت کا فریضہ
۲۵۴	۵: ۲	انعام - (بہیمہ)			امت
۳۲۱	۴: ۳۸	انفاق -	۱۸۹	۳: ۱۰۹	خیر امت -
۲۴۰	۳: ۱۳۳				امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا
۱۴۱	۳: ۹۱				فریضہ ساری امت کا ہے -
۸۳	۳: ۴۲	انقلابی اقدام -	۱۸۶	۳: ۱۰۳	{
۵۲۰	۵: ۴۵	انکھ کے بدلے آنکھ، یہودیوں کیلئے تھا	۱۸۹		اس فریضہ میں مرد و عورت
۳۴	۳: ۱۳	اولاد اور مال ختم -	۹۰	۳: ۱۰۹	{
۴۳	۳: ۱۹	اہل الکتاب اور امیوں کو دعوت	۳۳۵	۴: ۵۸	امانات ان کے اہل کے سپرد کرو -
۵۵۵	۵: ۷۸	اہل الکتاب کو ایمان لانے کی دعوت	۴۳	۳: ۱۹	امیوں کو دعوت ایمان -
۳۲۷	۴: ۴۳	اہل کتاب کو مکمل ضابطہ حیات			انبیاء
۴۸	۳: ۲۲	نہیں دیا گیا تھا	۳	۳: ۱۰	انبیاء کی (معاذ اللہ) لغزش -
		ایمان	۳۱	۳: ۱۰	عصمت انبیاء کا مفہوم -
۲۲۴	۴: ۱۳۶	مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کا حکم -	۶	۳: ۳	انتقام کا مفہوم (خدا کا انتقام)
		ب	۸	۳: ۴	انجیل کی تاریخ
			۱۳۵	۳: ۵۴	انجیل برنباس -
۱۵۲	۳: ۱۶۸	باطنی معانی (قرآن کے) -			انسان
۲۲۶	۳: ۱۶۰	نخل بدترین خصلت ہے -	۶۷۴	۴: ۱	{
۲۵۷	۳: ۱۷۹	نخل سے توہین تباہ ہو جاتی ہیں -			انسانی پیدائش عورت اور مرد
۲۵۸	۳: ۱۷۹	نخل سے توہین تباہ ہو جاتی ہیں -	۲۹۸	۵: ۳۲	انسانی جان واجب الاحترام ہے -
۲۲۰	۴: ۲۷	بدر کی جنگ میں ملائکہ کی نصرت -	۲۹۲		انسان کا جرم خود اس کے اپنے خلاف ہوتا ہے
۲۴۴	۳: ۱۲۲	بغاوت کی سزا -	۴۱۰	۴: ۱۱۱	خدا چاہے تو نوع انسان کو معدوم
۵۰۰	۵: ۲۳	بنی اسرائیل کے جرائم -			کر کے دوسری مخلوق لے آئے -
۵۱۰		بنی اسرائیل کے بند راؤ مسوور بن جانے کا	۲۲۱	۴: ۱۳۳	
۵۳۶	۵: ۵۹	مفہوم -			

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۱	۱۷۸-۱۷۹	۵۳۷	۵ : ۶۱
۲۳۱	۲ : ۱۶۵		
۲۵۲	۳ : ۱۴		
۵۶	۳ : ۲۷		
۴۰	۳ : ۱۷		
۴۱۵	۴ : ۱۱۹	۳۹۶	
۲۲۲، ۳۱۱	۳ : ۱۳۴	۴۳۳	۴ : ۱۴۸
۲۰۲	۴ : ۱۷۷-۱۸	۵۶۱	۵ : ۹۳
۲۲۲	۴ : ۵۳-۵۹	۵۴۵	۵ : ۷۲
۲۲۶	۴ : ۲۳۵، ۶	۳۲۸	۴ : ۴۶
۴۷۲		۵۱۳	۵ : ۴۱
		۳۱۵	۴ : ۲۸، ۳۱
۲۵۳، ۵۶			
۴۲۱	۴ : ۱۳۴	۳۳۸	۴ : ۴۹
		۴۳۲	۴ : ۱۴۸
		۵۵۷	۵ : ۷۸
۲۱۵	۴ : ۱۵۸	۲۶۵	۴ : ۱۸۷
۴۰۳	۴ : ۱۰۳	۵۲	۴ : ۲۵
۴۱۱	۴ : ۱۱۲	۳۶۰	۴ : ۴۱
۵۰۸	۵ : ۳۸	۲۳۰	۴ : ۱۶۴
		۲۶۱	۴ : ۱۸۱

ت

تاریخ { ہماری تاریخ کے افسانے }
جنگِ جبل و معین

تائب ہو جانے والے کے ماضی {
سے درگزر کیا جائے گا

تشکیث کا باطل عقیدہ -

تحریف - کتب سابقہ میں تحریف -

الفاظ کا مفہوم بدل دینا -

تجارت اور ربو امیں فرق -

ترکہ — دیکھئے وراثت -

تزکیہ نفس کی خود فریبی -

تشہیر کسی کی برائیوں کی تشہیر مت کرو -

(بجز مظلوم کے)

تصوف -

تعریف اُن کاموں پر جنہیں کرتے نہیں

تقدیر

عزت و دولت - حکمرانی و حکومتی

سب خدا کے ہاتھ میں ہے ؟

ہر مصیبت اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے -

ث

ج

اِنَّ اللہ کا مفہوم -

کیا موت کا وقت مقرر ہے ؟

تقیہ کا مفہوم -

توحید (خدا، ملائکہ - ارباب علم کی شہادت)

توہم پرستانہ رسوم -

توبہ دلغزش کے فوری بعد

توکل کا مفہوم -

تھیا کریسی (THEOCRACY)

تیمم -

ثواب کا مفہوم -

ثواب الدنیا و الاخرت -

جنت اور طاغوت کی عبودیت -

جمہوریت اور مشاورت میں فرق -

جمہور کے دن کی چھٹی غلاف {

منشاء خداوندی ہے -

جہنم خود کرے، تھوپے دوسروں کے

جرائم کی سزائیں صرف اسلامی {

معاشرہ میں دی جاسکتی ہیں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۹۸	جہاد میں شرکت کے لئے تیز گام	۳۶۴	جرائم کس طرح ختم ہو سکتے ہیں۔
۳۹۸	اور سست رفتار	۲۴۳	جرائم کی سزا کے لئے شرائط۔
۳۹۷	جہاد اور احمدیوں کی غلط فہمی۔	۲۱۰	بنیادی اصول۔
۲۳۳	جہنم کی زندگی (نہ موت نہ حیات)	۲۷۱	جنت کے دروازے ہر ایک کیلئے کھلے ہیں۔
۵۴۹	جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کے مکالمات	۲۷۱	جنت میں عورت و توقیر۔
۲۰۴-۲۳	جنگ بدر اور اُحد میں ملائکہ کی نصرت	۲۷۹	جنت، ارض و سماء کو محیط۔
			جنت ارض
		۲۲۶	مسائل حد و جہد سے ملتی ہے
		۲۱۷	نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ اہل کتاب کی
		۲۹۴	جنسیات سے متعلق جرائم کی سزائیں۔
		۲۱۰	جہاد کا جذبہ محرک۔
			جہاد کا جذبہ محرک۔
			(مظلوموں کی حفاظت)
			جہاد میں قتل ہو جائے یا ویسے ہی موت آجائے
			(مقتولین فی سبیل اللہ)
			جہاد (قتال) کیلئے ہر وقت تیار رہو۔
			جہاد (قتال) فی سبیل اللہ اور
			فی سبیل الطاعت
			جہاد (قتال) سے گریز اور
			ناز و روزے تک اسلام
			جہاد (جنگ) میں حوصلہ کی پیش کش
			کرے، اُسے قبول کرے۔



حدیث

۲۷	حیث اعمال کس طرح بڑا ہے۔
۲۵۷	حج میں معاشی مفاد کا حصول۔
۵۶۱	حج۔ حالت احرام میں شکار
۵۶۴	حج سے مقصود (کعبہ کا مقام)
۲۱۶	دجی غیر متلو۔
۵۵۱	حدیث میں غلو۔
۲۱۶	مثلثہ معلہ کی وضعی روایت۔
۳۵۸	حدیث کی جمع و تدوین کی تاریخ۔
۲۲۰	امام ابو حنیفہ کا مسلک۔

حرام

۳۳۷	یہودیوں کے جرائم کی وجہ سے بعض چیزیں ان پر حرام قرار دیدی گئیں
-----	--

صفحہ	سورۃ	مضمون	صفحہ	سورۃ	مضمون
		خدا	۵۸	۵:۱	حرام و حلال کی مزید بحث -
		خدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے	۵۵	۵:۵۵	حزب اللہ جو غالب رہے گی -
۲۶۰	۳:۱۸۰	ہاتھوں پوری کرایا کرتا ہے	۳۳	۳:۱۱	حشر کا مفہوم
۳۴۴	۴:۷۵	مکہ کے مظلومین کی پکار کا جواب -			حق
۳۴۳					حق کے معاملہ میں مفاہمت نہیں ہو سکتی -
۳۴۴	۴:۷۵	خدا اور انسان کا تعلق -	۱۵۱	۳:۶۸	حق و باطل کی تبلیہ -
۳۴۳			۱۵۲		کتمان حق -
۳۴۴	۵:۴	شکاری جانوروں کو سدھانا:	۱۵۲		حکمت - حکم - حکیم -
۳۴۴		خدا اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے	۲۶۵	۳:۱۸۶	حکومت
۳۴۴			۱۸	۳:۶	کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں،
۳۴۴	۵:۱۲	خدا کی سمیت کیسے حاصل ہوتی ہے -			حتیٰ کہ رسول کو بھی نہیں
۲۱۳	۳:۱۵۵	خود کشی کی ممانعت -	۱۶۳	۳:۷۸	دعویٰ ایمان کا - فیصلے طاغوت کے؟
۲۴۹	۳:۱۴۳	ختم نبوت سے شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا -			فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں گے -
۵۴۴	۵:۱۱۱	(نظام اور قانون کا دور آ گیا)	۳۲۲	۴:۳۹	استکبار بغیر حق جائز نہیں -
۵۵۹	۵:۹۰	خمر -	۳۸۴	۴:۸۳	ہر تحقیق غلبہ معاملہ کو حکومت کی طرف لوٹاؤ
۵۶۶	۵:۱۰۰	نجیث کی کثرت -	۲۶۵	۵:۴	ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتا -
۴۰۷	۴:۱۰۷	جہانت کی ممانعت -	۲۶۶	۵:۴	شکاری جانوروں کا شکار -
۴۰۶	۴:۱۰۷	غائبین کی وکالت مت کرو -			حواری
					حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں اور
۲۷۰	۳:۱۹۴	دعا کی قبولیت کیسے ہوتی ہے -	۸۷	۳:۵۱	صحابہ کرامؓ کا تعاقب
۵۵	۳:۲۷	ووقومی نظریہ			
۱۹۶	۳:۱۱۸	دین (المدین)			
۴۲	۳:۱۸	ساری کائنات میں دین خداوندی -			
۱۶۸	۳:۸۳	دین کے اصول شروع سے کیساں چلے آ رہے تھے			
۲۴۹	۴:۱۶۳				

صفحہ	سورۃ آیت	مضمون	صفحہ	سورۃ آیت	مضمون
۱۸۲	۹۵-۹۶: ۳	دین کے ظواہر اور اس کی روح	۱۴۳	۹۲: ۳	رسول کا ذاتی فعل دین نہیں بن سکتا۔
۲۶۳	۳: ۵	دین کی تکمیل (نعاء کا اتمام)	۵۴۰	۴۷: ۵	رسول اللہ کو تبلیغ دین کی تاکید۔
۵۶۷	۱۰۱: ۵	دین کی جزئیات (جو قرآن میں نہیں)	۲۲۴	۱۵۹: ۳	رسول کی صداقت پر ایمان۔
		کی کریمت کرو۔			رسول اللہ ﷺ
		دُنیا			ضروری نہیں کہ رسول اللہ کی زندگی
		مرنے کے بعد اس دنیا سے کوئی	۲۲۳	۱۶۸: ۳	ہی میں شائع پیدا ہو جائیں
		تعلق نہیں رہتا			اللہ اور رسول کی اطاعت۔
					رسول اللہ کو بھی جتنی حکومت
					حاصل نہیں تھا
۳۰	۱۰: ۳	ذنب (ذنوب) کا مفہوم	۱۶۳	۷۸: ۳	رسول اللہ کی رسالت پر ایمان کا مطالبہ
۲۶۷	۱۹۰: ۳	ذکر کا مفہوم۔	۱۶۳	۹۳: ۳	رسول اللہ کی سنت کی تفصیل بحث
۴۰۲	۱۰۳: ۴	(صلوٰۃ و ذکر کا مفہوم)	۲۰۱	۱۲۰: ۳	رسول اللہ (روح کے کمانڈر)
					رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ
					ربحالت جنگ)
۲۳۹	۱۲۹: ۳	ربو کا نظام۔	۲۰۹	۱۵۲: ۳	رسول اللہ (رافت و شفقت کے پیکر)
۳۱۵	۲۹-۳۱: ۴	ربو اور تجارت میں فرق۔	۵۱۳	۱۵۸: ۵	رسول اللہ کا مشاورت کا حکم۔
۴۳۸	۱۶۱: ۴	ربو کے مجرم (یہودی)	۲۱۵	۱۵۸: ۳	رسول اللہ اپنی وحی میں
۲۹۶	-	رحم۔	۲۲۵	۱۶۰: ۳	خیانت نہیں کرتے تھے
۵۴	۲۶: ۳	رزق بلا حساب کا مفہوم۔	۲۲۸	۱۶۳: ۳	رسول اللہ کی بعثت خدا کا احسان تھا
۴۳	۱۹: ۳	رسالت اور نبوت میں فرق	۲۲۸	۱۶۳: ۳	رسول اللہ کے فرائض: تعلیم
۴۴	۱۹: ۳	رسول کا فریضہ تبلیغ ہے،			کتاب و حکمت اور تزکیہ
		دوسروں کو راہ پر چلانا نہیں			رسول اللہ کی وفات کے بعد
					شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا

[illegible]

صفحہ	سورۃ نمبر	مضمون	صفحہ	سورۃ نمبر	مضمون
۴۹ : ۵	۵۴۲	صابین کون تھے۔	۲۳ : ۳	۴۹	شفاعت کے متعلق مروجہ غلط عقائد۔
۱۴ : ۳	۳۸	صابین۔ صادقین۔	۸۵ : ۴	۳۸۵	شفاعت حسد اور شفاعت سیئہ۔
۴۲ : ۳	۸۷	صحابہ کبار کے ازداد کے متعلق غلط روایت		۱۷۷	شریعت پنچیں۔
۱۵۸ : ۳	۲۲۱	صحابہ کی عظمت۔	۴۶ : ۵	۵۲۳	شریعت کے معنی۔
۱۷۸ : ۳	۲۳۷	صحابہ میں کوئی منافق نہیں تھا۔	۹۰ : ۵	۵۵۹	شراب (دیکھئے خمر)۔
		صلوٰۃ	۱۵۰ : ۳	۲۵۷	شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔
		جب یہ معلوم نہ ہو کہ تم کیا کہہ	۱۵۰ : ۳	۲۵۷	شرک کیا ہے؟
۴۳ : ۴	۳۲۷	رہے ہو، تو صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ	۴۸ : ۴	۳۲۹	شرک ناقابل تلافی جرم ہے۔
۱۰۳ : ۴	۴۰۲	صلوٰۃ اور ذکر کا مفہوم۔		۳۰۸	شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔
	۴۰۴	صلوٰۃ موقت فریضہ ہے۔	۶ : ۵	۴۵۷	شعائر اللہ کا احترام۔
۱۰۱-۱۰۳ : ۴	۴۰۱	حالت جنگ میں قصر صلوٰۃ اور طرہ صلوٰۃ			شکوہ تم شکر گزار ہو تو خدا نے تمہیں
۱۴۲ : ۴	۴۲۹	صلوٰۃ اور رسمی نقل و حرکت۔	۱۴۷ : ۴	۴۳۲	عذاب دے کر کیا لینا ہے
۱۴۲ : ۴	۴۲۷	منافقین کی صلوٰۃ (کسالی)	۱۳۵ : ۴	۴۲۲	شہادت (گواہی) کا عظیم اصول۔
۴۳ : ۴	۳۲۷	تیمم کا حکم۔	۱۳۵ : ۴	۴۲۲	شہادت کے احکام۔
		وضو (دیکھئے وضو)	۱۶۸ : ۳	۴۳۳	شہداء (مقتولین فی سبیل اللہ)
۱۰۲ : ۴	۴۰۲	امامت سربراہ مملکت کا فریضہ ہے۔	۴۱ : ۴	۳۲۳	شہید (گواہ)۔ ہر امت کے شہید۔
		ط			رسول اللہ سب پر شہید
		طاغوت کے فیصلے۔			ص
۴۰ : ۴	۲۵۹	طلاق			صفات خداوندی
		اگر بیوی کو خاوند کی طرف سے	۱۹ : ۲۱-۲۲ : ۳	۳۸۵	الحی القيوم۔
۱۲۸ : ۴	۴۱۹	سرکشی کا اندیشہ ہو	۱۲۱ : ۳	۳۰۳	الحی القيوم کا عملی مفہوم۔

صفحہ	سورۃ	مضمون	صفحہ	سورۃ	مضمون
۲۳۵-۲۳۴	۴: ۵۴	عش۔ روایات کے آئینے میں۔	۲۷۰	۴: ۱۳۰	طلاق کے بعد اللہ مستغنی کر دیگا کا مفہوم
۲۳۲	۴: ۱۴۲	عذاب۔ تم شکر گزار ہو تو خدا نے تمہیں عذاب دے کر کیا لینا ہے			طلاق سے متعلق احکام کے لئے
۳۳۵	۴: ۵۸	عدل کی تاکید۔			جلد سوم دیکھئے
۲۴۵-۲۴۴	۵: ۸۵	عدل کی مزید تاکید۔			
۲۵۹	۵: ۲	(دشمنوں سے بھی عدل)۔	۱۸۲	۲: ۹۵	ظواہر دین اور ان کی روح۔
۵۶۱	۵: ۹۳	عدل۔ قانون کا اطلاق تالیخ			
		اجرا سے ہوگا۔			
۲۵۳	۳: ۱۴۴	عمر۔ کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟	۲۴۱	۳: ۱۳۳	عافین عن الناس کا مفہوم۔
۶۴	۳: ۳۲	عمران کون تھا۔			عائلی قوانین
		عورت			(عائلی قوانین کی پوری تفصیل
۳۱۷	۴: ۳۲	عورت اپنے مال کی خود مالک ہے			مطالب الفرقان جلد سوم میں گور چکی ہے۔
۲۷۴	۴: ۳	انسانی پیدائش، عورت اور مرد	۲۷۴	۴: ۳	تقدراز و واج۔
۲۷۴	۴: ۱۲۷	دونوں کے اختلاط سے ہوتی ہے	۲۱۹	۴: ۱۲۷	یتامی النساء۔
۱۹۰	۳: ۱۰۹	فرائض حکومت میں مرد اور عورت سب شامل ہو سکتے ہیں	۲۷۴	۴: ۴	مہر۔
۲۷۰	۳: ۱۹۴	عورتوں اور مردوں کی مساوات۔	۲۷۸	۴: ۴	نکاح کی عمر۔
۳۱۷	۴: ۱۲۴	عورتوں اور مردوں دونوں کو جنت	۲۹۴-۳۱۰	۴: ۱۳	جرائم اور ان کی سزائیں۔
۱۶۰	۳: ۷۵	عہد۔ ایفائے عہد کی تاکید۔	۳۱۳	۴: ۲۶	ان احکام کی غایت
۵۸۰	۵: ۱۱۲-۱۱۵	عہد کے معنی۔	۴۱۹	۴: ۱۲۸	اگر بیوی کو خاوند کی طرف سے
۵۸۱	۵: ۱۱۶-۱۱۸	عیسائیوں کے باطل عقائد			سرکشی کا اندیشہ ہو تو
		(نیز دیکھئے نصاریٰ)	۴۱۹	۴: ۱۲۹	بیویوں کے ساتھ عدل کا مفہوم
			۳۷	۳: ۱۵	عبداللہ کی خصوصیات۔

مضمون	صفحہ	سورۃ و آیت	مضمون	صفحہ	سورۃ و آیت
(حضرت عیسیٰ علیہ السلام)			غلو - دین میں غلو کی ممانعت -	۲۸-۴۸	۴: ۱۴۱
کوئی حیات -	۸۵	۳: ۴۲	شان رسالت میں غلو کی احادیث -	۵۵۰	۵: ۷۷
پیدائش -	۸۸	"	وضع کردہ ہیں -	"	"
ابن ابیہ کا باطل عقیدہ -	۱۰۰-۱۰۲	"	اجبار و رہبان اور سلاطین کی	۵۵۳	۵: ۷۷
ابن مریم کیوں کہا گیا -	۹۶		شان میں غلو		
انقلاب آفرین تعلیم -	۱۱۸	۳: ۴۹	ف		
معجزات -	۱۱۲				
مخالفت -	۱۲۰		دال (فتح سورہ) کا مفہوم -	۳۲	۳: ۱۰
حیات و ممات (حضرت مسیح کا مسئلہ) -	۱۳۳-۱۳۴	۳: ۵۳	فرعون کی قوم کا مال -	۳۰	۳: ۱۰
واقفہ صلیب -	۱۳۳-۱۳۴	۲: ۵۴	فرقہ بندی		
ہجرت -	۱۲۵		رسول اللہ ﷺ تھے یا شیعہ ؟	۱۴۷	۳: ۶۴
رفع الی السماء کا عقیدہ -	۱۲۷	۳: ۵۴	اہل حدیث تھے یا اہل فقہ ؟	۱۴۷	
یہودیوں کی آخری تباہی -	۱۳۷		حنفی مجموعہ احادیث -	۱۴۸	
عصر حاضر کی تحقیق -	۱۳۹		حنفی تفسیر قرآن -	۱۴۹	
نزول کا عقیدہ -	۲۵۱	۳: ۱۴۳	سنی ترجمہ قرآن -	۱۴۹	
حضرت عیسیٰ کو خدا کا عید ہونے م			فترہ کے معنی -	۴۸۳	۵: ۱۹
سے غار نہیں	۴۴۷	۴: ۱۷۲	فقہ میں غلو -	۵۵۱	۵: ۷۷
حواریوں کی طرف وحی -	۵۷۴	۵: ۱۱۱	فاحشات سے اجتناب -	۲۴۲	۳: ۱۳۴
مائدہ من السماء -	۵۷۸	۵: ۱۱۲-۱۱۵	ق		
غ					
غلامی کا خاتمہ -	۲۰۶	۳: ۱۲۶	قانتین -	۳۸	۳: ۱۶
			قتال -	(دیکھئے جہاد)	

صفحہ	سورۃ و آیت	مضمون	صفحہ	سورۃ و آیت	مضمون
۲۹-۲۹۵	۴:۹۲-۹۳	قتل کے جرم کی سزا -	۲۹۵-۲۹۶	۴:۹۲-۹۳	قتل کے جرم کی سزا -
۴۱	۳:۱۷	قسط کا مفہوم -	۴۱	۳:۱۷	قسط کا مفہوم -
۲۲۶، ۲۲۷	۳:۱۶۰ ۵:۶	قرأت (اختلاف کا عقیدہ) اور اس کا عجیب و غریب مفہوم	۲۲۶، ۲۲۷	۳:۱۶۰ ۵:۶	قرأت (اختلاف کا عقیدہ) اور اس کا عجیب و غریب مفہوم
۲۵۰	۴:۱۷۵	قرآن مجید کی خصوصیات -	۲۵۰	۴:۱۷۵	قرآن مجید کی خصوصیات -
۲۵۰	۴:۱۷۵	قرآن خدا کی طرف سے بُراہان ہے -	۲۵۰	۴:۱۷۵	قرآن خدا کی طرف سے بُراہان ہے -
۳۸۳	۴:۸۲	قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں -	۳۸۳	۴:۸۲	قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں -
۴۸	۳:۲۲	قرآن کے مطابق فیصلے نہ کرنیوالے	۴۸	۳:۲۲	قرآن کے مطابق فیصلے نہ کرنیوالے
۴۰۶ ۵۱۸ ۵۲۸	۴:۱۰۵ ۵:۴۲ ۵:۲۹	کافر ہیں -	۴۰۶ ۵۱۸ ۵۲۸	۴:۱۰۵ ۵:۴۲ ۵:۲۹	کافر ہیں -
۱۵۶	۳:۷۲	قرآن ہی معیار ہدایت ہے -	۱۵۶	۳:۷۲	قرآن ہی معیار ہدایت ہے -
۲۲۶ ۱۵۲ ۱۸۳	۳:۱۶۰ ۳:۱۰۰-۱۰۲ ۳:۱۶۰	قرآن کے باطنی معانی -	۲۲۶ ۱۵۲ ۱۸۳	۳:۱۶۰ ۳:۱۰۰-۱۰۲ ۳:۱۶۰	قرآن کے باطنی معانی -
۲۲۶	۳:۱۶۰	اعتصام بکتاب اللہ ہی دین ہے -	۲۲۶	۳:۱۶۰	اعتصام بکتاب اللہ ہی دین ہے -
۲۲۶	۳:۱۶۰	ناسخ و منسوخ کا عقیدہ -	۲۲۶	۳:۱۶۰	ناسخ و منسوخ کا عقیدہ -
۳۷۷	نیز دیکھیے اسلامی نظام	قرآنی نظام	۳۷۷	نیز دیکھیے اسلامی نظام	قرآنی نظام
۲۶۱	۳:۱۸۲	دینا قرآنی نظام کی طرف آ رہی ہے -	۲۶۱	۳:۱۸۲	دینا قرآنی نظام کی طرف آ رہی ہے -
۲۶۲	۵:۳	قرآنی -	۲۶۲	۵:۳	قرآنی -
۵۵۸	۵:۸۹	سوختنی قرآنی کی فرمائش -	۵۵۸	۵:۸۹	سوختنی قرآنی کی فرمائش -
۲۵۷	۵:۲	قرعہ اندازی -	۲۵۷	۵:۲	قرعہ اندازی -
		قسمیں (لغو قسموں کا کفارہ)			قسمیں (لغو قسموں کا کفارہ)
		قلائد -			قلائد -
۲۴۰	۳:۱۳۳	کاظمین الغیظ کا مفہوم -	۲۴۰	۳:۱۳۳	کاظمین الغیظ کا مفہوم -
۲۶۸	۳:۱۹۰	کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے -	۲۶۸	۳:۱۹۰	کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے -
۲۰	۳:۱۷	کائنات کی وحدت -	۲۰	۳:۱۷	کائنات کی وحدت -
۲۶۷	۳:۱۸۹	کائنات کے نظم و نسق پر غور و فکر -	۲۶۷	۳:۱۸۹	کائنات کے نظم و نسق پر غور و فکر -
۳۷	۳:۱۵	کافران کا فریضہ ہے -	۳۷	۳:۱۵	کافران کا فریضہ ہے -
		کبار الاثم -			کبار الاثم -
		کتاب اللہ - (دیکھیے قرآن)			کتاب اللہ - (دیکھیے قرآن)
۲۶۵	۳:۱۸۶	کتمان حقیقت (کتمان حق)	۲۶۵	۳:۱۸۶	کتمان حقیقت (کتمان حق)
۱۷۸ ۵۶۲	۳:۹۵-۹۶ ۵:۹۷	کعبہ کے متعلق آیات -	۱۷۸ ۵۶۲	۳:۹۵-۹۶ ۵:۹۷	کعبہ کے متعلق آیات -
		کفار			کفار
		کفار کے ساتھ تعلقات -			کفار کے ساتھ تعلقات -
۱۹۵ ۵۶ ۳۲۶	۴:۱۱۷ ۳:۲۷ ۴:۱۳۹	کفار کو ان کے اچھے کاموں کا صلہ	۱۹۵ ۵۶ ۳۲۶	۴:۱۱۷ ۳:۲۷ ۴:۱۳۹	کفار کو ان کے اچھے کاموں کا صلہ
۱۶۰	۳:۷۵	اسی دنیا میں مل جاتا ہے -	۱۶۰	۳:۷۵	اسی دنیا میں مل جاتا ہے -
۱۹۲	۳:۱۱۵	کفار اسلامی حکومت میں شامل نہیں کئے جاسکتے	۱۹۲	۳:۱۱۵	کفار اسلامی حکومت میں شامل نہیں کئے جاسکتے
۲۵۶	۳:۱۴۸	کفار کا مسلک اختیار کرنے سے اسلام باقی نہیں رہتا	۲۵۶	۳:۱۴۸	کفار کا مسلک اختیار کرنے سے اسلام باقی نہیں رہتا

صفحہ	سورۃ و آیت	مضمون	صفحہ	سورۃ و آیت	مضمون
۲۲۷	۴: ۱۴۱	کفار، مومنین پر غالب نہیں آ سکتے۔	۱۸	۳: ۴	محکمات و متشابہات -
۳۸۹	۴: ۸۹-۹۱	کفار اور منافقین کے ساتھ	۲۶	۳: ۴	(ر متشابہا مثانی)
۲۹۹	۴: ۱۳-۱۴	تعلقات کی مماثلت	۳۸	۳: ۱۶	مستغفرین بالاسرار -
		کوڑوں کی سزا۔	۴۲۴	۴: ۱۳۶	مسلمانوں کو ایمان لانے کا حکم۔
					مشاورت
			۲۱۵	۳: ۱۵۸	رسول اللہ ﷺ کو حکم۔
			۲۲۱	۳: ۱۵۸	امت کو حکم۔
			۲۴۱	۴: ۱۱۴	مخفی مشورے۔
			۲۳۰	۳: ۱۶۴	مصبیبتیں اپنی ہی لائی ہوئی ہوتی ہیں
			۳۰۵	۳: ۱۵۱	(حضرت) مریمؑ
			۳۰۵	۴: ۱۵	کوائف حیات -
			۷۸	۳: ۳۵	ہیکل کی زندگی -
			۷۱	۳: ۴۱	راہبیت کی زندگی -
			۷۶	۳: ۴۱	انقلابی اقدام -
			۸۳	۳: ۴۲	ازواج کی زندگی -
			۸۳	۳: ۴۲	حمل کے متعلق سہاری وضعی روایات
			۱۰۴	۳: ۵۸	(حضرت) مسیحؑ (دیکھئے حضرت عیسیٰؑ)
			۲۵۱	۳: ۱۴۳	کا نزل -
			۲۵۱	۳: ۱۴۳	معاشی نظام
			۶۲	۳: ۳۰	مال و وجہ قیام -
			۶۷۸	۵: ۱۳	مذہبی پیشوائیت (تحریف کا ارتکاب)
			۶۷۷	۴: ۳	محراب کے معنی -
			۶۶	۳: ۳۸	

صفحہ	سورۃ	مضمون	صفحہ	سورۃ	مضمون
۵۱۳	۵ : ۴۱	منافقت بھی کفر ہے۔	۳۱۹	۴ : ۳۶	معاشرتی زندگی
۳۸۹	۹۱ - ۸۹ : ۴	منافقین کے ساتھ تعلقات	۳۸۷	۴ : ۸۶	حسن سلوک
۴۳۰	۴ : ۱۴۴	کی ممانعت	۵۶۱	۵ : ۹۲	کھانے پینے کے طریقوں پر
۲۶۵	۳ : ۱۸۸	منافقین اُن کاموں پر تعریف	۱۰۸	۳ : ۴۸	کوئی پابندی نہیں
۴۲۷	۴ : ۱۴۱	چاہتے ہیں جنہیں وہ کرتے نہیں	۴۳۵	۴ : ۱۵۳	معجزات کے متعلق تفصیلی بحث۔
۴۲۷	۴ : ۱۴۲	منافقین مفاد پرست ہوتے ہیں۔	۱۱۲	۳ : ۴۸	(حضورؐ سے معجزات کی فرمائش)
۴۳۰	۴ : ۱۴۳	منافقین کی صلوٰۃ۔	۵۰۱	۵ : ۳۴	(حضرت عیسیٰؑ کے معجزات)
۴۳۱	۴ : ۱۴۵	منافقین مذہب ہوتے ہیں۔			معافی — سزائیں۔
۵۲۶	۵ : ۴۶	منافقین درک اسفل ہیں۔			مکافاتِ عمل
		منہاج کے معنی۔	۱۶۰	۳ : ۷۵	کفار کے اچھے کاموں کا صلہ
		موت	۲۶۲	۴ : ۳۹	اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔
۲۳۳	۳ : ۱۶۸	موت کے بعد اس دنیا سے	۴۱۰	۴ : ۱۱۱	انسان کا ہر جرم خود اس کی اپنی
۲۱۳	۳ : ۱۵۵	کوئی تعلق نہیں رہتا	۳۶۳	۴ : ۷۵	ذات کے خلاف ہوتا ہے
۲۳۳	۳ : ۱۶۸	موت و حیات کا قرآنی مفہوم۔	۲۵۰	۳ : ۱۴۳	مکہ کے مظلومین کی امداد کے لئے
۲۵۲	۳ : ۱۴۴	موت ہر ایک کے لئے ہے۔			اٹھنے کا حکم
۵۷	۳ : ۴۷	(کیا) موت کا وقت مقرر ہے؟			ملکوکیت۔
		مودودی (مرحوم) کی تفسیر۔			علائکہ
۲۱۶	۳ : ۱۵۴	دروغ گوئی اصول شکنی کی تعلیم	۲۰۵	۳ : ۱۲۲-۱۲۳	جنگ بدر اور احد میں ملائکہ کی نصرت
		مودودی (مرحوم) کا غلط نظریہ	۲۳۲	۳ : ۱۶۵	منافقت۔
۴۰	۵ : ۶	دربارہ رسولؐ	۲۳۷	۳ : ۱۷۸	منافقین کی شناخت خود کرنی تھی۔
۳۱	۳ : ۱۰	(اختلافِ قرأت کے قائل بھی)	۲۳۷	۳ : ۱۵۸	مناقی اور مومن الگ ہو چکے تھے۔
		مودودی (مرحوم) کی، انبیاء کی	۳۸۹	۴ : ۸۶	منافقین کے بارے میں دو آراء
		لغزشوں کے متعلق گمراہ کن تعلیم			نہیں ہونی چاہئے

صفحہ	سورۃ	مضمون	صفحہ	سورۃ	مضمون
۲۶۴	۳: ۱۸۴	نجات کا مفہوم -	۲۶۲	۳: ۱۹۸	مومن کی خصوصیات -
۲۵۱	۳: ۱۴۳	نزول حضرت مسیحؑ -	۲۳۵	۳: ۱۴۲	مومن کی خصوصیات -
۲۲۳	۳: ۱۵۹	نصرت خداوندی کا مفہوم -	۲۴۰	۳: ۱۹۸	(صبر - ربط باہمی - تقویٰ)
۲۴۹	۳: ۱۴۳	نظام اور قانون کا دور آگیا -	۲۴۰	۳: ۱۹۸	مومن مفکر بھی ہوتا ہے اور مجاہد بھی -
۵۴۶	۵: ۷۶	نفع نقصان صرف قوانین خداوندی کے مطابق پہنچ سکتا ہے -	۲۴۰	۳: ۱۹۸	مومنین پر کفار غالب نہیں آسکتے -
۲۷۸	۴: ۷	نکاح کی عمر -	۵۳۱	۵: ۵۵	(حزب اللہ غالب رہے گی)
		نماز - (دیکھئے صلوٰۃ)	۲۴۵	۲: ۱۳۸	مومن کا مقام - اَعْلُوْنَ -
			۴۱۳	۴: ۱۱۵	(سبیل المومنین کا اتباع -
			۲۷۸	۴: ۴	مہر کی ادائیگی -
			۲۵۱	۳: ۱۴۳	مہدی -
۳۱۹	۴: ۳۶	والدین اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک	۲۳۶	۳: ۱۴۶	جہالت کا قانون -
۴۰	۳: ۱۷	وحدت کائنات -	۵۵۹	۵: ۹۰	میسرہ -
۴۱۱	۴: ۱۱۲	وحی نے وہ کچھ بتایا جو تم نہیں جانتے تھے -	۴۷۲	۵: ۱۲۱	میشاق بنی اسرائیل -
۵۷۴	۵: ۱۱۱	وحی کا تفصیلی مفہوم -	۴۷۳	۵: ۷۰	میشاق (نصاری سے)
۵۷۴	۵: ۱۱۱	(حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی)	۴۷۹	۵: ۱۲۱	میشاق (تمام انبیاء سے)
۴۴۵	۴: ۱۶۶	وحی کے منزل من اللہ ہونے کی شہادت وراثت	۲۲۶	۳: ۱۶۰	ناسخ و منسوخ کا عقیدہ -
۲۷۹	۴: ۷	قانون وراثت کا تمہیدی بیان -	۴۳	۳: ۱۹	نبوت اور رسالت میں فرق -
			۵۱۷	۵: ۴۴	بنی بلاتاب (احمدیوں کا باطل عقیدہ -
			۴۱۲	۴: ۱۱۴	نجوی (مخفی مشورے) -

صفحہ	سورۃ آیت	مضمون	صفحہ	سورۃ آیت	مضمون
۴۰۰	۴:۱۰۰	ہجرت سے بلندی درجات -	۲۷۹	۴: ۷	وراثت
۳۹۸	۴:۹۷-۹۸	(بلا عذر ہجرت نہ کرنیوالے)	۲۸۲	۴:۱۱-۱۲	قانون وراثت کا تمہیدی بیان -
		ی	۲۹۳	۴:۱۱-۱۲	وراثت سے متعلق تفصیلی احکام -
۴۱۹	۴:۱۲۷	نیامی النساء کا نکاح -	۳۱۸	۴: ۳۳	(یتیم پوتے کی) وراثت -
۲۹۳	۴:۱۱-۱۲	یتیم پوتے کی وراثت -	۲۸۲	۴:۱۱-۱۲	وراثت کی تقسیم وصیت پوری {
۲۷۵	۴: ۲	یتیموں کے حقوق کا تحفظ -	۳۱۸	۴: ۳۳	کرنے کے بعد
۲۷۸	۴: ۲		۲۵۱	۴: ۱۷۷	عقدی رشتوں کی وراثت -
۲۸۱	۴: ۸-۱۰		۵۰۲	۵: ۳۵	کلام کی وراثت -
۴۷	۳: ۳۸	(حضرت) یحییٰ کے کوائف حیات	۵۷۲	۵: ۱۰۸	وسیلہ -
۴۳۸	۴: ۱۶۱	یہودی ربوا کے مجرم تھے -			وصیت کے متعلق شہادت -
۴۳۸	۴: ۱۸۲	{ یہودیوں میں سے ایمان لے آنے والے	۴۷۸	۵: ۶	(وصیت کا حکم تیسری جلد میں آچکا ہے)
۱۳۷	۳: ۵۴	یہودیوں کی آخری تباہی -	۴۷۲		وصو کا حکم (شیعہ سُنی کا اختلاف)
۱۳۸	۳: ۵۵	(عیسائیوں کے غلبہ کی پیش گوئی)	۴۱۶	۴: ۱۲۲	وعد اللہ -
۳۳۳	۴: ۵۴	{ یہودیوں کا حسد کہ نبوت بنی اسمعیل کی طرف کیوں چلی گئی	۴۰۸	۴: ۱۰۷	وکالت کا پیشہ -
۴۸۲	۵: ۱۷-۱۸	یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد -	۴۰۶	۴: ۱۰۷	(خائنین اور غلط کاروں کی {
۵۲۹	۵: ۵۱	(اُن کے ساتھ تعلقات)	۴۰۸	۱۰۹	وکالت مت کرو)
		یہودیوں سے خطاب :			ہ
۴۸۳	۵: ۱۷-۱۸	{ اگر تم خدا کی چاہتی اولاد ہو تو پھر مبتلائے عذاب کیوں ہو	۴۹۲	۵: ۲۷	ہابیل و قابیل کا قصہ
			۳۱		(یہ نام قرآن میں نہیں ہیں)
			۳۸۹	۴: ۸۸-۹۱	ہجرت ایمان کا ثبوت تھی -

جُمْلہ حقوق محفوظ

نام کتاب	مطالب الفرقان (جلد چہارم)
مصنف	علامہ غلام احمد پرویزؒ
ناشر	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور (۵۳۶۶۰)
طالع	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	ایچ۔ وائی پرنٹرز، لاہور
ایڈیشن	اول، نومبر ۱۹۸۱ء
	دوم، جولائی ۱۹۹۳ء

کتاب ملنے کے پتے

طلوع اسلام ٹرسٹ، بی، گلبرگ ۲ لاہور

دوست ایسوسی ایٹس

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی
جُمْلہ آمدن و شرعی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے